انجمن ترقی اردو پاکستان کا ماہوار ترجمان

قومی زبان

شمارہ - ۱

جولائی سنہ ۱۹۶۶ء

فی پرچہ
ایک روپیہ

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ
کراچی

فہرست

ڈاکٹر سید عبداللہ

استاد کی ذمّہ داری

۲۶ مئی ۱۹۶۶ء کو میونسپل کالج چنیوٹ میں ایک تعلیمی مذاکرہ جسٹس سجاد احمد جان صاحب کی
صدارت میں منعقد ہوا تھا جس میں ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے یہ تقریر کی تھی۔

طلبہ کی تربیت میں استاد کی ذمہ داری مسلم ہے۔ استاد کا منصب ہی یہ ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کو علم پڑھائے اور ان کی تربیت بھی کرے۔ استاد کا یہ منصب نیا نہیں ازل سے ہے۔ اور اس سے انکار کسی اور کو ہو تو ہو مگر کوئی استاد اپنے اس فرض۔ اپنے اس حق کا منکر نہیں ہو سکتا۔ اور اس وقت میں بھی استاد کو اس کی یہ ذمہ داری یاد دلا رہا ہوں! میرا خیال ہے کہ ہر استاد یہ ذمہ داری از سرِ نو قبول کرنے کے لئے تیار بھی ہے۔ لیکن وہ کہتا ہے ذمہ داری کے مسئلوں پر گفتگو کرنے سے پہلے میری بھی تو سنو۔ میں غریبِ شہر سہی مگر میرے بھی کچھ سخن ہائے گفتنی ہیں۔ ان کو اظہار کا موقع ملنا چاہیئے۔

میں خود استاد ہوں۔ بحیثیت استاد میری گزارش یہ ہے کہ نئے زمانے میں جس طرح زندگی کے باقی شعبوں میں پیچیدگی آگئی ہے استاد کی ذمہ داری کا مسئلہ بھی پیچیدہ ہو گیا ہے یعنی یہ ویسا سہل اور سادہ سوال نہیں جیسا کسی زمانے میں ہوا کرتا تھا۔

بنیادی بحث یہ ہے کہ استاد پر ذمہ داری ڈالنے والا معاشرہ کیا استاد کو اس نظر سے اب بھی دیکھتا ہے جس نظر سے کل تک دیکھتا تھا۔ ممکن ہے بچوں کے والدین میں سے بعض اب بھی استاد کو احترام کی نظر سے دیکھتے ہوں لیکن اب استاد اور بچوں کے والدین کے درمیان ایک اور شے حائل ہو گئی ہے اور وہ شے ہے نظام اور ادارہ۔ پہلے استاد خود ایک ادارہ ہوتا تھا، خود اپنی ذات میں نظام ہوتا تھا۔ اس کے اور والدین کے مابین بلکہ اس کے اور بچے کے مابین کوئی اور حائل نہ ہوتا تھا۔ مگر اب نظام اور ادارہ استاد اور طلبہ کے درمیان حائل ہے۔ اس لئے ذمہ داریوں کے معاملے میں، استاد سے پہلے وہ نظام اور ادارے مسئول ہیں جو تربیت کے قانون بناتے ہیں، استاد کے لئے دستور العمل وضع کرتے ہیں۔ ادارہ جو استاد کی کشش کا مسئلہ بنانے کے بجائے بلند عمارتیں قائم کرنے کے لئے تعلیم کو فیس اور اجرت کا مسئلہ بناتے ہیں۔ ان سب

معاملات میں استاد کا اتنا اختیار بھی نہیں جتنا کسی سبزی بیچنے والے کا اپنی دکان کو سجانے اور آراستہ کرنے کے معاملے میں ہوتا ہے ۔ استاد اپنا دستور العمل خود وضع نہیں کرتا دوسروں کا وضع کردہ دستور العمل استاد کے ہاتھ میں دے دیا جاتا ہے کہ بیٹے! یوں چلئے اور یوں نہ چلئے ۔ غرض نظام اور تربیت کا نفاذ ادارے اور نظام کے ہاتھ میں ہے استاد اس میں ایک ملازم اور ساجرت پر پڑھانے والا ایک اہل کار ہے ۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں ۔

آپ کو غلط فہمی نہ ہو، میں نظام کی مخالفت نہیں کر رہا ہوں میں صرف ذمہ داری کے مسئلے کا تجزیہ کر رہا ہوں اور یہ ذہن نشین کرانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ موجودہ حالات میں، ساری ذمہ داری استاد کی نہیں اس میں ادارے اور نظام بھی حصہ دار ہیں ۔ لہذا ان معاملات میں غور و فکر کرتے وقت نظام کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے ۔

میں اس نکتے پر بہت کہہ چکا ہوں پھر بھی مزید وضاحت کی خاطر عرض کرتا ہوں کہ تعلیم کا کوئی نظام بھی ہو اس کا کوئی نہ کوئی بنیادی فلسفہ ہوتا ہے ۔ ہماری تعلیم کا بنیادی فلسفہ پہلے تو ہے ہی نہیں ۔ اور اگر ہے بھی تو اس کو وضع کرنے والے کون ہیں؟ انگریزوں کے زمانے میں نظام تعلیم کا دستور بنانے والے انگریز علما اور حکام تھے، انہیں خوب معلوم تھا کہ ان کے تعلیمی مقاصد کیا ہیں ۔ قیام پاکستان کے بعد اب تک کوئی معین ہی نہیں کر سکا کہ ہماری تعلیم کا مقصد کیا ہے؟ ایسے حالات میں، تعلیم اب محض ایک انتظامی مسئلہ ہے اس میں کسی فلسفیانہ بصیرت اور ماہرانہ تجربے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی ۔

بڑی مصیبت یہ ہے کہ ملک میں تجربہ و تحقیق کی کمی یا اس سے بے اعتنائی کی وجہ سے، تعلیم کے منتظم آسانی اس میں سمجھتے ہیں کہ کوئی باہر کا بنا بنایا نظام، معمولی قطع و برید کے بعد، پاکستان میں نافذ کر دیا جائے ۔ البتہ اتنی احتیاط ضرور کر لی جاتی ہے کہ رپورٹوں کے شروع میں قرآن مجید کی ایک آیت انگریزی ترجمے کے ساتھ ضرور رکھ دی جاتی ہے اور مقدمے میں اسلامی اسپرٹ اور اسلامی اصول کی قسم کے چند الفاظ ضرور آ جاتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ یہ پاکستانی مال ہے ۔ اندر وہی پرانی باتیں اور پرائے اصول ۔ زیادہ سے زیادہ یہ سوچا جاتا ہے کہ دو چار ٹیڑھیاں استادوں کو بھی سنا دی جاتی ہیں تاکہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ تعلیمی حالات کی خوب چھان بین کی گئی ہے اور جائزہ ماہرانہ ہے ۔

ہمارے ہاں تعلیمی مہارت اب بھاگ دوڑ، رسوخ اور ساز باز کا نام ہے ۔ تعلیمی فلسفوں پر غور اور تعلیمی تجربوں کی تحقیق اور تصنیف ضروری چیز نہیں ۔ کوئی چھ برس پہلے بنی سیلیو یا کی کسی یونیورسٹی کا سربراہ اتفاق سے لاہور میں وارد ہوا ۔ اس نے ادھر ادھر دریافت کیا کہ یہاں تعلیم و تعلم سے متعلق لوگوں میں سے کتنوں نے تعلیم پر کتابیں لکھی ہیں بڑی جستجو کے بعد معلوم ہوا کہ کوئی چھ سات برس قبل لاہور کے سنٹرل ٹریننگ کالج کے ایک استاد نے " انگریزی درس و تدریس " پر ایک کتاب لکھی تھی ۔ اس پر اس نے تعجب سے پھر پوچھا ۔ بس یہی؟ جواب ملا ۔ ہم تعلیم کو ایک

انتظامی سوال سمجھتے ہیں اس پرانی فلسفہ طرازی کی ضرورت کیا ہے ؟ ایک سربراہ نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ کتابیں لکھی جائیں تو پتھراؤ کا ڈر ہے ۔ بنی سیلیویا والا اپنے ناطقے کو سر بہ گریباں کئے ہوئے ہمہ حیرت ، ہمہ سوال ، بن کر یہاں سے رخصت ہوا اور معلوم نہیں اپنے ملک میں جاکر کیا کیا کہا ہوگا ۔

خلاصہ یہ کہ جب ہمارے ملک میں ، تعلیم کو محض انتظامی مسئلہ سمجھا جاتا ہے تو اُستاد کی تربیتی ذمہ داری کہاں رہی ۔ استاد اب انتظامی مشین کے کل پرزوں سے زیادہ حیثیت و اہمیت نہیں رکھتے ۔ ایسے حالات میں ، ان پر ساری ذمہ داری ڈال دینا ناانصافی اور صریح زیادتی ہے ! اس ملک کا تعلیمی مسئلہ اس وقت تک روبہ اصلاح نہیں ہوسکتا جب تک پہلے نظام اور ادارے ٹھیک نہیں ہوجاتے ۔ اور نظام اور ادارے اس وقت تک ٹھیک نہیں ہوسکتے جب تک پورا معاشرہ درست نہیں ہوتا ۔ اور معاشرے کی یہ اصلاح ، ہمہ گیر ایمانی یا ہمہ گیر معقولیت کی تحریک کے بغیر ممکن نہیں ۔

یہ تو میں کہہ چکا کہ اُستاد اب اُستاد نہیں رہا ملازم ؛ دراہل کار ہے ۔ اس سے زیادہ وہ اگر کچھ ہونا بھی چاہے تو ہو نہیں سکتا ۔ پھر بھی استاد سے یہ سوال ہوسکتا ہے (اور میں جانب داری کے الزام سے بچنے کی خاطر یہ سوال ضرور اٹھاؤں گا) کہ استاد اگر ملازم اور اہل کار بھی ہے تو بھی اسے اچھا ملازم اور اچھا اہل کار تو ہونا ہی چاہئے ۔ یہ کیوں ؟ یہ اس لئے کہ استاد پر اس بارے میں بھی کچھ الزام دھرے جارہے ہیں ۔

بہت سے اُستاد اس الزام کی تردید کریں گے ؟ بہت سے اُستاد معنی خیز خاموشی سے اس سوال کو ٹال جائیں گے ۔ کچھ استاد ایسے بھی ہوں گے جو الزام دھرنے والوں کے ہم نوا بن کر ، اہل انتظام کے انعام کا استحقاق پیدا کرلیں گے ۔ مگر اس سوال کا جواب استادوں کے ذمے ہے اور وہ عنداللہ اس سے بری الذمہ نہیں ہوسکتے ۔

اس وقت کے استاد کے دو فرض ہیں ۔ یا تو وہ اپنے قدیم منصب کی عزت برقرار رکھنے کے لئے جرات گفتار سے کام لے اور بلا خوف ، اپنے نظام تعلیم پر ماہرانہ اظہار رائے کرتا رہے ۔ اس کی پاداش میں عین ممکن ہے کہ اسے عقوبت کا مستحق بھی ٹھہرایا جائے لیکن وہ اگر قدیم منصب کا دعوے دار ہے تو اسے ، ملک کے برتر مقاصد تربیت کی خاطر ، جرات گفتار سے کام لینا ہی ہوگا ۔ تعمیری تنقید ہر استاد کا فرض اولیں ہے !

اور اگر یہ نہیں کرسکتا اور وہ سچ مچ اپنے آپ کو اہل کار سمجھتا ہے تو بھی اسے ، اپنے فرائض تدریس کو دیانتداری سے انجام دینا چاہیئے تاکہ وہ دیانتدار اہل کار ثابت ہو ۔

یہاں پہنچ کر ، پھر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ استادوں کے طبقے میں بے دلی کیوں ہے ؟ استاد اپنے فرائض سے (اگر یہ سچ ہے تو) غفلت کیوں برتتے ہیں ؟ جسٹس حمود الرحمٰن کے کمیشن نے ان اسباب پر بہت کچھ لکھا ہے ۔ ان میں تنخواہ کی کمی ، دوسری سہولتوں کی کمی ، سوسائٹی کا استادوں کو عرفی مقام وحیثیت سے محروم

کر دینا - وغیرہ وغیرہ

کمیشن نے استادوں کی ان شکایتوں پر ہمدردانہ نظر ڈالی ہے اور ان کے حق میں کچھ سفارشات بھی کی ہیں اور اساتذہ کو کمیشن کا شکر گزار بھی ہونا چاہیئے - مگر میں بہ ادب عرض کروں گا کہ اس سے ذمہ داری کا مسئلہ حل نہیں ہوتا - یہ ٹھیک ہے کہ استادوں کی معاشی تکلیفوں کا کچھ ازالہ ممکن ہے مگر اصل سوال دو ہیں -

(۱) کیا ان رعایتوں کے بعد استاد تربیت کے کل نظام کے درست کرنے کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں ؟

(۲) کیا ان رعایتوں کے مل جانے کے بعد، استاد معاشرے میں وہ معزز مقام پھر حاصل کر سکتا ہے جو کبھی اسے حاصل تھا !

میں ان دونوں سوالوں کا جواب نفی میں دیتا ہوں - یہ رعایتیں مل بھی جائیں تو بھی جب تک تربیت کے دستور و منع کرنے کی ذمہ داری ایک انتظامی ذمہ داری سمجھی جائے گی اور استاد کی حیثیت اس میں موثر نہ ہوگی جملہ خرابیوں کو دور کرنے کی ذمہ داری استاد کو قبول نہیں کرنی چاہیئے -

معاشرے میں استاد کی عرفی حیثیت اس وقت تک بہتر نہیں ہو سکتی جب تک معاشرہ استاد کو محض ایک اہل کار سمجھتا رہے گا - دوسرے ملکوں میں استاد کی اب بھی بہت عزت ہے - میرے ایک شاگرد نے مجھے بتایا ہے کہ اٹلی میں استاد کو بڑے احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے - میں نے سنا ہے کہ عدالتوں تک میں جج صاحبان استاد کو کرسی پیش کرتے ہیں - اور اعزاز کی دوسری بہت سی صورتیں ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں -

معترض کہہ سکتا ہے کہ ہمارے ملک کے استاد، اس پائے کے نہیں - معترض پر میرا اعتراض یہ ہے کہ اس ملک کے استاد اس پائے کے کیوں نہیں ؟ اس لئے کہ معاشرے نے غلط تعلیمی تصورات کے تحت استاد کو ملازم اور اہل کار سمجھ رکھا ہے - اچھے استاد گوشہ نشین ہوتے جا رہے ہیں - ان پر ثابت ہوتا جا رہا ہے کہ خلوص سے بڑھ کر کوئی حماقت مجرمانہ نہیں ہو سکتی - ان کی بے دلی سے دوسرے استاد بھی بے دل ہوتے جا رہے ہیں، اور یہ سلسلہ بڑھتے بڑھتے تعلیم کا معاملہ محض کاروباری اور محض انتظامی ہوتا جا رہا ہے - اور اچھے استاد خود بخود غائب ہو رہے ہیں -

یہ مسئلہ انتظامی نہیں روحانی ہے - تربیت کے سوال کو محض محکمانہ اہمیت حاصل نہیں - اس کا تعلق تہذیب سے ہے - جو بچے اسکولوں اور کالجوں میں آتے ہیں وہ اپنے معاشرے کے رنگ میں ڈوبے ہوئے آتے ہیں - والدین، اہل محلہ، سینما، ہوٹل، تھیٹر، کلب، ان میں سے ہر شئے کا اثر ان پر پڑتا ہے - اب استاد سے یہ توقع کہ وہ اپنی بے دست و پائی کے باوجود بچے کے ان سب گدلے رنگوں کو دھو ڈالے بڑی مشکل توقع ہے - اور اس سے بھی مشکل امر یہ ہے کہ نظام تعلیم کے واضعین خود بھی متشکک ہیں اور یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ

صحیح تربیت کا معیار کیا ہے؟ اس بے یقینی کے عالم میں خود واضعین، نظام تعلیم میں بعض ایسے عناصر داخل کر دیتے ہیں جن سے بڑے بڑے فساد پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور جب یہ فساد پیدا ہو چکتے ہیں تو یہ سب حضرات دامن جھاڑ کر الگ ہو جاتے ہیں اور آوازے کسنے لگتے ہیں۔ پکڑ یو۔ ماریو۔ یہ کم بخت استاد۔ اس نے ہمارے بچے برباد کر دیئے۔ حالانکہ جہاں تک مجھے معلوم ہے، کسی کالج میں آج تک کوئی سٹرائک کسی استاد کے خلاف نہیں ہوئی۔ سٹرائکیں ان انتظامی مسئلوں کی وجہ سے ہوتی ہیں جن میں استاد کی بہت کم ذمہ داری ہوتی ہے۔ یہ پیچیدگیاں نظام اور ادارے کے نیم معقول قواعد کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

وقت کی تنگی کے باعث، صرف ایک آدھ مثال پر اکتفا کروں گا ہماری تعلیم میں کیفے ٹیریا اور مخلوط تعلیم اور پہاڑوں پر مخلوط گرمائی کورس۔ یہ کس کی ایجاد ہے؟ یہ تحفے، ہمارے واضعین نے بچوں اور بچیوں کے ہاتھ میں خود پکڑائے ہیں، ان سے جو غنچے کھل رہے ہیں اور جو شگوفے پھوٹیں گے ان کا ذمہ دار کون ہے؟ آنکھیں بند کر لینے سے حقائق کو چھپایا نہیں جا سکتا۔ کیفے ٹیریا کی سرپرستی کرنے والے کون لوگ ہیں؟ اب کہا گیا ہے کہ لڑکے کالجوں میں فساد کرتے ہیں ان کی توجہ دوسری طرف لگانے کے لئے، مزید کیفے ٹیریا کھول دو۔ بچے بالے ہیں، ذرا کھائیں پئیں، ہنسیں کھیلیں، اچھلیں کودیں۔ اس میں کچھ مد بھیڑ بھی ہو جائے تو مضائقہ نہیں۔ کالجوں کے کمروں کے شیشے تو نہیں ٹوٹیں گے! حالانکہ یہ محض فریب خیال ہے۔ تعلیم کو تن آسانی، تفریح اور تعیش سے وابستہ کرنے سے ہی عدم ضبط اور بدنظمی کا آغاز ہوا ہے۔ مگر نظام کے واضعین اس سے تغافل برت رہے ہیں! اور پیش گوئی کی جا سکتی ہے کہ کل جب اس غلط ترویج کے نتائج نمودار ہوں گے تو یہ سب لوگ استادوں کو اس کا ذمہ دار قرار دیں گے اور مخلوط تعلیم کے عواقب سے جواب مخلوط تفریح کا دوسرا نام ہے، پھر بھی نظر بچا کے نکل جائیں گے۔

میری ان گزارشات سے، اگر کسی کو یہ غلط فہمی ہوئی ہو کہ میں نے استادوں کو ذمہ داری سے بچا لیا ہے تو اسے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہئے۔ میں استاد کی ذمہ داری کو مانتا ہوں اور علی الامکان کہتا ہوں کہ استاد کی سنگین ذمہ داری کا روز آغاز وہ تھا جب اس نے اپنے عمل سے، اور ضمیر کی کمزوری کی وجہ سے عملاً یہ تسلیم کر لیا اور ثابت کر دیا کہ وہ اہل کار ہے تنخواہ دار ہے، اجرت والا ہے، دہاڑی دار ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ جب یہ معاملہ یہ ہے تو دہاڑی دار کو یہ حق کہاں سے مل گیا کہ وہ پھر بھی اپنے آپ کو روحانی پیشوا اور رہنما سمجھتا رہے کہ یہی اس کی ذمہ داری ہے۔ غالب نے ایک شعر میں کتنی اچھی تصویر کھینچی ہے ؎

عشق و مزدوری عشرت گہ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامیٔ فرہاد نہیں!

سید جاوید اختر

مولانا محمد علی جوہر۔ اور ان کی صحافت

مجھے یہ مختصر سا مضمون اس بڑی شخصیت سے متعلق تحریر کرنا ہے۔ جس کا نام ان چوٹی کے اکابر و مشاہیر میں ، بہ لحاظ جامعیت ، سرفہرست آتا ہے۔ جنہیں اسلامی ہند کی سرزمین نے ماضی قریب میں جنم دیا۔ اس بڑی شخصیت کا اسم گرامی "محمد" اور "علی" کے مقدس الفاظ آپس میں جوڑ دینے سے مکمل ہوتا ہے۔ اور جب اس نام کے ساتھ "جوہر" کا، اضافہ کر دیتے ہیں تو یک لخت ہمارے ذہن میں ایک ایسے شخص کی تصویر سی بن جاتی ہے۔ جو بیک وقت انگریزی زبان کا ایک اعلیٰ انشاپرداز۔ ایک بہترین مدیر، شیکسپیئر کا ایک ماہر نقاد، اتھیلو اور میکبتھ وغیرہ کا ایک اعلیٰ مبصر، ایک سحر بیان مقرر، ایک بلند پایہ شاعر، ملک کا ایک نامور رہنما اور ایک ممتاز ترین سیاسی سردار تھا۔ مگر طرح طرح کے گہرے گہرے نقاب اس عظیم ہستی کے چہرے پر کچھ یوں تہ بہ تہ پڑے ہوئے ہیں کہ اس کے روئے مبارک کے اصلی خدوخال اور بشرہ کے حقیقی حسن و جمال کا مشاہدہ دشوار معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال اپنے موجودہ موضوع کو بطرز احسن نبھانے کے لئے میں اپنے ذہن کی پوری قوتوں کو یکجا کر کے، اس عظیم ہستی کے چہرے سے صرف وہی اہم نقاب الٹوں گا جن کے اٹھ جانے سے ایک صحافی کی صورت دکھائی دے سکے۔

کامریڈ مولانا محمد علی جوہرؒ کی صحافیانہ زندگی کا آغاز اس وقت سے ہوا۔ جب انھوں نے ۱۹۱۰ء کے آخر میں بڑودہ کی ملازمت ترک کر کے کلکتہ سے اپنا ایک ہفتہ وار اخبار "کامریڈ" نکالا۔ اس سے قبل انھوں نے کسی اخبار کی ایڈیٹری نہیں کی تھی اور نہ کسی اخبار کے دفتر کا کوئی تجربہ رکھتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود محض یہ دیکھ کر کہ مسلمانان ہندوستان کے پاس ایک اخبار بھی ایسا نہیں جو صحیح طور پر ان کے خیالات اور خواہشات کی ترجمانی یا ان کی اصلاح کر سکے، مولانا نے پورے عزم و استقلال کے ساتھ صحافت کے بحر ذخار میں اپنی کشتی ڈال دی تھی، اپنی اس نئی زندگی کی ابتدا سے متعلق خود مولانا کا ارشاد ہے " یہ نئی راہ ایک حد تک کافی سنگین تھی اور خاص طور سے اس شخص کے لئے جو بیکن کی پرمعنی اصطلاح میں قسمت کے حضور میں اپنی بیوی اور بچوں کی صورت میں اتنے یرغمال پیش کر چکا ہو[1]۔

---

[1] مولانا محمد علی جوہر ، مرتبہ محمد سرور ص ۸۸

مولانا محمد علی نے جن حالات میں "کامریڈ" کا اجرا کیا۔ ان کی یاد اور ذکر حیرت انگیز ہے۔ یہ پرچہ نکالنے سے پیشتر آپ رام پور اور بڑودہ میں اونچے اونچے عہدوں پر فائز رہ چکے تھے اور کامریڈ کی پہلی کاپی زیور طبع سے آراستہ کرنے سے کچھ ہی روز پہلے آپ کو ریاست جاورہ کی وزارت کی پیش کش کی گئی تھی اور بلاشبہ یہ ایک بہت بڑا منصب تھا۔ لیکن مولانا نے اسے "کامریڈ" سے زیادہ اہم اور عزیز تر نہ جانا۔ انھوں نے اس پیش کش کے لمبے چوڑے تار کو اس وقت تک نہ کھولا، جب تک "کامریڈ" کا پہلا پرچہ چھپ کر کلکتہ کے بازاروں میں بکنے کے لئے نہیں چلا گیا۔ کیونکہ انھیں یہ شک تھا کہ یہ تار اس نوجوان والیٔ ریاست کا ہوگا۔ جس کی باصرار پیش کش کی سر مائیکل اڈوائر جیسا آدمی بڑے زوروں سے تائید کر چکا تھا۔ دراصل مولانا اپنی صحافیانہ زندگی کے آغاز کے عین پہلے لمحہ تک تمام ترغیبات سے بچنا چاہتے تھے خیال فرمائیے کہ میدان صحافت میں اترتے وقت مولانا کس قدر مخلص اور باعزم تھے۔ اور صحافت کی نئی راہ اختیار کر کے انھیں یقینی آمدنی اور مستقبل کی ترقی کے تمام مواقع سے دست بردار ہونا پڑا اور یوں انھوں نے "ایک جواری کی طرح" وہ تمام روپیہ جو وہ کہیں سے بھی جمع کر سکے تھے۔ ایڈیٹر اور پروپرائٹر بننے کے داؤ پر لگا دیا۔ جس نے بعد میں ایک غیر مقدس اور بہت ہی گراں تثلیث کی، یعنی ایڈیٹر۔ پروپرائٹر مع پرنٹر کی شکل اختیار کر لی۔

"کامریڈ" کے اجراء کا اولین مقصد قوم و ملت کی گزارشات اس حکومت کے گوش گزار کرنا تھا۔ جو ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے برصغیر پاک و ہند پر آ قابض ہوئی تھی۔ مولانا چاہتے تھے کہ ہندوستانیوں کو جس چیز کی بھی ضرورت ہو اس کا مطالبہ کسی معتبر ذریعہ سے ایوان حکومت تک پہنچایا جا سکے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے باہر اسلامی ممالک کو ایک ایسے انگریزی اخبار کی ضرورت تھی جو اسلامی قدروں سے ہم آہنگ ہوتا۔ خود اپنے ملک میں کئی ایسے مسلمان موجود تھے جو اردو میں مہارت نہیں رکھتے تھے۔ مزید برآں مولانا محمد علی جوہر سرزمین پاک و ہند کے کروڑوں مختلف مذاہب اور فرقوں کے لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر مجتمع کرنے کے آرزومند تھے۔ انھیں ہند میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے متحدہ مذاہب ہند کا خواب مولانا ایک زمانے سے دیکھتے رہے تھے۔ چنانچہ ہفت روزہ "کامریڈ" کو جو سب کا کامریڈ یعنی ساتھی تھا۔ انہی خیالات کا ترجمان ہونا تھا۔

وہ لوگ جو پرانے وقتوں سے آشنا ہیں، اس بات کی گواہی دیں گے کہ ہفت روزہ کامریڈ نے بہت جلد صحافتی دنیا میں ایک بلند مرتبہ پیدا کر لیا تھا اور اس کامیابی کی وجہ یقیناً یہ تھی کہ "کامریڈ" نے انگلستان کے مختلف اخباروں کی تقلید کی تھی۔ اور حاکم و محکوم دونوں کے مشترک مذاق کے مطابق ایک معجون مرکب تیار کر کے دونوں کے حضور پیش کی تھی۔ اس اخبار کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے لگائیے کہ نہ صرف ہندوستان کے "کالے" لوگوں نے بلکہ انگلستان کے "گوروں" حکومت کے افسروں اور بڑے بڑے صاحب بہادروں نے اس پرچہ کو سینے سے لگایا

میر محفوظ علی فرماتے ہیں "انگریزوں کی اچھی خاصی تعداد کامریڈ کی خریدار تھی اور اس کے مضامین کی عاشق اور اس کے طرز نگارش کی مداح تھی"[1]

لیکن ہفت روزہ "کامریڈ" اور انگریزی سرکار کی زیادہ عرصہ تک نہ بن سکی۔ ۱۹۱۲ء کے سال تک کہ جس میں پایہ تخت کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ "کامریڈ" بھی دہلی چلا گیا تھا۔ ہندوستان کے سیاسی حالات میں کافی تغیر رونما ہوا۔ اس کی تفصیل میں میں اس وقت نہیں جاؤں گا۔ بہر حال اس سلسلے میں تقسیم بنگال کے فیصلہ کی منسوخی کو ذہن میں رکھنا لازمی ہے کہ جس سے مسلمانان ہند پر یہ واضح ہوگیا تھا کہ ان کی ملک کے باہر اور نہ ملک کے اندر کوئی قدر و قیمت ہے۔ چونکہ "کامریڈ" مسلمانوں کے ان احساسات کا ترجمان تھا۔ اس لئے جلد ہی وہ حکام کی نظر کرم سے محروم ہوگیا۔ ۱۹۱۳ء میں تو مولانا محمد علی کا حکام سے کھلم کھلا تصادم ہوگیا کہ جب حکومت نے ایک پمفلٹ جو مولانا کو کئی دوسرے مسلمانوں کی طرح موصول ہوا تھا۔ ضبط کر لیا۔ ۱۹۱۴ء میں جب برطانیہ نے ترکی کے خلاف اعلان جنگ کیا تو مولانا نے اس کی سخت مخالفت کی۔ جس کے نتیجے میں آپ کا چھاپہ خانہ، پریس ایکٹ کے ماتحت بند کر دیا گیا۔

بیجا پور جیل سے رہائی کے ایک سال بعد اکتوبر ۱۹۲۴ء میں محمد علی نے اپنی صدارت کانگرس کے دوران میں دوبارہ "کامریڈ" نکالا، لیکن اب ملک کی سیاسیات میں اتنا تغیر رونما ہو چکا تھا۔ ان کے مشاغل میں اتنا اضافہ ہو چکا تھا اور ان کی ذمہ داریاں اس قدر بڑھ گئی تھیں، نیز راجہ غلام حسین اور ولایت علی جیسے یگانۂ روزگار ساتھیوں سے وہ یوں محروم ہوگئے تھے کہ کامریڈ جیسا نکالنا چاہیئے تھا۔ ویسا نہ نکال سکے۔ تاہم مولانا کمر ہمت کس کر تن تنہا کامریڈ کا بار اٹھاتے رہے۔ آپ کو کسی معیاری سب ایڈیٹر کی تلاش تھی۔ جو پوری نہ ہو سکی۔ بالآخر ناساز گار حالات سے مجبور ہو کر آپ نے کمریڈ کی اشاعت ۱۹۲۶ء میں اس امید پر ملتوی کر دی کہ جب بھی کوئی اچھا سب ایڈیٹر ملے گا۔ پرچہ کو سہ بارہ جاری کر دیا جائے گا۔ لیکن افسوس کہ نہ سب ایڈیٹر ملا اور نہ محمد علیؒ کمریڈ کا تیسری بار اجراء کر سکے۔

ہفت روزہ کامریڈ کی سب سے بڑی خدمت یہ تھی کہ اس کے ذریعہ قوم کے منتشر افراد ایک ہی مرکز پر آگئے۔ یہ کمریڈ ہی کا طفیل تھا کہ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۱ء تک مسلمانان ہند بتدریج ایک ہی قومی پالیسی پر متفق ہوگئے تھے اور وہ پالیسی خود بتدریج ترقی کرتے کرتے انھیں خلافت کی بقاء و احیاء اور ہندوستان کی آزادی اور سوراج کے مطالبہ تک لے گئی تھی

ہمدرد

اُن دنوں مسلمان قوم کے عوام کے لئے۔ خصوصاً ان کے لئے جو انگریزی زبان سے نابلد تھے۔ مگر اُردو خوب سمجھ سکتے تھے۔ اعلیٰ پیمانے پر ایک اردو جریدے کی ضرورت تھی۔ مولانا محمد علی نے دہلی پہنچکر "ہمدرد" کے نام سے ایک اردو روزنامہ جاری کرنے کے انتظامات بھی کامریڈ کے ساتھ شروع کر دیے۔ اصل میں

---

[1] سیرت محمد علیؒ از رئیس احمد جعفری ص ۲۲۸

ارادہ انھوں نے کلکتہ ہی سے کیا ہوا تھا۔ مگر چونکہ حالات سازگار نہ ہو سکے تھے۔ اس لئے فوری طور پہ یہ پرچہ نہ نکل سکا اس سلسلے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ بیروت سے مولانا نے جو ٹائپ "ہمدرد" کے لئے منگایا تھا وہ پورا نہیں تھا اور جب تک وہ مکمل نہ ہو جاتا ہمدرد کا نکلنا محال تھا۔ لیکن بعد ازاں، ۲۳ فروری ۱۳ء کو مولانا محمد علی نے حکیم اجمل خاں کے مشورہ پر ایک ورق کا ہی پرچہ شائع کرنا شروع کر دیا، جسے عام طور پر "نقیب ہمدرد" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے[1]۔

یہاں ایک بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، کہ "ہمدرد" کا ادارتی عملہ قابل ترین افراد پر مشتمل تھا۔ اسٹاف ہمدرد کا ایک ایک فرد اپنے وقت کا ایک بہت بڑا ادیب اور صحافی ثابت ہوا۔ اور بقول مولانا رئیس احمد جعفری "بہت سے ذرّوں کو محمد علی نے اپنی نگاہ کیمیا اثر سے آفتاب بنا دیا تھا"۔ ان اصحاب میں میر محفوظ علی، سید ہاشمی فرید آبادی۔ عبدالغفار، سید جالب۔ مولوی عبدالحلیم شرر اور فاروق اور عارف ہسوی وغیرہ شریک تھے۔

مولانا محمد علی نے ہمدرد کو اس شان اور آن بان سے چلایا کہ اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ ہمدرد، ہندوستان کا وہ پہلا اردو روزنامہ تھا جس نے براہ راست ایسوسی ایٹڈ پریس اور روائٹر کی خدمات حاصل کی تھیں۔ ہزاروں کی تعداد میں شائع ہو کر ہاتھوں ہاتھ بک جانے سے زیادہ کسی پرچے کی کامیابی کی اور کونسی دلیل ہوتی ہے؟ اور "ہمدرد" اخبار کو یہ دلیل حاصل تھی۔ خاص کر جنگ عظیم کے زمانے میں تو اس پرچہ کی اشاعت اپنی پوری بلندیوں پہ پہنچ گئی تھی۔

مولانا محمد علی جوہر کی نظر بندی کے بعد ہمدرد کی اشاعت بھی ملتوی کرنا پڑی اور گو سید جالب نے بہتیری کوششیں کیں مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے اور اخبار کا چلانا ان کے لئے ناممکن ہو گیا۔ بیجاپور جیل سے رہائی کے بعد محمد علی نے "کامریڈ" کے ساتھ "ہمدرد" کی زمامِ ادارت پھر اپنے ہاتھ میں لے لی۔ چنانچہ ۹ر نومبر ۲۴ء کو "ہمدرد" کی دوسری بسم اللہ ہوئی۔ اس اشاعت میں "دعا" کے عنوان سے جو ایک مضمون شامل کیا گیا اس میں سے ایک اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

"الہ العالمین! تو جانتا ہے کہ میری نیت میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔ میری بصیرت نے میری رہ نمائی اسی طرف کی ہے کہ میرے وطن کی مظلومیت و محکومیت کے خاتمہ کا صرف یہی ایک راستہ ہے اگر میں غلطی میں مبتلا ہوں تو مجھ کو سیدھا راستہ دکھلا اور اگر میں نے صراط مستقیم اختیار کی ہے تو میرے قلم اور میری زبان میں اتنی قوت اور طاقت عطا فرما کہ اپنے گم کردہ راہ بھائیوں کو صحیح اور سیدھے راستے کی طرف لا سکوں۔"

اس عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ایک دردمند دل رکھتے تھے۔ ایک ایسا دل۔ جو شب و روز قوم و وطن کے غم میں ڈوبا رہتا تھا۔ آپ نے صحافت کے پیشے کو اپنی "بصیرت" کی "رہ نمائی" کے بعد اپنے گم کردہ راہ بھائیوں کو صراط مستقیم پر ڈالنے اور غلامی کے طوق سے آزاد کرنے کے لئے، اختیار کیا تھا۔ بلاشبہ مولانا ایک مخلص اور سچے صحافی تھے اگر وہ چاہتے تو بعض دیگر اخبارات کی طرح کسی کی خوشامد کرکے، یا کسی کو بے جا ڈرا دھمکا کر اپنی جیبیں گرم کر سکتے تھے لیکن

---

[1] بعد ازاں "ہمدرد" ٹائپ کو چھوڑ کر لیتھو میں چھپنے لگا تھا۔

انھوں نے یہ روش کبھی اختیار نہ کی۔ بلکہ انتہائی دیانت داری کے ساتھ ایک ہی مخصوص پالیسی پر کاربند رہے۔ اس سلسلہ میں خواجہ حسن نظامی نے "ہمدرد" کی بلند پائیگی کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے۔

"مسلمانوں کے اور ہندوستان کے شہرہ آفاق لیڈر محمد علی صاحب کی ایڈیٹری میں "ہمدرد" روزانہ شائع ہوتا ہے۔ اس اخبار کی طرز عامیانہ نہیں ہے، بلکہ انگریزی کے اعلیٰ اخباروں کی شان کے موافق نہایت باوقار اور مدلل رائے زنی اس اخبار میں ہوتی ہے۔ اسلامی ممالک اسلامی حقوق اور ہندوستانی حقوق کی یکساں حمایت کرتا ہے۔"[1]

لیکن باوجود ان سب اوصاف کے ہمدرد کا عہد ثانی، عہدِ اوّل کی نسبت کمزور رہا۔ اس کا سبب مولانا کی بے اندازہ مصروفیات اور بیماری تھی۔ نیز جوہر مرحوم کو ایسے اچھے مترجم نہیں مل سکے تھے جو انگریزی زبان کو اردو کے قالب میں بخوبی ڈھال سکتے۔ اور یہ ذمہ داری مولانا خود بھی نہ اٹھا سکتے تھے۔ کیونکہ انھیں اور بھی تو بہت سے کام کرنا ہوتے تھے۔ چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ "ہمدرد" پہلے سی آب و تاب سے محروم ہوگیا اور اس کا معیار وہ نہ رہا، جس کی دھوم میں اول عہد میں تھیں۔

جب مئی ۱۹۲۸ء میں محمد علی جوہر، علاج کی غرض سے یورپ تشریف لے گئے تو "ہمدرد" کی ایڈیٹری مولانا عبدالماجد دریا بادی اور انتظامات مولانا ظفر الملک نے سنبھال لئے۔ مگر یہ دو حضرات بھی پرچے کی بگڑتی ہوئی حالت کو نہ سنوار سکے۔ اور پرچہ پیہم نقصانات کی نذر ہوتا گیا، محمد علی جوہر ۱۰ ستمبر کو ہندوستان واپس آئے۔ کچھ عرصے انھوں نے "ہمدرد" کو سنبھالا دے رکھا۔ لیکن بالآخر بڑھتے ہوئے خسارہ اور مالی مجبوریوں سے تنگ آکر انھوں نے ۱۲ اپریل ۱۹۲۹ء کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہ روزنامہ بند کر دیا۔ مولانا محمد علی کے اس پرچے میں آخری الفاظ یوں تھے۔" اب میں قارئین ہمدرد کو الوداع کہتا ہوں۔ میں نے جس کسی کا قصور کیا ہے۔ اس سے استدعا ہے کہ وہ مجھے معاف کرے نہیں تو اسے اختیار ہے کہ جو جی چاہے مجھے کہہ لے۔ مگر میرے لئے دعا ضرور کرے کہ خدا مجھے حق گوئی، حق نگاری اور حق پرستی کی توفیق عطا فرمائے اور میرے بے شمار گناہوں کو معاف کرے۔"

نظریۂ صحافت

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ محمد علی جوہر کا وہ نظریہ صحافت پیش کر دیا جائے جس پر عمل پیرا ہوکر "ہمدرد" نے ہندوستانی صحافت میں اپنے غیر فانی نقوش قائم کئے۔ ایک بار مولانا جوہر کے ایک واقف کار نظام الدین نامی نے گجرات سے ایک اخبار نکالنا چاہا اور اول الذکر سے مشورہ طلب کیا۔ اس کے جواب میں جوہر مرحوم نے صحافت کے جو زرّیں اصول نظام الدین صاحب کی خدمت میں پیش کئے ان کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے:۔ (۱) اخبار کی کامیابی کے لئے لازمی ہے کہ وہ ذاتیات سے بالکل مبرا ہو۔ (۲) جہاں تک ممکن ہو وہی خبریں چھاپی جائیں جو انگریزی ڈیلی چھاپتے ہیں۔ خبروں کا صحت مند ہونا ضروری ہے۔ (۳) اخبار کا مقصد اپنی قوم

---

[1] روزنامچہ ۱۴ر نومبر ۱۹۲۶ء

کو نفع پہنچانا ہونا چاہیئے۔ (۴) اخبار میں زیادہ تر خبروں کا حصّہ ہونا چاہیئے۔ (۵) اداریہ جان دار ہو اور یوں نہ معلوم ہو کہ محض اخبار بھرنے کے لئے لکھا گیا ہے۔ (۶) ایڈیٹوریل نوٹ حال کے واقعات اور خبروں پہ اپنی رائے زنی کے لئے ہے۔ اس لئے اسی کام میں آنا چاہیئے۔ (۷) خطوط وہی چھاپے جائیں جو واقعی کسی ضرورت کے تحت لکھے گئے ہوں (۸) اخبار مذہبی بحث سے بالکل معرّا و مبرّا ہو۔ (۹) ایڈیٹر کو خود تمام مسئلوں پر غور کرنا اور دوسرے اخباروں اور کتابوں سے واقفیت حاصل کرنا لازم ہے۔"

اولوالعزمی

مولانا محمد علی جوہر ایک ہوشیار اور ذہین صحافی تھے۔ بیک وقت "کامریڈ" اور "ہمدرد" ایسے دو معیاری پرچوں کو چلانا آپ ہی کا کام تھا اور اس کے لئے آپ کو شب و روز محنت کرنا پڑتی تھی۔ اول تو آپ کی مصروفیات ہی کیا کم تھیں اور اس پر طرّہ بیماری کا، لیکن اس کے باوجود مولانا کے نیک عزائم متزلزل نہ ہوئے۔ آپ نے ایک فرض شناس انسان کی طرح، جو ذمہ داریاں اپنے سر لی تھیں، انھیں ادا کیا۔ ایک سچے صحافی کی طرح راستہ کی مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ اور خلوص اور دیانتداری کے ساتھ اپنا کام کرتے رہے۔ اکثر اوقات یوں بھی ہوا کہ مولانا نے علیل ہونے کے باوجود کئی کئی گھنٹے لگاتار "کامریڈ" یا "ہمدرد" دونوں کا کام کیا۔ خوراک تک کی پروا نہ کی اور محض قہوہ کی چند پیالیوں پر گزارا کیا۔ کھانے کی کسے فرصت تھی۔ اور جب ایک مخلص فن کار کے سامنے کام کے ڈھیر لگے ہوں تو خوراک اور نیند کی کسے طلب اور فکر ہوتی ہے؟ جب کبھی مولانا کسی جلسہ کی صدارت یا کسی دوسرے غیر صحافیانہ کام پر باہر تشریف لے جاتے۔ پرچہ کا کام آپ برابر جاری رکھتے۔ تاکہ پرچہ کی اشاعت دیر سے نہ ہو۔ متعدد بار یہ دیکھا گیا ہے کہ ادھر آپ تقریر سے فارغ ہوئے ہیں اور ادھر کوئی لیڈنگ آرٹیکل لکھ رہے ہیں یا پروف پڑھے جا رہے ہیں۔

حق گوئی و بیباکی

دوسرے ملکات و فضائل کے ساتھ مولانا محمد علی کا سب سے بڑا جوہر" جو فطرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا تھا۔ وہ جذبہ حق گوئی اور خوفِ غیر اللہ سے بے نیازی تھا۔ اپنے عرصۂ حیات میں محمد علی کو بارہا حاکموں، کج کلاہوں اور شہریاروں سے واسطہ پڑا، لیکن حق گوئی کی راہ پر چلتے ہوئے۔ ان کے پائے ثبات کو کبھی لغزش نہیں ہوئی۔ وہ ہر ایک جگہ رعد کی طرح گرجے اور بجلی کی طرح چمکے اور خاشاک غیر اللہ کو خاکستر کر کے رکھ دیا۔ بلاشبہ ان کی زندگی کا ہر لمحہ ایک پیہم حرکت تھی۔ جہاں جاتے دلوں میں آگ لگا دیتے۔ ان کی تقریریں نوجوانوں کو جنون و شوق کے نشہ میں سرشار کر دیتیں اور بوڑھے ان کے الفاظ کے تیر و نشتر سے بلبلا اٹھتے۔

ایک دلچسپ لطیفہ

مولانا محمد علی جوہر کے "ہمدرد" کے اداریے بڑے زور دار اور معنی خیز ہوتے تھے۔ قارئین ہمدرد انھیں خصوصی دلچسپی سے پڑھتے۔ مولانا ان اداریوں میں قوم و ملّت کو بڑے بڑے کام کے نکتے سمجھاتے جاتے تھے۔ برطانوی حکومت پر، "ہمدرد" کے اداریوں پر بڑی

گہری نظر رکھتی تھی۔ اور جب جنگ عظیم کے بعد " ہمدرد " پر حکومت نے سنسر بٹھادیا تولیڈنگ آرٹیکلز پر اور بھی گہری نظر رکھی جانے لگی۔ جوہر مرحوم سے کہا گیا کہ وہ کوئی بھی مضمون یا خبر حکومت کی منظوری کے بعد شائع کریں۔ انہی دنوں مولانا مرحوم و مغفور نے حکومت کی کوتاہ بینی اور بے انصافی کی قلعی کھولنے کے لئے اپنے ادارے میں " چڑے اور چڑیا " کی مشہور بچوں کی کہانی لکھی۔ دوست احباب کو دکھائی اور ہمدرد کے سنسر کے سپرد کردی تاکہ شامل اشاعت کرنے کی اجازت دی جائے۔

جو لوگ بزرگوں کی صف میں شامل ہوتے ہیں، انھیں یاد ہوگا کہ کس طرح سنسر بے چارے کو اس مہمل سے " چڑے اور چڑیا " کے قصے نے پورے چھ ماہ تک پریشانی کے جال میں پھنسائے رکھا تھا۔ سنسر بورڈ کا خیال تھا کہ محمد علی جوہر کا کیا پتہ، سادہ اور معمولی سی داستان ہی میں کوئی " زہر بھر دیا ہو "

مولانا جوہر آسمان صحافت کے ایک درخشاں ستارے تھے انھوں نے اہل ہند کے واسطے شعبہ صحافت میں جو اعلیٰ و ارفع اور قابل تقلید معیار قائم کیا، اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ ان کی صحافت کا اصلی اور بنیادی مقصد ملک و ملت کی خدمت کرنا تھا اور بلا شبہ انھوں نے جب تک صحافت کی، اس بنیادی مقصد سے کبھی انحراف نہ کیا اور ہمیشہ قوم و وطن کی بے لوث خدمت کے جذبے کو اپنے سینے سے لگائے رکھا۔

خدائے بزرگ و برتر، انھیں ان کی بے شمار نیکیوں کا اجر دے اور اپنی رحمتوں کے سائے تلے رکھے۔

اس انجمن گل میں

نوادر انجمن

انجمن کے کتب خانۂ خاص میں نادر و نایاب مطبوعات کے علاوہ اردو فارسی اور عربی کے مخطوطات بھی بڑی تعداد میں ہیں، جن میں سے بعض مخطوطات ایسے ہیں جن کا کوئی دوسرا نسخہ دنیا کے کسی کتب خانے میں نہیں۔ خطاطی اور مصوری کے شاہ کار بھی خاصی تعداد میں ہیں۔ اس کتب خانے کی مطبوعات کی فہرست بارہ جلدوں میں مرتب ہو چکی ہے جو عنقریب شائع ہوگی۔ اردو مخطوطات پر کام ہو رہا ہے اور ان کی وضاحتی فہرست کی پہلی جلد شائع ہو چکی ہے۔ دوسری اس سال شائع ہوگی۔ اب یہ طے کیا گیا ہے کہ "نوادر انجمن" کے نام سے خطاطی اور مصوری کے نمونوں کی بھی ایک فہرست شائع کر دی جائے ظاہر ہے کہ اس کام پر خاصا وقت صرف ہوگا، لہٰذا فی الحال یہی مناسب سمجھا گیا ہے کہ جس قدر کام ہوتا جائے وہ سہ ماہی "اردو" میں شائع ہوتا رہے۔ "نوادر انجمن" کی پہلی قسط "اردو" کے جولائی ۱۹۶۶ء کے شمارے میں شائع کی گئی ہے۔ اس میں خطاطی کے آٹھ نمونے اصل رنگوں میں شائع کئے گئے ہیں جن خطاطوں کے یہ نمونے ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں:۔ یاقوت مستعصمی، بہادر شاہ ظفر، آغا مرزا، محمد علی ابن زرّیں قلم، مالک، محمد یوسف، سید محمد علی۔

بابائے اردو کی پانچویں برسی

۱۶ راگست ۱۹۶۶ء کو بابائے اردو کی پانچویں برسی منائی جا رہی ہے، اس روز ایک جلسۂ عام ہوگا جس میں اہل علم بابائے اردو کی خدمات کو خراج تحسین پیش کریں گے۔ توقع ہے کہ لاہور سے ڈاکٹر سید عبد اللہ اور حیدر آباد سندھ سے ڈاکٹر سید غلام مصطفیٰ اس اجلاس میں شرکت کے لئے تشریف لائیں گے۔

اس موقع پر قومی زبان کا بابائے اردو نمبر بھی شائع کیا جائے گا۔ اس کے لئے ممتاز اہل قلم کے مقالات خاصی تعداد میں موصول ہو چکے ہیں۔ بابائے اردو کے دوستوں کے انٹرویو بھی اس میں شائع کئے جائیں گے نیز "مرقع عبد الحق" کے عنوان سے نادر تصاویر بھی چھاپی جائیں گی۔

بابائے اردو کے عقیدت مندوں سے

اگست ۱۹۶۷ء میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کی پانچویں برسی کے موقع "قومی زبان" کا ایک خاص شمارہ شائع کیا جا رہا ہے۔ جس میں مرحوم کی شخصیت اور ان کے علمی و ادبی کارناموں پر مقالات شامل ہوں گے۔ مرحوم کے دوستوں، عقیدت مندوں اور شاگردوں سے گزارش ہے کہ اگر ان کے پاس بابائے اردو کے مکاتیب اور تصاویر ہوں تو وہ ادارہ "قومی زبان" کو ارسال فرمائیں۔ اشاعت کے بعد یہ نوادر شکریے کے ساتھ واپس کر دیئے جائیں گے۔

انجمن ترقی اردو لاہور

انجمن ترقی اردو لاہور کی طرف سے شہر کے ہوٹلوں میں اردو کی مہم کا آغاز ہوا۔ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت شورش کاشمیری کی قیادت میں مال روڈ کے چند ہوٹلوں اور ملک باروں میں کارکنان مہم نے ان ہوٹلوں کے مالکان سے درخواست کی کہ وہ اپنے کاروبار میں اردو کو داخل کریں۔ جس پر بعض نے فوراً عمل کیا اور بعض نے وعدے کئے کہ وہ ضرور اردو کے بورڈ آویزاں کریں گے۔ شورش کاشمیری نے اس موقعے پر جلوس کے خلوص کو سراہا اور امید ظاہر کی کہ بہت جلد اردو اپنا صحیح اور جائز مقام حاصل کرے گی۔ انہوں نے کہا کہ میں نے یہ عہد کر لیا ہے کہ وہ کسی ایسی تقریب میں شرکت نہیں کریں گے۔ جہاں انگریزی کا استعمال بلا کسی وجہ کے کیا گیا ہو۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کی اپیل

انجمن ترقی اردو لاہور کے ناظم اعلیٰ ڈاکٹر سید عبداللہ نے ہوٹلوں قہوہ خانوں کے مالکان سے اپیل کی ہے کہ وہ قومی حمیت کا ثبوت دیتے ہوئے انگریزی کا بے جا استعمال ترک کر دیں۔ اس سے جہاں کاروبار پر خوشگوار اثر پڑے گا وہاں پاکستان کی بھی قابلِ قدر خدمت ہو گی۔ انہوں نے تعلیم یافتہ طبقہ اور عوام سے اپیل کی ہے کہ وہ اپنے علاقوں کے ہوٹلوں اور قہوہ خانوں کی فہرست انجمن کو بھیجیں تاکہ کارکنان اردو مہم ہر جگہ پہنچ سکیں۔

تحقیقاتی مرکز حروف

کراچی ۱۲ جون۔ تحقیقاتی مرکز حروف کے ایک اعلان میں کہا گیا ہے کہ صدر انجمن ترقی اردو مسٹر اختر حسین نے مرکز کے چیرمین کا عہدہ قبول کر لیا ہے۔ یہ ادارہ گزشتہ کئی برس سے پاکستان کی قومی زبانوں کے لئے ٹائپ اور طباعت کی ترقی کے لئے مسٹر تمنائی کی نگرانی میں کام کر رہا ہے یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ لائنو ٹائپ پر اردو نستعلیق میں کمپوزنگ کے لئے سب سے پہلے اسی مرکز نے ٹائپ کا ڈیزائن تیار کیا تھا جو برطانیہ کی مشہور کمپنی نے حال ہی میں تیار کیا ہے توقع ہے کہ جلد ہی پاکستان میں اردو بنگلہ کی ٹیلی پرنٹر سروس شروع کرنے کے لئے یہ مرکز ٹیلی پرنٹر کی تیاری کے لئے اعلیٰ پیمانے پر کام شروع کر دیگا اس مرکز کا مقصد اردو اور بنگلہ زبانوں کی طباعتی دشواریوں کو دور کر کے قومی زبانوں کو ترقی دینا ہے۔

انتخاب علی کمال

مہر تقوی جے پوری

جناب شاغل جے پوری مولف تذکرۂ شعرائے جے پور نے اپنے تذکرے کے صفحہ ۴۷۸ سے ۴۸۱ تک جناب مہر تقوی جے پوری مرحوم کے متعلق جو عبارت لکھی ہے۔ وہ یہ ہے۔

" مہر تخلص۔ " محمد خورشید علی " تاریخی نام۔ تخلص کے ساتھ " تقوی " اپنے استاد جناب مرزا محمد نقی بیگ مائل کی نسبت سے لکھتے ہیں۔ نسباً سید، مذہباً سنی حنفی ولادت ۴ راگست ۱۹۰۲ء مطابق ۱۲ رجمادی الاول ۱۳۲۲ھ یوم پنجشنبہ بمقام جے پور۔ بزرگوں کا وطن قصبہ سانبھر تھا۔ مگر آپ کے والد ماجد مستقلاً جے پور میں رہتے تھے۔ اس لئے آپ کو سانبھری کہنے کے بجائے جے پوری کہنا زیادہ صحیح ہے۔ ابتدائی تعلیم اپنے نانا سید رحمت علی سے حاصل کی۔ نو برس کی عمر میں قرآن مجید ختم کیا۔ دس سال کی عمر میں گلستاں، بوستاں، انوار سہیلی ختم کیں۔ کچھ روز سانبھر اسکول میں تعلیم پائی ۱۹۱۹ء میں جے پور آکر مولوی اساس الدین صاحب تسنیم نارنولی جے پوری سے عربی کی ابتدائی تعلیم شروع کی۔ مگر تھوڑے دنوں بعد بوجہ ملازمت یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ۱۹۲۶ء میں بحالتِ ملازمت " طبیہ کالج جے پور " میں طب کی تعلیم شروع کی۔ ۱۹۲۹ء میں " طبیب فاضل " اور ۱۹۳۲ء میں " عمدۃ الحکماء " کے امتحانات پاس کئے۔ ۱۹۳۱ء میں پنجاب یونیورسٹی سے " منشی " فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ پھر میٹرک کیا۔ ۱۹۳۵ء میں " پولیس ٹریننگ اسکول جے پور " کے امتحان میں امتیازی کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۲۰ء میں صدر دفتر محکمہ پولیس جے پور میں کلرک مقرر ہوئے۔ اور ہیڈ کلرک کے عہدے تک ترقی پائی۔ ۱۹۴۷ء میں انقلابی ہنگاموں سے متاثر ہو کر پاکستان چلے گئے۔ اور وہاں ایڈوکیٹ جنرل مغربی پاکستان کے دفتر واقع کراچی میں آفس سپرنٹنڈنٹ ہیں۔ (بہ ۱۹۵۸ء)[1]

آخر ۱۹۱۶ء یا شروع ۱۹۱۷ء میں آپ نے پہلا شعر موزوں کیا۔ اس کے بعد سے وقتاً فوقتاً شعر کہتے رہے۔ ۱۹۲۰ء

---

[1] یہ سلسلۂ ملازمت وفات تک بدستور قائم رہا۔

میں حضرت مائل سے باقاعدہ شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ ان کی وفات ۱۹۳۱ء تک برابر استفادہ کرتے رہے[۱]۔ ادبی خدمت کا جذبہ ہونے کے باعث ملازمتی اور عائلی مصروفیات کے باوجود کچھ نہ کچھ خدمتِ ادب ضرور کرتے رہتے ہیں۔

آپ کو تصانیف کے سلسلے میں دیدہ ریزی و جفاکشی کا بھی اچھا ملکہ ہے۔ چنانچہ پاکستان جانے سے پہلے آپ کی حسبِ ذیل تصانیف تھیں۔

(۱) بیاضِ کلام (مہرِ درخشاں) غزلیات، قطعات اور مختصر نظموں کا مجموعہ۔ یہ مجموعہ پاکستان جاتے وقت ہندوستان ہی میں رہ گیا۔ اور اب بے پتہ ہے۔

(۲) ۱۹۴۰ء میں ایک رسالہ "واحد و جمع" کا مرتب کیا۔ جس میں بارہ سو سے زائد واحد الفاظ کے معنی اور ہر ایک کی ایک یا زیادہ جمع درج کی ہیں۔

(۳) ایک رسالہ ہم آہنگ الفاظ کا مرتب کیا۔ جس میں مختلف ہجا اور مختلف معنی کے پانچ سو سے زیادہ الفاظ ہیں۔ اس کا نام "تجنیسِ مضارع" ہے۔

(۴) نقشۂ عروض (موجز العروض) جو اپنی نوعیت و ترتیب کے لحاظ سے بہت آسان اور نفع رساں ہے۔

(۵) پاکستان پہنچنے کے بعد ۱۹۵۱ء میں "ترجمانِ بیخودی" کے نام سے علامہ اقبال کی مثنوی "رموزِ بیخودی" کا اردو منظوم ترجمہ کیا جس کے ایک ہزار چھبیس اشعار ہیں[۲]۔

(۶) ایک اور رسالہ مرتب کیا۔ جس میں موجودہ سنہ ہجری (۱۳۷۵ھ) سے آئندہ پچیس سال تک کے لڑکوں اور لڑکیوں کے تاریخی نام نکال کر جمع کئے ہیں۔ اور ہر سنہ کے کئی کئی سو نام ہیں۔ (تذکرۂ شعرائے جے پور)

(۷) انیس تاریخ گوئی (۱۳۷۹ھ) یہ کتاب مصنف کے فن تاریخ گوئی پر عمیق مطالعہ کا نتیجہ ہے فنِ جمل اور تاریخ گوئی کی تاریخ ہے جس میں اس بات کی تحقیق کی گئی ہے جمل کے الفاظ ... اور کس طرح قائم ہوئے ... ان کے مقابل اعداد کب مقرر ہوئے اس فن کے ماتحت تاریخ گوئی اور ... واقعہ کا خیال سب سے پہلے ... کس کو ہوا ... تاریخ گوئی کے ارتقائی منازل۔ مختلف صنعتیں۔ قطعات تاریخ کے نمونے، قطعۂ تاریخ مرتب کرنے کا طریقہ وغیرہ

---

[۱] جناب مائل کی وفات کے بعد ... جناب ... ... سے ... ... مولانا حافظ محمد یوسف صاحب غرق سلیمانی سے مشورۂ سخن کیا۔ ... ... ادبی ... متلمذ ہونے کی وجہ سے۔ اس ماحول کو خیرباد کہہ کر ۱۹۴۳ء میں علامہ سیماب اکبر آبادی سے باقاعدہ شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ اور ... ... کی وفات تک ... کراچی میں آنے کے بعد ... انہیں کو اپنا کلام دکھاتے رہے۔ اور اس ... وفات تک جناب ... ... علامہ سیماب اکبر آبادی سے مشورۂ سخن جاری رکھا۔

[۲] ترجمہ ۱۹۶۳ء میں ... ... اینڈ برادرس پبلشرز حیدرآباد (پاکستان) کے توسط سے طبع ہو گیا ہے۔

(۸) مجموعۂ تواریخ ۱۳۸۰ھ ۔ اس کتاب میں اُن کے والد ماجد حضرت شاد جے پوری کا تاریخی کلام درج ہے۔

(۹) تاریخہائے دل پسند ۱۳۷۷ھ ۔ یہ جناب مہر نقوی مرحوم و مغفور کے تاریخی قطعات کا مجموعہ ہے ۔

(۱۰) تذکرہ درفشاں ۱۹۶۴ء ۔ تاریخ گوئی کے ابتدائی زمانے سے آج تک کے تقریباً تمام مشہور اساتذہ اور دوسرے تاریخ گو شعرا کا تذکرہ جس میں ہر تاریخ گو شاعر کے مختصر و جامع حالات اور تاریخی قطعات درج ہیں ۔

کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے صاحب تذکرۂ شعرائے جے پور لکھتے ہیں :۔

" قواعد زبان و عروض کی پابندی طبع ثانیہ بن گئی ہے ۔ محاسن سے پہلے شعر کے معائب پر نظر پڑتی ہے کلام میں زور ہے روانی ہے ۔ چست بندشوں اور خوبصورت ترکیبوں پر زیادہ توجہ کرتے ہیں ۔ ندرتِ تخیل بھی ہے ۔ اور مضمون آفرینی و بلند پردازی بھی ۔ زبان صاف و شستہ استعمال کرتے ہیں"۔

اب نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

ابھی تو مری داستاں ہی سنی ہے
ابھی معنئ داستاں اور بھی ہیں

غمِ الفت میں جینا شاہکارِ زندگانی ہے
فرشتہ بن کے جی لینا تو کچھ مشکل نہیں ہوتا

محبت میں کہاں یہ اضطرابِ دل نہیں ہوتا
نہیں ہوتا تو زیرِ خنجرِ قاتل نہیں ہوتا

اک جنبش لب میں ہی نکل آتے ہیں آنسو
ہم اپنا فسانہ بھی تو دہرا نہیں سکتے

ہم نے جو تجھے دیکھ کے دل تھام لیا ہے
آدابِ محبت سے بڑا کام لیا ہے

لے دیا کیوں اپنے دلسوزوں میں پروانے کا نام
سوچ کر لینا تھا تم کو اپنے بیگانے کا نام

غم ملا، رنج ملا، درد ملا، داغ ملے
اک ستم ہو گیا انسان کا انساں ہونا

تنکے چن کر کیوں کروں توہینِ حسنِ انتخاب
پھول جب موجود ہیں میرے نشیمن کے قریب

بنا ہے یہ جہاں کیا اس غرض سے آئینہ خانہ کہ دنیا کو تمہیں پہچاننا دشوار ہو جائے

ہیں شکستہ در و دیوار، مگر ہیں تو سہی عظمتیں مٹ گئیں آثار مگر ہیں تو سہی

"تذکرہ درفشاں" میں حضرت قہر نے اپنے حالاتِ زندگی قلم بند کئے ہیں۔ جو یہ ہیں۔

"چونکہ میرے والدِ محترم جناب شادؔ جے پوری کو تاریخ گوئی کا شوق تھا۔ اکثر و بیشتر اس سلسلے میں ان کے نقوشِ قلم دیکھتے رہنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ اس لئے حروف ابجد کے اعداد تو بہت چھوٹی عمر سے ہی ازبر تھے۔ تاریخی مادّے اور مصرعے والد صاحب کے حاصل کئے ہوئے دیکھتا رہتا تھا۔ اُن کا اسلوب ترتیب اور طرز ادا سے بھی رفتہ رفتہ واقف تھا۔ میرے اُستادِ معظم جناب مائلؔ کی وفات کے بعد جب اُن کی وفات پر تاریخی قطعات لکھے جانے کا کام ہو رہا تھا۔ جس کے نتیجے میں ۱۹۳۲ء میں "شاہدِ غم" کی ترتیب و طباعت ہوئی۔ تو مجھے بھی شوق ہوا۔ چنانچہ میں نے اس موقع پر دو مادّے نکالے اور والد صاحب کی خدمت میں پیش کئے دونوں مادّے یہ تھے۔

(۱) "محمد تقی مائل شمع انور" (مائل صاحب جناب انور دہلوی کے شاگرد تھے)
۱۳۵۰ھ

(۲) داخلِ خلد مائل
۱۳۵۰ھ

یہ دونوں مادّے والد صاحب نے پسند تو فرمائے۔ مگر پہلے والے مصرعے کے مقابلے میں دوسرے مادّے کو ترجیح دی اور وجہ ترجیح کی بھی وضاحت کی۔ اس کے بعد ان پر مصرعے ضم کر دیئے۔ ان مادّوں کے بعد طبیعت میں مزید شوق ہوا۔ اور پانچ مادّہ تاریخ اور نکالے۔ جن میں ایک حروف مہملہ میں تھا اور اس پر مصرعے بھی بے نقط الفاظ ہی میں لگائے۔ مصرع تھا ؎

"راحلِ راہ مُعلّا موردِ رحم و کرم"
۱۳۵۰ھ

انہیں مادّوں میں ایک مادّہ حروفِ ملفوظی میں تھا ؎

سر بسر لطفِ سخن رفتہ ز دہر

متذکرۂ بالا تاریخوں سے یہ بات تو واضح ہے کہ راقم الحروف کو اپنے تاریخ کہنے کے ابتدائی زمانے سے ہی مختلف حیثیتوں سے تاریخ نکالنے کا شوق تھا۔ ان تاریخوں کے کہہ لینے کے بعد طبیعت میں مسرت و جولانی کی لہریں اٹھنے لگیں۔ اور بہت سے مختلف موقعوں پر تاریخی نام۔ مادّہ یا مصرع تاریخ حاصل کرتا رہا۔ مگر شغل گاہے گاہے کی ہی صورت رہی۔ اور معدودے چند تاریخیں محفوظ کیں۔ پاکستان میں (کراچی) آنے کے بعد ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو قائدِ اعظم جناب محمد علی جناح گورنر جنرل پاکستان کی وفات پر قطعۂ تاریخ کہا۔ جس کا آخری مصرع یہ ہے۔

"ندا آئی۔" جگر دوز انتقال قائدِ اعظم
۱۹۴۸ء

اس کے بعد دل میں مزید شوق پیدا ہوا - اور اس فن کی کتابوں کا بغور و تعمق مطالعہ شروع کیا - بہت سے مسائل اور اصل اپنے والد صاحب سے سیکھے - کئی سال تک وقتاً فوقتاً فنی مباحث کا مطالعہ کیا مختلف صنعتوں کی معلومات حاصل کیں - ۱۳۷۵ھ میں جب والد صاحب قبلہ پر بوجہ ضعیفی، کمزوری دماغ اور سہو کا غلبہ ہوا - اور اطبا رنے ان کو دماغی دباؤ ڈالنے سے روکا - تو بعض احباب و اعزہ نے یہ خدمت میرے سپرد کی - اور "اگر پدر نتواند پسر تمام کند" کے تحت بوقت ضرورت مجھے قطعہ تاریخ کہنے یا کوئی تاریخی نام تجویز کرنے پر مجبور کیا - تو میں نے تاریخیں کہنی شروع کیں - اور اب یہ دباؤ ایسا پڑا کہ مجھے جلد جلد تاریخیں کہنی پڑیں جس کی وجہ سے میری مشق روز بروز بڑھتی گئی - اور چونکہ صنعتوں کی طرف طبیعت شروع سے ہی مائل تھی - اس لئے سادہ تاریخوں میں روانی، واقعہ متعلقہ سے مطابقت، کے علاوہ کئی تاریخیں پرانے شعراء کی تقلید کرتے ہوئے - پرانی صنعتوں میں حاصل کیں - اور کئی صنعتیں ایسی نظر آئیں کہ جن میں آج تک کسی تاریخ گو شاعر نے طبع آزمائی نہیں کی تھی - ان میں میں نے غور و فکر کر کے تاریخیں نکالیں :-

بالکل نئی صنعتوں کی تفصیل یہ ہے -

(۱) "صنعتِ منفصلۂ کامل" یعنی تمام مصرع یا مادۂ تاریخ کے حروف جدا جدا ہی لکھے جاتے ہیں -

(۲) "صنعتِ رقطا" جس میں مصرع کا ایک حرف نقطہ دار ہو اور دوسرا حرف بے نقطہ -

(۳) "صنعتِ فوق النقاط" جس میں مصرع کے حروف منقوط ایسے ہوں جن کے اوپر نقطہ لگائے جاتے ہیں -

(۴) "صنعتِ تحت النقاط" " " " " " " نیچے نقطے " "

(۵) "صنعتِ واسع الشفتین" یعنی ایسا مصرعِ تاریخ جس کے ادا کرنے میں دونوں ہونٹ آپس میں نہ ملیں -

(۶) حروف مہوسہ سے تاریخ -

جناب شمیم صبائی متھراوی نے "مہر نقوی جے پوری "تاریخ گو شاعر کی حیثیت میں" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے - جو ۱۵ اپریل ۱۹۶۳ء کے روزنامہ انجام کراچی میں شائع ہوا ہے - اسی مضمون میں سے چند سطور اور چند دلچسپ تاریخیں بطور اقتباس درج کرتا ہوں -

" مہر نقوی جے پوری نے فنِ تاریخ گوئی کا شوق ورثتاً پایا ہے - مہر صاحب سید انور علی صاحب شاد جے پوری کے خلفِ اکبر ہیں - جو دور حاضر کے بڑے مشاق تاریخ گو شاعر تھے - اور جنہوں نے ۱۹۶۰ء میں کراچی میں انتقال فرمایا .... مہر صاحب بیشتر صاف رواں، نفسِ مضمون کے متعلق مادہ مرتب کرتے ہیں - بالعموم تخرجہ و تعمیہ کی تاریخوں کو پسند نہیں کرتے اور حق بھی یہ ہے کہ تاریخی مادہ ایسا ہونا چاہیئے کہ وہ خود بول اٹھے - کہ میں کب کس لئے، کس کے لئے، اور کن الفاظ میں تخلیق کیا گیا ہو - مہر صاحب ہمیشہ ایسے مادوں سے اجتناب کرتے ہیں - جو عام ہوتے ہیں - مثلاً

۱۹۵۸ء میں جب سردار عبدالرب نشتر نے انتقال کیا۔ تو کئی احباب نے "غریق رحمت" (۱۹۵۸ء) سے تاریخ وفات نکالی۔ اس مادہ کو قہر صاحب نے اس لئے ناپسند کیا۔ کہ اول تو یہ مادہ ۱۹۵۸ء میں مرنے والے ہر شخص کی تاریخ وفات کے لئے کام آ سکتا ہے۔ اس کا نشتر مرحوم سے کیا خصوصی تعلق رہا۔ دوم یہ کہ یہ مادہ ایک سے زیادہ آدمیوں کے ذہن میں آیا۔ اس کا صحیح حقدار کسے ٹھہرایا جائے۔ اس لئے تاریخ گو شاعر کو ایسا مادہ تاریخ مرتب کرنا چاہیئے جس کا توارد کسی طرح نہ ہو سکے۔ قہر صاحب نے نشتر صاحب مرحوم کی وفات پر جو قطعہ لکھا۔ اس کا آخری مصرع یہ ہے ؎

بگفتا۔ "بروحانیاں رفت نشتر" (۱۹۵۸ء)

فی البدیہہ تاریخیں

جناب قہر تقوی کو فی البدیہہ تاریخیں کہنے کا بھی اتفاق ہوا ہے۔ مثلاً بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب مرحوم کے انتقال کی خبر سن کر ان کی زبان سے نکلا۔ "راہی خلد بریں بابائے اردو ہو گیا" اور جب حساب کیا گیا۔ تو اس مصرع سے سال وفات بابائے اردو مرحوم (۱۳۸۱ھ) برآمد ہوتا تھا۔

اسی طرح ۱۷؍ اکتوبر ۱۹۶۲ء (۱۳۸۲ھ) کو جب وفا راشدی (مولف "بنگال میں اردو") نے حیدرآباد (پاک) میں "بزم وحشت" قایم کی۔ تو قہر صاحب نے چند منٹ میں قطعہ تاریخ کہا۔ جس کا آخری مصرع یہ ہے۔

"ہے مبارک اہل مجلس بزم وحشت کا قیام" (۱۳۸۲ھ)

۶؍ مئی ۱۹۶۲ء (۱۳۸۱ھ) کو چند احباب کے اجتماع کے موقع پر کہا۔

چند احباب خصوصی جمع ہیں — ہو مبارک آج کا مل بیٹھنا
قہر اس مجلس کی یہ تاریخ ہے — "اجتماع دوستاں صد مرحبا" (۱۳۸۱ھ)

۱۳۸۰ھ میں آپ نے دو طوطے پال رکھے تھے۔ ان میں سے ایک طوطا مر گیا۔ آپ فی البدیہہ مندرجہ ذیل قطعہ موزوں فرمایا ؎

میرا طوطا جو صاحب دل تھا — اس کے مرنے سے غمزدہ ہا ہیں
بہر تاریخ اس کے ساتھی نے — کہہ دیا تین بار "ٹیں ٹیں ٹیں" (۱۳۸۰ھ)

(روزنامہ انجام مورخہ ۵؍ اپریل ۱۹۶۱ء)

نثر کے فقروں سے تاریخ حاصل کرنا۔

ایک خط قہر صاحب نے مسٹر الٰہی بخش خیسانی، آنریبل جج ہائی کورٹ لاہور جو ان دنوں ہائی کورٹ کراچی میں جج ہیں کی خدمت میں ۱۹۵۸ء (۱۳۷۸ھ) میں لکھا۔ جو حسب ذیل ہے۔

بملاحظہ، کامران و کامیاب (۱۳۷۸ھ)، جویائے حق الٰہی بخش صاحب خیسانی (۱۹۵۸ء)، بالیتہ جج عدالت العالیہ لاہور (۱۳۷۸ھ)

شوقِ انتظار
۱۹۵۸ء

"اس عریضے کا ہر ایک جملہ سالِ حال کا بہرہ مند ہے
۱۹۵۸ھ

عدالت مآب وفیض انتساب
۱۹۵۸ھ

سلام و کورنشِ عقیدت آگیں ۔ جناب کی زیارتِ رفیع کے لئے دل بے حد مشتاق ہے
۱۳۷۸ھ ۱۹۵۸ء

امید کہ جلد شرفِ قدمبوس بہم بخشیں گے ۔ آپ لاہور کی مُروّح فضا سے لطف اندوز ہو رہے ہیں
۱۹۵۸ء ۱۹۵۸ء

اور ہم پروردۂ وفا اس لطف اندوزی سے محروم ۔ ہم سب کارکنان کی طرف سے ہدیۂ سلام مخلصانہ قبول ہو
۱۹۵۸ء ۱۹۵۸ء

خدا حافظ و ناصر باید
۱۹۵۸ء

راقم نیاز سید خورشید علی مہر
۱۹۵۸ء

عمارت ہائی کورٹ معمورۂ کراچی
۱۹۵۸ء

تاریخ پودہ اکتوبر ۔ صبح
۱۹۵۸ء

مہر صاحب کے والد ماجد حضرت شادؔ جے پوری کی وفات پر

صنعت واسع اشفتین یعنی جس کو زبان سے ادا کرنے میں (پڑھنے) میں ہونٹ سے ہونٹ نہیں ملتا۔ مہر صاحب مرحوم کے تخلص (مہر) کو زبان سے ادا کرنے میں ہونٹ ملتے ہیں۔ اس لئے مہر صاحب مرحوم نے اپنے نام (خورشید) کو اس میں استعمال کیا ہے۔ قطعہ یہ ہے جس کو پڑھنے میں ہونٹ کہیں بھی آپس میں نہیں ملتے ۔

اس جہاں سے راہی جنت ہوئے انور علی گلشنِ تاریک کو ئی نذرِ گلچیں ہو گیا
سالِ رحلت کے لئے خورشید یہ آئی ندا "از رحیل شادؔ سے دل دردآگیں ہو گیا"
۱۳۸۰ھ

۱۹۶۰ء (۱۳۸۰ھ) میں ملکۂ فرخ دیبا کے بطن سے شہنشاہ ایران کے فرزند تولد ہونے پر یہ قطعہ لکھا۔

نغماتِ عیش افزا

۱۹۶۰ء

خدا بخشید فرزندے، ولی تخت کیخسرو — زہے تقدیر ایران و خوشا بختِ فرح دیبا
ندا آمد بگوشِ قہر، بہر سالِ میلادش — "ابنِ دولتِ ایران بگشد بدر الدجیٰ پیدا"

۱۳۸۰ھ

از انوارِ طبع قہر تقوی جے پوری — اعلیٰ مشیر مکتبۂ اردو

۱۳۳۹ (شمسی) — ۱۳۳۹ (شمسی)

علالت و وفات

کافی عرصے سے سرطان کے عارضے میں مبتلا تھے لیکن کبھی کسی کو اپنی تکلیف نہ بتائی۔ بالآخر شدید تکلیف کے باعث یکم دسمبر ۱۹۶۵ء کو صاحبِ فراش ہو گئے۔ ۱۶ جنوری ۱۹۶۶ء کو گورنمنٹ آف مغربی پاکستان اسپتال میں داخل ہوئے۔ جہاں سے آپ کو جناح اسپتال میں منتقل کیا گیا۔ وہاں آپ کے پیٹ کا آپریشن ہوا۔ نقاہت میں کافی اضافہ ہو گیا تھا۔ اس لئے آپ کو خون بھی دیا گیا۔ کچھ عرصے جناح اسپتال میں رہے پھر گھر واپس آ گئے۔ اور ڈاکٹری علاج چھوڑ دیا۔ اور یونانی علاج شروع کیا۔ لیکن یونانی بھی کارگر نہ ہوا۔ اور بالآخر پانچ ماہ کے بعد ۷ مئی ۱۹۶۶ء بروز ہفتہ صبح تقریباً ۹½ بجے یہ خورشید تاریخ گوئی غروب ہو گیا۔ جس کی روشنی سے دنیائے تاریخ گوئی منور تھی۔ اور اسی شام تقریباً آٹھ بجے میوہ شاہ قبرستان میں اپنے والدِ بزرگوار قبلہ شاد جے پوری مرحوم کے سرہانے دفن کیا گیا۔

(بقیہ از صفحہ ۳)

غزل

کہیں جو شیشۂ مے ساقیا ذرا ٹوٹا — تو جانیو کہ مرا دل ہزار جا ٹوٹا
مصاحب آئینہ ٹھہرا ہے اس خود آرا کا — اب اپنی دید کا بھی اس کا آسرا ٹوٹا
کسی کا بال بھی ٹوٹے تو سانس لیتا ہے — یہ میرا شیشۂ دل تھا کہ بے صدا ٹوٹا

مری شکستہ دلی کی دلیل ہے یہ عطاؔ
کہ ہیں ردیفِ غزل میں بھی جا بجا ٹوٹا

مرحوم کی آخر عمر انتہائی تلخی میں گزری۔ ۷ ذی الحجہ ۱۲۹۶ھ ہجری مطابق ۲۲ نومبر ۱۸۷۹ء کو انتقال فر

س مصطفٰے زبیری

غالبؔ کا ایک گمنام شاگرد
عطا مارہروی

غالبؔ کے شاگردوں سے متعلق جناب مالک رام کی کتاب "تلامذہ غالب" ایک مفید تحقیقی کتاب ہے اس میں غالبؔ کے ایک سو چھیالیس شاگردوں کا ذکر ہے ۔ مالک رام نے شاگردوں کے حالات جمع کرنے میں خاصی محنت کی ہے اور بعض ایسے مآخذ کی نشان دہی کی ہے جن تک عام لوگوں کی رسائی نہ تھی لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ انھوں نے بہت سے شعراء کے حالات سرسری طور پر لکھے ہیں اور بعض جگہ تو محض ایک آدھ سطر لکھ کر ہی بات ختم کر دی ہے ۔ ایسے ہی ایک شاگرد غالب مولوی عنایت حسین عطاؔ مارہروی ہیں جن کے بارے میں لکھتے ہوئے جناب مالک رام نے صرف "المشاہیر" مصنفہ فیض احمد سے استفادہ کیا ہے ۔ عطاؔ کے حالات کے لئے "سلسلۂ عالیہ" (مصنفہ عنایت حسین و فیض احمد مارہروی) ایک اہم مآخذ ہے ۔ ذیل میں اس کتاب کی روشنی میں عطاؔ کے حالات پیش کئے جاتے ہیں ۔

چودھری عبدالغفور سرورؔ کے نام مرزا غالب ایک خط میں لکھتے ہیں :-

" اپنے عم والا قدر جناب چودھری غلام رسول صاحب کو فقیر کا سلام پہنچا ئیے اور جناب شیخ عطا حسین صاحب عطاؔ کو بھی سلام کہئے ۔"

اسی طرح ایک دوسرے خط میں غالبؔ نے عطا حسین صاحب عطاؔ کو استاد لکھا ہے ۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے دل میں موصوف کی کس قدر وقعت تھی اور وہ ان کے علمی تبحر کے کتنے معترف تھے ۔ خط کے بالکل آخر میں لکھتے ہیں :-

" استاد شیخ عطا حسین کی جناب میں سلام ۔"

مندرجہ بالا دو اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالبؔ اور شیخ عطا حسین صاحب عطاؔ کے تعلقات میں بے حد خلوص تھا اور غالبؔ ان کے قدر شناس تھے ۔

عطا حسین صاحب معمولی زمیندار تھے آمدنی گزر بسر کے لئے کافی تھی ایک بیوی اور ایک لڑکے "حسن عسکری" پر یہ خاندان مشتمل تھا۔ حسن عسکری کو اللہ تعالے نے ایسا فیل تن اور قوی ہیکل بنایا تھا کہ ان کے زمانے میں ان کی قوت اور ہنر مندی کا مقابل تمام ہندوستان میں کوئی نہ تھا۔ صاحب سلسلۂ عالیہ[ا] لکھتے ہیں :۔

"حسن عسکری نام کہ بہمت و مردانگی از اشجعہ زماں بود و در فن مصارعت و پنجہ کشی و بانک و پٹہ و بنوٹ استادان اہل فن راسبق می داد و موسیقی را فلکسامی دانست۔ گاہ گاہے بخلوت یاران ہمدم سرائیدے از لحنِ جانفزاد نغماتِ دلکشا دلہائے مستمعان ربودی۔ و جاہنار امضطر نمودے و بدیگر صناعات ہم دستی قوی داشت و بشیوۂ اخلاق و محبت واخلاص عزیز دلہا بود۔ اما در عین شباب پیش پدر کہ ذی الشل عاشق و بے تواں گفت دست از حیات دنیا شست و علائے راباتم خود دلہا کباب و چشم پرآب گزاشت۔ بادختے اوسط کریم الہیٰ مقصد بود۔ از و دخترے یادگار است کہ با سبحان الدین (راقم الحروف کے حقیقی نانی و نانا) عقد یافت الخ"

چنانچہ اکلوتے بیٹے اور وہ بھی ایسے بیٹے کی (جو اپنے ایک فن میں یکتائے روزگار تھا) اچانک موت نے عطا حسین صاحب کی کمر توڑ دی۔ گھر میں بیوی۔ بیوہ نوجوان بہو اور شیر خوار پوتی کے علاوہ کوئی اور نہ تھا۔ انھیں دیکھ دیکھ کر اپنے بیٹے کا غم بجائے سرد ہونے کے برابر بڑھتا ہی گیا اعزہ کے مشورہ سے ایک مکتب کی بنیاد ڈالی اور محلے کے بچوں کو پڑھانا شروع کیا اور اپنی بیوی کے بھانجے کو بیٹا بنا کر اپنے پاس رکھا اور دن رات اس کی تعلیم و تربیت اور دلجوئی میں مصروف ہو گئے۔ یہ لڑکا جب پڑھ لکھ کر اس زمانہ کے مطابق قابل اور ہوشیار ہوا تو اس کے والدین نے لڑکے کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ شیخ عطا حسین صاحب نے بہ حیلۂ مناسب انکار کر دیا۔ مگر وہ لوگ اپنے ہمراہ کچھ آدمی لائے اور شیخ صاحب کی عدم موجودگی میں لڑکے کو زبردستی لے گئے۔ اس واقعہ کا شیخ صاحب کے قلب پر بہت اثر ہوا اور انھوں نے ایک مثنوی

"شکایت سعادت"

مرتب کی اس نام سے مثنوی کی تاریخ بھی نکلتی ہے۔

مثنوی مکمل ہونے کے بعد چودھری عبدالغفور سرور کے خط کے لفافے میں ہی یہ مثنوی غالب کے پاس بغرض اصلاح بھیجی گئی۔ جواب میں غالب لکھتے ہیں۔

خط ۹ بنام چودھری عبدالغفور سرور

" صاحب یہ مثنوی تو میرے واسطے مرثیہ ہو گئی۔ ہے ہے اُس بزرگوار کے جگر میں کیا کیا گھاؤ

ا؎ مطبوعہ ۱۳۰۱ ہجری مصنف حکیم عنایت حسین و فیض احمد مارہروی

پڑے ہوں گے تب یہ تراوش خونبانہ ظہور میں آئی ہوگی۔ مزہ یہ ہے کہ عنوان بیان سے حق بجانب انہیں کے معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ اصل کار میری نظر میں نہیں اور حقیقت حال مجھ پر مجہول ہے اس واسطے انجام و آغاز۔ اندازہ و انداز کچھ نہیں سمجھ سکا۔ و اصلاح کو آپ بہ نظر اصلاح ملاحظہ فرمالیں۔ میں نے بحسب دستور اپنے ہر جگہ منشاء اصلاح لکھ دیا ہے۔ میر اشیخ صاحب سے سلام کہئے گا اور کہئے گا کیا کروں دور ہوں معذور ہوں مدد نہیں کر سکتا۔ اعانت کے مراسم تقدیم کو نہیں پہونچا سکتا۔ خدا تمھارا نگہبان رہے۔ والسلام "

شیخ عطاحسین صاحب کے متعلق صاحب سلسلہ عالیہ لکھتے ہیں۔

"عطاحسین در علم عربی۔ فارسی استعداد شایستہ می داشت و بہ اخلاق ستودہ و مہر پروری و ہمدردی و دل سوزی عزیزان و آشنایان و حسن قیافہ و لطیفہ گوئی و بذلہ سنجی و سخن گستری یگانہ می داشت و رقیق القلب بود در فنِ شعر پایہ بلند و فطرت ارجمند داشت۔ اشعارش رنگیں است و معانیش دل نشیں مثنوی "شکایت سعایت" کہ تراوش خوننابہ اش تواں گفت موید بریں روش سادہ و شیوہ نیازی پسندیدہ و قاری گزاشت الخ

شیخ صاحب کے متعلق صاحب المشاہیر[۵] لکھتے ہیں:۔

"عطاحسین صاحب متخلص بہ عطا۔ حکیم نجف علی مارہروی کے بیٹے خوش مزاج نیک خو، بذلہ سنج لطیفہ گو تھے۔ عربی فارسی کی اعلیٰ استعداد تھی۔ ہر شخص کے ساتھ خلوص نیاز اور دلسوزی سے ملتے۔ عزیزہ آشنا کی تکلیف دیکھ کر دل بھر آتا تھا، آبدیدہ ہو جاتے تھے۔ عمر کا ایک حصہ معلم گری میں بسر ہوا، شعر و سخن کا چسکہ رہا۔ مثنوی "شکایت سعایت" اردو زبان میں انکی تصنیف مشہور ہے" الخ

"مثنوی کے اقتباسات"

چندے بغم دل بدل درون پروردم	از خوفِ جنوں کنوں بروں آوردم
اعداد وقوع چوں موافق افتاد	ہم نام "شکایتِ سعایت" کردم

۱۲۷۲ ہجری

۵　المشاہیر مصنفہ فیض احمد مطبوعہ ۱۸۹۷ء

اے سخن آفرین مارہرہ — مگسِ انگبینِ مارہرہ
خلل انداز بزم یکجہتی — تفرقہ ساز بزم یکجہتی
نمکِ خوانِ تفرقہ سازی — شورشِ اندازِ فتنہ پردازی
ناوکِ سینۂ نیاز دروں — کاہشِ خاطرِ دلِ محزوں
زلفِ سر دادۂ پریشانی — آئینہ وار روئے حیرانی
سرمۂ دیدۂ سخن چینی — خالِ رخسارِ زیبِ خود بینی
کاوشِ سینۂ نیاز قریں — خارشِ دیدۂ نشار آئیں
عالم نکتہ ہائے غمازی — واقفِ رمزِ افترا سازی
کینہ توزِ دلِ محبت کیش — سینہ سوزِ سرِ وفا اندیش
رونقِ مسندِ سخن چینی — آبروئے نگاہِ خود بینی
باعثِ سردیِ وفا و داد — سببِ گرمئی عناد و فساد
تو ہے کون اور کیا ہے تیرا دیں — اہلِ دیں کا تو یہ نہیں آئیں
ہیں تو دل دادۂ محبت ہوں — اور گرفتارِ دامِ الفت ہوں
ہر کسی سے نیاز رکھتا ہوں — سوز کے ساتھ ساز رکھتا ہوں
گل ہوں میں گلستانِ الفت کا — سرو ہوں گلشنِ محبت کا
رنگِ روئے گلِ وفا ہوں میں — مستِ بوئے گلِ وفا ہوں میں
بلبلِ گلستانِ یاری ہوں — قمریِ سروِ جاں نثاری ہوں
نہ سہی خوبیوں میں افسانہ — اچھی باتوں کا ہوں تو دیوانہ
بے حقیقت ہوں چوں شکستہ سفال — باحقیقت ولے بہ صرفِ نعال
مستمند و غریب بیچارہ — دشتِ ادبار میں ہوں آوارہ
دل شکستہ ہوں اور غم زدہ ہوں — خستہ تن اور میں ستم زدہ ہوں
دردمندِ جگر گداختہ ہوں — ایک غم سے میں زہر باختہ ہوں
تاب و طاقت رہینِ وحشت ہے — خواب و آرام وقفِ حسرت ہے
نہ چمن ہوں نہ باغبانِ چمن — مرغِ گم گشتہ آشیانِ چمن
کیا کہوں کیسا بد نصیب ہوں میں — ہوں وطن میں ولے غریب ہوں میں

ماجرا اپنا گر سناؤں کبھو — چشمِ خورشید سے گریں آنسو
ابر کا سینہ چاک ہو جاوے — برق بھی جل کے خاک ہو جاوے
اشک سے میرے رشک جیحوں کو — آہ کی تاب کب ہے گردوں کو
غنچہ گر بے کلی مری دیکھے — نام کو بھی ہنسی کا نام نہ لے
لالہ ساں گر یہ دیکھے داغِ دلی — چشمِ نرگس رہے کبھی کی کھلی
گل مرا حال دیکھ جلتے ہیں — کفِ افسوس برگ ملتے ہیں
لیک اس بے کینہ جو صفا دشمن — اس قدر میرے ساتھ سوءِ ظن

دوسرا اقتباس

دیکھ کر حالِ چرخِ دوں پرور — کی معلم گری میں عمر بسر
گرچہ کچھ اس قدر نہ تھی پروا — مقتضائے زمانہ پر یوں تھا
ایک مدت برنگِ فصلِ بہار — رہی منصب کی گرمیٔ بازار
پھر کچھ اس میں کساد آنے لگا — آخر آخر فساد آنے لگا
گو متاعِ سخن تھی بالا دست — تھا ہر اک مشتری کا حوصلہ پست
نادہندی کو کام فرمایا — رسمِ دادن نہ لب تلک آیا
اور شاید جو کی طلب تنخواہ — حاصلِ امرِ خواستن تھا نخواہ
جب ہوا حال ماضیٔ مطلق — خواستن سے نخواہ کر مشتق
حرفِ مطلب پہ رکھ کے سب نے لب — متحرک کیا کہا مطلب
خوب مصدر سے اشتقاق کیا — متعدی کو لازمی جانا
فعلِ مجہول سب وہ قول و قرار — تھا نہ دادن قریب استمرار
مانگنے میں سمجھ کے رسوائی — نہ ہوا اس کا میں تمنائی
دل کو اس پر بھی جب سکون نہ ہوا — پھر بھی مکتب میں تفرقہ ڈالا
کر کے اثباتِ علت و معلوم — فعلِ معروف کر دیا مجہول

ہو گیا خط کے آنے جانے پر
ادبستاں تمام زیر و زبر

تیسرا اقتباس

ہمد موکس لئے یہ کاوش ہے | کونسے بغض کی تراوش ہے
جرم ٹھہرا کے دو سزا اُس کی | حرکت دیکھو یہ نہیں اچھی
میں تو تعظیم میں رہوں سرگرم | تم کو اُس کی بھی کچھ نہ آوے شرم
جرم کاروں کو یوں منا لانا | رحم کی جا یہ غیض فرمانا
پئے آزار یہ کمربندی | اللہ اللہ رے خردمندی
عوضِ خدمتِ زن و اطفال | خون مرا تم کو کیوں ہوا ہے حلال
اے سرسرورانِ دولتمند | کون کرتا ہے یہ طریق پسند
اُٹھ کے کیوں آئے تھے لڑائی کو | دیکھتے خوردی اور بڑائی کو
گھر پہ چڑھ آنا طرفہ تھا مضمون | مافیا فطرت اور تھا یہ جنوں
ورنہ یہ کیا وفورِ دانش تھا | یہ تو صاحب قصورِ دانش تھا

کہو کیا عقل تھی یہ فرماؤ
اپنے دل میں ذرا تو شرماؤ

یہ مثنوی جب بہت مشہور ہوئی تو فریق مخالف نے بھی پڑھی تو بجائے اس کے کہ وہ اپنی حرکات پر نادم ہوتے اور زیادہ برافروختہ ہوئے۔ تمام مارہرہ مولوی عطا حسین صاحب کا ہمدرد اور بہی خواہ نہ ہوتا تو شاید مخالف کسی اور کمینی حرکت سے بھی باز نہ رہتے۔ مگر ان کی ریشہ دوانیاں جاری رہیں۔ دشمنوں کے اس ردِّ عمل سے متاثر ہو کر عطا صاحب نے ایک قطعہ لکھا :۔

کاوشِ اہلِ وطن سے ہے یہ جی کی حالت | کہ مشبک ہے جگر خانۂ زنبور صفت
جیتے جی ہے یہ ارادہ کہ اتاریں ٹوپی | بعد مردن ہے مگر اخذِ کفن کی نیت
اے عزیز دلِ استاد فلاں سلمہٗ | تا بکے در جگر این نشترِ کینِ نقمت

مندرجہ بالا کلام کے علاوہ مجھے مرحوم کا اور کلام دستیاب نہ ہو سکا۔ تذکروں میں جو اشعار مل سکے وہ درج کئے جاتے ہیں۔

رباعی

تھی نکہتِ عیش سے یہ دل کو فرحت | خنداں خنداں سدا تھی ہم گل کی صفت
کیا بادِ خزاں چلی چمن میں کہ عطا | شبنم کی طرح سے اب ہے روتی صورت

(باقی صفحہ ۴۲ پر)

مراسلات

خدا کے واسطے

ہمارے ملک میں علمی تحقیق کا شوق روز بروز ترقی پر ہے، ملک کی اقتصادی بضاعت کی مجبوریوں کی وجہ سے کتابوں کی اشاعت کی مجموعی تعداد تھوڑی سی ہے، اس وجہ سے نہایت ضروری ہے کہ تصنیف اور کتاب سازی کے آئین میں مستعدی کا معیار بلند ہو۔

سب سے بڑی آفت تحقیقی مقالوں اور کتابوں میں یہ ہے کہ مصنفین حواشی میں اپنے ماخذ کے حوالے یوں دیتے ہیں:-

سیر العارفین صفحہ ۷۵

عجائب الاسفار، ج ۲ صفحہ ۱۴۴

ہم مصنفین کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے مستند کتابوں کے حوالے دیئے جس سے ظاہر ہوا کہ گپ نہیں ہانکی جاری ہے، سند پر مبنی بات کہی جارہی ہے، مگر خدا کے واسطے یہ تو ارشاد ہو کہ اگر کوئی قاری دیئے ہوئے حوالے کی صحت کی طرف سے تسلی چاہتا ہے تو وہ سیر العارفین اور عجائب الاسفار کو کیونکر جلد سے جلد تلاش کرنے میں کامیاب ہو۔ چنانچہ ضروری ہے کہ حوالے میں ماخذ کے مصنفوں کے نام ساتھ درج ہوں۔ پھر بھی نہیں، اسی قدر یہ بھی ضروری ہے کہ (۱) صحیح نام مطبع کا (۲) نمبر ایڈیشن اور (۳) شہر اشاعت کا اور (۴) سنہ اشاعت یہ چار باتیں وضاحت سے درج کی جائیں، اتنی چھوٹی سی کوتاہی اور سہل انگاری سے بہت سی تحقیقی اشاعتوں اور مقالوں کی قدر و قیمت آدھی رہ جاتی ہے، تحقیق کے شوق کی ترقی جب ہی ہوسکتی ہے کہ آیندہ محقق پچھلوں کے بیانات کی صلابت اور سچائی کو پرکھ سکیں اور اس کے لئے ضروری ہے کہ حوالوں میں تفصیل صحت کے ساتھ درج ہو۔

جہاں کسی حوالے میں کوئی عنوان یا کوئی مغربی نام کسی مصنف کا ہو۔ بے حد ضروری ہے کہ اس نام کے

اردو تلفظ (بحروفِ ابجد اردو) کے ساتھ (اصل حروف) یا نام لاطینی حروف میں نہایت صحت کے ساتھ درج کیا جائے۔

تحقیقی مقالوں اور کتابوں میں اعلیٰ معیار کے لئے بہت سے اصول ہیں جن پر انشاء اللہ راقم ایک مقالہ لکھ کر شائع کرنے کا متمنی ہے۔ فی الحال ادھ یہ دو اصول لکھ کر بھیج رہا ہوں۔ کیونکہ اس باب میں کوتاہی سے تحقیقی کام کا بہت نقصان ہے اور اسی وجہ سے مغربی محقق ہمارے موجودہ مورخین کی تصانیف کو کم قیمت حتیٰ کہ ناکارہ سمجھتے ہیں اور بہت حد تک وہ حق بجانب ہیں۔

خاکسار

داؤد رہبر (امریکہ)

ڈاکٹر بجنوری اور مفتی آزردہ کی تحریریں

میں عبدالرحمان (سیوہاروی) بجنوری مرحوم کے خطوط اشعار، اور مضامین مرتب کر رہا ہوں۔ دو ڈھائی سو صفحو کا ایک مجموعہ مرتب ہو گیا ہے اور جلد پریس جانے والا ہے۔ ناظرین میں سے کسی صاحب کے پاس ان کی تحر نظم و نثر ہوں یا ان کے علم میں کہیں ہوں تو مطلع فرمائیں۔ اصل خطوط نقل کے بعد واپس کر دیئے جائیں گے۔

مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی (متوفی ۱۲۸۵ھ) کی زندگی اور تصانیف پر ایک کتاب زیر ترتیب ہے۔ ان کی نظم و نثر، خاص طور سے اُن کے لکھے ہوئے فتاویٰ کی ضرورت ہے۔ میں بہت ممنون ہوں گا اگ معلومات جلد اس پتے پر بھیجی جائیں۔

مختارالدین احمد آرزو

۵۔ شبلی روڈ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (انڈیا)

"غم خوار عالم" اور "اردو اخبار"

اس صدی کے شروع میں لاہور سے "غم خوار عالم" اور "اردو اخبار" شائع ہوت تھے۔ مجھے ان اخباروں سے متعلق معلومات درکار ہیں۔ اگر کوئی صاحب رہنما کر سکیں تو ممنون ہوں گا۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، اوّل الذکر اخبار کے مدیر مولوی احمدالدین (مصنف سرگذشت الفاظ تھے) اور ثانی الذکر اخبار رام نرائن پبلشرز شائع کرتے تھے۔

انور شعور

معرفت انجمن ترقی اردو اردو روڈ کراچی

بہ ـ سید معین الرحمٰن

انجمن ـ تقسیم ہند تک
(۱)

انجمن کی تاسیس

"ہر تحریک[۱] خواہ اصلاحی ہو یا انقلابی کسی ایک شخص کے دماغ کا نتیجہ ہوتی ہے ۔ پھر چند ہم خیال اس کے ساتھ
ا جاتے ہیں رفتہ رفتہ ہم دردوں کا حلقہ بڑھنا شروع ہوتا ہے اور تنظیم کی بنیاد پڑتی ہے ۔ تنظیم کے ساتھ مقصد
تبلیغ و اشاعت اور عمل کی نوبت آتی ہے ۔ تحریک کی کامیابی دو چیزوں پر ہے ۔ ایک بات جس پر غور کرنا ضروری ہے
، یہ ہے کہ جس اصلاح کو پیش کیا گیا ہے اس کی فی الحقیقت ضرورت بھی ہے یا محض ایک شخص کی جولانیٔ طبع یا
وش تخیل کا نتیجہ ہے ۔ اگر فی الواقع ضرورت نہیں اور زمانہ اور لوگ اس کے ساتھ نہیں یا ناقابل عمل ہے تو اسے
میابی کا منھ دیکھنا نصیب نہ ہوگا ۔ دوسرے جن لوگوں نے اس کا بیڑا اٹھایا ہے ان میں خلوص، ایثار اور کام کی
ن ہونی چاہیے ورنہ بُری طرح ناکام رہے گی ۔

اس برعظیم کے مسلمانوں کی تمام تر تحریکوں یعنی تعلیمی، معاشرتی، علمی و ادبی، سیاسی کا سرچشمہ سر سید احمد خاں کی ذات
ی، یوں تو مسلمانوں کا انحطاط و زوال بہت پہلے سے شروع ہوگیا تھا مگر اس کا احساس عام طور پر نہیں ہوا تھا۔ غفلت[۲]
بے حسی، آرام طلبی، کم ہمتی، خود غرضی عام تھی اور مستقبل سے بے خبری ۔ البتہ ماضی کا فخر ضرور باقی تھا ۔ دنیا میں جو نیا
قلاب اور نئے حالات پیدا ہو گئے تھے وہ ان کی سمجھ میں نہیں آتے تھے ۔ یہ نہیں کہ ان میں باہمت، اولوالعزم،
بہادر، صاحب فکر اور ہمدرد لوگ بالکل نہ تھے، کہیں کہیں ضرور تھے مگر عام اخلاق گر گئے تھے ۔ قومی شیرازہ بکھر گیا تھا اور
وئی ایسا نہ تھا جو اس بکھرے ہوئے شیرازے کو ایک رشتہ میں منسلک کرے اور غفلت سے بیدار کرکے آگے بڑھنے کا صحیح

---

۱ خطباتِ عبدالحق، (مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی، ایڈیشن ۱۹۵۲ء)، صفحہ ۴۹۸

۲ چند ہم عصر، (ترمیم و اضافہ شدہ ایڈیشن، اُردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۵۹ء)، صفحہ ۲۴۷

رستہ دکھائے۔ انگریزی حکومت میں سب سے زیادہ خسارے میں مسلمان رہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد تو ان پر تباہی و بربادی اور مصائب و آلام کا آسمان ٹوٹ پڑا۔ انگریز ان کو ۱۸۵۷ء کی شورش کا بانی، اپنا دشمن اور اپنی حکومت کا غدار سمجھتا تھا، ان کو مٹا دینے پر تُلا ہوا تھا۔ مسلمانوں کا قصور صرف یہ تھا کہ اس نے حکومت ان سے لی تھی۔ وہ فاتح تھا اور یہ مفتوح۔ مفتوح ہندو بھی تھے مگر ان کو وہ اپنا مخالف نہیں بلکہ دوست سمجھتا تھا۔ اُدھر ہندو مسلمان کا مفتوح رہ چکا تھا کہ اسے مسلمان سے بدلہ لینے کا اب موقع ملا تھا۔ مسلمانوں کی حالت بڑی نازک اور قابلِ رحم تھی۔ وہ چکی کے دو پاٹوں میں پسا جاتا تھا۔ بہت سی جاگیریں اور زمینداریاں بغاوت کے الزام میں سرکار میں ضبط ہو چکی تھیں اور جو باقی تھیں وہ غفلت اور عیش پسندی کی بدولت ہاتھ سے نکلتی جا رہی تھیں۔ سرکاری ملازمت سے وہ ویسے ہی محروم تھا۔ اگرچہ اسلامی حکومت کو زوال آچکا تھا لیکن ۱۸۵۷ء سے پہلے اور اس کے بعد بھی قصبات وغیرہ میں مسلمانوں کا اثر باقی تھا اور باوجود اقلیت کے وہ اکثریت پر بھاری تھے لیکن یہ چند روز کی بہار تھی۔ "آفتاب اقبال گو غروب ہو گیا تھا لیکن ڈوبتے سورج کی ہلکی شعاعیں ابھی کچھ کچھ پڑ رہی تھیں ان کے جاتے ہی اندھیرا ہو گیا۔

فاتح[1] کے ہاتھوں مفتوح پر اتنا ظلم نہیں ہوتا جتنا قوت پانے کے بعد مفتوح کے ہاتھوں فاتح قوم پر ہوتا ہے یہی حال مسلمانوں کا ہندوستان میں ہوا۔ (جیسا کہ ابھی عرض کیا) دونوں طرف سے راندہ تھے اور چکی کے دو پاٹوں میں پسے اور دبے جا رہے تھے۔ اس سے دل بجھ گئے تھے اور مایوسی و افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ دو بڑی قوتوں کا مقابلہ ان کے بس کی بات نہ تھی اور یہ سمجھ چکے تھے کہ ہم سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ ایسے میں سر سید احمد خاں نے غیر معمولی دوراندیشی اور ہمت سے کام لے کر وہ کام کیا جو کسی اور سے نہ ہو سکا اور جس کی کسی کو توقع نہ تھی اور تمام مخالفتوں، مزاحمتوں اور مشکلات کو سر کر کے جس کام کا بیڑا اٹھایا تھا اُسے تکمیل تک پہنچا کے رہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ایسے نازک وقتوں میں جب قومیں قعرِ مذلت تک پہنچ جاتی ہیں تو انھیں میں سے ایسے باہمت جوانمرد اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں جو ڈوبتے ہوئے بیڑے کو بچا لیتے ہیں اور تاریخ میں ایک نیا عہد قائم کر جاتے ہیں۔ سر سید بھی انھیں برگزیدہ ہستیوں میں سے تھے۔ ان کے بعد بھی جتنی اصلاحات، تغیرات اور منصوبے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے عمل میں آئے۔ جب ہم ان کی ابتدا کا سراغ ڈھونڈتے ہیں تو اسے سر سید احمد خاں کی مساعی میں پاتے ہیں۔ انجمن ترقی اردو بھی سید احمد ہی کی تحریک کی ایک کڑی ہے۔

ان کا سب سے بڑا کام مدرسۃ العلوم مسلمانانِ ہند کا قیام تھا۔ جب کالج کی جڑیں کسی قدر مضبوط ہو گئیں تو انھوں نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی جس کا بڑا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو تعلیم کی ترغیب دی جائے۔ ان کی

---

[1] خطباتِ عبدالحق، ص ۴۹۹

قطعی رائے تھی کہ تعلیم سب سے مقدم ہے ۔ جب ان میں تعلیم پھیل جائے اور کافی تعلیم یافتہ ہو جائیں تو اس وقت سیاسی امور میں دخل دینے کے اہل ہو سکتے ہیں ۔

۱۹۰۲ء میں دلّی میں شاندار شاہی دربار ہوا ۔ لارڈ کرزن وائسرائے تھے جو جاہ و جلال اور شان و شکوہ کے بے دلدادہ تھے ۔ ان کی کوششوں سے دلّی میں ان دنوں بہار آگئی ۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنا سالانہ جلسہ بھی اسی سال دسمبر کے آخری ایام میں دلی میں کیا ۔ جس کے صدر ہز ہائی نیس آغا خاں تھے ۔ کانفرنس نے اپنی ایک قرارداد میں چار ذیلی شعبے قائم کئے ۔ ایک مدارس ، دوسرا اصلاح تمدّن کا ، تیسرا اصلاح نسوں کا اور چوتھا اردو کا ، جو " انجمن ترقیٔ اُردو " کے نام سے موسوم ہوا ۔ اس شعبے کے صدر پروفیسر آرنلڈ اور سیکریٹری مولانا شبلی قرار پائے شروع میں دو سال کام مستعدی اور خوش اسلوبی سے چلا مگر پھر معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا اور مولینا شبلی نعمانی نے بددل ہو کر استعفا دے دیا ۔ ان کی جگہ (دسمبر ۱۹۰۵ء میں) مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی (رئیس حبیب گنج) کا انتخاب ہوا مگر وہ بھی گھبرا کر الگ ہو گئے ۔ ان کے بعد (آواخر ۱۹۰۹ء) میں یہ خدمت مولوی عزیز مرزا کے سپرد ہوئی ۔ کام کا آغاز کیا ہی تھا کہ ان کا انتقال ہو گیا ۔ کچھ مدّت تک یہ شعبہ بالکل معطّل رہا ۔"[1]

محولہ بالا تحریر " ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیان اپنا " ۔۔۔ انجمن کا احوال اور اس کے " مہا پرُش " کی زبان سے والا معاملہ ہے ۔۔۔ گفتگو کا آغاز محض تبرکاً مولوی صاحب کے کلمات سے نہیں کیا گیا ، اس کی اور یوں بھی ضرورت تھی کہ انجمن کے بارے میں مُستند تر ہے ان کا فرمایا ہوا ۔۔۔ ، والا مضمون بھی ہے ۔ میں امکان بھر یہی کوشش کروں گا کہ مولوی صاحب کی زبان میں گفتگو بڑھاؤں ، اُن کے کسرِ و انکسار یا خاموشی کی صورت میں اکابر ہم نشینوں اور پھر دوسرے فاضل ہم عصروں کی زبان سے بات اُٹھاؤں ۔ اس لئے کہ میری حیثیت تو مولوی صاحب کی جناب میں ایک ادنیٰ متعلم اور ارادت مند کی رہی اور یہ عزت بھی کچھ بہت دنوں نصیب نہیں رہی ۔ اس صورت میں جس قدر کم میں زبان کھولوں اتنا ہی حَسَن ہو گا کہ انجمن کے ذکر کا حق مجھ سے کہیں زیادہ مجھ سے بہتر لوگوں کا ہے ۔۔۔ ترقی اُردو کا شعبہ مولوی عزیز مرزا کے جنّت مکان ہونے کے بعد لاوارث رہ گیا تھا ۔ اس کے بعد کا احوال مولوی سید ہاشمی فرید آبادی مرحوم کی زبانی سنئے :

" ۔۔۔ ۱۹۱۲ء میں برطانوی عہد کا دوسرا (اور آخری) دربار دہلی منعقد ہوا ۔ جس میں پہلی مرتبہ ایک فرنگی بادشاہ

---

[1] پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ، ص ۱۹

ہندوستان آیا اور شاہ جہاں کے دارالسلطنت میں اس کی رسم تاج پوشی ادا کی گئی۔ اس موقع پر علی گڑھ کی تعلیمی کانفرنس کا سالانہ اجلاس بھی دہلی کیا گیا۔ کانفرنس کے سربراہ صاحب زادہ آفتاب احمد خاں تھے۔ صاحب زادہ مرحوم نے (شعبہ ترقی اردو) کا سکریٹری جناب مولوی عبدالحق صاحب کو نامزد کیا۔ حاضرین جلسہ نے بالاتفاق منظوری دی۔ مولوی صاحب موصوف انہی دنوں اورنگ آباد دکن میں انسپکٹر آف اسکولز مقرر ہوئے تھے۔ علی گڑھ کے ممتاز پرانے طالب علم اور ادبی حلقوں میں پہلے سے روشناس تھے۔ مگر صاحبزادہ مرحوم کے انتخاب کی تحسین کرتے وقت اس بات کو نہ بھولنا چاہیئے کہ ان دنوں کانفرنس کا یہ شعبہ بالکل نیم جان اور غیر اہم رہ گیا تھا۔ اس کے مقاصد بہت بلند رکھے گئے تھے مگر ان تک پہنچنے کے ذرائع مفقود و مسدود تھے۔ یہ واقعہ اب ہماری ادبی تاریخ کا مشہور لطیفہ بن گیا ہے کہ جب شعبہ ترقی اردو کا دفتر علی گڑھ سے اورنگ آباد منتقل ہوا تو نئے سیکریٹری کو:

> ایک پرانا صندوق ملا جو بوسیدگی کی وجہ سے رسی سے بندھا ہوا تھا۔ اس میں ایک رجسٹر چند پرانے اور غیر مرتب مسودات، ایک قلم دوات اور باقی —— اللہ کا نام!

یہی کل کائنات انجمن ترقی اردو کی جو اس نے اپنے معتمد چہارم کے حوالے کی۔ ایک رجسٹر اور ایک قلم دوات کو ہاتھ میں لے کر ہندوستان جیسے ملک میں کسی علمی کام کے لئے کھڑا ہونا مولوی عبدالحق صاحب ہی کا کام تھا ——"

> اس میں کوئی شک نہیں کہ انجمن کے معتمد ابتدا ہی سے بڑے منتخب اور باکمال اہل علم رہے۔ لیکن جب یہ خدمت مولوی عبدالحق کے سپرد ہوئی تو تنہا وہ ان بزرگ اسماء ہی کی دولت کے ورثہ دار تھے۔ اس اثاثے کے علاوہ انجمن کا اپنا کوئی سرمایہ نہیں تھا۔ یہ مولوی صاحب کی "نگہہ بلند" کا کرشمہ تھا کہ دنیوی لحاظ سے بے مایہ ہونے کے باوجود انجمن بہت جلد اس قابل ہوگئی کہ اپنے پیروں کھڑی ہو سکے۔ اخلاص کار اور مقصد سے قرار واقعی محبت کے بغیر یہ ممکن نہ تھا کہ مولوی صاحب ہی کے لفظوں میں کامیابی آسمان سے نہیں اترتی، یہ سب کچھ محنت، صبر اور استقلال کی کرامات ہے۔ جانیں کھپانی پڑتی ہیں تب کچھ ہاتھ آتا ہے ؎
>
> ہر اک کو نہیں ملتی یاں بھیک زاہد
> بہت جانچ لیتے ہیں، دیتے ہیں تب کچھ

اب اس کے بعد کا احوال پھر مولوی صاحب کی زبان سے سنئے[1]:

> ۱۹۱۲ء سے شعبہ ترقی اردو میں کچھ جان پڑنی شروع ہوئی اور مملکت آصفیہ کی فیاضانہ امداد سے اسے

---

[1] خطبات عبدالحق ص۵۳

ی تقویت پہنچی ۔ اس کا علمی اور عملی کام آگے بڑھنے لگا اور جگہ جگہ شاخیں قائم ہوئیں ۔ یہ کام خاموشی سے ہوتا رہا۔
ردو کی مخالفت یوں تو ہندی والوں کی طرف سے آج سے (۹۶) برس پہلے شروع ہوگئی تھی لیکن اس کی رفتار کبھی
رہو جاتی اور کبھی دھیمی ۔ اردو بڑی سخت جان ہے ۔ یہ بھی اسی رفتار سے مقابلہ کرتی رہی ۔ اُردو والوں کو سر سید احمد خاں
بہت بڑا سہارا تھا ۔ وہ اُردو کی حمایت میں آخر دم تک مردانہ وار لڑتے رہے ۔ ان کا انتقال ہوتے ہی رنگ بدل
ا اور فرقہ پرست ہندی والوں نے زور باندھا ۔ اسی زمانے میں سر انٹنی میکڈانل یو۔ پی میں لفٹنٹ گورنر ہو کر آئے
تھے ۔ جو پہلے سے ہندی کی طرف مائل تھے ۔ ان سے ہندی والوں کی ہمت اور بڑھی اور ان کی متفقہ کوشش سے اپریل سنہ ۱۹۰۰ء
ں وہ رزولیوشن پاس ہوا جو سر انٹنی میکڈانل کے عہد جبر دت عہد کو ہمیشہ یاد دلاتا رہے گا ۔ اس سے مسلمانوں
ں کھلبلی مچ گئی ۔ نواب محسن الملک نے جو اس وقت علی گڑھ کالج کے سکریٹری تھے ، اس رزولیوشن کی مخالفت اور
ردو کی تائید میں ایک بہت بڑا جلسہ لکھنؤ میں کیا جس میں اطراف و جوانب سے اور ہر صوبے کے نمائندے
ریک تھے اس وقت مسلمانوں کی بے چینی اور غیر معمولی جوش و خروش صاف بتا رہا تھا کہ انھیں اپنی قومی زبان
دو سے کیسا عشق ہے ۔ نواب محسن الملک بڑے فصیح البیان مقرر تھے ۔ اس موقعہ پر جو تقریر انھوں نے کی وہ نہایت
جوش اور دل ہلا دینے والی تھی اور جب انھوں نے یہ مصرعہ پڑھا ؏

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے اُٹھے!

جلسہ میں کہرام مچ گیا ۔ اس جلسے میں بعض ہندو صاحبوں نے بھی اُردو کی حمایت میں بہت اچھی تقریریں کیں ۔

جب اس جلسے کی کیفیت سر انٹنی میکڈانل کو معلوم ہوئی تو وہ سخت برہم ہوا ، اور اُس نے اپنی حاکمانہ اور جابرانہ قوت
ے اس تحریک کا خاتمہ کر دیا ۔ نواب صاحب کو بھی اس خوف سے کہ کہیں اس کا نزلہ کالج پر نہ گرے دست بردار ہونا پڑا
ر انجمن[1] (جو اُردو کی حفاظت اور حمایت کے لئے قائم کی گئی تھی اور جس کا یہ عظیم الشان جلسہ لکھنؤ میں ہوا تھا ۔) ٹوٹ
وٹ کے رہ گئی ۔ اُن کی یہ کمزوری نہایت قابل افسوس ہے ۔ شاید اندیشہ یہ تھا کہ اگر انھوں نے اس پر اصرار کیا تو انھیں
لج کی سکریٹری شپ سے سبکدوش ہونا پڑے گا ۔ کالج کی حالت اُس وقت بہت نازک تھی ۔ اس لئے مصلحت اس
ں سمجھی کہ اُردو کی حمایت سے دست بردار ہو جائیں ۔ تاہم ان کی یہ کارروائی بے اثر نہ رہی ۔
سنہ ۱۹۰۳ء[2] والے سالانہ جلسے میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے انجمن ترقی اردو کا جو شعبہ قائم کیا اس کی شان نزول
ی واقعہ تھا ۔

کسی تحریک کو ہمدردوں کی ہمدردی اور مربیوں کی سرپرستی ہی سے تقویت نہیں پہنچتی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ

---

[1] چند ہمعصر صفحہ ۱۵
[2] خطبات عبدالحق صفحہ ۲۰۳

اس کی تقویت کا راز بہت کچھ اس کی مخالفت میں ہے۔ مخالفت بیدار کرتی ہے۔ عملی قوت کو ابھارتی ہے اور انسان کے اُن جوہروں کو جلا دیتی ہے جو پہلے مدھم پڑے تھے۔ مخالفت درپردہ امتحان ہے۔ تحریک اگر حق پر ہے اور کام کرنے والوں میں خلوص اور استقلال ہے تو مخالفت دَب جائے گی اور تحریک سولہ سوبسوے کامیاب ہوگی۔ مخالفت ہی نے پاکستان بنایا ورنہ کیا اتنی جلد بن جاتا اور مخالفت ہی کے طفیل میں اُردو زبان کو ترقی نصیب ہوئی۔

---

(۲)

تقسیم ہند تک کی مختصر کارگزاری

"ابتدا[۱] میں انجمن خاموشی سے کام کرتی رہی۔ اس کا مقصد اردو زبان کی اشاعت و ترقی اور اردو ادب کو پُرمایہ اور وسیع بنانا تھا۔ اس نے کبھی ہندی یا کسی دوسری زبان کی مخالفت نہ کی۔ یہ اس کے اصول اور شعار کے خلاف تھا۔ البتہ جب اس کی مخالفت کی گئی اور اس کے رستے میں روڑے اٹکائے گئے تو اسے مجبوراً مدافعت کرنی پڑی۔ حفاظت اور سلامتی کے لئے مدافعت لازم ہے۔

اس ضمن میں اُس واقعے کا ذکر کرنا ضروری خیال کرتا ہوں جس نے انجمن کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اس کی مختصر روداد یہ ہے۔ ۱۹۳۵ء میں مسٹر کنہیا لال منشی (جو آب ..... ؟) مجھ سے حیدرآباد آکر ملے اور بیان کیا کہ ہم ایک ایسی انجمن بنانا چاہتے ہیں جس میں ہر زبان کے ادیب شریک ہوں تاکہ ایک دوسرے کے ادب کے حالات اور معلومات سے واقفیت ہو سکے۔ آپ اس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر ہو جائیے۔ چونکہ یہ ادبی معاملہ تھا، میں نے منظور کر لیا۔ ۱۹۳۶ء میں اس کا سالانہ جلسہ ناگ پور میں گاندھی جی کی صدارت میں ہوا۔ اس انجمن کا نام "اکھل بھارتیہ ساہتیہ پرشد" تھا۔ اس میں ایک مسئلہ یہ پیش ہوا کہ پرشد کی زبان کیا ہونی چاہئے۔ مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا "ہندوستانی" گاندھی جی نے دریافت کیا کہ میں ہندوستانی کیوں تجویز کرتا ہوں۔ میں نے کہا اس لئے کہ انڈین نیشنل کانگرس کا یہ رزولیوشن ہے کہ کانگرس کی اور ملک کی زبان ہندوستانی ہوگی۔ نیز کانگرس کے آئین کی دفعہ ۲۱ میں صاف طور سے یہ درج ہے۔ گاندھی جی نے فرمایا کہ اس کا یہ مطلب نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ ہر دس سال کے بعد مطلب بدلتا رہا تو کام کیسے چلے گا۔ گاندھی جی ہندی کے حق میں تھے جب بحث زیادہ بڑھی تو گاندھی جی نے پینترا بدلا اور ایک نئی زبان اور نیا نام تجویز کیا یعنی ہندی ہندوستانی۔ میں نے پوچھا ہندی سے آپ کی کیا مراد ہے

---

[۱] خطبات عبدالحق ص۳۰۵

فرمایا وہ زبان جو کتابوں میں ہے بول چال میں نہیں۔ پھر میں نے پوچھا ہندوستانی سے آپ کا مطلب کیا ہے تو فرمایا وہ زبان جو بول چال میں ہے کتابوں میں نہیں۔ اس پر میں نے دریافت کیا تو پھر ہندی ہندوستانی زبان کیا ہوئی۔ فرمایا وہ زبان جو آگے چل کر ہندوستانی ہو جائے گی۔ میں نے عرض کیا کہ جب ہندوستانی پہلے سے موجود ہے تو پچاس سال اور انتظار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس پر انھوں نے جھنجھلا کر کہا کہ میں ہندی نہیں چھوڑ سکتا۔ میں نے عرض کیا جب آپ ہندی نہیں چھوڑ سکتے تو ہم اردو کیوں چھوڑ دیں۔ اس پر انھوں نے ایسا غلط اور عجیب و غریب جواب دیا جس کی ان سے توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ فرمایا کہ مسلمان چاہیں تو اردو رکھ سکتے ہیں۔ یہ ان کی مذہبی زبان ہے قرآن کے حرفوں میں لکھی جاتی ہے۔ مسلمان بادشاہوں نے پھیلائی۔ اس کے بعد بحث کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی اور میں نے اکھل بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی کمیٹی سے استعفا دے دیا۔ اب ہماری آنکھیں کھلیں اور معلوم ہوا کہ زمانے کا رنگ کچھ اور ہے۔

انجمن اب تک خاموشی سے علمی اور ادبی کام کر رہی تھی۔ اب اسے ایک نئی مہم سے سابقہ پڑا۔ چنانچہ اس پر غور کرنے کے لئے اسی سال علی گڑھ میں ایک کُل ہند اردو کانفرنس منعقد کی گئی۔ جس میں علاوہ دوسرے مسائل کے ایک مسئلہ قابلِ غور یہ تھا کہ انجمن کا مستقر کہاں ہو کیوں کہ اب حالات بدلنے سے حیدرآباد میں رہ کر یہ کام حسب منشا انجام نہیں پا سکتا۔ اسی کانفرنس میں یہ طے پایا کہ انجمن کا صدر مقام دلّی میں منتقل کر دیا جائے۔ ملک میں اس وقت کانگرس حکومتوں کا راج تھا۔ اس لئے اردو کی طرف سے تشویش پیدا ہو گئی اور انجمن کو ہر علاقے اور مقام پر نظر رکھنی پڑی۔ بمبئی، یو۔ پی، بہار اور خاص کر سی پی کی حکومت سے بڑے معرکے کرنے پڑے۔ جہاں کہیں اردو پر آنچ آئی اس کے انسداد کی انجمن نے فوراً کارروائی کی۔ جہاں کہیں اردو مدرسے بند ہو گئے تھے انھیں کھلوایا۔ جہاں ازروئے قواعد اردو تعلیم نہیں ہوتی تھی اسے جاری کرانے کی کوشش کی۔ ودّیا مندر کے خلاف بہت جد و جہد کرنی پڑی۔ کئی بار وزرائے حکومت نیز گاندھی جی سے مراسلت کے ذریعے اور بالمشافہ اس بارے میں کارروائی کی گئی۔ ریاست کشمیر اور جے پور میں ایک مدت سے پہلے فارسی اس کے بعد اردو، سرکاری زبان تھی۔ وہاں اردو کو ہٹا کر ہندی رائج کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ انجمن نے فوراً اس کے متعلق قدم اٹھایا۔ جے پور میں متوفی مہاراجا کے زمانے میں پنڈت مالویہ بھی دو بار مہاراجا کی خدمت میں وفد لے کر گئے اور درخواست کی کہ اردو کے بجائے ہندی سرکاری زبان کر دی جائے۔ لیکن مہاراجا نے صاف انکار کر دیا۔ مہاراجا کی وفات کے بعد ایک وفد ریاست کے ریجنٹ گلانسی کی خدمت میں حاضر ہوا لیکن انھوں نے بھی معذرت کر کے ٹال دیا۔ ان کے بعد ایک ہندو صاحب وزیر اعظم ہوئے۔ انھوں نے بھی یہ درخواست منظور نہ کی۔ لیکن جب سر مرزا اسمٰعیل اس منصب جلیلہ پر فائز ہوئے تو انھوں نے بلا تامل اردو کی جگہ ہندی کو سرکاری زبان بنا دیا اور جو کام خود مہاراجا نہ کر سکے، جو انگریز ریجنٹ سے نہ ہو سکا اور جسے ہندو وزیر اعظم نے

رد کر دیا وہ جناب مرزا صاحب کے دست مبارک سے بے خرخشے انجام پایا۔ انجمن نے اس پر سخت احتجاج کیا۔ جس سے سر مرزا اسمٰعیل ناراض ہوئے۔ اس کے کچھ دنوں بعد وہ بدقسمتی سے ریاست حیدرآباد کے صدر اعظم ہو گئے جاتے ہی پہلا وار انھوں نے انجمن پر کیا اور اس کی امداد بند کر دی۔

انجمن نے اس کے علاوہ سرکاری اداروں میں اُردو کے حقوق کے لئے جد و جہد جاری رکھی۔ ڈاکخانوں کے فارم اور ریلوے کے ٹکٹوں پر اردو لکھوائی۔ سی۔ پی کی اسمبلی میں اردو تقریروں کی اجازت دلوائی۔ اُردو میں اسمبلی کی رپورٹ لکھنے کی منظوری دلوائی اور اردو اسٹینوگرافر کے تقرر کرائے۔ غرض اس قسم کے مختلف کام ہوتے رہے۔

یہ تو مختصر رُوداد اُردو کی مدافعت اور دادرسی کی ہے۔ دوسرا کام اشاعت کا تھا۔ اس کے لئے انجمن نے مقدور بھر کوشش کی۔ بلا مبالغہ کشمیر سے راس کماری تک اور پشاور سے چاٹگام تک انجمن کی شاخوں کا سلسلہ پھیلایا۔ خاص کر ان علاقوں کی طرف زیادہ توجہ کی جہاں اردو کا رواج نہ تھا یا بہت کم تھا۔ ملیبار میں تقریباً آٹھ لاکھ موپلے آباد ہیں وہ اُردو زبان سے ناآشنا تھے۔ وہاں انجمن نے مدرسے قائم کئے، انجمن کی شاخیں قائم کیں۔ عربوں سے نسبت ہونے کی وجہ سے وہ عربی کے دلدادہ ہیں۔ عربی مدرسوں میں اُردو کی تعلیم جاری کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو سال کے عرصے میں اردو کا خاصا رواج ہو گیا۔ کالی کٹ میں اُردو کانفرنس بڑی شان سے ہوئی اور مشاعرے ہونے لگے۔ یہاں تک کہ وہاں کے سرکاری مدرسوں میں بھی اُردو کی تعلیم ہونے لگی

اسی طرح نارتھ ارکاٹ، ساؤتھ ارکاٹ، ٹراونکور اور کوچین میں انجمن نے کام کیا اور شاخیں قائم کیں اور راس کماری میں سمندر کے کنارے میں نے خود جاکر اردو پڑھائی تری وندرم پہنچ کر ٹراونکور کے دیوان سرسی پی سوامی مدلیار سے ملاقات کی اور ٹراونکور یونی ورسٹی میں عربی اُردو کی مسند (چیر) قائم کرانے کی کوشش کی لیکن اس سے بھی زیادہ موثر کام انجمن نے چھوٹا ناگ پور میں کیا۔ چھوٹا ناگ پور پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے سے رومن کیتھولک مشنریوں کا تسلط تھا اور وہ سارے چھوٹا ناگ پور پر چھائے ہوئے تھے۔ کسی دوسری جماعت کی مجال نہ تھی کہ وہاں قدم رکھ سکے یا کام کر سکے۔ انجمن نے جب وہاں کام کرنے کا ڈول ڈالا تو ان کے کان کھڑے ہوئے اور سمجھے کہ انجمن مذہب کی تبلیغ کرنے آئی ہے۔ ہم نے انھیں اطمینان دلایا کہ ہمارا یہ منشا نہیں، ہم صرف اُردو کی اشاعت کے لئے یہاں آئے ہیں۔ اس غرض کے لئے مقتدر پادریوں اور بشپ سے مل کر اپنا مقصد سمجھایا۔ انھوں نے ہمارے ساتھ پورا تعاون کیا اور بشپ صاحب نے تمام پادریوں کو ہدایت کی کہ وہ اپنے مدارس میں اردو کی تعلیم جاری کردیں چنانچہ ہزاروں عیسائی لڑکے اور لڑکیاں لازمی طور پر اُردو پڑھنے لگیں۔ چھوٹا ناگ پور میں اصل باشندے ابھی تک نیم وحشیانہ حالت میں ہیں۔ انجمن نے ان کے لئے مدارس کھولے اور سیکڑوں لڑکے لڑکیاں اردو پڑھنے لگیں اور تھوڑے ہی عرصے میں انھوں نے اردو لکھنے اور پڑھنے میں حیرت انگیز ترقی کی۔ رومن کیتھولک ننوں نے اُردو پڑھ کر اُردو مڈل کے امتحان پاس کئے

ص خاص پادری وہاں پڑھ کر تکمیل کے لئے دلی میں آکر میرے ساتھ رہتے تھے۔ چنانچہ ان میں سے ایک پادری نے دِلّی کے کیتھڈرل میں اردو میں سرمن دیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ رومن کیتھولک کیتھڈرل میں اردو میں سرمن دیا گیا۔

لیکن اشاعت اردو کا سب سے اول اور سب سے زیادہ کام سی پی میں کیا کیونکہ یہیں گاندھی جی سے معرکے کے بعد انجمن کی کارگزاری کا نیا دور شروع ہوا تھا۔ یہاں اتفاق سے ایسے کام کرنے والے مل گئے کہ سی پی کی کایا پلٹ کردی، ہمارے رضاکاروں اور کارکنوں نے سارے سی پی کا دورہ کیا۔ شہر شہر اور قصبے قصبے میں انجمن کی شاخیں، کتب خانے اور مدرسے قائم کیئے۔ حکومت کو اردو کی طرف توجہ دلائی۔ انجمن[۱] کے بعض سرگرم ارکان خصوصاً حکیم اسرار احمد کریوی صاحب اور ابراہیم خاں صاحب، نواب صدیق علی خاں صاحب، نواب محی الدین خاں صاحب وغیرہم نے جس جانفشانی، بے جگری اور ایثار سے کام کیا وہ ہمیشہ یادگار رہے گا۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہاں اب اردو کا عام رواج ہو رہا ہے۔ اردو جسے وہاں کوئی منھ نہیں لگاتا تھا آج گھروں میں، بازاروں اور جلسوں میں اسی کا بول بالا ہے۔ یا[۲] تو ایک وقت یہ حالت تھی کہ مسلمان اردو بولنے سے شرماتے تھے اور مرہٹی بولتے تھے یا تھوڑے عرصے میں نوبت یہ ہوئی کہ مرہٹے اردو بولنے لگے اور اردو میں تقریریں کرنے لگے۔ ناگ پور اردو کا خاص مرکز ہو گیا۔ ہر ہفتے اور ہر مہینے اردو کے جلسے ہوتے تھے۔ بڑی شاندار اردو کانفرنسیں ہوئیں اور مشاعروں کا تو کچھ شمار ہی نہ تھا۔ انجمن نے اچھوتوں کے لئے مدرسے قائم کئے۔ تمام کالجوں میں جن کی تعداد آٹھ تھی اردو لکچرار مقرر کرائے۔ یہاں تک کہ مرہٹی عورتوں کے کالج میں بھی اردو لکچرار کا تقرر کرایا۔ لیجس لیٹو اسمبلی میں اردو میں تقریریں ہونے لگیں اور ان تقریروں میں اردو فارسی کے شعر پڑھے جانے لگے۔ انجمن کی کوششوں سے اردو اسٹینوگرافر (مختصر نویس) کا تقرر ہوا۔ اسمبلی کی رپورٹ اردو میں بھی لکھی جانے لگی۔ ودیا مندر اسکیم کے ضمن میں حکومت سے بڑے بڑے معرکے رہے۔ مسلمان سی پی میں دو ڈھائی فیصد سے زیادہ نہ تھے اور ان کی حالت بہت پست تھی لیکن اردو کی اشاعت سے ان میں عجیب بیداری اور قوت پیدا ہوگئی اور وہ سارے سی پی پر چھا گئے۔

افسوس کہ ہم لوگوں کو اس کا احساس نہیں کہ اردو میں کیسی کیسی قوتیں چھپی ہوئی ہیں۔ یہ صرف زبان ہی نہیں اور بھی بہت کچھ ہے۔ جہاں اس کی اشاعت زیادہ ہے وہیں قومی عصبیت اور حمیّت اور روشن خیالی بھی زیادہ ہے اور جہاں اس کا رواج کم ہے وہاں قومی عصبیت اور روشن خیالی بھی کم ہے۔ یہ[۳] محض خیالات کے اظہار کا آلہ ہی نہیں۔ خیالات کے بنانے اور سنوارنے کا آلہ بھی ہے۔ یہ ہماری زندگی کا جزو ہے۔ ہماری زندگی کے ہر شعبے میں دخیل اور کارفرما ہے۔ اگر ہم اس کے تحفظ اور ترقی کے لئے جدوجہد کریں اور جان لڑا دیں تو یہ ہمارا فرض ہے اور

۱۔ رپورٹ، تیسری کل ہند انجمن کانفرنس ناگ پور ص۱۱۴

۲۔ خطباتِ عبدالحق، ص۵۰۸

۳۔ ایضاً ص۷۶

اس فرض سے غفلت کسی مذہب و ملت میں روا نہیں۔ ہمیں[1] یہ زبان اس لئے عزیز ہے کہ یہ ہماری بول چال کی زبان ہے ہمیں یہ زبان اس لیے عزیز ہے کہ یہ ہمارے تمدن، ہماری معاشرت، ہمارے دل و دماغ کے نتائج، ہمارے مادی اور روحانی خیالات کی حامل ہے۔ ہمیں یہ اس لئے عزیز ہے کہ اس میں ہمارے اسلاف کی صدیوں کی محنت و جانکاہی دماغی و ذہنی کاوشوں کا نچوڑ ہے۔ ہمیں یہ اس لئے عزیز ہے کہ یہ ہمارے بزرگوں کی مقدس وراثت ہے۔ اگر اس پر بھی ہم اس کی قدر نہ کریں اور اس کے بنانے سنوارنے اور بڑھانے میں اپنی پوری ہمت صرف نہ کر دیں اور اس کی ترقی و نشو و نما میں جان نہ لڑا دیں تو ہم سے بڑھ کر کوئی نا خلف نہ ہو گا۔

۱۹۱۹ء[2] کا ذکر ہے میں اینگلو انڈینز کے لیڈر سر ہنری گڈنی سے ملا اور اُن سے کہا کہ اب انگریزی حکومت کچھ دن کی مہمان ہے۔ کسی نہ کسی روز یہاں دیسی راج ہو گا، خواہ وہ کسی نوعیت کا ہو۔ آپ لوگوں کو بڑی مشکل ہوگی۔ اگرچہ انگریز آپ کو زیادہ منہ نہیں لگاتے مگر آپ ہر چیز میں ان کی نقل کرتے ہیں اور اپنی طرزِ معاشرت اور نظامِ تعلیم انگریزوں ہی جیسا رکھتے ہیں۔ ہندوستانیوں سے الگ الگ رہتے ہیں اور ان سے میل جول بڑھانے کی کوشش نہیں کرتے۔ انگریزی حکومت اٹھ گئی تو آپ کا کیا حال ہوگا۔ آپ کو تو بہر حال اسی ملک میں رہنا ہوگا۔ اس پر آپ کو ابھی سے غور کرنا چاہیئے سب سے پہلی بات یہ ہے کہ آپ اپنا طریقۂ تعلیم بدل دیں اور اسے ملکی حالات کے مطابق بنائیں خاص کر آپ کے بچوں کو ملک کی زبان لازمی سیکھنی چاہیئے۔ ہندوستان میں بہت سی زبانیں ہیں لیکن آپ کے لئے اردو زبان سب سے زیادہ مناسب ہو گی۔ کیونکہ آپ کسی خاص مقام یا صوبے میں آباد نہیں بلکہ سارے ہندوستان میں منتشر ہیں اور اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو ہر جگہ کام آسکتی ہے۔ یہ سننے کے بعد انھوں نے کہا میں نے بارہا اپنی تقریروں میں ان باتوں پر زور دیا ہے اور مجھے آپ سے بالکل اتفاق ہے۔ آپ مجھے یہ سب باتیں لکھ کر بھیجئے۔

میں نے ایک خط میں یہ باتیں لکھ کر بھیجیں اور اس کے ساتھ اردو کی نسبت بعض یوروپین علماء کی رائیں بھی شامل کر دیں۔ اس کے جواب میں سر ہنری نے مجھے بہت اچھا خط لکھا اور اس میں اردو زبان کی خوبی اور شیرینی کی بہت تعریف کی۔ اس کے بعد انھوں نے مجھ سے کہا کہ یہ خط و کتابت چھاپ دی جائے اور اس کی کچھ نقلیں انھیں بھیجدی جائیں میں نے چھاپ کر کوئی دو سو نقلیں انھیں بھیجدیں جو انھوں نے اینگلو انڈین اور یوروپین اسکولوں کے پرنسپلوں اینگلو انڈین اور یوروپین کلبوں کے سیکریٹریوں وغیرہ میں تقسیم کیں۔ اس کے کچھ دنوں بعد ان کی تعلیم گاہوں کے ہیڈ ماسٹروں اور پرنسپلوں اور اُن کے ایجوکیشنل بورڈ کے ممبروں کا ایک جلسہ الہ آباد میں ہوا جس کی صدارت یو۔پی کے ڈائریکٹر تعلیم نے کی۔ کئی دن کے بحث مباحثے کے بعد یہ قرارداد منظور ہوئی کہ وہ اپنے مدارس میں اردو زبان

---

[1] خطباتِ عبدالحق ۹۱ [2] خطباتِ عبدالحق ۹۰۵

لیم لازمی طور پر جاری کریں گے اور اردو کے سوا کسی دوسری ہندوستانی زبان کو نہیں پڑھائیں گے۔

اس کے بعد اینگلو انڈین اینڈ یورپین ایجوکیشن بورڈ نے مجھے اپنی لینگویج کمیٹی کا ممبر بنایا۔ اس کا ایک جلسہ دلّی ہوا۔ اس میں ایک بحث یہ تھی کہ اینگلو انڈین اور یورپین بچوں کو اُردو کب شروع کرائی جائے۔ سب نے اس سے لاف کیا اور کہا کہ ہم اردو پہلے ہی سال سے شروع کرانا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا پہلے ہی سال دو زبانیں ایک شروع نہیں کرنی چاہییں۔ یہ اصولاً درست نہیں۔ لیکن وہ نہ مانے اور کہا کہ جس وقت ہمارے بچے اے۔ بی۔ سی ع کریں۔ اسی وقت وہ الف ب ت بھی پڑھیں۔ بڑی مشکل سے وہ اس بات پر رضامند ہوئے کہ پہلے ماہ انھیں زبانی اور نقشوں اور سیاہ تختوں کی مدد سے زبان سکھائی جائے اور کوئی کتاب پڑھنے کو نہ دی جائے۔ ماہ کے بعد پرائمر یعنی اردو قاعدہ پڑھنے کو دیا جائے۔ یہ غور کرنے کی بات ہے کہ اینگلو انڈین اور یورپین تو اپنے ں کو اُردو پہلے ہی سال پڑھانا چاہتے ہیں مگر ہمارے بعض علاقے کے بزرگ تیسرے چوتھے سال میں بھی اُردو مانے پر آمادہ نہیں تھے۔

میں نے بنگال کا بھی کئی بار دورہ کیا۔ کلکتہ میں انجمن کی شاخ قائم کی لیکن یہ شاخ کبھی سرسبز نہ ہونے پائی ی فضل حق اور خواجہ ناظم الدین صاحب کی وزارتوں میں بھی حاضر ہوا اور دونوں حضرات سے اس بارے میں وہوئی۔ لیکن ان ملاقاتوں اور گفتگوؤں کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ میں ان مشکلات کو سمجھتا تھا۔ وہ اس وقت حالات اور اپنے منصب کی نزاکت کی وجہ سے کوئی ایسا اقدام نہیں کرنا چاہتے تھے۔ جس سے کسی طبقے یا فرقے کو بیت کا موقع ملے۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا اور میری ہرگز یہ خواہش نہ تھی کہ وہ نصابِ تعلیم میں کوئی ایسا ر تبدیل کریں۔ بات یہ ہے کہ بنگال میں ہزاروں کی تعداد میں مکاتب تھے (اور اب بھی ہیں) جن میں مسلمان بچے بم پاتے تھے۔ ان کے نصاب میں اردو بھی داخل تھی اور نظام اوقات میں اُردو کے لئے بھی وقت مقرر تھا مگر مائی نہیں جاتی تھی میری درخواست یہ تھی کہ پڑھائی کا بھی انتظام کردیا جائے۔ ان کا عذر یہ تھا کہ پڑھانے کے استاد نہیں ملتے۔ میں نے عرض کیا کہ میں کلکتہ ہی میں ایک ٹریننگ اسکول قائم کردوں گا جس میں آپ ہی کے ادوں کو اُردو پڑھانے کے لئے تیار کردیا جائے گا۔ اس کے جواب میں فرمایا کہ اس میں تو گورنمنٹ کی سُبکی ہوگی، ز دہی اس کا انتظام کریں گے۔ اس کا میں کیا جواب دے سکتا تھا اور اس وعدے کا جو انجام ہونے والا تھا اُسے میں جانتا تھا۔

میں نے اس کے جواب میں یہ کیا کہ دلّی کے عربی مدارس میں جتنے بنگالی طالب علم تھے اُن سب کو جمع کیا۔ ل تعداد ایک سو پچاس سے کم نہ تھی۔ اُن سے میں نے کہا کہ آپ کئی کئی سال تک ان مدارس میں تعلیم پاتے ہیں، ساتھ میں ملتے جلتے ہیں اور دلی والوں سے میل جول نہیں رکھتے، یہ اچھی بات نہیں۔ یہاں کے قیام سے آپ کو

فائدہ اٹھانا چاہیئے اور کچھ نہیں تو یہاں کی زبان اچھی طرح سیکھ لی جائے اور یہ بہت آسان ہے۔ انھوں نے کہا ہمارے نصاب میں اُردو داخل نہیں اس لئے اس سے محروم رہ جاتے ہیں۔ میں نے کہا اچھا، اگر ہم اُردو پڑھانے کا انتظام کریں تو کیا تم اس کے لئے تیار ہو۔ انھوں نے کہا بڑی خوشی سے۔ چنانچہ اس کے بعد ہی میں نے مسجد فتح پوری میں دو کمرے لے کر شب کو ان کے پڑھانے کا انتظام کر دیا۔ چند ہی مہینے میں وہ بہت اچھی اُردو لکھنے پڑھنے لگے اسی زمانے میں ڈھاکے سے حکیم حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم دلی تشریف لائے۔ ایک شب میں ان کو ان طالب علموں سے ملانے لے گیا۔ حکیم صاحب نے جب ان کی تقریریں سنیں اور مضامین دیکھے تو بڑی حیرت ہوئی۔ بعض قابل طالب علموں کو انھوں نے انعام تقسیم کئے۔ میں نے استاد تو تیار کر دئے مگر ان کا تقرر میرے ہاتھ میں نہ تھا۔ یہ نہایت مختصر کیفیت اشاعت کی ہے۔

تیسرا مقصد انجمن کا اردو زبان و ادب کو وسیع اور پُر مایہ بنانا تھا۔ اس میں بھی انجمن کا کارنامہ بہت قابلِ ستائش ہے۔ تقریباً ۲۵۰ کتابیں شائع کیں۔ جن میں ادب، تاریخ، فلسفہ، سائنس، لغات، اصطلاحات صناعت تعلیم، سوانح اور معلوماتِ عامہ، معاشیات، صرف و نحو، سیاسیات، تنقید وغیرہ کی اعلیٰ پائے کی تصانیف شامل ہیں۔ اصطلاحات علمیہ کی کئی جلدیں اور اصطلاحاتِ پیشہ وران آٹھ جلدوں میں شائع کیں۔ انگریزی اُردو کی جامع لغات، وضع اصطلاحات، دنیا کے ادبیاتِ عالیہ کے ترجمے شائع کئے۔ اردو شعرا کے قدیم تذکرے جن کے نام صرف کتابوں میں نظر آتے ہیں تلاش کر کے شائع کئے۔ اُردو کے قدیم مخطوطات کئی ہزار کی تعداد میں بڑی جستجو سے جمع کئے اور ان میں سے بعض طبع کئے اور ان پر مضامین لکھے۔ اِن سے اُردو کی تاریخ کی کایا پلٹ گئی ——— ایسے[1] قدیم تذکرے جن کے نام کتابوں میں کہیں کہیں ملتے تھے مگر ان کا وجود ناپید تھا۔ بڑی جستجو اور صرف کثیر سے بہم پہنچائے۔ ان میں سے بعض کا دنیا میں صرف ایک ہی نسخہ تھا اور بعض کے دو ایک سے زیادہ نہ تھے۔ یہ تذکرے ہمارے قدیم شعرا کی سیرت، ان کے طرزِ خیال اور طرزِ بیان اور اس زمانے کی معاشرت و تمدن کے سمجھنے اور صحیح تاریخ ادب لکھنے کے لئے نہایت ضروری ہیں۔ انجمن نے ان سب کو صحت و احتیاط کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا۔ نیز انجمن نے اُردو زبان کی قدیم کتابوں کی اشاعت اور یا ان پر تنقیدی تبصرے لکھ کر ملک کو اُردو ئے قدیم سے روشناس کیا اور اردو زبان کی تاریخ ادب میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ جس سے بہ قول ایک فاضل نقاد کے اردو کی عمر میں دو سو سال کا اضافہ ہو گیا۔ ان کتابوں سے ابتدائی زبان کی کیفیت اور ارتقائی نشو و نما کی حالت معلوم ہوتی ہے۔ زبان و ادب کے مورخ (اور متعلم) کے لئے ان کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ان میں سے اکثر وہ کتابیں ہیں جن کے نام سے بھی کوئی واقف نہ تھا۔۔۔ "

۱۹۳۰ء میں حکومتِ حیدرآباد نے مولوی عبدالحق مرحوم کو بہ اصرار جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ اُردو کا صدر مقرر کیا اور اردو

---

[1] رپورٹ، تیسری کل ہند انجمن کانفرنس۔ ناگ پور صفحہ ۱۲

ن کی جدید و مکمل لغت کی تالیف و تسوید کی خدمت سپرد کی۔ مولوی صاحب ہی کے لفظوں میں ایک کامل و جدید
ستند لغت ہیں:

ہر لفظ کے متعلق یہ بتانا ہوگا کہ وہ کب، کس طرح اور کس شکل میں اردو زبان میں آیا اور اس
کے بعد سے اور اس وقت سے تا حال اس کی شکل و صورت اور معانی میں کیا کیا تغیرات ہوئے
اس کے کون کون سے معنی متروک ہو گئے اور کون کون سے اب تک باقی ہیں۔ اور اس میں
اب تک کون کون سے نئے معانی پیدا ہو گئے۔ ان تمام امور کی توضیح کے لئے زبان کے ادیبوں
کے کلام سے نظائر پیش کرنے ہوں گے۔ ہر لفظ کی اصل کی تحقیق کرنی ہوگی۔ یعنی یہ بتانا ہوگا کہ
یہ کس زبان کا لفظ ہے اور اس کی صورت وہی ہے جو اصل تھی یا بدل گئی ہے۔ اصل زبان میں
اس کے کیا معنی تھے اور اب کیا ہیں اور اگر درمیان میں کچھ تغیرات ہوئے تو وہ کیا تھے۔ لفظ
کی تاریخی حالات معلوم کرنے کے لئے اصل یا اشتقاق معلوم کرنا بہت ضروری ہے۔ اس
کے علاوہ یہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے مماثل اور ہم علاقہ الفاظ کے صحیح تعلقات اور ہم شکل
مگر مختلف الاصل الفاظ کی تحقیق اور ان میں امتیاز ہو سکتا ہے۔[۵]

ظاہر ہے ان خطوط پر ایک جامع لغت کی ترتیب کس قدر دشوار کٹھن اور محنت و وقت طلب امر تھا۔ معقول عملے اور خاطر خواہ
مددگاروں کے علاوہ اس کے لئے فراہمیٔ سرمایہ بھی بڑا زبردست مسئلہ تھا۔ مگر جواں حوصلہ عبدالحق نے اس کام کا بھی
بیڑا اٹھایا اور بڑی مستعدی سے لغت کی تالیف کا کام شروع ہوا۔ مرحوم احتشام الدین صاحب حقی دہلوی
مددگار مقرر ہوئے۔ محترم حقی مرحوم نے ذوق ادب ورثے میں پایا تھا۔ خود صاحب نظر انشا پرداز تھے۔ سید ہاشمی
فرید آبادی صاحب کے لفظوں میں "لغت کے کام میں ان سے بہتر مددگار ملنا مشکل تھا۔ مولوی صاحب کی نگرانی
میں سنسکرت اور ہندی کے بعض ماہرین الفاظ کی اصل اور سرگزشت کا پتہ چلانے کے لئے بھی مقرر کئے گئے نظم و
نثر کی مستند کتابوں سے الفاظ و اسناد اخذ کرنے اور ڈھونڈنے میں متعدد اصحاب مصروف رہے۔ مگر قدم قدم پر
مولوی صاحب کی رہنمائی بھی شریک عمل رہی۔ وہ جزئی تلاش و تحقیق تک میں شریک ہوتے۔ یہاں تک کہ دس بارہ
برس میں اس کام کے لئے قابل قدر مواد فراہم ہوگیا۔ چند اجزا حیدرآباد کے سرکاری مطبع میں شائع ہوئے تھے کہ یہ سرمایہ
تقسیم ہند کی نذر ہوگیا۔ ویسے ۱۹۳۷ء میں بڑی تقطیع کے دو کالمی ڈیڑھ ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل انگریزی سے
اردو کی جدید ترین "ڈکشنری" شائع کی گئی۔ اس لغت میں تقریباً دو لاکھ انگریزی لغات کے ہم معنی اردو الفاظ
دئے گئے ہیں۔ یہ لغت مولوی عبدالحق مرحوم کی رہبری میں متعدد اہل علم کی دس گیارہ سال کی محنت سے تیار ہوئی:

۵۔ مقدمہ جدید اردو لغت (اردو لغات اور لغت نویسی)، رسالہ اردو، جنوری اپریل ۱۹۵۹ء

طلبہ کی سہولت اور عام استعمال کے پیش نظر اس کی تلخیص بھی کی گئی۔ لغات کا یہ سلسلہ بے حد مفید ثابت ہوا اور بہت پسند کیا گیا۔

انجمن کی طرف سے مولوی صاحب نے کچھ اخبار اور ادبی علمی جرائد بھی جاری کئے۔ یہ اپنی نوعیت کے ممتاز اور منفرد رسالے تھے اور ان کا اپنا ایک خاص معیار تھا۔ ان میں پندرہ روزہ "ہماری زبان" — "اُردو" سہ ماہی "سائنس" ماہانہ اور "معاشیات" کے رسالے شامل تھے اس سے قطع نظر اردو کے قدیم مخطوطات اور معیاری مطبوعات کا ایک بہت بڑا کتب خانہ بھی قائم کیا گیا۔

" اس[1] کے علاوہ دنیا کی متعدد اُمہات کتب کے ترجمے شائع کئے۔ ان میں عربی، سنسکرت، فارسی، فرانسیسی، جرمن، انگریزی وغیرہ کی کتابیں ہیں۔ نیز سائنس کی مختلف شاخوں، فلسفہ، تعلیم، تاریخ، سوانح، حفظان صحت، معاشیات، تنقید اور دیگر علوم پر بہت سی کتابیں شائع کیں۔ یہ ایک بیش بہا خزانہ ہے جو انجمن کی بدولت اُردو ادب کو حاصل ہوا ہے۔ کسی ادارے نے اُردو داں طبقے کے لئے علمی و ادبی معلومات کا ایسا ذخیرہ بہم نہیں پہنچایا۔

یہ سب[2] کچھ کیا۔ لیکن ۱۹۴۷ء کے ہولناک فسادات میں اس سارے کئے کرائے پر پانی پھر گیا۔ اس زمانے میں جن وحشیانہ حرکات اور بربریت کا ظہور ہوا انھیں دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیطان بے چارہ خواہ مخواہ بدنام ہے۔ وہ انسان کی قساوتِ قلبی، ظلم و جبر، غارت گری و خوں ریزی کو نہیں پہنچتا۔ اس لپیٹ میں انجمن بھی آگئی۔ اس کا تمام سامان و اسباب تباہ کر دیا گیا۔ اس کا ایک رکن اور بال بچے قتل کر دیئے گئے۔ کتب خانے کا بیشتر حصہ جو بچ رہا تھا اس کے لانے کی اجازت نہیں ملی، کئی لاکھ کی مطبوعات وہیں چھوڑنی پڑیں اور نقدی سرمایہ بھی ضبط ہو گیا۔ انجمن ایک لٹے پٹے قافلے کی طرح پاکستان پہنچی اور کراچی آکر اطمینان کا سانس لیا — "

اگلے شمارے میں انجمن کی پاکستان ہجرت کا سیاق و سباق انجمن کی روحِ رواں ہی کی زبان اور بیان میں ملاحظہ کیجئے — اسے میں نے انجمن کی پنجاہ سالہ تاریخ (مرتبہ سید ہاشمی فرید آبادی) کے چھٹے باب (نوشتہ مولوی عبدالحق) سے اختصار کیا ہے۔

---

[1] رپورٹ، تیسری کل ہند انجمن کانفرنس ناگ پور ص ۱۲۱

[2] خطباتِ عبدالحق ص ۵۱۴

گردوپیش

تصویر کا ایک رُخ

ہمارا قومی امتیاز پنجاب یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد میں مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے جج جناب جسٹس اقبال نے خطاب فرماتے ہوئے کہا ہے کہ "ممکن ہے کہ آج منافقت ہمارے قومی کردار کا امتیازی نشان بن گئی ہو۔ اس کا اظہار قدم قدم پر ہوتا ہے۔ زہد و اتقا کے بلند بانگ دعووں، اسلامی تعلیمات کے ساتھ لگاؤ کے نعروں اور آزاد ریاست کی حیثیت سے ہمارے اعلانات میں یہی منافقت کارفرما ہے اگر ہمیں تعلیم کی حالت بہتر بنانا ہے تو اس منافقت سے نجات پانا ناگزیر ہے ہمیں اس مسئلے کا مردانہ وار مقابلہ کرنا ہوگا اور ہمیں اپنے نہاں خانۂ دل کا جائزہ لینا ہوگا کہ بلند مقاصد کا حرف وعظ ہی نہیں کرنا چاہیے بلکہ ان پر خود عمل پیرا ہونا ضروری ہے" جسٹس اقبال کے ان زرّیں ارشادات گرامی کی روشنی میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اردو بھی اسی منافقت کا پوری طرح شکار ہے۔ جس سے عبرت بھی ہوتی ہے اور مایوسی بھی جسٹس اقبال کے خیالات کے سلسلے میں ہم بلا تبصرہ چند خبریں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

اسی جلسۂ تقسیم اسناد میں جس میں جسٹس اقبال نے اپنے اِن ارشادات گرامی کا اظہار کیا ہے۔ پروفیسر حمید احمد خاں وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی نے (جو خود اردو کے بہت بڑے حامی ہیں اور جن کی اردو دوستی کسی قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے) اپنا خطبہ انگریزی میں پڑھا اور جناب جسٹس اقبال نے بھی اسی زبان کو اظہار کا ذریعہ بنایا۔

مغربی پاکستان مسلم لیگ کے صدر اور صوبائی وزیر تعلیم جناب ملک خدا بخش بُچّا جو اردو کے حق میں بڑی زبردست تقریریں کر کے اور اردو کو بہت جلد ملک کی قومی زبان کے طور پر اختیار کرنے کا مژدہ دے کر داد وصول کر چکے ہیں۔ انہوں نے مغربی پاکستان اسمبلی میں ایک سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا" آئین کے تحت

جب تک ۱۹۷۲ء میں قائم ہونے والا کمیشن اس مسئلے کا جائزہ نہ لے۔ صوبائی حکومت اس مسئلے پر غور کرنے کی مجاز نہیں

بلدیہ حیدرآباد کا تخمینہ برائے ۶۷-۱۹۶۶ء انگریزی میں تیار ہو چکا ہے۔ جب کہ ایک قرارداد کے ذریعے بلدیہ کی زبان اردو قرار دی جا چکی ہے۔ یہی صورت کراچی کی بلدیہ کو درپیش ہے۔ جو کئی بار اردو کو اختیار کرنے کے نعرے بلند کر چکی ہے۔

حمود الرحمان کمیشن جو قومی خواہشات کی روشنی میں تعلیم اور طالب علموں کے مسائل کا جائزہ لینے بیٹھا تھا اس کی مرتبہ رپورٹ میں ساری قومی خواہشات اور ابتدائی تعلیم کے خیالات کو قومی زبان کے ذریعے تعلیم کو صرف ایک سابق وائس چانسلر کے خیالات کی بنا پر رد کر دیا گیا ہے اور لکھا گیا ہے کہ اردو یا بنگالی عبارت میں انگریزی اصطلاحات استعمال کی جائیں اور نہ اردو یا بنگالی میں نئی اصطلاحیں وضع کی جائیں۔

کراچی یونیورسٹی میں انگریزی لازمی حیثیت سے بی۔ اے میں صرف ایک پرچے کی حد تک پڑھائی جاتی تھی اور کراچی یونیورسٹی کو یہ افتخار حاصل ہے کہ اس نے اردو کو اعلیٰ جماعتوں میں سب سے پہلے اختیار کرنے کا فیصلہ کیا مگر ۱۹۶۶ء سے انگریزی کا ایک مزید پرچہ بی۔ اے فائنل میں بڑھا دیا گیا ہے۔

فلسفہ کانفرنس میں جن دانشوروں نے اپنے مقالے پڑھے ان میں سے بیشتر ایسے تھے کہ جو اردو کے سپاہی سمجھے جاتے ہیں اور وہ اردو کو اپنانے کے لئے بہت پرجوش بیانات دیتے رہتے ہیں مگر انہوں نے اس کانفرنس میں جو مقالے پڑھے وہ انگریزی میں تھے۔

مشرقی پاکستان کا اخبار "ڈھاکا ٹائمز" جو خود کو قومی امنگوں کا نقیب کہتا ہے اور بنگلا زبان و ادب کا بہت بڑا مداح ہے اور چاہتا ہے کہ ملک میں بنگالی ایک قومی زبان کی حیثیت سے پڑھائی جائے وہ ڈھاکا ریڈیو اسٹیشن کے انگریزی پروگراموں پر معترض نہیں بلکہ اردو کے خلاف اداریہ لکھتا رہتا ہے۔

ان سب خبروں کو پڑھنے کے بعد ایک بار پھر جسٹس اقبال کے مذکورہ بالا ارشادات پر ایک نظر ڈال لیجئے۔

تصویر کا دوسرا رخ

بنگلا اور اردو کی لازمی تعلیم مشرقی پاکستان کے طلبہ کی ایسوسی ایشن نے مرکزی حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ مغربی پاکستان میں میٹرک تک لازمی اور کالجوں میں اختیاری مضمون کی حیثیت سے بنگالی زبان کی تعلیم کا اہتمام کیا جائے اور مشرقی پاکستان میں اسی طرح اردو کی تعلیم کا اہتمام کیا

جائے۔ یہ اہم اور معقول مطالبہ اس سے پہلے ملک کے تمام دانشور اور ماہرین تعلیم کر چکے ہیں۔ اور اخبارات و رسائل میں بھی اس تجویز کو سراہا گیا ہے۔

ایک ڈپٹی کمشنر کی تجویز

گوجرانوالہ کے ڈپٹی کمشنر جناب سید حسنات احمد نے گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ کے جلسۂ تقسیم اسناد میں تقریر کرتے ہوئے پاکستانیوں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ قومی زبان اردو کو ہر مقام اور ہر مرحلہ پر بروئے کار لائیں۔ اس قسم کے خیالات انتظامیہ کے تقریباً تمام افسران مختلف تقریبات میں ظاہر کرتے رہتے ہیں۔ مگر ان کے تحت دفاتر میں اردو کی کوئی شنوائی اور وقعت نہیں ہوتی۔

قومی زبان اور آزاد قوم

ارجنٹائن کا سفارت خانہ وہ واحد غیر ملکی ادارہ ہے جس نے پہلی بار پاکستان کی قومی زبان کو ایک آزاد اور باغیرت قوم کی حیثیت میں خطاب کیا ہے اور دعوت دی ہے۔ ارجنٹائن کے ناظم الامور کی طرف سے ایک استقبالیے میں مدعو کرنے کے لئے جو دعوت نامے جاری کئے گئے ہیں، وہ اردو میں ہیں۔

مڈل تک لازمی تعلیم اور اردو

گورنمنٹ کالج لاہور کے سابق پرنسپل ڈاکٹر نذیر احمد نے قومی جمعیت طلبہ پاکستان کے زیر اہتمام ایک مذاکرے کی صدارت کرتے ہوئے کہا ہے کہ قومی اور صوبائی تخمینوں میں مڈل تک لازمی تعلیم کے لئے خاطر خواہ رقم مہیا کی جائے اور اعلیٰ جماعتوں میں سائنس کی تعلیم کے لئے اردو ذریعۂ تعلیم اور ذریعۂ امتحان فوراً منظور کیا جائے۔

وہ کالج جہاں اردو ہے

اینگلو عربک کالج جامعہ اسلامیہ عارف والا کے جلسۂ تقسیم انعامات و اسناد میں سابق وزیر اعظم چودھری محمد علی نے طلبہ کو مشورہ دیا ہے کہ وہ ایک طرف توجدید علوم کو یورپ کی معیاری سطح تک حاصل کریں اور دوسری طرف غلامانہ ذہنیت کو بالکل ترک کر کے اسلامی اخلاق و کردار کا نمونہ بن جائیں۔ اس سے پہلے کالج کے پرنسپل نے اپنی سالانہ سرگزشت پیش کرتے ہوئے کہا کہ ملک بھر میں یہ پہلا کالج ہے جس نے اپنے قیام کے پہلے دن ہی سے اردو کو عملی طور پر قومی زبان کا درجہ دیا ہے جب کہ انگریزی زبان کی تدریس بھی معیاری رہی۔ انہوں نے ڈاکٹر سید عبداللہ کی خدمات اردو کو خراج تحسین پیش کیا اور اُن کی اُن مساعی کو ملک کے لئے بہت ضروری قرار دیا جو آج کل وہ انجام دے رہے ہیں۔

ایک قابل قدر اقدام

پنجاب یونیورسٹی کے حکام نے سائنس کے مضامین کے لئے اردو کو ذریعہ تعلیم کے طور پر متعارف کرانے کی طرف قدم اٹھایا ہے۔ اس سلسلے میں یونیورسٹی نے مقامی گورنمنٹ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر نذیر احمد کی خدمات حاصل کی ہیں وہ علم الحیوانات پر اردو میں درسی کتابیں تالیف کریں گے

نیز دیگر سائنسی مضامین کے لئے اردو میں کتاب تیار کرنے میں یونیورسٹی کی معاونت کریں گے۔ یاد رہے کہ پوسٹ گریجویشن کی سطح پر اردو کو پہلے ہی ذریعۂ تعلیم کے طور پر اختیار کیا جا چکا ہے۔

بزم ثقافت ملتان کا منصوبہ

مئی ۱۹۶۹ء کو ملتان میں بزم ثقافت کے زیر اہتمام بنگالی زبان کی تدریس کا اہتمام کیا گیا اور اس موقع پر مطالبہ کیا گیا کہ اردو گیت بنگالی میں اور بنگالی گیت اردو میں منتقل کئے جانے چاہئیں جس کے لئے ایک بین الصوبائی دارالترجمہ قائم کیا جائے تاکہ دونوں صوبے ثقافتی اعتبار سے ایک دوسرے میں مدغم ہو سکیں۔

مصنوعات کے نام

ایک سماجی کارکن عبدالرحمان چودھری نے صنعت کاروں سے یہ درخواست کی ہے کہ وہ اپنی مصنوعات کا نام پاکستان کی قومی زبان اردو میں رکھیں۔ انہوں نے انگریزی میں مصنوعات کے نام رکھنے کو احساس کمتری کے جنون اور قومی زبان کی توہین سے تعبیر کیا ہے۔

قومی زبان اور قومیت

مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے جج جناب جسٹس سجاد احمد جان نے لاہور میں نذرالاسلام اور اقبال کے سلسلے میں ایک جلسے کی صدارتی تقریر میں ارشاد کیا کہ "یہ ہماری بڑی بدقسمتی ہے کہ ابھی تک ہماری قومی زبان کے صحیح مقام کا تعین نہیں ہو سکا کیونکہ قومی زبان کے بغیر قومیت کا تصور تشنہ رہتا ہے۔" انہوں نے کہا بنگلا اور اردو کے مقابلہ میں انگریزی کو اولین اہمیت دینا پست اور غلامانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے۔ جس کے خلاف علامہ اقبال اور نذرالاسلام نے ساری عمر جہاد کیا۔

نذرالاسلام اردو میں

صوبائی اسمبلی مغربی پاکستان کے اسپیکر جناب چودھری محمد انور نے قاضی نذرالاسلام کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ پڑھا لکھا طبقہ اُن کی ادبی اور قومی خدمات سے خوب واقف ہے۔ لیکن مغربی پاکستان کے عوام کو اُن کے کلام سے متعارف کرانے کی ضرورت ہے۔ جناب انور نے اس بات پر زور دیا کہ اُن کی ادبی خدمات اردو میں منتقل کی جانی چاہئیں۔ چودھری محمد انور گورنمنٹ کالج لاہور میں یوم نذرالاسلام کی تقریب کا افتتاح کر رہے تھے۔

عہد نامۂ اردو

جناب محمد رفیق صدر انجمن ترقی اردو کیماڑی کراچی نے ایک عہد نامہ ترتیب دیا ہے اور لوگوں سے اپیل کی ہے وہ اسے حرز جاں بنا لیں۔

لیڈر :- یہ عہد کریں کہ اردو میں سپاسنامے قبول کریں گے۔

وکلا :- یہ عہد کریں کہ عدالت میں بحث وجرح اردو میں کریں گے۔

مجسٹریٹ :- یہ عہد کریں کہ فیصلے اردو میں کریں گے۔

پولیس :- یہ عہد کرے کہ رپورٹ اور روزنامچے اردو میں لکھے جائیں گے۔

موٹر کار والے :- یہ عہد کریں کہ اپنی موٹر نمبر کی تختی اردو میں لکھوائیں گے

عوام :- یہ عہد کریں کہ اردو بولیں گے، اردو لکھیں گے، اردو پڑھیں گے۔

اردو کہاں تک پنجاب یونیورسٹی کے حکام نے یونیورسٹی کے تمام شعبوں اور ملحقہ کالجوں کے سربراہوں سے تفصیل طلب کی ہے کہ طلبہ اور اساتذہ کے لئے اردو ذریعۂ تعلیم کے طریقۂ کار سے کس حد تک استفادہ کیا گیا ہے۔ اس تفصیل طلبی کے بعد یونیورسٹی اس کی افادیت کا جائزہ لے گی اور مستقبل قریب میں اردو ذریعۂ تعلیم کو موثر اور واضح صورت دے گی۔

حیدرآباد بلدیہ میں ۲۱ مئی کو حیدرآباد بلدیہ کا اجلاس کچھ عرصے کے لئے ملتوی کر دیا گیا ہے کیونکہ اس اجلاس میں تخمینہ بجائے اردو کے انگریزی میں پیش کیا گیا تھا۔ اس موقع پر میر رسول بخش تالپور نے تخمینہ اردو کے بجائے انگریزی میں پیش کرنے پر سخت اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ ہم اس بجٹ پر اُس وقت تک بحث کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں جب تک اسے اردو میں پیش نہ کیا جائے اس بات کی پرزور تائید جناب محمد یمین ایڈووکیٹ اور قاضی محمد اعظم ایڈووکیٹ نے کی اور باقی اراکین نے بھی اس پر صاد کیا۔

تعلیمی، تہذیبی، علمی اور ادبی خبریں

فیضی رحیمن کی یاد میں بلدیہ کراچی ڈینسو ہال میں ایک آرٹ گیلری قائم کر رہی ہے۔ جس میں مشہور آرٹسٹ فیضی رحیمن کے نوادر محفوظ کئے جائیں گے۔ آرٹ گیلری کو مرحوم مصور کی شایان شان یادگار بنانے کے لئے بڑے انتظامات کئے جا رہے ہیں۔ نوادر حاصل کرنے کے لئے بیگم عطیہ فیضی سے بات چیت کی جا رہی ہے۔

ایشیا میں کتابوں کی تیاری اور تقسیم اقوام متحدہ کے تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی ادارے (یونیسکو) کے زیر اہتمام ایشیا میں کتابوں کی تیاری اور تقسیم کے موضوع پر ایک اجلاس ٹوکیو میں ایک ہفتے جاری رہنے کے بعد حال ہی میں ختم ہوا ہے۔ اس اجلاس میں ایشیا کے ان بیس ملکوں کے ستر ماہرین تعلیمات جمع ہوئے تھے۔ پاکستان، افغانستان، برما، کمبوڈیا، سیلون، جمہوریہ چین، ہونگ کانگ، بھارت، انڈونیشیا، ایران، اسرائیل، جاپان، جمہوریۂ کوریا، لاؤس، ملائشیا، نیپال، فلپائن، سنگاپور، تھائی لینڈ، اور جمہوریہ ویت نام۔ ان کے علاوہ دوسرے

براعظموں سے مبصرین بھی آئے تھے۔

اجلاس میں سفارش کی گئی کہ ایشیا کے تمام ملکوں میں اشاعت کے کاموں کو فروغ دینے کے لئے ایک پروگرام منظور کیا جائے اور دنیا کے اس حصے میں کتابوں کی مقبولیت کو فروغ دیا جائے۔ اس پروگرام کی نوعیت ایسی ہو کہ ابتدائی تعلیم کو وسعت دینے اور جہالت کا استیصال کرنے کے لئے درسی کتابوں کی تعداد میں اضافہ ہو سکے۔

ماہرین کی رائے کے مطابق کتابوں کی فراہمی ۱۹۸۰ء تک اب سے چار گنی ہو جانی چاہیئے۔ سفارش کی گئی کہ ہر ملک کتابوں کا ایک ترقیاتی منصوبہ مرتب کرے۔ درسی کتابوں کے سرکاری ادارے قائم کرے اور گرافک آرٹ کی انجمنیں بھی بنائے۔

ایشیا میں اشاعتی پروگرام کو فروغ دینے کی خاطر سفارش کی گئی ہے کہ عالمی بینک کم سود والے طویل المدت قرضے دے۔ آسٹریلیا، چیکوسلواکیہ، برطانیہ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے مبصرین نے اشارتاً کہا کہ ہم اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے دو طرفہ امداد کی سفارش اپنے ملکوں سے کریں گے۔ ایران نے وعدہ کیا کہ میں ناخواندگی کے خلاف جدوجہد کرنے کے لئے دس لاکھ کتابیں دوں گا۔

یونیسکو پر زور ڈالا گیا کہ وہ کتابوں پر ڈاک کے اخراجات کی کم شرح اور مطبوعات پر محصول کی کمی کے لئے اصرار کرے اور کتابوں کی وسیع تر تقسیم کو فروغ دینے کی خاطر حقوقِ اشاعت کی منظوری کے لئے برائے نام فیس مقرر کرائے۔

حکومت غیر سرکاری کتب خانوں کی ہر ممکن مدد کرے گی

صوبائی وزیر تعلیم ملک خدا بخش بچہ نے ۷ر جون کو باغ جناح لاہور میں دارالسلام لائبریری کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا کہ حکومت ان فلاحی اداروں اور مخیر حضرات کی ہر ممکن خدمت کرے گی جو عوام کے فائدے کے لئے کتب خانے قائم کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔

وزیر تعلیم نے فرمایا کہ علم کی اشاعت میں کتب خانے اہم کردار ادا کرتے ہیں خاص طور پر ترقی پذیر ملکوں میں ان کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔

دارالسلام لائبریری کرنل سلامت اللہ نے ایک بڑی رقم صرف کر کے قائم کی ہے۔ وزیر تعلیم نے کرنل صاحب کے اس اقدام کو سراہتے ہوئے فرمایا کہ دوسرے صاحب ثروت لوگوں کو بھی عوام کی بھلائی کے لئے ایسے ہی کام کرنے چاہئیں۔

مسلمانوں کے ادبیات کی تاریخ

۱۲، ۱۳ر جون کو لاہور میں برصغیر ہند و پاکستان کے مسلمانوں

کی ادبی تاریخ کے شعبۂ اردو کی مشاورتی کمیٹی کے چار اجلاس پروفیسر حمید احمد خاں کی صدارت میں منعقد ہوئے مجوزہ تاریخ ادب کی تیسری، چوتھی اور پانچویں جلدیں اردو ادب سے متعلق ہوں گی۔ ان اجلاسوں میں ان تینوں جلدوں کی حدود کا تعین کیا گیا اور موضوعات کی تقسیم کی گئی۔ ان جلدوں کے ابواب ہندو پاکستان کے معروف اہل قلم حضرات سے لکھوائے جائیں گے۔ مشاورتی کمیٹی میں ملک کے ممتاز محققین مولانا غلام رسول مہر، پیر حسام الدین راشدی، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر محمد باقر، سید فیاض محمود اور ڈاکٹر محمد صادق نے شرکت کی۔ کراچی، پشاور اور پنجاب کی یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے اردو کے صدور نے بھی مشاورتی کمیٹی کے اجلاسوں میں حصہ لیا۔

پروفیسر اقتدا حسن کا اعزاز

ڈاکٹر اقتدا حسن کو جو اٹلی میں علوم شرقیہ کی سب سے بڑی درس گاہ دانش گاہ علوم شرقیہ، نیپلز، میں شعبۂ اردو و ہندی کے پروفیسر ہیں، اطالوی و جرمن وغیرہ نظام ہائے تعلیم کی سب سے اعلیٰ ڈگری دوت سینت (DOZENT) روم سے عطا کی گئی ہے۔ یہ ڈگری ڈی۔ لٹ۔ کے مساوی ہے اور حکومت کے مقرر کردہ پانچ پروفیسروں کے ایک کمیشن کی سفارش پر عطا کی جاتی ہے۔ پروفیسر اقتدا حسن ہند و پاک کے پہلے اسکالر ہیں۔ جنہوں نے یہ اعزاز حاصل کیا ہے۔

کلیات قائم (دو جلدیں، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور) مرتب کرنے کے علاوہ موصوف کی چند انگریزی تصانیف یورپ سے شائع ہو چکی ہیں۔ آج کل وہ کلیات جرات اور تذکرۂ شاہ کمال مرتب کر رہے ہیں۔ سخندان اردو انگریزی زیر تالیف ہے اور تذکرۂ حیدری اور تذکرۂ قایم زیر طبع ہیں۔

دائرہ معارف اسلامیہ

پنجاب یونیورسٹی نے اردو دائرہ معارف اسلامیہ کی جلد دوم کا تیرھواں کراسہ شائع کیا ہے۔ جس میں "الاسود کعب العنسی سے اصطخر" تک کے مقالات شامل ہیں، جن میں بعض مقالات تاریخی، جغرافیائی اور مذہبی اعتبار سے نہایت اہم اور دلچسپ ہیں۔ ان میں کچھ طبعزاد بھی ہیں۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ کی اب تک دو جلدیں (چوتھی اور پہلی) اور دوسری جلد کے تیرہ کراسے شائع ہو چکے ہیں۔ چودھواں کراسہ پریس میں ہے اور عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ ہر کراسہ پانچ روپے میں پنجاب یونیورسٹی سیلز ڈپو سے دستیاب ہو سکتا ہے۔

اکبر نامے کا قلمی نسخہ

برٹش میوزیم نے برصغیر کا ایک خوبصورت قلمی نسخہ حاصل کر لیا ہے۔ جسے ایک ماہر نے جنگ کے بعد حاصل ہونے والا ہے سب سے اچھا ہندوستانی نسخہ کہا ہے یہ قلمی نسخہ اکبر نامے کی ایک جلد ہے جس کا مصنف فیضی تھا۔ اس کے کاتب مولانا محمد کشمیری ہیں جو زرّیں رقم کے

خطاب سے مشہور تھے۔ ۵۰ نفیس تصاویر پر مشتمل یہ جلد ان تین جلدوں میں سے ایک ہے جن میں سے دو جلدیں ڈبلن کی نوادر گاہ میں محفوظ ہیں۔ اس کی تصاویر مغلیہ دربار کے مصوروں کی تخلیق ہیں اور ان پر ایرانی اثرات غالب ہیں۔

ادیبوں کے لئے زمین ادارہ مصنفین پاکستان کے ہنگامی اجلاس میں ایک کمیٹی کی تشکیل کی گئی ہے جو ادیبوں کے لئے رہائشی قطعات کے حصول میں حکومت اور اراکین کی مدد کرے گی۔ ادارے کی طرف سے اس کمیٹی کو زمین کے حصول سے متعلق جملہ معاملات سرانجام دینے کا اختیار دے دیا گیا ہے۔

ذہنی اور اخلاقی زوال ہندوستان میں ذہنی اور اخلاقی زوال کی انتہا کا ثبوت اس واقعے سے ملتا ہے کہ وہاں کے ایک مورخ ڈاکٹر پی۔ این۔ ر۔ د۔ ر۔ نے اپنی تحقیق کے ذریعے مغل شہنشاہ شاہ جہاں کی بنوائی ہوئی بے مثال عمارت تاج محل کو ایک راجپوت کا محل قرار دے دیا ہے۔ یہ خوشخبری بھارتی پارلیمنٹ تک کو سنائی گئی ہے اور اس ذہنیت کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ امریکی سوسائٹی برائے قدیم تاریخ و مشرقی تعلیمات کے صدر ڈاکٹر ایم فلیگ میٹر نے بھی اس کی تصدیق کر دی ہے۔ شاید یہ بھی بھارت اور امریکہ کے باہمی تعلقات کو بہتر سے بہتر بنانے کی ایک کوشش ہے۔

وادیٔ سندھ تہذیبوں کا گہوارہ سانگھڑ میں زرعی و صنعتی نمائش میں آٹھویں صدی عیسوی کے مشہور شہر منصورہ کے نوادر کی نمائش کی گئی۔ جو حالیہ کھدائی میں دستیاب ہوئے ہیں۔ منصورہ قدیم زمانے میں برہمن آباد کہلاتا تھا۔ اور سندھ کا دارالحکومت تھا۔ محمد بن قاسم کے حملے کے وقت بھی وہ سندھ کا سب سے اہم شہر تھا۔ امید کی جارہی ہے کہ منصورہ کی کھدائی کا کام آئندہ سال تک مکمل ہو جائے گا۔

سانحۂ کربلا کا اثر اردو ادب پر بی این آر لاہور میں لٹریری لیگ کی طرف سے ایک مجلس مذاکرہ میں جسٹس سجاد احمد جان نے فرمایا ہے " سانحۂ کربلا نے اردو ادب کو جتنی جلا بخشی ہے اتنا کسی واقعے نے کسی زبان یا ادب پر کوئی اثر نہیں دکھایا اگر یہ کہا جائے کہ اردو زبان اسی سانحے کی مرہون منت ہے تو مبالغہ نہ ہوگا " مجلس مذاکرہ میں جناب جسٹس جمیل حسین رضوی، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، آغا شورش کاشمیری اور جناب ملک اسلم حیات نے حصہ لیا۔

اقبال کالج کی تجویز سیالکوٹ میونسپل کمیٹی کے وائس چیرمین ڈاکٹر بشیر احمد خاں کی قیادت میں شہریوں کے ایک وفد نے صوبائی وزیر تعلیم سے ملاقات کی اور علامہ اقبال کے نام پر ایک کالج قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔ وزیر تعلیم نے وفد کو یقین دلایا کہ میونسپل کمیٹی تعمیری نقطۂ نظر اختیار کر کے

اور سائنسی علوم کا کالج قائم کرے گی تو حکومت اس پر غور کرے گی اور اس کالج کا نام علامہ اقبال کے نام پر ہوگا۔

خواتین یونیورسٹی کا مطالبہ صوبائی اسمبلی کے حالیہ اجلاس میں سید منور حسن صاحب نے حکومت سے درخواست کی ہے کہ لاہور میں خواتین کی ایک یونیورسٹی کا قیام جلد سے جلد عمل میں لایا جائے حکومت کا یہ انقلابی اقدام عورتوں میں تعلیم کا شوق پیدا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوگا اور ہر مکتبۂ فکر کے لوگ اس کی حمایت کریں گے۔

یونیسکو کی رپورٹ اقوام متحدہ کے تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی ادارے کی سالانہ روداد شائع ہوگئی ہے اس میں تعلیمی اور ثقافتی امور کے بارے میں جو لکھا گیا ہے اس کا خلاصہ درج تحریر ہے
۱۹۶۰ء میں ساری دنیا کی آبادی میں سے تینتالیس کروڑ تئیس لاکھ شاگرد تمام اقسام کے تعلیمی اداروں میں داخل تھے اس کے علاوہ ایک کروڑ ستر لاکھ بچے مدارس میں داخل ہونے سے پہلے کی تعلیم اور بیس لاکھ طلبہ خصوصی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ دنیا میں پانچ اور انیس سال کے درمیان عمر کے جو بچے موجود ہیں، ان میں سے پینتالیس فی صد ایسے تھے جو پہلی یا دوسری منزل میں داخل تھے۔ پانچ سے چودہ سال عمر کی آبادی میں سے تقریباً باون فی صد کو پہلی منزل میں داخلہ ملا ہوا تھا اسی طرح پندرہ سے انیس سال عمر کی عالمی آبادی میں سے تقریباً تیس فی صد تعلیم کی دوسری منزل میں داخل تھے۔

مذکورہ بالا تینتالیس کروڑ تئیس لاکھ کی آبادی میں سے تقریباً اناسی فی صد تعلیم کی پہلی منزل میں، اٹھارہ فی صد دوسری منزل میں اور باقی تین فی صد تیسری منزل میں تھے۔

رپورٹ میں تعلیمی اداروں کے بارے میں جو نقشہ شریکِ اشاعت کیا گیا ہے، اس میں مدرسوں اور استادوں کی تعداد اور داخل ہونے والے طلبہ کی تعداد قریب ترین سالوں کے بارے میں درج کی گئی ہے۔ پڑھانے والی استانیوں اور طالبات کی تعداد علیحدہ نقشے میں دکھائی گئی ہے۔ تعلیم کی نوعیت کے اعتبار سے ان مدرسے میں داخلے سے پہلے (نرسری، مدارسِ اطفال اور کنڈر گارٹن) ابتدائی (تمہید اور ابتدائی) ثانوی (مڈل اسکول، ثانوی اور اعلیٰ اسکول) فنی (ثانوی پیشہ ورانہ تعلیم) اساتذہ کی تربیت (ثانوی اساتذہ کی تربیت والے مدرسے اور نصابات) اعلیٰ تعلیم (یونیورسٹیاں اور ما بعد الثانی پیشہ ورانہ مدارس) اور خصوصی (معذوروں، آوارہ، بے گھرے اور متروکہ) بچوں سے متعلق ادارے بھی الگ درج ہیں۔

کتابوں کی تیاری اشاعت کے اعتبار سے ۱۹۶۴ء میں سب سے زیادہ کتابیں روس میں تیار ہوئیں جن کی تعداد اکہتر ہزار دو سو چار تھی۔ اس کے بعد ریاست ہائے متحدہ میں اٹھائیس ہزار

چار سو اکیاون، برطانیہ میں چھتیس ہزار ایک سو تیئیس، وفاقی جمہوریہ، جرمنی میں پچیس ہزار دو سو چار، جاپان میں چوبیس ہزار انچاس، اسپین میں پندرہ ہزار چار سو چالیس اور فرانس میں تیرہ ہزار چار سو اناسی عنوانات سے شائع ہوئیں۔

روس نے ادبی موضوعات پر زیادہ کتابیں چھاپیں۔ ان کی تعداد آٹھ ہزار سات سو پینسٹھ تھی۔ کسی اور ملک نے اتنی نہیں چھاپیں۔ اس کے بعد اسی موضوع پر برطانیہ نے سات ہزار تین سو اڑتالیس، ریاست ہائے متحدہ نے سات ہزار تین سو پچیس، جاپان نے چھ ہزار آٹھ سو چھہتر، وفاقی جمہوریہ جرمنی نے پانچ ہزار آٹھ سو چونسٹھ اور اسپین نے چار ہزار تین سو چھبیس چھاپیں۔

عملی سائنس کے موضوعات پر بھی کتابیں روس میں سب سے زیادہ شائع ہوئیں۔ جن کی تعداد چونتیس ہزار نو سو ننانوے تھی۔ اس کے بعد برطانیہ میں چار ہزار تین سو چھبیس، ریاست ہائے متحدہ میں تین ہزار پانچ سو اکیاسی، جاپان میں تین ہزار چار سو اڑتالیس، پولینڈ میں تین ہزار تریسٹھ، چیکوسلواکیہ میں دو ہزار چار سو سرسٹھ، رومانیہ میں دو ہزار دو سو چھہتر اور وفاقی جمہوریہ جرمنی میں دو ہزار اکیانوے چھپیں۔

دوسرے ملکوں کے مقابلے میں ریاست ہائے متحدہ میں فلسفہ و مذہب کے موضوعات پر سب سے زیادہ کتابیں شائع ہوئیں۔

کتابوں کے ترجمے رپورٹ میں ایک ایسی جدول شریک اوراق کی گئی ہے جس میں اکیاون ملکوں میں شائع ہونے والے تراجم کے عنوان درج کئے گئے ہیں۔ ان ترجموں کو اصل زبانوں اور موضوعات کے اعتبار سے تقسیم کیا گیا ہے۔ اس پر نظر ڈالنے سے پتا چلتا ہے کہ ۶۳ ۱۹ء میں ان ملکوں نے مجموعی طور پر پینتیس ہزار دو سو چوبیس ترجمے شائع کئے جب کہ ۱۹۶۲ء میں ان کی تعداد بتیس ہزار سات سو چھہتر تھی۔ ان میں سے سینتیس فی صد انگریزی سے، تقریباً چودہ فی صد روسی سے۔ ساڑھے بارہ فی صد فرانسیسی سے اور ساڑھے نو فی صد جرمن زبان سے ترجمے ہوئے تھے۔ ۱۹۶۳ء میں جتنے بھی ترجمے شائع ہوئے تھے۔ ان میں سے تقریباً ستاون فی صد ادب و فنون (لسانیات، فنون اور ادبیات) کے موضوع پر، انتیس فی صد معاشرتی علوم (فلسفہ اور مذہب سمیت) اور باقی خالص طبعی اور عملی علوم پر تھے۔ سب سے زیادہ تعداد میں ترجمے روس نے شائع کئے۔ وہاں ان کی تعداد چار ہزار تین سو چھپن تھی۔

روزانہ اخبارات آبادی کو ذہن میں رکھ کر سوچا جائے تو پتا چلے گا کہ اخبارات کی سب سے زیادہ

روزانہ اشاعت برطانیہ میں تھی۔ وہاں ۱۹۶۴ء میں ہر ایک ہزار آدمیوں کے لئے پانچ سو تئیس کاپیاں شائع ہوئیں۔ اس کے بعد ۱۹۶۳ء یا ۱۹۶۴ء میں ہر ایک ہزار اشخاص کی آبادی پر اخبارات کی جتنی کاپیاں چھپیں، ان کی تعداد یہ ہے :- سویڈن میں پانچ سو پانچ، جاپان میں چار سو انتالیس، آئس لینڈ میں چار سو تئیس، لکسمبرگ میں چار سو پچیس، نیوزی لینڈ میں تین سو ننانوے، ناروے میں تین سو ستاسی، سوئٹزرلینڈ میں تین سو پینسٹھ، آسٹریلیا میں تین سو اڑتالیس، ڈنمارک میں تین سو چوالیس، وفاقی جمہوریہ جرمنی میں تین سو تئیس، اور ریاست ہائے متحدہ میں تین سو چودہ۔

رپورٹ میں لکھا ہے کہ ان اعداد و شمار میں جن روزناموں کا ذکر ہے، وہ ضخامت کے اعتبار سے مختلف النوع ہیں یعنی ایک ورق سے لے کر پچاس یا اس سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے۔ مثال ریاست ہائے متحدہ سے ملتی ہے۔

اخباری کاغذ - پیداوار اور خرچ

سرزمین کو چھوڑ کر ساری دنیا میں اخباری کاغذ ۱۹۶۴ء میں جتنا تیار ہوا، اس کی مقدار ایک کروڑ اٹھاون لاکھ ٹن تھی یعنی ۱۹۶۳ء کے مقابلے میں تقریباً آٹھ فی صد اور ۱۹۵۸ء کے مقابلے میں تینتیس فی صد زیادہ تھی۔ کل عالمی پیداوار میں سے کنیڈا کا حصہ بیالیس فی صد، ریاست ہائے متحدہ کا بارہ فی صد، جاپان اور فن لینڈ کا سات سات فی صد برطانیہ کا پانچ فی صد اور سویڈن اور روس کا چار چار فی صد تھا۔

اخباری کاغذ سب سے زیادہ ریاست ہائے متحدہ میں صرف ہوا۔ وہاں ۱۹۶۴ء میں اس کے استعمال کی مقدار بہتر لاکھ چھہتر ہزار میٹرک ٹن تھی۔ یعنی سرزمین چین کو چھوڑ کر ساری دنیا کی مقدار میں سے اس کا حصہ چھیالیس فی صد تھا۔ اس کے بعد زیادہ اخباری کاغذ خرچ کرنے والے ملکوں میں برطانیہ، جاپان، وفاقی جمہوریہ جرمنی، روس، فرانس، کنیڈا، اٹلی اور آسٹریلیا آتے ہیں۔

اخباری کاغذ کے فی کس خرچ کا اندازہ لگایا جائے تو سب سے زیادہ مقدار ریاست ہائے متحدہ میں تھی۔ وہاں اوسط اڑتیس کلوگرام ہے۔ اس کے بعد آسٹریلیا میں اکتیس، سویڈن میں تیس اور برطانیہ، ڈنمارک اور نیوزی لینڈ میں سے ہر ایک میں چھبیس کلوگرام صرف ہوا۔

جن ملکوں میں اخباری کاغذ کا فی کس خرچ سب سے کم ہے، ان میں سے ہائٹی اور شام میں سے ہر ایک میں ۰ء۱ کلوگرام، بھارت، اردن اور کینیا میں سے ہر ایک میں ۰ء۳ اور برما میں ۰ء۴ کلوگرام ہے۔

آئینہ خانے میں

جسٹس فاروقی کی تقریر مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے جج جناب جسٹس اے ایس فاروقی نے کراچی

گرامر اسکول میں یوم اقبال کی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے کہا "جن درسگاہوں میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہو وہاں کے بچے اگر اپنے ثقافتی سرمائے سے واقف نہ ہوں تو یہ ہماری کوتاہی ہے" انہوں نے نئی نسل کو خبردار کیا ہے کہ اگر انہوں نے سچ کو سچ کہنے اور جھوٹ کو جھوٹ کہنے کی جرات پیدا نہیں کی تو اس کا مستقبل تابناک نہیں ہو سکے گا۔

نذر الاسلام کی سالگرہ ۲۵ مئی کو بنگلا کے عظیم اور مشہور شاعر جناب قاضی نذر الاسلام کی ۷۰ ویں سالگرہ منائی گئی۔ بنگال میں جگہ جگہ جلسے ہوئے جن میں اُن کی شاعری پر مقالے پڑھے گئے اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی۔ مغربی پاکستان میں بھی لاہور، پنڈی اور کراچی میں یوم نذر الاسلام منایا گیا۔

یادوں کے چراغ

شاہ بھٹائی کی برسی بھٹ شاہ میں ۶ جون کو سندھ کے مشہور صوفی اور شاعر جناب شاہ عبدالطیف بھٹائی کی برسی بہت عقیدت سے منائی گئی۔ جس میں سندھ کے ہر گوشے سے عقیدت مند جمع ہوئے اور ایک ادبی تقریب میں ان کے کلام کی عظمت اور انسانیت دوستی کو خراج تحسین پیش کیا گیا۔

مولانا حامد حسن قادری کی برسی اردو کے مشہور ادیب اور محقق جناب مولانا حامد حسن قادری کی دوسری برسی ۷ جون کو کراچی میں منائی گئی۔ قادری اکاڈمی کی جانب سے اس موقع پر فاتحہ خوانی اور وعظ کا اہتمام بھی کیا گیا۔ مولانا کی یاد میں ایک ادبی تقریب۔ ادارۂ مصنفین پاکستان ترقی اردو بورڈ اور انجمن ترقی اردو کی طرف سے آئندہ ماہ ہوگی۔

مولانا صلاح الدین کی یاد میں پاکستان کے مایہ ناز صحافی ادیب اور اردو تحریک کے رہنما اور محسن جناب مولانا صلاح الدین کی دوسری برسی لاہور میں منعقد ہوئی۔ جس میں مرحوم کی شخصیت، ادب اور خدمات اردو کو زبردست خراج تحسین پیش کیا گیا۔ اس موقع پر اخبارات میں خصوصی مقالے میں شائع کئے گئے۔

واشنگٹن میں یوم اقبال یوم اقبال کے ضمن میں ایک تقریب کے لئے واشنگٹن ڈی سی پاکستانی سفارتخانے کی عمارت موزوں ترین جگہ تھی۔ یہاں گزشتہ ۲۱ اپریل کو، دنیا کے مختلف ملکوں سے تعلق رکھنے والے سفارتی نمایندے اہل علم حضرات، اور ادیب پاکستان کے قومی شاعر کی ۲۸ ویں برسی میں

شرکت کی غرض سے جمع ہوئے تھے۔ امریکہ کے دارالحکومت میں ہر سال "اقبال سوسائٹی" نامی ایک امریکی انجمن کے زیر اہتمام "یوم اقبال" منایا جاتا ہے۔ یہ انجمن اقبال کے کلام کو امریکہ میں زیادہ سے زیادہ مقبول بنانے کے لئے قائم کی گئی ہے۔

واشنگٹن میں یوم اقبال کی تقریب سے متعلق سب سے اہم بات یہ تھی کہ سفیر غلام احمد نے پاکستان کی اقبال اکیڈمی کے قائم کردہ ایک ہزار ڈالر کے سالانہ وظیفے کا اعلان کیا۔ یہ وظیفہ امریکہ میں اس شخص کو دیا جائے گا جو شاعر و فلسفی اقبال کے کلام کا مطالعہ کرکے بہترین تحریر یا مقالہ پیش کرے گا۔

اقبال سوسائٹی کے صدر لوائے۔ ہنڈرسن نے جو جلسے کی صدارت کر رہے تھے۔ اقبال کی شاعری کی قوت اور اثر انگیزی اور بیسویں صدی کے فلسفی انداز فکر کے تسلسل پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا " اقبال نے تمام بنی نوع انسان کو رنگ و نسل، مذہب و ثقافت اور ملک و عقائد کی تمیز کے بغیر جذبۂ اخوت سے کام لینے اور بھائی چارگی کی تلقین کرنے کا جو پیغام انتہائی موثر انداز میں دیا ہے اس نے ہر جگہ بہت سے ارباب فکر کے ضمیر کو بیدار کیا ہے"۔

"یوم اقبال" کی تقریب میں تقریر کرنے والوں میں ایک ممتاز شخصیت مانٹریال (کناڈا) کی میک گل یونیورسٹی کی ڈاکٹر شیلا میکڈونو تھیں جنہوں نے اقبال کی فلسفیانہ شاعری پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر شیلا میکڈونو یونیورسٹی کے شعبۂ مذاہب میں مددگار پروفیسر ہیں۔

اس کے بعد حاضرین جلسہ کو ڈاکٹر ولیم سی کلارک نے جو لاہور میں امریکی ثقافتی امور کے افسر رہ چکے ہیں اقبال کی نظمیں سنائیں۔ شہر لاہور کو اقبال سے ایک خاص تعلق رہا ہے۔ یہی وہ شہر ہے جہاں اقبال نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گزارا تھا اور یہیں وہ اپنے کمال عروج کو پہنچے۔ یہی وہ شہر ہے جہاں شاعر اسلام بادشاہی مسجد کے سامنے مقبرے میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ بادشاہی مسجد لاہور کے تاریخی شہر میں اسلامی عظمت کی ایک نمایاں یادگار ہے۔

یوم راس مسعود

اتوار، ۲۹ مئی ۱۹۶۶ء کو راس مسعود ایجوکیشن اینڈ کلچر سوسائٹی آف پاکستان کی طرف سے احاطہ اورنگی ہلز اسکول نارتھ ناظم آباد میں "یوم راس مسعود" منایا گیا۔ صبح کے اجلاس کی صدارت جناب ممتاز حسن منیجنگ ڈائریکٹر نیشنل بنک آف پاکستان نے کی، پہلے سید راس مسعود مرحوم پر علامہ اقبال کا مرثیہ پڑھا گیا، پھر اس موقع پر مشاہیر کے پیغامات سنائے گئے۔

اس کے بعد جناب ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی، صدر شعبۂ اردو کراچی یونیورسٹی جناب شاہ حسن عطا اور سید الطاف علی بریلوی سکریٹری آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس نے مسعود مرحوم کی زندگی اور تعلیم، خاندانی نیز ان کی شخصیت و میت کے مختلف پہلوؤں پر تقریریں کیں۔

خازن سوسائٹی جناب منظور حسین بیرسٹر ایٹ لا۔ نے سوسائٹی کی رپورٹ پیش کی اور معطیان، خصوصاً جناب ممتاز حسن و جناب رشید حبیب (حبیب بنک) کا شکریہ ادا کیا۔ صدر جلسہ جناب ممتاز حسن نے فرمایا کہ زوالِ سلطنت مغلیہ کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیمی و ثقافتی بیداری سرسید اعظم کی کوششوں کی رہین منت ہے۔ اور تعلیمی میدان میں اُن کی صحیح جانشینی کا حق، سید محمود نے نہیں بلکہ سید راس مسعود نے ادا کیا۔ جنہوں نے ساری زندگی اپنے دل و دماغ کی بہترین صلاحیتیں اس قومی کام پر صرف کیں۔

موصوف نے کارکنانِ راس مسعود سوسائٹی کو مسعود مرحوم کی تعلیمی و ثقافتی یادگار قائم کرنے پر مبارکباد دی اور راس مسعود لائبریری اور خاندان سرسید کے ثقافتی نوادر کی ایک نمائش کا افتتاح کیا۔

اس تقریب کے سلسلے میں کراچی کے متعدد علمی اداروں اور ناشروں نے تقریباً دو سو کتابیں لائبریری کو ہدیۃً پیش کیں اور جناب ڈاکٹر احسان رشید، صدر شعبۂ اقتصادیات کراچی یونیورسٹی اور جناب سید انور مسعود نارائن گنج (مشرقی پاکستان) نے ایک ایک ہزار روپے کی نقد رقم عطا کی کمشنر کراچی جناب سید دربار علی شاہ نے پانچ سو روپیہ عنایت کئے۔

نمائش نوادر کی کم و بیش ستر بیش قیمت اشیا میں سے حسب ذیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

(۱) سرسید کا ایک غیر مطبوعہ خط بنام نواب وقار الملک[1] (۲) سرسید کا کرتہ (۳) سرسید کی ٹائم پیس (۴) سرسید کی تین قلمی کتابیں (کلام پاک، دیوان حافظ، مجموعۂ وظائف) جو انہوں نے راس مسعود کی ولادت پر نومولود کے نام ہبہ کردی تھیں مع ہبہ نامہ دستخط و مہر سرسید (۵) سرسید کا شجرہ از اولاد ابراہیم تا حالیہ ارکان خاندان (قلمی) (۶) خلعت شاہی عطا کردہ بہادر شاہ بہ سید علی متقی پدر بزرگوار سرسید (۷) سید محمود کی انگریزی نظموں کا مجموعہ (قلمی، تحریر سید محمود) (۸) سید راس مسعود کی ڈائری سفر جاپان (قلمی انگریزی، پانچ جلد، تحریر مسعود مرحوم) (۹) سید راس مسعود کی انگریزی نظموں کا مجموعہ (قلمی، تحریر راس مسعود)۔

اس موقع پر سوسائٹی کے شعبۂ راس مسعود اکادمی نے "مرقع مسعود" نامی ایک مصور یادگار کتاب شائع کی جس میں مسعود کے بارے میں اردو اور انگریزی زبان کے نامور ملکی اور غیر ملکی اہل قلم کے لکھے ہوئے مضامین یکجا کر دیئے گئے ہیں۔ ایک نایاب مضمون اس مجموعے میں سرسید احمد خاں کی وہ تقریر ہے جو انہوں نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشن کانفرنس منعقدہ ۱۸۹۳ء میں راس مسعود مرحوم کی رسم بسم اللہ کے موقع پر کی تھی اور جو ان کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔

---

[1] یہ خط انجمن کے سہ ماہی رسالے "اردو" بابت جولائی ۶۶ء میں شائع کیا جا رہا ہے

شام کے اجلاس میں سوسائٹی کے اورنگی ہلز اسکول کا سالانہ جلسہ و تقریب رسم انعامات کا انعقاد ہوا۔ جس کی صدارت جناب ایس ایس جعفری نائب صدر محکمۂ ترقی سرمایہ کاری و رسد نے فرمائی۔ موصوف نے بیگم قدوائی پرنسپل سے مسعود مرحوم کی یاد میں سوسائٹی کے قائم کردہ اسکول اور اس کی ترقی کی روئیداد سننے کے بعد متعلقہ اصحاب کو مبارک باد دی اور سوسائٹی کے تعلیمی و ثقافتی کاموں میں ہر قسم کی امداد بہم پہنچانے کا وعدہ فرمایا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ پاکستان کا قیام نتیجہ ہے علی گڑھ تحریک کا۔ جس کی پیشوائی سرسید احمد خاں نے کی۔ مگر اس کی آبیاری میں علاوہ دیگر سربرآوردہ قومی کارکنوں کے راس مسعود مرحوم کا خصوصاً علی گڑھ کے ایک خاص زوال آمادہ دور میں بیش از بیش حصہ تھا۔ اگر ۱۹۲۹ء - ۱۹۳۴ء کے زمانے میں جب کہ مخالف طاقتوں اور حریفوں نے علی گڑھ پر غلبہ پا لیا تھا۔ راس مسعود حالات کو نہ سنبھالتے تو یہ کہنا مشکل ہے کہ علی گڑھ پاکستان کے قیام میں وہ حصہ لے سکتا جو اس نے لیا۔

ماتم میں ہم شریک

کراچی کی مختلف تنظیموں اور ممتاز شخصیات کی جانب سے اردو کے صاحب طرز ادیب، انشا پرداز اور نقاد علامہ نیاز فتحپوری کی وفات پر نہایت رنج و افسوس کا اظہار کیا گیا۔ متعدد جگہ علمی اور ادبی اداروں میں تعزیتی جلسے ہوئے اور ان میں اہم ادبی اور تہذیبی شخصیتوں نے علامہ کی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا رسائل اور اخبارات میں خصوصی مقالے شائع ہوئے۔ علامہ نیاز فتح پوری کا انتقال پرملال ۲۴ مئی کو کراچی میں ہوا۔

مولانا سید محمد نصیر موسوی کی رحلت

نصیر الملت مولانا محمد نصیر موسوی نے ۷۰ سال کی عمر میں لکھنؤ میں ۱۱ مئی کو رحلت فرمائی۔ مولانا نصیر عربی ادب کے بہت بڑے عالم تھے اور گزشتہ ۱۸ سال سے صوبائی قانون ساز کونسل کے رکن تھے۔ وہ متعدد دینی کتابوں کے مصنف تھے انہوں نے شیعہ فقہ کی بڑی خدمت انجام دی تھیں۔

○

نرملے رام جوہر

شرر کے تاریخی انشائیے

مولوی عبدالحلیم شرر کا محبوب ترین موضوع "تاریخ" ہے یہی وجہ ہے کہ اُن کی ہر تخلیق بلا واسطہ یا بالواسطہ تاریخ سے منسلک نظر آتی ہے دوسرے لفظوں میں یہ تاریخیت اُن کے مزاج میں اس حد تک رچ بس گئی ہے کہ اُن کی تحریر کا ہر فقرہ تاریخ کے رنگ میں رنگا ہوا نظر آتا ہے۔ تفریحی ادب کو اگر اُن کے قلم نے ناولوں کا حسین تحفہ دیا ہے تو اُن کے علمی وادبی شعور نے ادب کو تاریخی انشائیوں سے سرفراز کیا ہے یہ اور بات ہے کہ ادب داں طبقے نے تاریخی ناولوں کی عارضی چمک کے سامنے انشائیوں کے دائمی حسن کو کوئی اہمیت نہ دی جبکہ یہی انشائیے شرر کی تاریخ بینی کے شاہد ہیں۔ ان کے ذہن پر اگر تاریخ چھائی ہوئی تھی تو ان کے دل پر مورخین کی عظمت کا نقش بھی بیٹھ چکا تھا اور شاید اسی لئے وہ ان کو "دائمی زندگی کی شہ نشین پر بیٹھنے والے"[1] اور "آبِ حیات کے ساقی"[2] کہتے ہیں۔

شرر کے ان تاریخی مضامین میں فن اور خیال دونوں عروج پر نظر آتے ہیں جس کی بنا پر مضامین میں محاسن کے سامنے معائب ماند پڑ گئے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شرر کے قلم کی شگفتگی ہر عیب کو حسن بنا دیتی ہے پھر بھی ایک نقاد کی نظر ان معائب تک پہنچ ہی جاتی ہے جن کا ذکر ذیل کی سطور میں کیا جاتا ہے۔

تاریخی مضامین میں واقعات کے متعلق تین قسم کی غلطیاں پائی جاتی ہیں ۱۔کسی روایت یا واقعے کو حقیقت سمجھ کر قلبند کر لینا۔ ۲۔مضمون میں تسلسل قائم رکھنے کے لیے عجلت میں کوئی غلط بات کہہ دینا۔ ۳۔ رنگینیٔ بیان اور دلکشی و دلچسپی کے لیے جھوٹے واقعات گھڑ لینا۔

شرر کے یہاں پہلی قسم کی غلطی پائی جاتی ہے۔ دوسرے اور تیسرے نمبر کی غلطیاں آبِ حیات کے صفحات پر نظر آتی ہیں جن سے بحث مقصود نہیں۔ شرر کی اس لغزش کو اگر تنقیدی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کے یہاں یہ لغزش غیر شعوری رنگ کی حامل ہے کیونکہ موصوف نے تاریخ کا مطالعہ تو کیا لیکن اُس

---

[1] مضامین شرر، جلد اول حصہ اول طبع اول ص ۳۰۔ [2] ایضاً

مطالعہ کو درایت کی کسوٹی پر نہیں پرکھا اور اسی لیے ان کے مضامین میں مستند تاریخی واقعات کے ساتھ ساتھ غیر مستند، دور از قیاس اور محیر العقول قسم کے واقعات بھی جگہ پاگئے ہیں جن کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بسیار نویسی اور زود نویسی نے اتنی مہلت ہی نہ دی کہ وہ ہر واقعے کو محققانہ نظر سے دیکھیں پروفیسر حبیب اللہ غضنفر لکھتے ہیں :-

"زیادہ نویس اور زود نویس ہونے کی وجہ سے واقعاتِ تاریخی کی چھان بین کی طرف پوری توجہ نہیں رہ سکتے۔"[1]

تاریخی واقعات کی اسی سطحیت اور غیر تحقیق شدہ مواد کے لیے ڈاکٹر سید شاہ علی یوں لکھتے ہیں :-

"بعض جگہ شرر نے تاریخ کے معاملے میں بے احتیاطی برتی ہے۔ اور اپنے آپ کو محض مستند حالات تک محدود نہیں رکھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تحقیق و تنقیح اور روایت و درایت کے اصولوں کو انھوں نے قریب میں پھٹکنے ہی نہیں دیا۔ اور بیانات و روایات کا رد و قبول قاری کے انتخاب اور فیصلے پر چھوڑتے گئے ہیں۔"

بعض اوقات اخباری تجارت کو پیش نظر رکھ کر بھی موصوف نے ایسے محیر العقول قسم کے واقعات تحریر کر دیے ہیں جن کو بیسویں صدی کا ذہن قبول کرنے سے قاصر ہے مثلاً رات کا ایک ساعت کے برابر ہونا، جنوں کی لڑائی اور جنگ کے واقعات میں ہیرو کے غیر معمولی شجاعانہ کارنامے وغیرہ۔ ان واقعات سے بقول ڈاکٹر سید شاہ علی "دیگر باتوں کی صداقت بھی معرض شک میں پڑ جاتی ہے۔"[2] ایسے واقعات نہ صرف تاریخی صداقت سے عاری ہوتے ہیں بلکہ بعض اوقات ان میں مزاحیہ عنصر بھی پایا جاتا ہے جس کی بنا پر یہ تاریخی واقعات تو نہیں رہتے البتہ لطیفے ضرور بن جاتے ہیں۔ اسی قسم کا ایک واقعہ شرر کے لفظوں میں یوں درج ہے :-

"بعض بانکوں کے واقعات میں مشہور ہے کہ لڑائی کے بعد زخمی حریف کو اس کے گھر تک پہنچانے گئے اور وہاں سے چلے تو حریف دوست نے کہا "تو کیا آپ تنہا جائیں گے؟ یہ نہیں ہو سکتا" وہ انھیں ان کے گھر تک پہنچانے کو آیا۔ اور جب وہ پہنچا کے چلا تو اخلاقاً پھر اس کے ساتھ ہو لیے۔ اسی اخلاق میں صبح ہو گئی کہ جب یہ آخر اس کے گھر پہنچتے ہیں تو وہ ان کی مشایعت کے لیے ان کے ساتھ ہو لیتا ہے۔ اور جب وہ ان کے گھر پہنچتا ہے تو یہ اس کی مشایعت کے لیے اس کے ساتھ ہو لیتے ہیں۔"[3]

---

[1] مشاہیر ... ص۱۲ ... ادب اور تنقید از ڈاکٹر سید شاہ علی طبع اول ص۹۱ (مضمون "شرر کے افسانوں پر ایک نظر")

[2] ایضاً ص... مضامین شرر حصہ دوم ... طبع اول ص...

بعض تاریخی واقعات ایسے بھی ہیں جن کو بیان کرنے میں شرر نے مجلدات میں چند معمولی غلطیاں کی ہیں جو خفیف ہونے کے باوجود توجہ طلب ہیں مثلاً وہ اپنے ایک مضمون میں زماں شاہ کو ایران کا بادشاہ کہہ گئے ہیں جبکہ شاہ زماں احمد شاہ ابدالی کا پوتا تھا اور افغانستان کا بادشاہ[1]...... اسی طرح ایک اور مضمون میں شرر کا قلو پطرہ کے یہاں دو سال قیام بتایا ہے جبکہ یہ مدت صرف دس ماہ ہے۔[2] ان واقعات کو گو نظر انداز کیا جا سکتا ہے لیکن جب تاریخی مضامین کے معیار پر نظر جاتی ہے تو ان کی طرف نشاندہی ضروری ہو جاتی ہے۔

ان تاریخی مضامین میں چند ایسے مضامین بھی شامل ہیں جو مضمون اور مواد کے اعتبار سے تاریخی نہیں ہیں مثلاً ذیل کے مضامین، جن کے سامنے قوسین میں اُن کی نوعیت بھی درج ہے

۱	"ہمارا سفر پالن پور"	(معاشرتی)	مضامین شرر جلد دوم حصہ دوم
۲	"موجودہ اہلِ عرب"	(")	" " "
۳	"مسیحیت کے مبتدعہ فرقے"	(مذہبی)	" " "
۴	"کانٹوں کا متبرک تاج"	(")	" " "
۵	"قبطی زبان"	(لسانی)	" " "
۶	"گلاب کا پھول"	(شاعرانہ و عاشقانہ)	" جلد ششم

ان مضامین میں ایک امر یہ بھی نمایاں ہے کہ شرر نے بعض تاریخی اور مذہبی واقعات کو بار بار دہرایا ہے جس سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں اول یہ کہ شرر بحیثیت مسلمان ان واقعات سے خلوص سے متاثر تھے اور دوسرے وہ قاری کو ان واقعات کی دینی اور اصلاحی اہمیت کا احساس دلانا چاہتے تھے اُن میں سے ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ عقبہ بن نافع جب پہلی بار افریقہ کے تپتے ہوئے ریگ زاروں میں علَمِ توحید بلند کیے ہوئے سمندر کے کنارے تک پہنچ گئے تو اپنا گھوڑا سمندر میں ڈال کے پکار اٹھے کہ:۔

"بارِ الٰہا! اگر یہ سمندر میرا راستہ نہ روکتا تو مغرب کی جانب جہاں تک زمین ملتی میں تیری توحید اور تیرے پُر عظمت و جلال نام کی صدا بلند کرتا چلا جاتا۔"

شرر کے ان تاریخی مضامین میں موضوع و خیال کا معتدبہ حصہ تاریخ اسلام اور یونانیوں کی قدیم تاریخ سے ماخوذ ہے جبکہ آرین ہسٹری اور تاریخ ہندوستان کی جھلک بہت کم نظر آتی ہے جس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ تاریخ

---

[1] مضامین شرر، جلد ششم، طبع اول ص۱۳۳ (مضمون "یا آصف الدولہ دلی")

[2] مضامین شرر، جلد دوم حصہ اوّل، طبع اول، ص۲۸۸ (مضمون "مارکس کا زوال")

اس دور پر موصوف کی نظر اچٹتی ہوئی پڑی ہو اور یا پھر وہ ہندوستانی مسلمانوں کو تاریخِ اسلام سے قریب لاکر اُن کے ماضی کا آئینہ دکھانا چاہتے ہوں۔ ان دونوں صورتوں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ تاریخِ ہندوستان سے اُن کی واقفیت سطحی تھی۔ اپنے ایک مضمون "مناظرے کی تاریخ" میں جہاں ہندوؤں کا ذکر آیا وہاں موصوف نے یہ کہہ کر بحث ختم کر دی کہ "انھوں نے بھی غالباً ایسا ہی کیا ہوگا"[1] اس سے یہ امر ظاہر ہے کہ موصوف آریہ تاریخ سے کسی حد تک ناآشنا تھے اس کے وہ خود بھی معترف تھے۔ لکھتے ہیں:۔

"آرین ہسٹری سے ہمیں بہت کم واقفیت ہے۔ بخلاف اس کے مسلمانوں کی ہسٹری تھوڑی بہت ہمیں معلوم ہے"[2]

اسی طرح اپنے ایک مضمون "ایثارِ نفس" میں لکھتے ہیں کہ "ہندوستان کی تاریخ ایثارِ نفس کے معمولی واقعات سے بھی خالی ہے فی الحال ہم کو یورپ سے فدائے قوم بننے کے سبق ملے ہیں"[3] اس عبارت سے بھی نہ صرف شررؔ کی یورپ پرستی کا علم ہوتا ہے بلکہ اپنے ماحول اور اپنی تاریخ سے عدمِ واقفیت کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

مذکورہ تاریخ سے ناآشنائی کی بنا پر جب شررؔ نے تاریخِ اسلام ہی کو اپنا موضوع بنائے رکھا تو رفتہ رفتہ انھیں یہ احساس ہونے لگا کہ ہندو قارئین اُن کے رسالے "دلگداز" سے عدمِ دلچسپی کا اظہار کر رہے ہیں اور اپنے مذہب اور اپنے اسلاف کے ذکر کو رسالے کے صفحات پر دیکھنے کے متمنّی ہیں تو موصوف نے رہوارِ قلم کو گھڑی بھر کے لیے اِس جانب بھی موڑ دیا اور اپنے ایک مضمون "۱۸۸۸ء" میں آریہ قوم کا ذکر ان الفاظ میں کیا:۔

"ذی علم، پرہیزگار، قوی ہیکل اور کامیاب آریہ لوگ جنھوں نے پہلے پہل فتح مندی کا جھنڈا مشرقی دنیا کے دلفریب سبزہ زار میں گاڑ دیا تھا۔ جن کے حملے پہاڑوں کو ہلا دیتے تھے۔ جن کی ترقیانہ رفتار تیز رو دریاؤں کے حوصلے پست کر دیتی تھی جن کی دھاک دنیا بھر میں بیٹھی ہوئی تھی۔ جن کے سامنے کوئی بہادری کا لفظ زبان پر نہیں لا سکتا تھا۔ جن کا نام تاریخ میں سب سے پہلے لکھا گیا۔ اور جو اگلی دنیا کے بہت پرانے اور بہت نامور ہیرو تھے"[4]

اِس بحث سے قطع نظر اگر ان تاریخی مضامین کے سماجی پس منظر کا جائزہ لیا جائے تو ان میں ماحول اور فضا کی یکسانیت عیب نظر آئے گی وہ اس طرح کہ شررؔ نے واقعات اور قصّے تو عرب اور یونان کے بیان کیے ہیں لیکن ان کا ما

---

[1] مضامینِ شررؔ جلد دوم حصہ اول، طبع اول، ص ۲۹۵۔ [2] مضامینِ شررؔ، جلد اوّل حصہ سوم، طبع اوّل ص ۳۲ (مضمون ۱۸۸۸ء)
[3] مضامینِ شررؔ جلد ششم، طبع اوّل ص ۱۰۱۔ [4] مضامینِ شررؔ، جلد اوّل حصہ سوم، طبع اوّل ص ۳

اور فضا خالص ہندوستانی ہے جو اِن مضامین کو فنی اعتبار سے حقیقت سے دور لے جاتی ہے نیز یہ مضامین اندازِ بیان کا اثر بھی کھو بیٹھتے ہیں۔ مثلاً اپنے ایک مضمون میں شرؔر نے عثمانی تاجدار اورخان اور یونان کی شہزادی تھیو ڈورا کی شادی کا جو منظر پیش کیا ہے وہ ہندوستانی معاشرت اور شادی بیاہ کی رسومات کا غماز ہے .... منظر ملاحظہ ہو:-

"جب سب سامان درست ہو گیا تو ایک تریہی بجی ..... نظر آیا کہ مشعلیں بلند ہیں۔ مہتابیں چھوٹ رہی ہیں۔ ملائک فریب تھیو ڈورا اپنے زرنگار مرصع تخت پر جلوہ افروز ہے۔ اُس کی ماں شہنشاہ بیگم ایرینہ اُس کے برابر بیٹھی شوق و محبت کی نگاہوں سے بیٹی کے پروان چڑھنے کا تماشا دیکھ رہی ہے۔ اور صدہا خواجہ سرا، فرشتہ صورت غلام اور حور طلعت کنیزیں آگے پیچھے اُسکے گرد حلقہ باندھے ہوئے ہیں جو ادب کے ساتھ گھٹنے ٹیکے اور ہاتھ جوڑے ہیں۔ گویا سب اپنی پری رخسار دیوی کی پرستش کر رہے ہیں۔ پردوں کے ہٹتے ہی ہر چہار طرف باجے بجنا شروع ہوئے۔ نفیری اور شہنائی کا نغمہ بلند ہوا۔ نقاروں پر چوبیں پڑیں۔ ڈومنیوں نے بنّی بنّو کا ترانہ گایا۱"

مندرجہ بالا بحث کے بعد شرؔر کے تاریخی مضامین کے لیے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ان مضامین کو انشا پردازانہ رنگینی اگر ناولوں سے قریب لے گئی ہے تو موضوعات اور تاریخی واقعات کا تنوع اِن کو علمیت کے دائرے میں لے آیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مضامین رنگینیٔ بیان اور تاریخی علمیت کا حسین سنگم ہیں۔

---

۱ مضامینِ شرؔر، جلد دوم، طبع اول، صـ۶۷ (مضمون "آلِ عثمان میں پہلی سلطانۂ مسیحیہ")

اردو انجمنوں کی مجلسِ مشاورت

مغربی پاکستان کی اردو انجمنوں کے نمائندوں کا ایک اجلاس، ۲ر اپریل ۱۹۶۶ء کو انجمن ترقی اردو لاہور کے دفتر میں
ارت پروفیسر حکیم نیر واسطی صاحب منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں شرکت کرنے والے مندوب لاہور کے علاوہ لائل پور
دھا، بہاولپور، ہزارہ، گجرات، لالہ موسیٰ، پھالیہ، خانیوال، ملتان، لیہ، رحیم یار خاں، کراچی، راولپنڈی
اور کی انجمن ترقی اردو اور دوسری انجمنوں سے متعلق تھے۔ لاہور کی ادبی انجمنوں کے علاوہ، یوتھ موومنٹ
ے دار حکیم آفتاب احمد قرشی اور مسٹر شاہ محمد اور حلقہ ارباب ذوق کے سرگرم رکن اعجاز بٹالوی صاحب نے بھی
ت کی۔

اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے پروفیسر نیرؔ صاحب نے فرمایا کہ ۱۹۷۲ء سے پہلے پہلے نجی دائرے میں اُردو
ستعمال کو مقبول بنانا بے حد لازمی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ دنیا کے کسی ملک میں کسی غیر زبان کو وہ درجہ حاصل نہیں
متی سے اس ملک میں انگریزی کو حاصل ہو گیا ہے۔ پروفیسر حکیم نیرؔ واسطی نے اس بات پر زور دیا کہ حکومت
معاملہ میں محض تماشائی کی حیثیت اختیار نہیں کرنی چاہیئے بلکہ مثبت اور فوری اقدام کرنا چاہیئے۔ اب اردو کی ترقی
تک ٹالا نہیں جا سکتا۔ سیلاب آچکا ہے، اور بے کار عذرات سے اس کے آگے بند نہیں باندھا جا سکتا، دوسرے
ت نے بھی تقریریں کیں اور دفتروں میں اُردو کے فوری استعمال پر زور دیا۔ اس سلسلے میں جو تجاویز منظور ہوئیں
لاع عام کے لئے شائع کی جارہی ہیں۔ اس کے بعد متعلقہ حضرات دار باب اقتدار کی خدمت میں بھیجی جائیں گی اور
عمل درآمد کرانے کے لئے تنظیم سے کام ہوگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ!

ڈاکٹر سید عبداللہ۔ ناظم اعلیٰ انجمن ترقی اردو لاہور

داد (۱) | نجی دائرے میں اردو کے عام استعمال کی اپیل

مغربی پاکستان کی اُردو انجمنوں کے نمائندوں کا یہ اجلاس، اپنے اس یقین و ایمان کا اعادہ کرنا ضروری سمجھتا ہے

کہ انگریزی زبان نہ صرف یہ کہ ملک کی قومی زبان نہیں ہو سکتی بلکہ یہ بھی کہ اس کے بے ضرورت استعمال اور اس کی بے ضرورت توسیع و اشاعت سے ہماری قومیت اور تہذیبی نصب العین کو گزند پہنچنے کا اندیشہ ہے خصوصاً جب کہ ہمارے پاس اپنی وسیع الاطراف اور باثروت زبان اور زبانیں موجود ہیں۔ انگریزی زبان کا نجی دائرے میں پھیلنا یا اس کا پھیلایا جانا ہماری تہذیب ہی کے لئے خطرے کا باعث نہیں بلکہ اس سے خود ہماری قومیت کو بھی نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔

بنا بریں یہ اجلاس جمہور سے درخواست کرتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو۔

(۱) نجی اور کاروباری دائرے میں انگریزی کے استعمال سے احتراز کر کے اپنے قومی احساس کا ثبوت دیں۔

(۲) اپنے مکانوں اور دکانوں کے نام اردو میں لکھوائیں۔

(۳) عید نامے اور ملاقات نامے، غرض جملہ نجی تحریریں اور رقعات جہاں تک ممکن ہو اردو میں ہوں۔

(۴) سڑکوں اور محلوں کے اردو نام تجویز کر کے، ان کی تشہیر کریں۔

(۵) غرض کاروبار اور نجی امور میں انگریزی زبان کا استعمال ترک کر کے، قومی زبان کی ترقی و ترویج کا راستہ ہموار کریں۔

(۶) اور اس مقصد کے لئے اپنے اپنے شہروں میں اردو کی خاموش تحریک جاری کریں تاکہ انگریزی کے بے جا غلبے کا موثر انسداد ہو سکے۔

تجویز: ڈاکٹر سید عبداللہ (لاہور)
تائید: اخگر سرحدی (سرگودھا)
تائید مزید: ارشد حسین ارشد (ملتان)

قرارداد (۲) | ہفتہ قومی زبان (اردو) منایا جائے۔

مغربی پاکستان کی اردو انجمنوں کی یہ مجلس مشاورت تجویز کرتی ہے کہ کسی مناسب موقعہ پر ملک بھر میں قومی زبان (اردو) کا ہفتہ منایا جائے۔

اس ہفتے کے پروگرام کی تفصیل یہ ہے :۔

(۱) تجارتی اداروں سے درخواست کی جائے کہ وہ اپنی مصنوعات پر نام اور اشتہاری اشارے اردو میں لکھیں۔ نیز تشہیر کے لئے اشتہار بھی اردو میں چھپوائیں۔
(ہفتہ کے اختتام پر اداروں کو بہترین تعاون کے لئے انعامات دئے جائیں)

(۲) ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے درخواست کی جائے کہ وہ اس ہفتہ کے دوران ہر پندرہ منٹ کے بعد اردو کی حمایت

میں اعلانات کریں۔

۳) اخبارات اور رسائل سے درخواست کی جائے کہ وہ اُردو کی حمایت میں اپنے اخبارات اور رسالوں میں اس ہفتے کے پروگرام کی دل کھول کر اشاعت کریں۔

۴) سرکاری محکموں، نیم سرکاری محکموں، وزیروں، اسمبلی کے اراکین، یونیورسٹی کے سربراہوں اور دیگر اداروں کے مالکوں سے اس ہفتہ کے دوران کامل تعاون کی اپیل کی جائے۔

محرک: شاہ محمد سیکریٹری جنرل
مغربی پاکستان یوتھ موومنٹ

مؤید: ارشد حسین ارشد (ملتان)

مؤید: آصف کیانی (راولپنڈی)

قرارداد (۳) | مغربی پاکستان میں ذریعۂ تعلیم کی فوری اور مکمل تبدیلی کا مطالبہ۔

مغربی پاکستان کی اردو انجمنوں کے نمائندوں کی یہ مجلس اپنے اس احساس کا برملا اظہار کرنا چاہتی ہے کہ اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا جو نصب العین قومی تعلیمی کمیشن نے ملک کے سامنے پیش کیا تھا، اور اس کے حصول کے لئے جن تدریجی اقدامات کا وعدہ کیا گیا تھا، ان پر اب تک عمل نہیں ہوا ۔۔۔ اور جہاں ہوا بھی ہے ناکافی، ناقص اور بے دلانہ ہے۔

یہ اجلاس تبدیلی کی اس سست رفتار کو حیرت اور تشویش کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور مطالبہ کرتا ہے کہ ذریعۂ تعلیم کی فوری اور مکمل تبدیلی کا اعلان کیا جائے۔

(الف) ان طلبا کے لئے جو اردو میں امتحان دینا چاہتے ہیں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم کا موثر انتظام کیا جائے کیونکہ اس وقت جس جگہ ذریعۂ تعلیم و امتحان میں انتخاب جائز رکھا گیا ہے وہاں بھی اردو میں تعلیم کا کوئی انتظام نہیں جس کے نتیجے کے طور پر، اردو پسند طلبہ کو شدید دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اس امر کا خدشہ ہے کہ انتخاب کی اجازت کا تجربہ، سہولتوں کی کمی کے باعث کہیں ناکام نہ ہو جائے۔ لہٰذا ہر کالج اور یونیورسٹی میں اردو میں تدریس کا انتظام ہونا چاہیئے کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ طلبہ استاد کی مدد کے بغیر، اپنی تیاری مکمل نہیں کر سکتے۔

(ب) یہ اجلاس مطالبہ کرتا ہے کہ (پروفیشنل) پیشہ ورانہ تعلیم کے اداروں میں اردو میں پڑھانے اور امتحان دینے کی اجازت دی جائے۔

(ج) پی ایچ۔ڈی کی سطح تک کے مقالات اردو میں لکھنے کی اجازت دی جائے۔

(د) مرکزی اور صوبائی پبلک سروس کمیشن کے جملہ امتحانات میں قومی زبانوں کو انگریزی کے مساوی جگہ دی جائے اور تبادلہ خیال اور گفتگو کا ذریعہ بھی اردو ہونا چاہیے۔

(ه) یہ اجلاس حمود الرحمان کمیشن کی متعلقہ سفارشات پر تعجب اور سخت بے اطمینانی کا اظہار کرتا ہے اور ان کی معلومات کو یک طرفہ اور ناقص قرار دیتا ہے جن پر انھوں نے اپنے نتائج کی بنیاد رکھی ہے، یہ اجلاس ان سفارشات کو یک طرفہ اور ناقص قرار دیتا ہے۔

محرک: آفتاب احمد قریشی (لاہور)
مؤید: ملک حسن اختر (لیہ)
مؤید: ارشاد احمد (بھالیہ)
مؤید: انوار الحسن (لائلپور)

قرارداد (۴) دفتری زبان کی فوری تبدیلی کا مطالبہ۔

مغربی پاکستان کی اردو انجمنوں کے نمائندوں کا یہ اجلاس دفتری زبان کی تبدیلی کے مسئلے کو بے حد اہمیت دیتا ہے اور پرزور مطالبہ کرتا ہے کہ بلا تاخیر دفتری زبان کی تبدیلی کے انتظامات کیے جائیں۔

چونکہ مجلس زبان دفتری نے دفتری اصطلاحات کا ایک جامع لغت مرتب کر کے شائع کر دی ہے اس لیے اس اجلاس کی رائے میں دفتروں میں اردو کے نفاذ کے راستے میں اب کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی۔

محرک: آفتاب احمد قریشی (لاہور)
مؤید: نذر حسین طارق (خانیوال)
مؤید: ریاض مجید (لائل پور)

قرارداد (۵) پبلک سکولوں کی روزافزوں تعداد پر تشویش کا اظہار

مغربی پاکستان کی اردو انجمنوں کا یہ اجلاس، ملک میں انگریزی طرز کے پبلک سکولوں اور مشنری اداروں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو تشویش کی نظر سے دیکھتا ہے اور اپنے اس خدشے کا اظہار کرنا اپنا فرض اولین سمجھتا ہے کہ پبلک اسکولوں کے ذریعے، نہ صرف انگریزی زبان کے غلبے کی صورتیں پیدا ہو رہی ہیں بلکہ ملک میں دو طرح کے متوازی نظام چل رہے ہیں اور ان اسکولوں کے ذریعے ملک میں امیر تعلیم یافتہ اور غریب تعلیم یافتہ

کے نام سے دو طبقے بھی پیدا ہو رہے ہیں یہ امر قومی مساوات و اخوت کے منافی اور قومی تہذیب کے لئے سخت خطرناک اور مہلک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سوڈان وغیرہ میں ایسے اسکول بند کر دئے گئے ہیں۔

بنابریں مطالبہ ہے کہ:

(الف) پبلک اسکولوں کی جگہ ملک میں مساوات سکول جاری کیے جائیں جن میں ہر کہ ومہ بربنائے قابلیت داخل ہو سکے۔

(ب) پہلی جماعت سے انگریزی پڑھانے کا طریقہ ترک کرکے تعلیم کا آغاز اردو سے ہونا چاہئے اور اس غرض کے لئے موزوں اساتذہ کا اور ان کے لئے تربیتی کورسوں کا مناسب انتظام کیا جائے۔

محرک: اخگر سرحدی (سرگودھا)

مؤید: مولانا انوار الحسن (لائل پور)

قرارداد (۶) | انجمن تنظیم ملی کی کوششوں پر اظہار تحسین۔

مغربی پاکستان کی اردو انجمنوں کے نمائندوں کا یہ اجلاس مشرقی پاکستان کی انجمن تنظیم ملی کی اردو کی ترویج کے سلسلے میں کوششوں اور خدمات کو بہ نظر استحسان دیکھتا ہے اور توقع رکھتا ہے کہ انجمن تنظیم ملی اردو کے لئے اپنی کوششوں کو برابر جاری رکھے گی۔

مجوزہ: پروفیسر حکیم نیر واسطی (لاہور)

مؤید: عبدالرحمن شاکر (ملتان)

قرارداد (۷) | اردو بل کی منظوری کا مطالبہ

یہ اجلاس مغربی پاکستان کی مجلس قانون ساز کے اراکین سے اپیل کرتا ہے کہ اردو زبان کو دفتری زبان قرار دینے کے متعلق مجلس قانون ساز کی مجلس قائمہ نے جس بل کی منظوری کی سفارش کی ہے۔ اسے موجودہ اجلاس میں جلد از جلد منظور کیا جائے۔

محرک: سید مسعود احمد اثیر (لالہ موسیٰ)

مؤید: سید ذوالفقار حسین بخاری (لائل پور)

قرارداد (۸) | علوم مشرقی کے اساتذہ کو انگریزی کے اساتذہ کے برابر درجہ دیا جائے۔

یہ اجلاس حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ ہر قسم اور ہر درجہ کے مدارس نیز جامعاتی تعلیم میں اردو، عربی اور فارسی کی تعلیم کے لئے ان زبانوں کے فاضل اساتذہ کو زیادہ اہمیت دی جائے۔ اور انھیں اسی سطح پر کام کرنے والے انگریزی اساتذہ

کے برابر کا درجہ دیا جائے۔

محرک : ریاض زیدی (ملتان)

مؤید : سید مسعود احمد اثیر (لالہ موسیٰ)

قرارداد (۹) | اُردو کے ہندسوں کو دوبارہ رائج کیا جائے۔

یہ اجلاس محکمۂ تعلیم، مغربی پاکستان سے اپیل کرتا ہے کہ بنیادی تعلیم حاصل کرنے والے بچوں میں اردو کے ہندسوں کو رواج دیا جائے اور عام طور سے بھی اردو ہندسوں کو رائج کیا جائے۔

محرک : ریاض زیدی (ملتان)

مؤید : سید مسعود احمد اثیر (لالہ موسیٰ)

قرارداد (۱۰) | فاضل سلسلے کے لئے ادارے کھولے جائیں۔

یہ اجلاس صوبائی حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ مشرقی علوم خصوصاً اردو کی ترقی و ترویج کے لئے ہر ڈویژن میں خاص تعلیمی ادارے کھولے جائیں۔ جن میں فاضل سلسلے کے طلبہ کے لئے تعلیم کا معقول انتظام ہو۔

محرک : تاج الدین حقیقت (سرگودھا)

مؤید : آفتاب احمد قریشی (لاہور)

قرارداد (۱۱) | اُردو مرکزی تنظیم کی تجویز۔

یہ اجلاس تجویز کرتا ہے کہ اُردو کی ترویج کے لئے مرکزی تنظیم قائم کی جائے۔ جس کی شاخیں صوبہ کے تمام شہروں میں قائم کی جائیں اور اس سے مختلف انجمنوں کا الحاق بھی ہو۔

یہ اجلاس تجویز کرتا ہے کہ مرکزی اور صوبائی مجالس قانون ساز اور دوسری مختلف جماعتوں میں اردو کی ترویج و ترقی کے لئے تحریک کی جائے۔

محرک : آفتاب احمد قریشی (لاہور)

مؤید : شاہ محمد (لاہور)

مؤید : ارشد حسین ارشد (ملتان)

قرارداد (۱۲) | اضلاع میں اردو کانفرنسیں منعقد کی جائیں۔

اس مجلس مشاورت میں جو تجاویز اور قراردادیں پیش کی گئی ہیں ان کی کامیابی کا جائزہ لینے نیز ان پر مزید موثر اور بطور پر عمل درآمد کرانے کے لئے مغربی پاکستان میں لاہور کے علاوہ کسی اور بڑے شہر میں اُردو کانفرنس منعقد کی جائے۔
اس سلسلہ میں انجمن ترقی اردو، سرگودھا کی دعوت ہے کہ پہلی اُردو کانفرنس وہاں منعقد کی جائے۔
اس کے علاوہ بھی ہر ڈویژن میں اردو کانفرنسوں کا ایک اور سلسلہ شروع کیا جائے۔

محرک: تاج الدین حقیقت (سرگودھا)
مؤید: اخگر سرحدی (سرگودھا)
مؤید: انوار الحسن (لائل پور)
مؤید: ارشد حسین ارشد (ملتان)

قرارداد (۱۳) | اردو تربیتی کورس جاری کئے جائیں۔

پاکستان کے نظام تعلیم میں اُردو زبان کی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ:
۱) محکمہ تعلیم اور یونیورسٹیوں کی طرف سے منعقد ہونے والے جملہ ریفریشر کورسوں کی زبان اُردو ہو۔
۲) کالجوں میں سائنس پڑھانے والے اساتذہ کے لئے اردو میں ریفریشر کورسوں کا اہتمام کیا جائے۔
۳) پاکستان میں ملازمت کے سلسلہ میں، پاکستانی یونیورسٹیوں سے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرنے والوں کو بیرونی ممالک سے ڈگریاں حاصل کرنے والوں کے برابر تصور کیا جائے اور دونوں کو یکساں مراعات حاصل ہوں۔

محرک: افتخار حسین شاہ (ملتان)
تائید: شاہ [illegible] (لاہور)

قرارداد (۱۴) | حکومت کے نشریاتی محکموں کی حکمت عملی پر اظہار اطمینان

یہ اجلاس حکومت کی اس حکمت عملی کا خیر مقدم کرتا ہے جس کے مطابق نشریات و اطلاعات میں قومی زبانوں اُردو اور بنگالی کو اہمیت دی گئی ہے اور حکومت کے سربراہ اور دیگر اراکین نے اردو کی ترقی و ترویج میں جو مدد دی ہے اس کا شکریہ ادا کرتا ہے۔
یہ اجلاس توقع رکھتا ہے کہ محکمہ نشریات و اطلاعات قومی زبانوں کے فروغ میں مزید اقدامات

کرے گا۔

محرک : آفتاب احمد قریشی (لاہور)

مؤید : اسلم یوسفی (ملتان)

قرارداد (۱۵) مجلس احتساب قائم کی جائے۔

یہ اجلاس تجویز کرتا ہے کہ منظور شدہ قراردادوں پر عمل درآمد کرنے کے لئے مجلس احتساب مقرر کی جائے۔ اس مجلس میں مختلف انجمنوں اور شہروں کے نمائندے شامل ہوں۔

محرک : آفتاب احمد قریشی (لاہور)

مؤید : اسلم یوسفی (ملتان)

قرارداد (۱۶) (۱) ملک کے جرائد و کتب میں جو مضامین سائنس اور دقیق موضوعات پر چھپتے ہیں ان میں اصطلاحات صرف اردو میں نہ ہوں بلکہ انگریزی اصطلاحات بھی ساتھ ہوں۔ تاکہ انگریزی پڑھا لکھا طبقہ بھی اس سے خاطر خواہ متمتع ہو سکے۔

(۲) ان کتابوں کے آخر میں ایسی اصطلاحات کی اردو میں (GLOSSARY) فرہنگ دی جائے۔

(۳) کتابوں کے آخر میں اشاریہ دیا جائے۔

محرک : رحمت علی مجاہد (لاہور)

مؤید : مسرور کیفی (لاہور)

قرارداد (۱۷) ملک کے تمام جرائد و اخبارات مستقل طور پر سائنس کے مضامین اردو میں شائع کریں۔ خصوصاً کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے جرائد چند صفحات پر مشتمل شعبہ سائنس (اردو) قائم کریں۔ اس کے لئے انجمن ایسے سب اداروں کو خطوط لکھے۔

محرک : رحمت علی مجاہد (لاہور)

مؤید : جاوید احمد خاں (لاہور)

قرارداد (۱۸) مغربی پاکستان کی انجمنوں کا یہ اجلاس حکومت پاکستان سے مطالبہ کرتا ہے کہ ۲۱ اپریل کو یوم اقبال کی سرکاری تعطیل حسب سابق منظور کی جائے۔

محرک : ارشاد احمد (گجرات)

مؤید : ملک حسن اختر (لیہ)

(باقی صفحہ ۹۵ پر)

بو سلمان شاہجہانپوری

نئے خزانے

پیش نظر اشاریہ مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت ترتیب دیا گیا ہے

اس اشاریے کی ترتیب میں جنوری ۱۹۶۶ء کے مندرجہ ذیل رسائل و اخبارات سے مدد لی گئی ہے۔ بعض رسائل دیگر مہینوں کے ہیں جو بعد میں دستیاب ہوئے۔

سہ ماہی	اردو	کراچی	جنوری ۱۹۶۶ء	ماہنامہ	قومی زبان	کراچی	جنوری ۱۹۶۶ء
"	اردو نامہ	"	شمارہ (۲۱، ۲۲) جولائی تا دسمبر ۱۹۶۵ء	"	کتابی دنیا	"	"
ماہنامہ	اردو ڈائجسٹ	لاہور	جنوری ۶۶ء	"	ماہ نو	کراچی	نومبر ۱۹۶۵ء
"	الرحیم	حیدرآباد	"	—	مجلہ الجامعہ	ربوہ	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۵ء
"	الشجاع	کراچی	"	ماہنامہ	مشرق	کراچی	دسمبر ۱۹۶۵ء
"	افکار	"	سال ۱۲ نمبر ۱۷۳	"	منشور	"	جنوری ۱۹۶۶ء
سہ ماہی	اقبال ریویو	"	جنوری ۱۹۶۶ء	"	نقش	"	نومبر ۱۹۶۵ء تا جنوری ۱۹۶۶ء
ماہنامہ	امام	"	مئی ۱۹۶۵ء	پندرہ روزہ	صحیفہ اہل حدیث	کراچی	جون ۱۹۶۵ء تا "
—	اوراق	لاہور	جنوری ۱۹۶۶ء	ہفت روزہ	آئین	لاہور	جنوری ۱۹۶۶ء
ماہنامہ	بینات	کراچی	"	"	المنبر	لائل پور	"
"	ترجمان القرآن	لاہور	"	"	چٹان	لاہور	"
"	تہذیب الاخلاق	"	"	"	خدام الدین	"	"
"	جام نو	کراچی	"	"	شہاب	"	"
"	سیارہ	لاہور	"	"	قندیل	"	"
"	طلوع اسلام	"	"	"	لاہور	"	"
"	عارف	لاہور	"	روزنامہ	انجام	کراچی	اشاعتہائے جمعہ و اتوار
"	عالمی ڈائجسٹ	کراچی	"	"	جنگ	"	"
"	فاران	"	"	"	حریت	"	"
"	فکر و خیال	"	نومبر و دسمبر ۱۹۶۵ء				
"	فکر و نظر	"	جنوری ۱۹۶۶ء				

اشاریہ بابت ماہ جنوری سنہ ۱۹۶۶ء

آپ بیتی

مصنف	عنوان	ماخذ
سہروردی، حسین شہید	سہروردی کی کہانی ان کی اپنی زبانی (قسط ۵)	جنگ کراچی ص ۲ + ۹ ۳ر جنوری سنہ ۶۶ء
سہروردی، حسین شہید	سہروردی کی کہانی ان کی اپنی زبانی (قسط نمبر ۶)	" ص ۲ ۱۰ر جنوری سنہ ۶۶ء
سہروردی، حسین شہید	سہروردی کی کہانی ان کی اپنی زبانی (" ۷)	" ص ۲ ۱۷ر "
سہروردی، حسین شہید	سہروردی کی کہانی ان کی اپنی زبانی	" ص ۲ ۳۱ر "
صفیر بلگرامی	خود نوشت سوانح عمری۔ سید فرزند احمد صفیر بلگرامی[1]	اردو ص ۶۷ تا ۹۰ جنوری سنہ ۶۶ء
کشفی، سید ابو الخیر	۱۷ دن جامعہ نگر میں	چراغ راہ ص ۱۴۵ تا ۱۴۹ جنوری سنہ ۶۶ء
محمد عزیز، ڈاکٹر	ہندوستان میں ۱۷ دن	" ص ۱۵۱ تا ۱۵۸ "

ادب اور تحقیق و تنقید

مصنف	عنوان	ماخذ
احمد، ڈاکٹر کریم الدین	یگانہ کی غیر مطبوعہ رباعیات	نیرنگ خیال ص ۱۱ تا ۲۳ جنوری سنہ ۶۶ء
اسماعیل پانی پتی۔ شیخ محمد	سرسید کی ادبی حیثیت (۲)	تہذیب الاخلاق ص ۹ تا ۱۷ "
افسر صدیقی	رباعیات نصرتی	اردو ص ۵۹ تا ۶۶ "
آزاد، مولانا محمد حسین	ہرن منارہ (ایک غیر مطبوعہ مضمون)	اوراق (شمارہ خاص ص ۲۲۷ تا ۲۲۸ سنہ ۶۵ء
بلیغ الرحمان، شاہ	داغ کی باتیں	عالمی ڈائجسٹ ص ۴۷ تا ۵۴ جنوری سنہ ۶۶ء
پرویز پروازی، ناصر احمد	ادب اور زندگی	مجلۃ الجامعہ ص ۹۹ تا ۱۰۴ اکتوبر سنہ ۶۵ء
حامد حسن قادری، مولانا	میرا کارنامہ غزل	قومی زبان ص ۴۷ تا ۵۰ جنوری سنہ ۶۶ء
خدا بخش بچا، ملک	خطبہ صدارت مغربی پاکستان اردو اکیڈمی	" ص ۷ تا ۱۰ "
خورشید احمد	۱۷ دن اور ہماری قوم — نظریاتی پہلو	چراغ راہ "
رفعت، سید مبارز الدین	ظفر کی شاعری[2]	کتابی دنیا ص ۴ تا ۸ "

---

[1] اس خود نوشت پر جناب وصی احمد بلگرامی صاحب کے قلم سے مفید حواشی بھی ہیں۔

[2] تلخیص از کتاب نما۔ دہلی

ہدانی، حاجی عبدالرحمن	سچل سرمست کی اردو شاعری	انجام کراچی	ص ۵ ۲۹ جنوری ۱۹۶۶ء
افت مرزا، محمد	مثنوی بہارستان عشق اور اس کا مصنف	اردو	ص ۱۰۵ تا ۱۲۴ جنوری ۱۹۶۶ء
در، پروفیسر منظور حسین	گوئٹے، دیوان شرقی کے پس منظر میں	منشور	ص ۱۲ تا ۱۸ ″
ورش کاشمیری	یوم حالی پر خطاب	چٹان	ص ۱۰ + ۱۸ ۱۰ جنوری ۱۹۶۶ء
ہزاد احمد	سوال یہ ہے کہ فن میں ابلاغ کی اہمیت کیا ہے [1]	اوراق (شمارہ خاص)	ص ۵۰ تا ۵۷ ۱۹۶۵ء
رف، مفضل الٰہی	زبان کی لطافتیں	اردو ڈائجسٹ	ص ۱۲۰ تا ۱۲۲ جنوری ۱۹۶۶ء
بدالحق، بابائے اردو مولوی	درس زندگی	قومی زبان	ص ۱۱ تا ۱۲ ″
بداللہ، محمد	حالی اور بنکم	ماہ نو	ص ۷ تا ۱۰ نومبر ۱۹۶۵ء
صمت اللہ	ڈاکٹر سید عبداللہ کے دو نظریے	اردو زبان	ص ۱۸ تا ۲۱ فروری ۱۹۶۶ء
اطمہ شجاعت، ڈاکٹر	حالی کا مذہبی تصور	اردو	ص ۵۳ تا ۷۵ جنوری ۱۹۶۶ء
درت نقوی، سید	پرپیچر (ایران جدید کا ایک ناولٹ)	ماہ نو	ص ۶۱ تا ۶۴ نومبر ۱۹۶۵ء
شفی، میر غلام احمد	ہمارا نیا ادب	لاہور	ص ۵ ۱۷ جنوری ۱۹۶۶ء
کلیم اختر	موجودہ اردو ادب — تغیر یا تجربہ	قندیل	ص ۶ ۲۳ جنوری ۱۹۶۶ء
ماہر القادری	میری نعتیہ غزل	فاران	ص ۱۶ تا ۲۷ جنوری ۱۹۶۶ء
محمد حسن، ڈاکٹر	تنقیدی اسلوب	الشجاع	ص ۴۲ تا ۴۵ ″
محمد عمر، پروفیسر	میر کا سیاسی و سماجی ماحول	لاہور	ص ۱۱ تا ۱۴ ۱۷ جنوری ۱۹۶۶ء
مسیح الزماں، پروفیسر	کاظم علی جوان کی شکنتلا	تہذیب الاخلاق	ص ۸ تا ۲۷ جنوری ۱۹۶۶ء
ملک، فتح محمد	فیض کی دو آوازیں	اوراق (شمارہ خاص)	ص ۲۶۱ تا ۲۷۶ ۱۹۶۵ء
نظیر صدیقی	میر — ماضی سے مستقبل تک	اوراق (″)	ص ۲۴۱ تا ۲۵۹ ۱۹۶۵ء
وزیر آغا	ادبی مسائل	اردو زبان	ص ۳ تا ۸ فروری ۱۹۶۶ء
وزیر آغا	آتش کی غزل	اوراق (شمارہ خاص)	ص ۲۷۷ تا ۲۸۳ ۱۹۶۵ء

---

[1] سوال یہ ہے! ماہنامہ اوراق کا ایک مستقل ادبی عنوان ہے اس عنوان کے تحت مختلف ادبی مسائل پر ادباء کے خیالات پیش کئے جاتے ہیں۔ مذکورہ سوال شہزاد احمد نے اٹھایا اور افتخار جالب، سجاد باقر رضوی، غلام جیلانی اصغر۔ صدیق کلیم اور صلاح الدین ندیم نے اس بحث میں حصہ لیا ہے۔

وقار عظیم، پروفیسر سید	قومی آزمائش، ادیب اور مورخ	افکار ص ۱۲ تا ۱۳
یوسف جمال انصاری	تنقید اور اس کی اہمیت	تہذیب الاخلاق ص ۴۰ تا ۴۸ جنوری ۱۹۶۶ء
——	وحشت کی شاعری	اردو نامہ ص ۷ تا ۱۴ ۱ دسمبر ۱۹۶۵ء
——	ہم اپنے اہل قلم کو سلام کرتے ہیں	چراغ راہ ص ۱۲۷ تا ۱۳۴ جنوری ۶۶ء

تاریخ

جعفری، سید بشیر حسین	جب جاپان نے سنگاپور فتح کیا	انجام کراچی ص ۵ ۱۷ جنوری ۶۶ء
خورشید، عبدالسلام	جنگ بدر اور اس کے نتائج	چٹان ص ۹ ″
سکندر احمد	ترکی — تاریخی پس منظر	نیرنگ خیال ص ۲۵ تا ۳۱ جنوری ۶۶ء
طاہر احمد۔ مرزا	نپولین اور اسلام	لاہور ص ۱۳ تا ۱۴ ۲۴ جنوری ۶۶ء
عبدالقادر لائل پوری، شیخ	حکمت لقمان	″ ص ۷ تا ۱۰+۱۷ ″
ع ر ح، عبدالروف	اسلامی فن تعمیر کا نقطۂ آغاز	انجام کراچی ص ۴ ۱۰ جنوری ۶۶ء
فاتح قائدآبادی	جنگ بدر	چٹان ص ۶ + ۱۶ ۱۷ جنوری ۶۶ء
فرانکو، پروفیسر	جنگ عظیم	عالمی ڈائجسٹ ص ۱۱ تا ۲۰ جنوری ۶۶ء
کاظم، مولوی عبدالغفور	خلافت ابوبکر	صحیفہ اہل حدیث ص ۱۷ تا ۲۰ ۱۸ مئی ۶۵ء
——	ایران پر اسلامی حملہ	مجلۃ الجامعہ ص اکتوبر تا دسمبر ۶۵ء
——	برلن سے فرار (آخری قسط)	اردو ڈائجسٹ ص ۱۲۷ تا ۱۴۲ جنوری ۶۶ء

تعلیم اور تعلیمی ادارے

اسعد گیلانی	اسلامی نظام زندگی	آئین ص ۱۲ تا ۱۳ ۲۴ جنوری ۶۶ء
اشتیاق حسین قریشی	اپنی زبانوں میں سائنس سیکھنے والے....[1]	جنگ کراچی ص ۵ ۵ جنوری ۶۶ء
اشرف، حکیم عبدالرحیم	جامعہ تعلیمات اسلامیہ (لاہور)	المنبر ص ۵ ۳۱ جنوری ۶۶ء
جعفری، سید منیر علی	پاکستانی اسٹوڈنٹس	فکر و خیال ص ۱۲ تا ۱۴ نومبر دسمبر ۶۵ء

---

[1] سائنٹفک سوسائٹی پاکستان کی ساتویں سالانہ کانفرنس منعقدہ کراچی کا خطبہ استقبالیہ

مصنف	عنوان	رسالہ	صفحات	تاریخ
حامد حسین صدیقی	مجلس تعلیم ثانوی و اعلیٰ ثانوی کراچی	فکر و خیال	ص ۱۰ تا ۱۱	نومبر دسمبر ۶۵ء
خدا بخش بچا۔ ملک	لادینی افکار بے ربطی افکار سے پیدا ہوتی ہے[1]	چٹان	ص ۲+۱۳-۱۴	۳ر جنوری ۶۶ء
خورشید احمد	طالب علم ـــ روشنی کے مینار[2]	آئین	ص ۱۲+۷	۳۱ر دسمبر ۶۵ء
سبط حسن، سید	فورٹ ولیم کالج	اردو	ص ۹۱ تا ۱۰۳	جنوری ۶۶ء
طفیل احمد قریشی	عربی مدارس کا موجودہ نصاب تعلیم۔ ایک تنقید کا جواب	الرحیم	ص ۵۰۷ تا ۵۲۶	″
عبدالغفار ایم اے، قاضی	ذریعہ تعلیم	چٹان	ص ۸	۳۱ر جنوری ۶۶ء
محمد تقی، سید	اردو اخبارات کی تعلیمی خدمات کا جائزہ	لاہور	ص ۱۰ تا ۱۱	۳ر جنوری ۶۶ء
منیر جعفری، سید	کراچی میں ثانوی اور اعلیٰ تعلیم	انجام	ص ۳	۱۰ر جنوری ۶۶ء

تہذیب و تمدّن

مصنف	عنوان	رسالہ	صفحات	تاریخ
السجاد، محمد عاصم	مسلمان عورت کا لباس	صحیفہ اہل حدیث	ص ۱۸ تا ۲۰	یکم جولائی ۶۵ء
حامد علی انصاری	اسلامی ثقافت	فکر و خیال	ص ۲۲ تا ۲۴	نومبر دسمبر ۶۵ء
خورشید عالم	پہاڑی قبائل	الشجاع	ص ۴۷ تا ۵۱	جنوری ۶۶ء
سجاد شیخ	ثقافت کا مفہوم	ماہِ نو	ص ۱۱ تا ۱۵	نومبر ۶۵ء
عباد اللہ فاروقی، حافظ	مراسم العرب قبل الاسلام	الرحیم	ص ۵۰۱ تا ۵۰۶	جنوری ۶۶ء
نصر، حکیم عبداللہ خاں	حدیث المائدہ	المنبر	ص ۲+۱۲	۲۸ر جنوری ۶۶ء
	مراکشی قبیلہ آیت حدیدو میں شادی کی عجیب و غریب رسمیں	حریت	ص ۷	۳۱ر جنوری ۶۶ء

سائنس

مصنف	عنوان	رسالہ	صفحات	تاریخ
اختر علی ڈھلوں	جدید آلات جنگ	قندیل	ص ۱۶ تا ۱۷	۲ر جنوری ۶۶ء
حسنات احمد، سید	سب سے کم قیمت ریڈیو ـــ پاکستانی سائنسدان کا کارنامہ	حریت	ص ۹	۱۷ جنوری ۶۶ء
محمد اسلم	کیمیا و صنائع کیمیا میں سائنسی تحقیقات	فکر و خیال	ص ۱۵ تا ۱۷	نومبر دسمبر ۶۵ء

---

[1] پنجاب یونیورسٹی کا خطبۂ تقسیم اسناد

[2] اشاعت تعلیم کالج لاہور میں اسلامی جمعیت طلبہ کے ایک اجتماع میں تقریر

محمد قریشی، ڈاکٹر	پاکستان میں دفاعی سائنس	فکر و خیال ص ۱۸ تا ۲۱	نومبر دسمبر ۶۵ء

سیاسیات

نذیر	بھارت نے حملہ کیوں کیا؟ (تاریخی و سیاسی پس منظر)	چراغ راہ	ص ۹ تا ۲۴	جنوری ۱۹۶۶ء
نذیر	سیاسی افق پر	"	ص ۱۱۳ تا ۱۱۶	"
لیث صدیقی	۱۷ دن اور ہماری قوم	"	ص ۱۰۷ تا ۱۱۱	"
ن، ڈاکٹر محمد	سترہ روزہ جنگ کے نتائج و تاثرات	مشرق	ص ۸ تا ۱۱	دسمبر ۱۹۶۵ء
رف، مولانا حکیم عبدالرحیم	مذاکرات تاشقند	المنبر	ص ۳ تا ۴	۷ر جنوری ۱۹۶۶ء
رف، حکیم عبدالرحیم	اعلان تاشقند۔ وزارت خارجہ کے ترجمان کی وضاحت	"	ص ۳ تا ۴	۱۴ر جنوری ۱۹۶۶ء
ہانی، ایم اے ایچ	ماؤ کا چین	عالمی ڈائجسٹ	ص ۵۳ تا ۵۴	جنوری ۱۹۶۶ء
مانت حسن قریشی	دوارکا۔ بحریہ کا ناقابل فراموش کارنامہ[1]	چراغ راہ	ص ۹۸ تا ۱۰۰	"
ریز	پاکستان کی نئی زیارت گاہیں	طلوع اسلام	ص ۷۵ تا ۷۶	"
ج الدین انصاری، ماسٹر	بھارت کے تنگدل اور متعصب رہنما	چٹان	ص ۱۳	۱۰ر جنوری ۱۹۶۶ء
قب زیدی	اعلان تاشقند	لاہور	ص ۳ تا ۴	۱۷ر جنوری ۱۹۶۶ء
نیف رامے	پاکستان اور دین اور سیاست۔ پرویز صاحب سے ایک انٹرویو۔	طلوع اسلام	ص ۱۱ تا ۴۱	جنوری ۱۹۶۶ء
الد محمو	قبرص کا مسئلہ	عالمی ڈائجسٹ	ص ۶۴ تا ۷۰	"
لیل حامدی	مسئلہ قبرص	ترجمان القرآن	ص ۴۱ تا ۵۳	"
ورشید احمد	جہاں فوجیں ٹکرائیں	چراغ راہ	ص ۱۰۱ تا ۱۰۵	"
اشدی، پیر علی محمد	مشرق و مغرب	جنگ کراچی	ص ۱۲	۲۹ر جنوری ۱۹۶۶ء
ھمی، انوار الحق	جمہوریت اور ہندو	چٹان	ص ۹ + ۱۲	۲۷ر دسمبر ۱۹۶۵ء
شاہین، پروفیسر	اسلامی اتحاد ۔ اسلامی دولت مشترکہ	جنگ کراچی	ص ۱۳	۲۳ر جنوری ۱۹۶۶ء
شفیع عقیل	ہماری منزل ۔ غازی یا شہید[2]	"	ص ۴	۱۰ر جنوری ۱۹۶۶ء

---

[1] منقول از اردو ڈائجسٹ

[2] ایک رپورتاژ کشمیر اور مغربی پاکستان کے محاذوں کے دورہ کے بعد لکھا گیا۔

شفیع عقیل	ہماری منزل ۔ غازی یا شہید	جنگ کراچی	ص ۴	۱۷/جنوری ۱۹۶۶ء
شفیع عقیل	ہماری منزل ۔ غازی یا شہید	؍؍	ص ۲	۲۳/جنوری ۱۹۶۶ء
شفیع عقیل	ہماری منزل ۔ غازی یا شہید	؍؍	ص ۲	۲۹/ ؍؍
شفیع عقیل	ہماری منزل ۔ غازی یا شہید	؍؍	ص ۴	۳۱/ ؍؍
شورش کاشمیری	اعلان تاشقند کے مضمرات کا جائزہ	چٹان	ص ۷ تا ۸	۲۴/ ؍؍
صہبا لکھنوی	سات دن چار محاذ [1]	افکار	ص ۸۷ تا ۸۷	
طٰہٰ حسین، ڈاکٹر	اسلام کا سیاسی نظام	قندیل	ص ۷	۲۳/جنوری ۱۹۶۶ء
عبدالجبار	قیام پاکستان کا مقصد	صحیفہ اہل حدیث	ص ۲۳	۱۶/جولائی ۱۹۶۵ء
غازی، عبدالحمید	اعلان تاشقند	لاہور	ص ۶ تا ۷ + ۱۲	۲۴/جنوری ۱۹۶۶ء
فضل حمید	قانون سازی اور عمرانی اصلاحات	الرحیم	ص ۹۳ تا ۱۰۰	۵ جنوری ۱۹۶۶ء
قاسمی، احمد ندیم	لاہور کے شہری محاذ کی چند جھلکیاں	چراغ راہ	ص ۱۲۳ تا ۱۲۶	؍؍
کوثر نیازی	صدر ایوب کا دورۂ افغانستان	شہاب	ص ۳ + ۱۴	۹/جنوری ۱۹۶۶ء
ممتاز احمد	۱۷ دن اور ہماری قوم ــــ فوجی محاذ پر	چراغ راہ	ص ۱۱۹ تا ۱۲۰	جنوری ۱۹۶۶ء
ممتاز احمد	۱۷ دن اور ہماری قوم ــــ عوامی محاذ پر	؍؍	ص ۱۲۱ تا ۱۲۲	؍؍
محمد تقی، سید	برصغیر کی سیاسی تاریخ کا سب سے بڑا گناہ	جنگ کراچی	ص ۵ + ۸	۳/جنوری ۱۹۶۶ء
محمد تقی عثمانی	حالیہ جنگ میں پاکستان کی عظیم الشان فتح [2]	المنبر	ص ۹ تا ۱۰	۷/جنوری ۱۹۶۶ء
ــــ	تاشقند ــ تاریخ کے آئینہ میں	جنگ کراچی	آخری صفحہ	۵/ ؍؍
ــــ	بڑھا دیتے ہیں ٹکڑا سرفروشی کے فسانے میں [3]	چراغ راہ	ص ۸۹ تا ۹۸	جنوری ۱۹۶۶ء
ــــ	آزمائش [4]	؍؍	ص ۷۳ تا ۸۵	؍؍

---

[1] مغربی پاکستان کے محاذوں کا آنکھوں دیکھا حال

[2] مولانا محمد تقی شفیع اور مولانا محمد یوسف بنوری صاحبان کے سفر مشرقی پاکستان کی روداد

[3] حالیہ جنگ کے شہدا اور سرفروش مجاہدین کی تابناک زندگی کے کچھ پہلو ۔ ماخوذ از اخبارات و رسائل مختلفہ

[4] حالیہ جنگ کے دوران میں علمی، ادبی اور سیاسی تخلیقات اور تجربات مشاہدات اور تاثرات پر مبنی تحریرات کے اقتباسات ۔ انتخاب از اخبارات و رسائل ۔

—	۶ ستمبر (۱۹۶۵ء) ۔ لہ	چراغ راہ ص ۲۵ تا ۳۸	جنوری ۶۶ء
—	اخوان المسلمون عراق کا پریس نوٹ		
	مترجم معروف شاہ شیرازی	آئین ص ۸ تا ۹	۱۰ جنوری ۶۶ء

شخصیات

آزاد، مولانا ابوالکلام

، مولانا ابوالکلام	عید الفطر	جنگ کراچی ص ۲۲	۲۴ جنوری ۶۶ء
"	رات کے پچھلے پہر کی خلوت	المنبر ص ۹	۳۱ دسمبر ۶۵ء
"	عید ــ مسرت و شادمانی یا ماتم و اندوہ کا دن	" ص ۷	۲۱ جنوری ۶۶ء
"	تاسیس و تجدید	الشجاع ص ۶۵ تا ۶۶	جنوری ۶۶ء

اقبال، علامہ

بن قریشی، ڈاکٹر	اقبال کی بعض نظموں کے مآخذ	اردو ص ۱۳ تا ۳۴	"
نش بجا، ملک	سرزمین شاعر مشرق	چٹان ص ۱۵	۳۱ جنوری ۶۶ء
حکیم، خلیفہ	اقبال کے ہاں تقدیر کا تصور	اقبال ریویو ص ۱۴۳ تا ۱۴۸	جنوری ۶۶ء
" "	اقبال اور تصوف	" ص ۱۴۹ تا ۱۵۳	"
" "	اقبال کا فلسفہ خیر و شر	" ص ۱۳۶ تا ۱۴۲	"
" "	علامہ اقبال سے میری ملاقات	" ص ۱۲۹ تا ۱۳۵	"

عبدالحکیم، خلیفہ

، قاضی ایم	خلیفہ صاحب کی ممتاز شخصیت	اقبال ریویو ص ۱ تا ۸	جنوری ۶۶ء

بھارتی حملہ کی خبر سن کر پاکستان و بیرون پاکستان کے سیاستدانوں، تعلیمی ماہرین، ادیبوں، شاعروں وغیرہ کے تاثرات۔ ان میں ابوالاعلیٰ مودودی، محمود حسین، الطاف گوہر، ابوالخیر کشفی، ماہر القادری، ابو اللیث صدیقی وغیرہم متعدد حضرات شامل ہیں۔ رہ گئے ہیں۔ مرد ہوی۔

"تذکرہ" اور الہلال سے چند اقتباسات

مصنف	عنوان	رسالہ	صفحات	تاریخ
انور خلیل، محمد	خلیفہ صاحب کا فلسفۂ مذہب	اقبال ریویو	ص ۵۰ تا ۷۱	جنوری ۶۶ء
باقر، محمد	ضابطۂ بزرگ خوش گفتار	"	ص ۹ تا ۱۵	"
بدر، خواجہ	خلیفہ عبدالحکیم مرحوم	"	ص ۱۷ تا ۲۵	"
حبیب، کمال محمد	خلیفہ صاحب کی نظر میں اسلام اور ارتقا کا تفاوق	"	ص ۱۱۱ تا ۱۲۳	"
رشدی، محمد حبیب اللہ	خلیفہ عبدالحکیم اور عثمانیہ یونیورسٹی	اقبال ریویو	ص ۲۷ تا ۳۹	"
زاہد حسین	مذہب کا پیرایۂ بیان اور خلیفہ صاحب کا نظریہ	"	ص ۷۲ تا ۹۰	"
عبدالحمید، کمالی	خلیفہ صاحب کا فلسفۂ عمومی	"	ص ۹۱ تا ۱۱۰	"
عبداللہ قریشی، محمد	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم	"	ص ۱۲۴ تا ۱۲۸	"
محمد عثمان	خلیفہ عبدالحکیم، ایک مفکر اسلام	"	ص ۴۰ تا ۴۹	"
ممتاز حسن	خلیفہ عبدالحکیم کی زندگی کا آخری دن	"	ص ۱ تا ۸	"

دیگر شخصیات

مصنف	عنوان	رسالہ	صفحات	تاریخ
ارشد، رشید احمد	شیخ عبدالوہاب شعرانی	بینات	ص ۲۵ تا ۲۶	"
افتخار حسین، آغا	سمرسٹ مام - عہد حاضر کا ایک عظیم داستان گو	افکار	ص ۱۸ تا ۲۴	
انور سدید	مولانا صلاح الدین احمد کی یاد میں	اوراق	ص ۹۴ تا ۹۹	۱۹۶۵ء
آسی ضیائی	ایک دلنواز، منافق ادب، شوکت تھانوی	سیارہ	ص ۳۱ تا ۳۷	جنوری ۶۶ء
باقر، آغا محمد	مولانا صلاح الدین احمد کی یاد میں	اوراق (شمارہ خاص)	ص ۸۹ تا ۹۳	۶۵ء
برنی، ضیاء الدین احمد	مولانا محمد علی جوہر	جنگ کراچی	ص ۳	۵ جنوری ۶۶ء
جاوید اختر، سید	اصغر گونڈوی	تہذیب الاخلاق	ص ۴۹ تا ۵۸	جنوری ۶۶ء
[illegible]	محمد علی	انجام کراچی	ص ۲	۳۰ "
	ڈاکٹر عترت حسین زبیری	قومی زبان	ص ۱۳ تا ۱۸	جنوری ۶۶ء
	(عبدالعزیز) خالد کی ایک جھلک	شہاب	ص ۹ تا ۱۰	۱۷ جنوری ۶۶ء
اقتباسات	شاہ ولی اللہ۔ سوانح حیات اور ماحول، مترجم خالد مسعود	الرحیم	ص ۲۷ تا ۵۰	جنوری ۶۶ء
	سندھ کے بعض قدیم اردو شاعر	اردو نامہ	ص ۳۵ تا ۴۰	دسمبر ۶۵ء

راشدی، پیر حسام الدین	ڈاکٹر عترت حسین زبیری	اردو نامہ ص ۴۹ تا ۵۵ دسمبر ۶۵ء
رشید احمد بٹ	مولانا حسرت موہانی	انجام کراچی ص ۵ ۳ر شوال سنہ ۱۳۸۵ھ
شمیم احمد	سید عابد علی عابد	قومی زبان ص ۱۹ تا ۲۲ جنوری سنہ ۶۶ء
شورش کاشمیری	اے ڈی اظہر اور ضمیر جعفری ۔ بسلسلہ قلمی چہرے	چٹان ص ۴ + ۱۷، ۲۷ر دسمبر سنہ ۶۵ء
"	قلمی چہرے [۵۱]	" ص ۶ تا ۷ + ۱۴، ۳ر جنوری سنہ ۶۶ء
"	قلمی چہرے [۵۲]	" ص ۴ ۱۰ر "
"	قلمی چہرے [۵۳]	" ص ۴ + ۲۹ ۲۴ر "
"	قلمی چہرے [۵۴]	" ص ۱۰ تا ۱۱ ۳۱ر "
"	حضرت خدیجۃ الکبریٰ	" ص ۲ + ۱۹ ۱۰ر "
شوکت علی، مولانا	جوہر (مولانا محمد علی) کے آخری ایام	جنگ کراچی ص ۳ ۵ر جنوری سنہ ۶۶ء
طارق بن یوسفی	بانیٔ پاکستان ... محمد علی جناح	مشرق ص ۱۳ تا ۱۵ دسمبر سنہ ۶۵ء
"	مولانا محمد علی جوہر	انجام کراچی ص ۵ ۔ ۳ر جنوری سنہ ۶۶ء
طفیل، محمد	یاس یگانہ چنگیزی	نیرنگ خیال ص ۹ تا ۱۰ جنوری سنہ ۶۶ء
عاشق حسین بٹالوی	مارمیڈیوک پکتھال	قندیل ص ۱۲ ۲۳ر جنوری سنہ ۶۶ء
عبدالرحمٰن لودھیانوی، ایم	سوانح قدسیہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی	خدام الدین ص ۷ تا ۹ ۳۱ر دسمبر سنہ ۶۵ء
عبدالرشید، حکیم	مسیح الملک حافظ حکیم محمد اجمل خاں	چٹان ص ۱۵ ۱۰ر جنوری سنہ ۶۶ء
عبدالعزیز قادری، مولانا ابوسعید	بیاد شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی	خدام الدین ص ۱۱ تا ۱۲ ۷ر جنوری سنہ ۶۶ء
عبدالماجد دریا بادی	شبلی ۔ انسان ۔ مصنف ۔ مصنف گر	نقوش ص ۱۱۷ تا ۱۲۴ سنہ ۱۹۶۵ء
عرش صدیقی	ٹی۔ ایس، ایلیٹ	اوراق (شمارہ خاص) ص ۱۸۱ تا ۱۹۰ سنہ ۶۵ء
عمر فاروق مودودی	حضرت عمر بن عبدالعزیز	آئین ص ۶ تا ۹ ۳۱ر جنوری سنہ ۶۶ء

۵۱؎ اس نمبر میں شیخ محمد اکرام، میاں محمد شفیع اور سردار کریم نواز کے قلمی چہرے ہیں۔

۵۲؎ مولانا احتشام الحق تھانوی، مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا غلام اللہ خاں اور مفتی محمد شفیع صاحبان

۵۳؎ اس نمبر میں جناب الطاف حسین گوہر، جناب سید قاسم رضوی اور جناب سید منیر حسین شاہ صاحب کے قلمی چہرے تحریر فرمائے ہیں۔

۵۴؎ سید عبدالحمید عدم، استاد دامن، احسان دانش، عابد علی عابد، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، وقار انبالوی، رئیس امروہوی۔

کلیم اختر	علامہ لطیف انور۔ عہد حاضر کا ایک حقیقت پسند شاعر!	قندیل ص ۶+۱۵ ۲؍جنوری سنہ ۶۵ء
"	اکبر الہ آبادی	جام نو کراچی ص ۱۳ تا ۱۸ جنوری سنہ ۶۶ء
محمد اسلام، حافظ	ایک مخلص اور بہادر رہنما[1]	جنگ کراچی ص ۲ ۵؍جنوری سنہ ۶۶ء
محمد عیسیٰ	سمیع الحق (علیگ) مخلص سیاسی رہنما	انجام کراچی ص ۴ ۳؍جنوری سنہ ۶۶ء
میر، جعفر علی	مولانا محمد علی جوہر[2]	چٹان ص ۱۱ تا ۱۲ ۱۰؍ "
میر منظور حسین	لاہور میں یوم چودھری افضل حق[3]	" ص ۱۷ تا ۱۸ ۱۷؍ "
میمونہ انصاری	غالب کی شاعری میں فرد کا تصور	تہذیب الاخلاق ص ۲۸ تا ۳۶ جنوری سنہ ۶۶ء
وزیر آغا	مولانا صلاح الدین احمد کی یاد میں[4]	اوراق (خاص نمبر) ص ۱۰۰ تا ۱۰۴ سنہ ۱۹۶۵ء
وفا راشدی	رضا علی وحشت اور ان کے معاصرین	مخزن ص ۱۱ تا ۱۳ ۱۳؍جنوری سنہ ۶۶ء
ناز، ایم ایس	مولانا محمد علی جوہر	قندیل ص ۱۰ تا ۱۱ ۲؍ "
نجید، حمید اصغر	مر گئے ہم تو زمانہ نے بہت یاد کیا[5]	چٹان ص ۷+۱۴ ۱۰؍جنوری سنہ ۶۶ء
نور الحق قریشی	حضرت مولانا احمد علیؒ[6]	خدام الدین ص ۲۱ ۲۱؍۲۸؍جنوری سنہ ۶۶ء

عالم اسلامی اور اس کے مسائل

راشدی، پیر علی محمد	تاریخ کا حالیہ دور اور عالم اسلام	المنبر ص ۷ تا ۸ ۱۴؍جنوری سنہ ۶۶ء
عاطر ہاشمی	عالم اسلام کا اتحاد	" ص ۵+۱۰ ۲۸؍جنوری سنہ ۶۶ء
معین الدین، مولانا۔ مرتب، رفیع الدین ہاشمی	عالم اسلام کے مسائل	آئین ص ۹ تا ۱۰ ۱۳؍دسمبر سنہ ۱۹۶۵ء

---

[1] مولانا محمد علی جوہر کے ایک رفیق مولانا عبدالحمید بھاشانی سے انٹرویو

[2] لاہور میں یوم محمد علی کی تقریب کی روداد

[3] چودھری صاحب مرحوم کی یاد میں جلسہ کی روداد اور مقررین کی تقاریر کا خلاصہ۔ اس جلسہ سے شورش کاشمیری، امجد حسین، غلام محمد خاں لوندخور، عبداللہ ملک، مظفر علی شمسی، سید عالی رضوی، ماسٹر تاج الدین اور قمر الحق پاشا ابن چودھری افضل حق مرحوم نے خطاب کیا

[4] سرگودھا اکاڈمی کے ایک خاص اجلاس میں پڑھا گیا۔

[5] چودھری افضل حق اور حکیم محمد اجمل خاں کا تذکرہ

[6] منقولا از روزنامہ مشرق لاہور

نجید، حمید اصغر	عرب و عجم کا اتحاد	چٹان	ص ۱۰ تا ۱۲	۲۷ دسمبر ۶۵ء

کتابیات

ابو سلمان شاہجہانپوری	نئے خزانے (جولائی ۶۵ء کے رسائل و اخبارات کا موضوع وار اشاریہ)	قومی زبان	ص ۱۵ تا ۱۷	جنوری ۱۹۶۶ء
احمد سجاد	تحریک پاکستان[1]	فاران	ص ۳۷ تا ۴۷	״
افسر امروہوی	گنج ہائے گرانمایہ (مخطوطات انجمن ترقی اُردو کی وضاحتی فہرست	قومی زبان	ص ۳۳ تا ۹	״
برنی، ضیاء الدین احمد	رسالوں پر طائرانہ نظر	کتابی دنیا	ص ۱۹ تا ۲۱	״
غالب، مرزا اسد اللہ خاں	مثنوی ابر گہر بار[2]	اردو	ص ۱۲۵ تا ۱۶۰	״
نعمانی، مولانا محمد عبدالرشید	نادر مخطوطات	فاران	ص ۳۰ تا ۳۵	״

لسانیات

اردو نامہ	اردو لغت (۱۶)	اردو نامہ	ص ۳۰۳ تا ۳۱۸	دسمبر ۱۹۶۵ء
سہیل بخاری ڈاکٹر	اُردو "تھا" کا ماخذ	اردو زبان	ص ۱۱ تا ۱۷	فروری ۶۶ء
״	الفاظ کا مطالعہ	اوراق (شمارہ خاص)	ص ۲۲۹ تا ۲۳۹	۶۵ء
شوکت سبزواری، ڈاکٹر	اشتقاقات	اردو نامہ	ص ۶۷ تا ۷۷	دسمبر ۱۹۶۵ء
״	ترادفی مرکبات	اُردو	ص ۷ تا ۱۱	جنوری ۶۶ء
عترت حسین زبیری	تالیف لغت کا مسئلہ	اردو نامہ	ص ۴۶ تا ۴۸	دسمبر ۱۹۶۵ء
عصمت جعفری، بیگم	لوبھ ماں لابھ نا (باگڑی بولی کا ایک نمونہ)	״	ص ۲۷ تا ۳۴	״
عین الحق	چند لسانی مسائل	״	ص ۱۵ تا ۲۶	״
غضنفر امروہوی	قواعد و املا کی بحث	״	ص ۶۷ تا ۷۳	״

---

[1] ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی انگریزی کتاب "پاکستان کے لئے جد و جہد" پر ایک فاضلانہ تنقید۔

[2] جناب مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی کے مقدمے اور جناب تحسین سروری کے ابتدائیہ کے ساتھ مثنوی کا ایک حصہ ــ مسلسل

ندرت نقوی، سید — متحدالاصل لسانی سرمایہ — اردو نامہ ص ۵۶ تا ۶۶ دسمبر ۱۹۶۵ء

معاشیات

ابن نذیر	۱۷ دن اور ہماری قوم — معیشت پر ایک نظر	چراغ راہ	ص ۱۱۷ تا ۱۱۸ جنوری ۶۶ء
حمزہ علوی، و امیر خسرو	پاکستان اور امریکی امداد کا بوجھ[۱]	منشور	ص ۱۳ تا ۱۵ "

مذہبیات

اخلاق و تصوف اور دعوت اصلاح و تجدید

جعفری، رئیس احمد	تصوف میں ایک نئے مسلک کی بانی حضرت رابعہ بصریہ	انجام کراچی	ص ۳ ۱۷ جنوری ۶۶ء
رشدی، محمد حبیب اللہ	یونانی اور اسلامی اخلاقیات کا تقابل	انجام کراچی	ص ۵ ۲۹ " "
عبدالحمید سورتی، مولانا	تحقیق وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود	الرحیم	ص ۸۵۴ تا ۹۲۴ جنوری ۶۶ء
محمد تقی عثمانی	مشرقی پاکستان میں — بسلسلہ مجلس دعوت و اصلاح	شہاب	ص ۸ تا ۱۰ ۲ جنوری ۶۶ء
"	مشرقی پاکستان میں چند روز[۲]	"	ص ۸ تا ۱۰ ۹ جنوری ۶۶ء

حدیث

جمیل، مبارک	علم حدیث	مجلۃ الجامعہ	ص ۳۲ تا ۵۶ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۵ء
عبدالستار، مولانا ابو محمد	نصرۃ الباری - شرح صحیح بخاری[۳]	صحیفۂ اہل حدیث	ص ۲۵ تا ۳۲ ۳ مئی ۶۵ء

سیرت و سنت نبوی

ابو طاہر فاروقی	ہمارا آقا (صلی اللہ علیہ وسلم)	لاہور	ص ۵ ۳۱ جنوری ۶۶ء

---

[۱] ایک انگریزی کتاب "پاکستان ٹوڈے" کا ترجمہ جو بالاقساط شائع ہوگا۔

[۲] مجلس دعوت و اصلاح اور تنظیم و تبلیغ کے سلسلے میں مفتی محمد شفیع صاحب اور مولانا محمد یوسف بنوری صاحب کے سفر کی روداد

[۳] حضرت مولانا ابو محمد عبدالستار صاحب مدظلہ کے قلم سے بخاری شریف کی ایک محققانہ شرح ۲۴ جنوری ۶۶ء تک کے پرچے پیش نظر ہیں۔ ان میں ۲۴۸ صفحے شرح کے شائع ہو چکے ہیں۔

السباعی، ڈاکٹر مصطفیٰ الحسنی	مستشرقین کا تصور سنت	بینات	ص ۳۷ تا ۴۱	جنوری ۶۶ء
الشیخ الاصفہانی (مترجم) محمد احمد	اخلاق النبی	//	ص ۱۲ تا ۲۴	//
فارانی، ابو طاہر	ہمارا آقا (صلی اللہ علیہ وسلم)	لاہور	ص ۵ + ۱۱	۱۰ر جنوری ۶۶ء
—	مکتوب مقدس نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	الام	ص زائد صفحہ	مئی ۶۵ء

عبادات

جہاد

سعیدہ پروین	جہاد	خدام الدین	ص ۱۰	۷ جنوری ۶۶ء
عبدالحمید، قاری	افضل جہاد	//	ص ۱۵ تا ۱۶	۷ر جنوری ۶۶ء
عظمت تفہیمی	نفیر جہاد	//	ص ۷ تا ۹ + ۱۸	۱۴ر //
محمد امین	جہاد بالحامل	//	ص ۸ تا ۹	۷ر جنوری ۶۶ء
محمد شفیع، مفتی	جہاد اور اس کے فضائل	بینات	ص ۳۴ تا ۳۵	جنوری ۶۶ء
// //	مومن کا جہاد	چٹان	ص ۹	۳ر جنوری ۶۶ء
// //	جہاد کی تیاری اور سامان جنگ کی فراہمی	//	ص ۱۶ تا ۱۸	۱۰ر //

روزہ وزکوٰۃ

الحسینی، مختار احمد	رمضان المبارک	خدام الدین	ص ۶ + ۱۷	۳۱ر دسمبر ۶۵ء
انور، مولانا عبید اللہ	ماہ رمضان المبارک اور قرآن کریم	//	ص ۵ تا ۶	۷ر جنوری ۶۶ء
// //	رمضان کے روزے۔ زندگی کی پاکیزگی کا ذریعہ	//	ص ۵ + ۱۰	۳۱ر دسمبر ۱۹۶۵ء
// //	رمضان المبارک۔ دلوں کی اصلاح کا ذریعہ	//	ص ۴	۳۱ر //
سیف، عبدالحکیم	فلسفہ روزہ	صحیفہ اہل حدیث	ص ۱۴ تا ۱۵	۲۵ر دسمبر ۶۵ء
کوثر نیازی	رمضان المبارک ... [1]	شہاب	ص ۲، ۳ + ۴	۱۴ر جنوری ۶۶ء

---

[1] "شام ہمدرد" کے ماہانہ اجتماع سے مدیر شہاب جناب کوثر نیازی صاحب کا خطاب۔ تقریر کا یہ حصہ ریڈیو پاکستان سے بھی نشر ہوا اور روزنامہ مشرق لاہور میں بھی شائع ہوا ہے۔

محمد زکریا ، مولانا	فریضۂ زکوۃ	جنگ کراچی	ص ۲۱	۲۴ جنوری ۶۶ء

قرآن اور علوم قرآنی

برہان احمد فاروقی ، ڈاکٹر	قرآنی علم اور اس کا مسئلہ	انجام کراچی	ص ۳	۳ شوال ۱۳۸۵ھ
زاہد الحسینی مرتب محمد عثمان غنی	درس قرآن ۔ سورہ بقرآیت ۱۸۳ تا ۱۸۸	خدام الدین	ص ۵ تا ۱۰	۱۴ جنوری ۶۶ء
سیگا لوف	صحیفہ عثمانی تاشقند میں	امام	ص ۳۱ تا ۳۲	مئی ۶۵ء
عبدالرحمٰن لودھیانوی ، ایم	آخری الہامی کتاب	خدام الدین	ص ۱۹ تا ۲۰	۲۱/۲۸ جنوری ۶۶ء
عبدالستار ، مولانا ابو محمد	تفسیر ستاری (ساتواں پارہ)	صحیفہ اہل حدیث	ص ۷۲ تا ۸۰	۳ مئی ۶۵ء
" "	تفسیر ستاری (ساتواں پارہ)	"	ص ۶۱ تا ۸۸	۱۸ مئی ۶۵ء
عزیز اللہ خاں	ایاک نعبد کا صحیح مفہوم	"	ص ۱۵ تا ۱۷	۱۷ جون ۶۵ء
محمد شفیع ، مفتی	معارف القرآن	شہاب	ص ۷	۲ جنوری ۶۶ء
" "	معارف القرآن (سورہ ہود آیت ۷۶ تا ۸۳)	"	ص ۷	۹ جنوری ۶۶ء
	معارف القرآن (سورہ ہود کی چند آیات کا ترجمہ اور تفسیر)	"	ص ۷	۱۶ " "
محمد شفیع ، مفتی	معارف القرآن (سورہ ہود رکوع ۸)	شہاب	ص ۷	۲۳ " "
محمد مصطفی ، مولانا	(تفسیر) ایاک نعبد و ایاک نستعین	فاران	ص ۲۸ تا ۲۹	جنوری ۶۶ء
مقبول احمد ، قریشی	علم تفسیر کی ابتدا اور ارتقا	مجلۃ الجامعہ	ص ۹ تا ۱۲	اکتوبر تا دسمبر ۶۵ء
مودودی ، ابوالاعلیٰ	تفہیم القرآن ۔ سورۃ الفتح	ترجمان القرآن	ص ۱۷ تا ۱۹	جنوری ۶۶ء
نجیب ، حمید اصغر	قرآن مجید کا اردو زبان میں ترجمہ ۔ حضرت شاہ عبدالقادر سے مولانا احمد علی تک	چٹان	ص ۱۰ تا ۱۲	۱۷ جنوری ۶۶ء

مسائل و مباحث

ابو سلمان شاہجہاں پوری	زردشت ۔ اس کا مذہب اور تعلیم	لاہور	ص ۱۰ تا ۱۲	۲۴ جنوری ۶۶ء
ابو حفص عثمانی ، مولانا	حضرت ابراہیم کا والد ۔ (از روئے کتب شیعہ)	صحیفہ اہل حدیث	ص ۱۰ تا ۱۳	ستمبر ۶۵ء
احمد علی لاہوری ، مولانا	قربانی کا تصور اور جذبات ابراہیمی	امام	ص ۲۱ تا ۲۴	مئی ۶۶ء
اسعد گیلانی ، سید	اسلام اور بین الاقوامی امن	آئین	ص ۸ تا ۹	۱۳ دسمبر ۶۵ء

...ن گیسو دراز پاکستانی، مولانا محمد مرزا منور علی بیگ — حمایت ضبط ولادت (قرآن و حدیث میں) — الارشاد ص ۲۲ تا ۲۷ ۱۶ اگست یکم ستمبر ۶۵ء

〃 — تصاویر (فوٹوگرافی از روئے قرآن ....) — صحیفہ اہل حدیث ص ۱۳ تا ۱۶ ۱۳ ستمبر ۶۵ء

...یرالبیان — تقلید کیا ہے ؟ — صحیفہ اہل حدیث ص ۹ تا ۱۷ اکتوبر ۶۵ء

...ارت علی قریشی، ڈاکٹر — قرآنی عمرانیات کا مطالعہ — سیارہ ص ۲۵ تا ۳۰ جنوری ۶۶ء

...عیدالزماں، سید — شہد اور قرآن حکیم — مشرق ص ۳۶ تا ۳۷ دسمبر ۶۵ء

...اد فاروقی — کائنات کا مقصد تخلیق اسلامی نقطۂ نظر سے — عارف ص ۲۹ تا ۳۴ جنوری ۶۶ء

...بدالطیف بہاولپوری — تحویل قبلہ — مجلۃ الجامعہ ص ۱۷ تا ۳۱ اکتوبر تا دسمبر ۶۵ء

...بدالعزیز بن باز — برتھ کنٹرول - اسلامی نقطۂ نظر سے — صحیفہ اہل حدیث ص ۹ تا ۱۲ ۱۵ اگست ۶۵ء

...مد شفیع، مفتی و بنوری، محمد یوسف — رؤیت ہلال کا شرعی نظام — حریت ص ۳ + ۹ ۲۹ جنوری ۶۶ء

...مودودی، ابو الاعلیٰ — امام ابو حنیفہ کا کارنامہ (۲) — ترجمان القرآن ص ۳۰ تا ۴۳ جنوری ۶۶ء

نفسیات

افتخار حسین، آغا — انسان فطرتاً جنگ پسند ہے — نقش ص ۱۱۵ تا ۱۲۴ ۱۹۶۶ء

رئیس امروہوی — ۱۹۶۵ء پر ایک نظر — جنگ کراچی ص ۵ ۳ جنوری ۶۶ء

〃 — درمیانی طبقے کی الجھنیں — 〃 ص ۵ ۱۷ جنوری ۶۶ء

〃 — تجربات اور معروضات — 〃 ص ۵ ۳۱ جنوری ۶۶ء

وفیات

ابراہیم جلیس — آہ مولانا جلالی — انجام ص ۲ ۳ جنوری ۶۶ء

اشرف، حکیم عبدالرحیم — مولانا عبدالغنی خانپوری کی رحلت — المنبر ص ۴ + ۱۰ ۱۴ جنوری ۶۶ء

بنوری، مولانا محمد یوسف — مولانا عبدالرحمٰن — بینات ص ۲ تا ۵ جنوری ۶۶ء

خاندہ علاء الدین — آہ! بدرالحسن چل بسے — کتابی دنیا ص ۲ تا ۳ + ۲۱ 〃

شورش کاشمیری — لال بہادر شاستری — چٹان ص ۱ ۱۷ جنوری ۶۶ء

〃 — اے ڈی ایم مصطفیٰ (ابوطیب محمد مصطفیٰ) — 〃 ص ۱ ۱۷ 〃

پروفیسر میاں محمد شریف — اقبال ریویو صحیفہ خاص جنوری ۶۶ء

ـــــــ	تلوک چند محروم		کتابی دنیا ص ۱۶ جنوری سنہ ۱۹۶۶ء

مطبوعات جدیدہ (نئی کتابوں اور رسالوں پر تبصرے)

نام	مصنف	تبصرہ نگار	حوالہ
ادب کی آڑ میں	رشید احمد لاشاری	ـــــــ	آئین ص ۱۳ ۳۱ دسمبر سنہ ۶۵ء
ادب و اخلاق	فردوس رحمانی	ا ۔ ح ۔ ق	اردو ڈائجسٹ ص ۱۷۶ جنوری سنہ ۶۶ء
ادیب سخن	سید ابوالحسن زنگ سکھڑی	ـــــــ	انجام کراچی ص ۵ ۳ جنوری سنہ ۶۶ء
اسلام اور اسکے ہم عصر مذاہب	محمود احمد بریلوی	ـــــــ	ترجمان القرآن ص ۶۴ تا ۶۵ جنوری سنہ ۶۶ء
اسلام اور اصول حکمت	شیخ عبدالرزاق	ص ۔ ا ۔ ب	کتابی دنیا ص ۱۷ تا ۱۸ ״
اقبال اور نظریہ پاکستان	نعیم صدیقی	ـــــــ	فاران ص ۵۸ تا ۵۹ ״
انوار قدسیہ	علامہ عبدالوہاب شعرانی	ح ۔ ا ۔ ن	چٹان ص ۲۰ ۲۴ جنوری سنہ ۶۶ء
انوار قدسیہ	شیخ عبدالوہاب شعرانی	ـــــــ	انجام کراچی ص ۵ ۳۱ جنوری سنہ ۶۶ء
اوراق لاہور	ـــــــ	عاشق جعفری	اردو زبان ص ۵۰ + ۵۲ فروری سنہ ۶۶ء
آزمائش کی گھڑی	مسکین حجازی	ح ۔ ا ۔ ن	چٹان ص ۲۷ ۲۴ جنوری سنہ ۶۶ء
آزادی کے آدم خور وحشی	مقبول جہانگیر	ر ۔ د ۔ ہ	آئین ص ۱۴ ۱۰ جنوری سنہ ۶۶ء
بلوچی لوک گیت	مرتب و مترجم:۔ عطا شاد و عین سلام	ا ۔ ح ۔ ق	اردو ڈائجسٹ ص ۱۷۵ تا ۱۷۶ جنوری سنہ ۶۶ء
بنک معاشیات	محمد مقیم شیخ	ـــــــ	ترجمان القرآن ص ۶۸ جنوری سنہ ۶۶ء
پالیٹیشین اینڈ ایوب	زیڈ اے سلہری	ـــــــ	انجام کراچی ص ۵ ۱۷ جنوری سنہ ۶۶ء
پنج سالہ رپورٹ انجمن ترقی طب پاکستان	حکیم محمد سعید	ـــــــ	فاران ص ۶۲ جنوری سنہ ۶۶ء
پھولوں کے محل	صادق حسین	سجاد نقوی	اوراق ص ۳۰۲ تا ۳۰۳ دسمبر سنہ ۶۵ء
تذکرہ صوفیائے بنگال	اعجاز الحق قدوسی	ـــــــ	انجام کراچی ص ۵ جنوری سنہ ۶۶ء
تذکرۃ المفسرین	قاضی زاہد الحسینی	ـــــــ	ترجمان القرآن ص ۶۳ ״
تزک بابری	بابر مترجم رشید اختر ندوی	محمد سرور	الرحیم ص ۵۷۵ تا ۵۷۶ ״
تعارف مدنیت	محمد امین جاوید	ا ۔ ح ۔ ق	اردو ڈائجسٹ ص ۱۷۶ ״

تعلیمات مجددیہ - مکتوبات کے آئینے میں - ملک حسن علی بی اے جامعی		———	خدام الدین ص ۱۷ تا ۱۸ ، ۷ جنوری سنہ ۶۶ء
تعارف منطق جدید	قاضی عبدالغفار	———	انجام کراچی ص ۵ ۳۱ جنوری سنہ ۶۶ء
تعلیمات مجددیہ	ملک حسن علی بی اے جامعی	———	ترجمان القرآن ص ۶۵ تا ۶۶ جنوری سنہ ۶۶ء
تفسیر معارف القرآن	محمد ادریس کاندھلوی	———	" ص ۶۸ "
تلاش منزل	ایم اسلم	خ - ح - ش	اردو نامہ ص ۸۸ تا ۸۹ دسمبر سنہ ۶۵ء
تین شاعر	ڈاکٹر محی الدین قادری زور	ح - ا - ن	چٹان ص ۲۸ ۲۴ جنوری سنہ ۶۶ء
جب ملت بیدار ہوئی	اسعد گیلانی	———	انجام کراچی ص ۵ ۱۷ جنوری سنہ ۶۶ء
جب ملت بیدار ہوئی	اسعد گیلانی	———	سیارہ ص ۸۶ جنوری سنہ ۶۶ء
جب ملت بیدار ہوتی ہے	اسعد گیلانی	———	آئین ص ۱۳ ۳۱ دسمبر سنہ ۱۹۶۵ء
جنگ کشمیر	ایوب خاں سید دخیل	عبدالرحمن شوق	عارف ص ۴۶ جنوری سنہ ۱۹۶۶ء
جہاد کے ترانے	مرتب: سید منیر علی جعفری	شمیم جاوید	فکر و خیال ص ۵۸ نومبر دسمبر سنہ ۱۹۶۵ء
چاکی واڑہ میں وصال	محمد خالد اختر	انور سدید	اوراق ص ۹۳ تا ۹۵ سنہ ۱۹۶۵ء
چاندنی کی پتیاں	———	غلام حسین اظہر	" ص ۲۹۶ تا ۲۹۸ "
چشم نم	نادر جاجوی	ح - ا - ن	چٹان ص ۱۳ ۱۷ جنوری سنہ ۶۶ء
حیدرآباد کا عروج و زوال	بدر شکیب	———	ترجمان القرآن ص ۶۷ جنوری سنہ ۶۶ء
خاتون پاکستان - جنگ و جہاد نمبر	مرتب: شفیق بریلوی	———	لاہور ص ۲ ۳ جنوری سنہ ۶۶ء
خوشحالی کی تلاش	———	شمیم جاوید	فکر و خیال ص ۵۶ نومبر دسمبر سنہ ۶۵ء
دودِ چراغ محفل (ناول)	ذکاء الرحمن	وحید قریشی	اردو ڈائجسٹ ص ۱۷۵ جنوری سنہ ۶۶ء
دیواریں	حمید کاشمیری	———	انجام ص ۵ ۳ جنوری سنہ ۶۶ء
ذکر رسول	محمد حسام اللہ شریفی	ض - ا - ب	کتابی دنیا ص ۱۹ جنوری سنہ ۶۶ء
راہ نمائے صحت	حکیم عبدالرحیم اشرف	حمید اصغر نجید	چٹان ص ۱۹ ۳ جنوری سنہ ۶۶ء
رزمیہ مشاعرہ	———	———	لاہور ص ۲ ۳ جنوری سنہ ۶۶ء
رسول کی باتیں	مولانا احمد سعید دہلوی	———	انجام کراچی ص ۵ ۳۱ جنوری سنہ ۶۶ء
روپ رنگ	ناصر غزنوی	ا - ا	اوراق ص ۲۹۸ تا ۳۰۰ سنہ ۶۵ء
زخم گل	سرشار صدیقی	———	انجام کراچی ص ۵ ۱۷ جنوری سنہ ۱۹۶۶ء

زراعت اور ہماری معیشت	———	———	انجام کراچی	ص ۵	۳۱ جنوری سنہ ۶۶ء
زبدۃ ریاض الابرار	———	قطب عالم امروہوی	صحیفہ اہل حدیث	ص ۲۴	۱۶ جولائی سنہ ۶۶ء
صبح غزل	نور الصباح بیگم	خ ۔ ح ۔ ش	اردو نامہ	ص ۸۷	دسمبر سنہ ۱۹۶۵ء
ضرب قلم	سہیل اقبال	———	فاران	ص ۵۹ تا ۶۲	جنوری سنہ ۶۶ء
ضرب قلم (رجزیہ نغمات)	———	شمیم جاوید	فکر و خیال	ص ۵۷ تا ۵۸	نومبر دسمبر سنہ ۶۵ء
طرح وار لونڈی	منشی سجاد حسین	عصمت اللہ	اوراق	ص ۳۰۰ تا ۳۰۱	سنہ ۱۹۶۵ء
عہد بنگش کی سیاسی، علمی اور ثقافتی تاریخ	مفتی ولی اللہ فرخ آبادی مترجم:۔ حکیم شریف الزماں	———	فاران	ص ۵۴ تا ۵۵	جنوری سنہ ۶۶ء
فارقلیط	عبد العزیز خالد	———	ترجمان القرآن	ص	جنوری سنہ ۶۶ء
فقہ السنہ (حصہ دوم)	محمد عاصم	———	فاران	ص ۵۰ تا ۵۳	"
فقہ السنہ (" ")	محمد عاصم	ر ۔ د ۔ ک	آئین	ص ۱۴	۲۴ جنوری سنہ ۶۶ء
فوائد جامعہ بر عجالۂ نافعہ	شاہ عبد العزیز۔ مرتب:۔ مولانا عبد الحلیم چشتی	———	بینات	ص ۵۷ تا ۵۸	جنوری سنہ ۶۶ء
قانون شراکت	کلیم الدین انصاری	———	انجام کراچی	ص ۵	۳۱ جنوری سنہ ۶۶ء
قانون دستاویزات	کلیم الدین انصاری	———	"	ص ۵	۳۱ جنوری سنہ ۶۶ء
قانون معاہدہ	کلیم الدین انصاری	———	"	" ۵	" "
قرآن مجید مترجم بطرز جدید	———	حمید اصغر نجیب	چٹان	ص ۱۹	۳ جنوری سنہ ۶۶ء
کان پارسی	مولانا سید ابوذر بخاری	نور محمد انور	خدام الدین	ص ۲۱	۲۱/۲۸ جنوری سنہ ۶۶ء
گلبانگ جہاد	———	نازش کاشمیری	اوراق	ص ۳۰۴	سنہ ۱۹۶۵ء
گوریلا جنگ	بدر شکیب	———	انجام کراچی	ص ۵	۳ جنوری سنہ ۶۶ء
مجاہدین صف شکن	سماد صدیقی	———	"	ص ۵	"
مجلس لاہور (ترانہ نمبر)	ایڈیٹر:۔ رضوی خیرآبادی	ح ۔ ا ۔ ن	چٹان	ص ۱۴	۱۷ جنوری سنہ ۶۶ء
مخزن الولایت (ملفوظات) شاہ خادم صفی	منشی محمد ولایت علی عزیز مترجم:۔ محمد خصلت حسین صابری	———	فاران	ص ۵۳ تا ۵۴	جنوری سنہ ۶۶ء
مخزن طب و کیمیا حصہ اول	سید محمد حنیف نازش	ح ۔ ا ۔ ن	چٹان	ص ۲۸	۲۴ جنوری سنہ ۶۶ء

مسلمان سسلی میں	نصیر احمد جامعی	محمد سرور	الرحیم ص ۷۳ تا ۷۴ جنوری ۶۶ء
مسلمان عورت کہاں جارہی ہے	السیدہ نعمتہ		
	مترجم: پروفیسر یحییٰ ندوی	ــــــ	آئین ص ۱۳ ۳۱ دسمبر ۶۵ء
مسلمانوں کے سیاسی افکار	رشید احمد	ــــــ	ترجمان القرآن ص ۶۹ جنوری ۶۶ء
معاشرتی و علمی تاریخ	سید معین الحق	محمد سرور	الرحیم ص ۷۱ تا ۷۳ "
معراج المومنین	سید عابد میاں	ــــــ	انجام کراچی ص ۵ ۳۱ جنوری ۶۶ء
مقالات سیرت	محمد آصف قدوائی	ــــــ	ترجمان القرآن ص ۶۶ تا ۶۷ جنوری ۶۶ء
مکتوبات سعیدیہ	شیخ محمد سعید	وحید قریشی	اردو ڈائجسٹ ص ۱۷۳ "
منور نعتیں	منور بدایونی	ــــــ	فاران ص ۵۷ تا ۵۸ "
وضع القرأت فی السبع المتواترات	محمد حبیب اللہ	ــــــ	بینات ص ۵۹ تا ۶۰+۶۴ "
ہدائے حق	نصیر انور	ــــــ	لاہور ص ۲ ۳ جنوری ۶۶ء
در مشرق	نور الصباح بیگم	خ - ح - ش	اردو نامہ ص ۸۷ تا ۸۸ دسمبر ۶۵ء
نقطۂ نظر	عبد المغنی	وحید قریشی	اردو ڈائجسٹ ص ۱۷۴ تا ۱۷۵ جنوری ۶۶ء
ہنسی کی کرنیں	عظمت اللہ خاں	ــــــ	انجام کراچی ص ۵ ۳ جنوری ۶۶ء

(بقیہ از صفحہ ۴۷)

قرارداد (۱۹) اظہار شکریہ۔

انجمن ترقی اردو، لاہور ان تمام انجمنوں اور اداروں کا شکریہ ادا کرتی ہے جو اس مجلس مشاورت میں شریک ہوئے یا جن کی اخلاقی اور غائبانہ تائید شامل حال رہی۔

انجمن ترقی اردو، لاہور ملک کی سب اردو انجمنوں سے درخواست کرتی ہے کہ وہ اپنے اپنے حلقۂ اثر میں اردو کی خاموش تحریک کے لئے مناسب تدابیر اختیار کرکے نجی اور کاروباری دائرے میں اردو کی ترویج کی مؤثر صورتیں پیدا کریں اور اپنی سرگرمیوں کی اطلاعات اخبارات میں شائع کرانے کے علاوہ حکام تک بھی پہنچائیں۔

محرک: ڈاکٹر سید عبداللہ (لاہور)
مؤید: آفتاب احمد قریشی (لاہور)

کیا قیمت ہی سب کچھ ہے؟

جب بات صحتِ انسانی کی ہو تو ایسا نہیں ہے۔ اور ہمدرد کے ہاں تو اعلا معیار اور صحتِ دوا ہی کی اہمیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کوالٹی کے بلند معیارات کو برقرار رکھتے ہیں۔ ایک دوا معائنہ و مطالعہ کے مراحل سے گزر کر کنٹرول لیبوریٹریز کی کسوٹیوں پر کسی جاتی ہے اور اس طرح دوا کا اعلا معیار قائم رکھا جاتا ہے۔ ہم دوائیں منوں میں نہیں ٹنوں میں بناتے ہیں۔ اس لیے ہمدرد کی ادویہ مقابلتاً کم قیمت ضرور ہیں مگر قیمت کی خاطر ہم اکملیت اور صحتِ دوا کو قربان نہیں کرتے۔

ہمدرد کی خدمات

۱۔ طبِ مشرقی کو پاکستان میں ہمدرد نے زندہ کیا اور اس طب کے معیارات کو بلند تر کر کے مقبولِ خاص و عام بنایا۔
۲۔ طبِ مشرقی کی دواسازی کے اعلا معیارات قائم کیے اور سب کے لیے راہ و منزل متعین کی۔
۳۔ فنِ طب اور طبیب و مطب کے مقام کو بلند کیا۔
۴۔ پاکستان کے خاص و عام کی ناقابلِ فراموش خدمت انجام دی ہے۔
۵۔ طبِ مشرقی کی ادویہ کو پاکستان کے کونے کونے میں پہنچا دیا۔
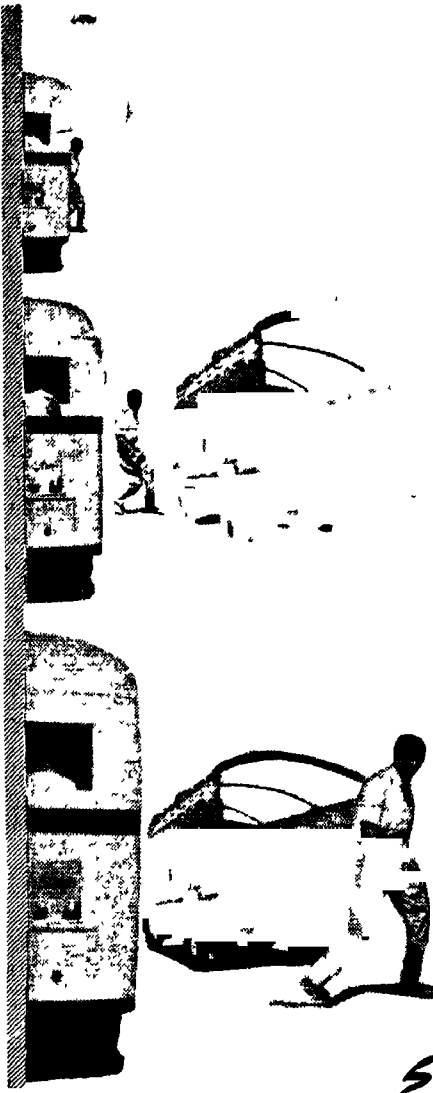
بس بال بال بچے...

خوش قسمتی سے بریک بروقت لگے
ورنہ اللہ کو پیارے ہو گئے ہوتے !
تیز رفتار بس اور اسے اوورٹیک کرتی ہوئی ٹرک
کی زد سے ذرا کم ہی بچا کرتے ہیں۔ چند لمحوں کی
دیر اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ دس بیس سال
پہلے دوسری دنیا میں پہنچ جائیں۔ سڑک پر چوکنا نہ
رہنا، جان بوجھ کر موت کو دعوت دینا ہے !

- جہاں کہیں ممکن ہو، فٹ پاتھ اور زیبرا کراسنگ استعمال کیجئے۔
- جہاں فٹ پاتھ نہ ہوں، وہاں دائیں کنارے پر یوں چلئے کہ آپ آتے ہوئے ٹریفک کو سامنے سے دیکھ سکیں
- سڑک پار کرتے وقت پہلے دائیں پھر بائیں پھر ایک بار دائیں اور دیکھ لیجئے تاکہ اطمینان ہو جائے کہ سڑک صاف ہے۔
- سڑک پار کرتے وقت ہمیشہ سیدھے اور نسبتاً تیز چلئے۔
- چلتی ہوئی بس یا ٹرام سے ہرگز نہ اتریئے اسی طرح کسی مقررہ اسٹاپ کے علاوہ اترنے کی کوشش نہ کیجئے۔
- ایسے موڑوں پر جہاں دائیں بائیں سے آنے والی گاڑیاں نظر نہ آئیں، انتہائی محتاط رہئے۔

united

کامرس بینک لمیٹڈ
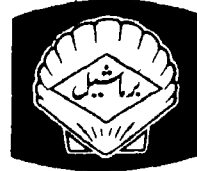
ہیڈ آفس: جوبلی انشورنس ہاؤس، میکلوڈ روڈ، کراچی

منظور شدہ سرمایہ

۲.۰۰.۰۰.۰۰۰ روپے

جاری کردہ سرمایہ

۱.۰۰.۰۰.۰۰۰ روپے

جمع شدہ رقم

۲۲.۰۰.۰۰.۰۰۰ روپے

سے اوپر

پاکستان کے تمام اہم تجارتی اور صنعتی مرکزوں میں اپنی شاخوں اور تمام دنیا میں اپنے نمائندوں کی موجودگی سے کامرس بینک بینکاری سے متعلق صنعت و تجارت کی وسیع خدمات انجام دیتا ہے

Asiatic

انجمن ترقی اردو پاکستان کا ماہوار ترجمان

قومی زبان

جلد ۲۹ شمارہ ۳

ستمبر ۱۹۶۶ء

سالانہ قیمت
دس روپے

فی پرچہ
ایک روپیہ

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ
کراچی

فہرست

جناب اختر حسین
صدر انجمن ترقی اردو

بابائے اردو کی یاد میں

آج بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی پانچویں برسی منائی جارہی ہے یہ برسی اس لئے منائی جاتی ہے کہ ہم اردو زبان کی ترقی کے لئے مولوی صاحب کی ان بے لوث اور ناقابل فراموش خدمات کو خراج تحسین پیش کرسکیں جن کے لئے انھوں نے اپنی زندگی وقف کردی تھی۔ آج ہم انھیں اس لئے اور بھی یاد کررہے ہیں۔ کہ وہ اپنے پیچھے اپنا نام ہی نہیں بلکہ عظیم الشان کارنامے بھی چھوڑ گئے ہیں۔

بابائے اردو کی علمی و ادبی حیثیت کے بارے میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ اردو کے تقریباً سبھی نقادوں اور ادیبوں نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے مرحوم کے ادبی کارناموں کا جائزہ لیا ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ان کی ادبی تنقیدات اور تحقیقی نگارشات ہر اعتبار سے اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں اور آئندہ کام کرنے والے ان تحریروں سے ہمیشہ فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔ بابائے اردو نے اردو کے قدیم ادب کو محفوظ کرنے کی روایت قائم کی تھی۔ اس پر دوسروں نے بھی عمل کیا اور آج یہ بات پورے اعتماد کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ قدیم ادبی شہ پارے جو آج ہمارے سامنے ہیں وہ بابائے اردو ہی کی توجہ سے محفوظ رہ گئے۔ اردو ادب اور زبان پر مرحوم کا یہ اتنا بڑا احسان ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

بابائے اردو کے علمی و ادبی کارناموں کیساتھ ساتھ ان کا سب سے اہم اور وقیع کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ایک عظیم ثقافتی رہنما کا کردار ادا کیا اور اس وجہ سے وہ ہماری قومی تاریخ میں منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ زبان ثقافت کا سب سے بڑا مظہر ہوتی ہے اور کسی ملک اور قوم کی خصوصیات سے پوری طرح آگاہی حاصل کرنے کا یہی سب سے اہم ذریعہ ہے متحدہ ہندوستان میں اردو کو جو ہمہ گیر حیثیت حاصل تھی اسے ختم کرنے کے لئے مختلف تحریکیں چلائی گئیں تو بابائے اردو اس کے تحفظ کے لئے سینہ سپر ہو گئے۔ انھوں نے نصف صدی سے زیادہ مدت تک جد و جہد کی۔ اور اس

یہ تقریر ۱۶ راگست ۱۹۶۶ء کو ریڈیو پاکستان کراچی سے نشر ہوئی تھی۔

عرصے میں مخالفت کے بڑے بڑے طوفانوں کا مقابلہ کیا۔ اور ایسے ایسے لوگوں کا سامنا کیا جن کو ملک کی اکثریت کی بلکہ اس وقت کی حکومت کی بھی تائید حاصل تھی۔ حکومت انگریزی زبان کے حق میں تھی۔ اور ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت ہندی بلکہ درپردہ سنسکرت جیسی مردہ زبان کو فروغ دینا چاہتی تھی ایسے عالم میں اُردو کا علم بلند کرنا ایک بڑی ہمت اور جسارت کی بات تھی۔ بابائے اُردو نے برصغیر کے گوشے گوشے میں اُردو کی اہمیت اور افادیت کو واضح کیا۔ اور اس ہمہ گیر زبان کا پیغام گھر گھر پہنچایا۔ اس وقت کی حکومت کو اُردو کے حقوق کی طرف متوجہ کیا اور اسی کے نتیجے میں یونیورسٹیوں میں اُردو کے علیحدہ شعبے قائم کئے گئے۔ اس زبان کا علمی مرتبہ بلند کرنے کے لئے لاتعداد سائنسی اور فنی کتابیں تالیف ترجمہ کرائیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام میں بھی ان کی کوششوں کو بڑا دخل رہا۔ اور اس یونیورسٹی کے پہلے ناظم دارالترجمہ کی حیثیت سے انھوں نے جو عظیم الشان علمی کام انجام دیئے ان سے سبھی واقف ہیں۔ ان تمام کاموں کے پس منظر میں جو جذبہ کارفرما تھا۔ وہ قومی ثقافت کے تحفظ ہی کا جذبہ تھا۔

قیام پاکستان کے بعد بابائے اُردو نے کراچی کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ اُردو جس کا مولد و منشا دراصل مغربی پاکستان ہے اپنے گھر میں بھی ترقی کی وہ منازل طے کرے جو اس نے برصغیر کے دوسرے خطوں میں طے کی تھیں۔ سندھ، مغربی پنجاب، صوبۂ سرحد اور بلوچستان سے اردو کا گہرا اور قدیم تعلق ہے بابائے اُردو نے اسی قدیم تعلق کی بنا پر یہاں اپنا کام شروع کیا۔ اردو کے ساتھ ساتھ علاقائی زبانوں کا مفاد بھی انھیں عزیز تھا۔ اور اس خیال کا اظہار انھوں نے متعدد موقعوں پر کیا ہے کہ اُردو علاقائی زبانوں کی حریف نہیں بلکہ ان کی ایک رفیق ہے اور اسی رفاقت کے ذریعے اردو علاقائی زبانوں سے اور علاقائی زبانیں اُردو سے بہت کچھ حاصل کر سکتی ہیں۔

بابائے اردو نے ۱۹۴۸ء سے اپنی وفات تک پاکستان میں اردو زبان کے تحفظ اور ترویج کے لئے متعدد کام انجام دئے۔ انجمن کی تنظیم اور اس کی بیشمار شاخوں کے قیام کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی کتابوں کی اشاعت کا بھی انتظام کیا بارہ برس کی قلیل مدت میں انھوں نے دوسو سے زائد علمی و ادبی اور فنی کتابیں شائع کیں لیکن ان کی اس زمانے کی سب سے بڑی یادگار اُردو کالج کا قیام ہے بابائے اُردو نے دہلی کالج اور جامع عثمانیہ کی درخشاں مثالوں کو سامنے رکھ کر یہ کالج قائم کیا، جہاں جملہ علوم و فنون کی تعلیم اُردو ہی کے ذریعے دیجاتی ہے۔ اب یہ کالج پاکستان کی ممتاز درس گاہوں میں شمار ہوتا ہے۔

بابائے اُردو کی وفات سے اُردو تحریک کو جو نقصان پہنچا اس کی تلافی مشکل سے ہو سکے گی۔ لیکن اگر ان کے کاموں کو جاری رکھا جائے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مرحوم کے روحانی فیضان سے آج بھی اُردو تحریک محروم نہیں ہے چند سال قبل جب صدر مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے مجھے انجمن کا صدر نامزد کیا تھا تو میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ

(باقی صفحہ پر)

یوم بابائے اُردو

۱۶ر اگست کا دن اردو زبان کی تاریخ میں ایک اہم دن ہے ، اسی دن اردو اپنے سب سے بڑے محسن سے محروم ہوگئی ۔ بابائے اردو کی وفات کے ساتھ ہی ایک پورے عہد کی روایات نے دم توڑ دیا۔ وہ ہمارے حال کو ہمارے ماضی سے ملانے والی آخری کڑی تھے ۔ ہر سال بابائے اردو کا یوم احترام و خلوص کے جذبات کے ساتھ منایا جاتا ہے ۔ یہ یوم رسماً نہیں منایا جاتا بلکہ اردو کے پرستار اس موقع پر اپنا جائزہ لیتے ہیں ، وہ یہ دیکھتے ہیں کہ انھوں نے کیا کچھ کیا ، وہ کیا کچھ کر رہے ہیں اور آئندہ انھیں اردو کے لئے کون کون سے کام کرنے ہیں ۔

اس سال بھی ۱۶ر اگست کو پاکستان کے مختلف حصوں میں یوم بابائے اردو منایا گیا۔ سب سے بڑی تقریب انجمن کے زیر اہتمام کراچی میں منعقد ہوئی ۔

کراچی کے تمام اخبارات نے بابائے اردو کی یاد میں خاص مضامین شائع کئے ۔ انجمن نے اپنے ماہنامہ "قومی زبان" کا ایک خاص نمبر شائع کیا۔

"قومی زبان" کا خاص نمبر شائع کیا جس میں بابائے اردو کی شخصیت اور ان کے کارناموں کے بارے میں ممتاز اہل قلم کی تحریریں شامل ہیں۔

صبح کے وقت انجمن میں قرآن خوانی ہوئی۔ بابائے اردو کے بے شمار عقیدتمندوں نے قرآن خوانی میں حصہ لیا اور بابائے اردو کے مزار پر فاتحہ پڑھی۔ متعدد لوگوں نے مزار پر پھول چڑھائے۔ بلدیہ کراچی کے وائس چیرمین جناب ضیاء اللہ نے اہل کراچی کی طرف سے مزار پر پھولوں کی چادر چڑھائی۔

شام کو پانچ بجے جلسۂ عام منعقد ہوا جس کی صدارت کے فرائض جناب اختر حسین نے انجام دیئے۔ جلسے کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ بعد ازاں بابائے اردو کی آواز سنائی گئی۔ حسن اتفاق سے سرسید کے کارناموں کے بارے میں بابائے اردو کی ایک تقریر کا ریکارڈ موجود ہے۔ یہی ریکارڈ جلسے میں سنایا گیا۔

جناب اختر حسین

سب سے پہلی تقریر نواب صدیق علی خاں صاحب کی تھی۔ انھوں نے بابائے اردو سے اپنے دیرینہ روابط کی داستان کو مختصر مگر موثر انداز سے پیش کیا۔ انھوں نے سی پی میں اردو کی جنگ کی روداد بھی پیش کی اور یہ بتایا کہ کس طرح قدم قدم پر بابائے اردو نے اردو کی تحریک کی رہنمائی کی۔ نواب صاحب نے یہ بھی بتایا کہ قیام پاکستان کے لئے بابائے اردو نے کیا کیا کوششیں کیں۔

قائد اعظم اور بابائے اردو کی ایک تاریخی ملاقات کی روداد سناتے ہوئے جناب موصوف نے فرمایا:-

" ایک تاریخی اور اہم واقعہ آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں جس کا علم معدودے چند لوگوں کو ہوگا اور ان معدودے چند میں سے بھی کچھ لوگ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اور چند لوگ شاید ایک یا دو ہی رہ گئے ہیں جو اس تاریخی اور اہم واقعے کو جانتے ہیں بابائے اردو نے اس اطمینان کے لئے کہ پاکستان میں اردو کا کیا مقام ہوگا قائد اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے بالمشافہ گفتگو کی اور اس کے لئے دلّی میں

ریا گنج میں جس گھر میں وہ رہتے تھے اور جس کا نام دارالسلام تھا اور ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی تھی۔ وہاں قائد اعظم کو اور نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب کو بات چیت کے لئے مدعو کیا۔ میری خوش نصیبی تھی میں اس گفتگو میں شریک تھا۔ اس کے غالباً دو ہی سبب ہو سکتے ہیں جس کی وجہ سے انہوں نے مجھے عزت بخشی۔ پہلی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس زمانے میں کل ہند انجمن ترقی اردو کی جو مجلس نظما تھی اس کا میں رکن تھا اور زیادہ تر اردو کا جھگڑا میرے ہی صوبے میں ہوتا رہا اور بحیثیت نمائندہ مرکزی اسمبلی میرا گہرا تعلق اپنے صوبے کے معاملات سے تھا تو اس وجہ سے بھی انہوں نے مجھے یہ عزت بخشی اور اس وقت ان بزرگوں میں یعنی قائد اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور بابائے اردو میں بات چیت ہوئی اور بات چیت کے بعد بابائے اردو مطمئن ہو گئے کہ پاکستان کی قومی زبان اردو ہوگی۔ یہ معاہدہ دونوں کے درمیان ہوا۔ بے شک یہ کوئی تحریری معاہدہ نہ تھا، اور تحریری معاہدے کی قائد اعظم اور بابائے اردو کو کوئی ضرورت نہیں تھی اور آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا اور بھولے نہیں ہوں گے کہ اس کے بعد سے قائد اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے باوجود اس امر کے کہ اردو نہیں جانتے تھے انہوں نے اردو زبان میں تقریریں شروع کر دی تھیں۔"

نواب صدیق علی خاں صاحب

نواب صاحب نے آخر میں یہ تجویز بھی پیش کی کہ مغربی پاکستان میں مولوی عبدالحق کے نام پر اور مشرقی پاکستان میں قاضی نذر الاسلام کے نام پر دو ایسی یونیورسٹیاں قائم کی جائیں جہاں قومی زبانوں کے ذریعے جملہ علوم و فنون میں تعلیم دی جائے۔

جمیل نقوی صاحب ہر سال یوم بابائے اردو میں اپنی نظم پڑھتے ہیں۔ اس مرتبہ انھوں نے ایک نہایت ہی مؤثر نظم پڑھی جسمیں بابائے اردو

صدرِ انجمن کی اپیل

"آج بابائے اردو کی برسی کے موقع پر انجمن نے زیر تعمیر کالج کی تعمیر اور دیگر اخراجات کو پورا کرنے کے لئے رقم فراہم کرنے کی مہم کا آغاز کیا ہے اور یہ طریق کار متعین کیا ہے کہ ہر شخص سے زیادہ سے زیادہ نہیں بلکہ کم سے کم رقم جو وہ دے سکتا ہو طلب کی جائے اس مقصد کیلئے ہم نے ایک روپے اور پانچ روپے کی رسید طبع کرائی ہیں تاکہ ہر محب وطن پاکستانی کی امداد حاصل کر سکیں میں تمام اردو دوستوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس مقدس کام میں میرا ہاتھ بٹائیں تاکہ بابائے اردو کا وہ خواب پورا ہو سکے جس کے لئے وہ زندگی بھر کوشاں رہے"

کو بڑے پرخلوص انداز میں خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔

مولانا ماہر القادری نے اپنی تقریر کا آغاز اس شعر سے کیا ؎

ہو پھول میں رنگت کیسی ہی خوشبو جو نہیں تو کچھ بھی نہیں
اس ملک میں چاہے ہن برسے اردو جو نہیں تو کچھ بھی نہیں

انہوں نے فرمایا " میرا یہ شعر بابائے اردو کو بہت پسند تھا۔ انہوں نے یہ شعر مجھ سے متعدد بار سنا اور پھر اسے اپنے کتب خانۂ خاص میں بھی دیوار پر جلی الفاظ میں لکھوا دیا۔ ماہر صاحب نے دلچسپ پیرائے میں بابائے اردو کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور آخر میں یہ فرمایا۔ " اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بابائے اردو سے زیادہ کسی شخص نے اردو زبان کی خدمت نہیں کی۔"

رئیس امروہوی صاحب بابائے اردو کے قدیم نیازمندوں میں سے ہیں۔ انہیں بابائے اردو سے جو بے پناہ عقیدت ہے اس کا اظہار انہوں نے ایک خوبصورت نظم کے ذریعے کیا۔

جناب فضل احمد صدیقی نے بابائے اردو مرحوم و مغفور سے اپنے

آزاد کشمیر میں یوم بابائے اردو

مظفر آباد۔ ۱۸ر اگست۔ آزاد کشمیر کے صدر جناب عبدالحمید خان نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اردو زبان کو زندگی کے ہر شعبے میں اپنانا نہایت ضروری ہے۔ انہوں نے عوام کو مشورہ دیا کہ انھیں اپنی زبان پر فخر کرنا چاہیئے کیونکہ یہ دنیا کی کسی بھی ترقی یافتہ زبان سے کم نہیں ہے خان موصوف نے ان خیالات کا اظہار ایک جلسۂ عام میں کیا جو بابائے اردو کی یاد میں انجمن ترقی اردو کی طرف سے منعقد کیا گیا تھا۔ عبدالحمید خان صاحب نے اپنے خطبۂ صدارت میں بابائے اردو کی خدمات کا شاندار الفاظ میں ذکر کیا۔ انہوں نے فرمایا " برصغیر ہند و پاکستان میں بابائے اردو نے جس انداز سے اردو زبان کی خدمت کی ہے اسکی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی" خانصاحب نے یہ بھی کہا کہ اردو کو مشرقی پاکستان میں اور بنگالی کو مغربی پاکستان میں مقبول بنانے کیلئے یہ ضروری ہے کہ ملک کے دونوں حصوں میں ثانوی درجوں تک دونوں زبانوں کی تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے۔"

مرقد بابا پر

تعلقات کی روداد ایک مضمون کی صورت میں پیش کی ۔ یہ مضمون
اپنے باغ و بہار اسلوب اور موضوع اور دلکشی کی وجہ سے بہت
پسند کیا گیا ۔

انجمن ترقیٔ اردو خواتین کی صدر بیگم محمد شریف صاحبہ
اردو کی نہایت سرگرم حامی ہیں ۔ انہیں بابائے اردو کے ساتھ
اردو کی تحریک میں حصہ لینے کا شرف حاصل ہے ، انہوں نے
اپنی تقریر میں فرمایا کہ کس طرح بابائے اردو خواتین کے ذریعے اردو
کی نشر و اشاعت کا کام لیتے تھے ۔ بیگم صاحبہ نے حاضرین جلسہ سے
یہ عہد لیا کہ وہ اردو کو اپنی زندگی کا لازمی جزو بنائیں گے اور غیر ملکی
زبان کے غیر ضروری استعمال سے اجتناب کریں گے ۔

آخر میں صدر جلسہ جناب اختر حسین نے اپنے خطبۂ صدارت
میں یہ بتایا کہ بابائے اردو کے بعد انجمن نے کیا کیا کارنامے انجام
دیئے ہیں ۔ انہوں نے یہ فرمایا
" بابائے اردو کو خراج عقیدت
پیش کرنے کا بہترین طریقہ
یہ ہے کہ مرحوم نے جو کام شروع کیا تھا اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے "

مولانا ماہرالقادری

جناب اختر حسین نے اپنے خطبۂ صدارت میں زیر تعمیر اردو کالج
کے منصوبے پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا

" انجمن کا اصل اور اہم کام یہ ہے کہ اردو کو ہر سطح پر ذریعۂ تعلیم
بنایا جائے ۔ اس مقصد کے لئے آج سے تقریباً سولہ برس پہلے اردو
کالج قائم کیا گیا تھا جہاں نہایت کامیابی سے اردو کے ذریعے تمام
علوم و فنون کی تعلیم دی جاتی ہے ۔ یہ اگرچہ بہت بڑی کامیابی
ہے لیکن میں اس سے مطمئن نہیں ہوں کیونکہ موجودہ کالج بہرحال
ایک محدود پیمانے پر یہ خدمت انجام دے رہا ہے اور اس سے
صرف کراچی کے طالب علم ہی استفادہ کر سکتے ہیں ۔ میری خواہش

جناب فضل احمد صدیقی

ہے کہ یہ کالج حقیقی معنوں میں ایک قومی درس گاہ بن جائے
جس سے پاکستان کے تمام علاقوں کے طالب علم فائدہ اٹھا سکیں
اس مقصد کو حاصل کرنے کی ایک ہی صورت ہو سکتی ہے
کہ اس کالج کو ایک عظیم الشان اقامتی درس گاہ بنا دیا جائے
جس سے پاکستان کے تمام علاقوں کے طالب علم فائدہ اٹھا سکیں

چنانچہ ہم نے کے ڈی اے سے ۲۰ ایکڑ زمین حاصل کر لی ہے
دو سال قبل صدر مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے
مجوزہ اقامتی کالج کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔ آپ کو یہ جان کر
خوشی ہوگی کہ اب ہم نے عملی اقدام بھی شروع کر دیا ہے
اور کالج کی عمارت تعمیری مرحل میں داخل ہو گئی ہے۔ اس
کالج کے لئے جو منصوبہ بنایا گیا ہے اس پر لاگت کا اندازہ تقریباً

بابائے اردو لائبریری قائم ہوگی

حیدرآباد ۲۲ اگست۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کی پانچویں برسی کے موقع پر خالد میموریل ہائی اسکول کی عمارت واقع رسالہ روڈ میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کی یاد میں ایک لائبریری اور ریڈنگ روم اکتوبر سے قائم کیا جا رہا ہے۔ اس کے افتتاح کے لئے جناب کمشنر صاحب سے درخواست کی جا چکی ہے اور مہمان خصوصی جناب اختر حسین صاحب چیئرمین انجمن ترقی اردو ہوں گے (حریت ۲۳-۸-۶۶)

بابائے اردو

رئیس امروہوی

جلوۂ گل سر دیوار خزاں تھے یہ لوگ — لشکر صبح بہاراں کا نشاں تھے یہ لوگ
شبلی و حالی و سر سید و اقبال و جناح — رہ نمایان جہان گزراں تھے یہ لوگ
اللہ اللہ وہ فکر و نظر عبدالحق — حامل زمرۂ صاحب نظراں تھے یہ لوگ
سفر شوق کی منزل نہ ابد ہے نہ ازل — وقت کی نبض تھی ساکت کہ رواں تھے یہ لوگ
کیوں نہ ہو سینۂ ملت میں حرارت ان سے — شعلہ آسا۔ تہ خاکستر جاں تھے یہ لوگ
آج ہم لوگ کہاں ہیں یہ کوئی کیوں سوچے — سوچئے منزل عظمت میں کہاں تھے یہ لوگ

کیوں نہ ہوں مایۂ صد نازش افکار رئیس
میر دانش کدۂ لفظ و بیاں تھے یہ لوگ

کروڑ روپے ہے ۔ ظاہر ہے اتنی بڑی رقم نہ تو
ت دے سکتی ہے اور نہ انجمن ہی اپنے محدود
ذرائع سے فراہم کرسکتی ہے ۔ ہم نے اگرچہ
ت کو اس طرف متوجہ کیا ہے اور یہ بھی طے کیا
ہ انجمن کے اخراجات کم سے کم کرکے کالج کی تعمیر
کے مصارف پورے
کئے جائیں لیکن محض
ان وسیلوں سے
اتنا بڑا کام مکمل نہیں ہوسکتا ، اب صرف اس کی ایک ہی صورت ہے
اور وہ یہ کہ عوام سے مالی امداد کی درخواست کی جائے ۔"

سرگودھا میں یوم بابائے اردو

سرگودھا۔ ۲۰ اگست ۔ انجمن ترقی اردو کی شاخ کے زیر اہتمام یوم بابائے اردو منایا گیا ۔ جس میں مقررین نے بابائے اردو کی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا اور عوام سے اپیل کی کہ وہ اردو کی ترویج و اشاعت میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں

-:-

بلا تبصرہ

Death Anniversa[ry] Of Baba-i-Urdu 'Ignored' In Lah[ore]

LAHORE, Aug. 17: T[he] fifth death anniversary [of] "Baba-i Urdu," Maulvi A[b]dul Haq, observed in Ka[ra]chi yesterday, went com[p]letely unnoticed in this cit[a]del of literature and cultu[re].

Dozens of Cultural and S[o]cial Organisations claimi[ng] themselves to be protect[ors] of social and cultural valu[es] as well as those working f[or] the development of Ur[du] remained silent on this occ[a]sion. No "Fateha" was off[er]ed, no meeting was organ[is]ed to observe the anniv[er]sary.

One could not imagi[ne] this "cold-shoulder trea[t]ment" to a person of the em[i]nence of "Baba-i-Urdu" a[nd] how his anniversary laps[ed] here without getting its d[ue] attention from the peo[ple] who are known for th[eir] hospitality and regard f[or] the great and the go[od].
—PPA.

[روزن]امہ مارننگ نیوز کراچی ۔ ۱۸ اگست ۱۹۶۶ء

اسی روز شام کو ریڈیو پاکستان کراچی سے بھی ایک خاص پروگرام نشر ہوا ۔ اس میں صدر انجمن جناب اختر حسین نے بابائے اردو کو خراج عقیدت پیش کیا ۔ موصوف کی یہ تقریر اس شمارے کے ابتدائی صفحات میں شائع کی جا رہی ہے۔

کراچی کے دو روزناموں "جنگ" اور "حریت" نے جو اداریئے لکھے وہ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں

روزنامہ جنگ کراچی

انجمن ترقی اردو کے صدر مسٹر اختر حسین نے "بابائے اردو" مولوی عبدالحق مرحوم کی پانچویں برسی کے موقع پر اردو کالج کی تعمیر کے اس عظیم منصوبے کی تکمیل کے لئے
تین کروڑ روپیہ صرف ہونا ہے عوامی چندے کی مہم کا آغاز کیا ہو، کالج کی عمارت کے
ب روڈ پر تعمیر شروع ہوچکی ہے اور اب بڑے پیمانے پر چندہ جمع کرنے کا کام کرنا ہے ۔ مسٹر
ن نے جو اس یادگار منصوبے اور انجمن ترقی اردو کے مقاصد کی تکمیل کیلئے بڑے خلوص ار
ے کام کر رہے ہیں توقع ظاہر کی کہ عوام مذکورہ مہم میں پورا تعاون کریں گے اور ہمیں یقین ہے کہ
قع پوری ہوگی ۔ تین کروڑ کی رقم ایسی بڑی رقم تو نہیں جس کا مہیا ہونا مشکل ہو اول تو

میرپور خاص میں بابائے اردو کو خراج عقیدت

میرپور خاص، ۲۳ اگست ۔ میرپور خاص میں بابائے اردو کی پانچویں برسی پر ایک شاندار اجتماع ہوا ۔ مقررین نے کہا کہ بابائے اردو نے جس کام کو شروع کیا تھا اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے سرگرمی سے کوششیں کی جائیں ۔ اجتماع میں مطالبہ کیا گیا کہ مولوی عبدالحق یونیورسٹی قائم کی جائے

روزنامہ "جنگ" ۲۴ - ۸ - ۶۶

حکومت اور نیم سرکاری اداروں کو اس معاملے میں فراخدلی کا ثبوت دینا ہوگا دوسرے صاحبان ثروت کو بھی اپنی ذمہ داریاں محسوس کرنی ہونگی۔ رہے عوام سو وہ تو اس جیسے بنیادی کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے ہی۔ ایک ایک روپیہ چندے کی رسیدیں انجمن نے تیار کرائی ہیں اور مسٹر اختر حسین کے بقول کوشش یہ کیجائیگی کہ لوگ کم سے کم چندہ دیں مگر دیں ضرور۔ گویا اصرار زیادہ سے زیادہ پر نہیں کم سے کم پر ہوا اور جب صورت یہ ہو تو مہم کی کامیابی یقینی ہے۔ امید ہے صدر انجمن جلد اپنی قیادت میں عوامی ارتباط کی مہم کا آغاز کر دیں گے تاکہ کام آگے بڑھے اور منصوبے کی تکمیل میں تاخیر نہ ہو۔" (جنگ کراچی مورخہ ۱۹ اگست ۱۹۶۶ء)

روزنامہ حریت کراچی "۱۷ اگست کو کراچی میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کی پانچویں برسی منائی گئی اور اردو کالج کی تعمیر و توسیع کے لئے عملی قدم اٹھایا گیا۔ بابائے اردو کی یاد کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہ تھا۔ انکی آخری تمنا یہی تھی کہ ایک اردو یونیورسٹی قائم ہو جائے اور اس آرزو کی تکمیل کیلئے وہ گلے میں جھولی ڈال کر نکلنے والے تھے، اب وہ موجود نہیں ہیں لیکن انکی آرزو موجود ہے۔ وہ آرزو جو در اصل قومی زبان کی آرزو ہے۔ اور وہ قوم بھی موجود ہے جو بابائے اردو کی جھولی میں بہت کچھ ڈالتی۔ انجمن نے پانچ پانچ روپے کی خوبصورت رسیدیں طبع کروائی ہیں جن کو "اردو نوٹ" کہنا چاہئیے۔ وہ نوٹ جو دلدادگان اردو کے اردو بینک میں پہنچ کر نقد کی صورت اختیار کریں گے۔

اردو کالج برسوں سے اردو زبان میں علوم و فنون کی تعلیم دے کر انگریزی زبان کے عملی چیلنج کا عملی جواب دے رہا ہے آج بھی اس کالج میں کوئی دو ہزار طلبہ ہیں گورنر امیر محمد خان نے بیس ایکڑ زمین اسے یونیورسٹی کیمپس میں دلوا کر اسے کھلی فضا فراہم کی ہے۔ یہ کالج بن گیا تو جلد ہی اردو یونیورسٹی کی صورت اختیار کر لیگا، یہ توقع ہے کہ ایکدن یہاں کی ہر یونیورسٹی اردو یونیورسٹی بن جائے گی اور قومی زبان سربلند ہو کے رہیگی لیکن یہ اردو کالج اردو یونیورسٹی بن گیا تو جہاں کراچی کو یہ فخر حاصل ہے کہ اسکی یونیورسٹی نے اردو کو ذریعہ تعلیم قرار دینے میں جرأت مندانہ پہل کی وہیں کراچی کو یہ فخر بھی حاصل ہوگا کہ اسکے باشندوں کے جذبۂ قومی نے اردو یونیورسٹی یہاں سب سے پہلے قائم کر دی اگر ایسا ہوا تو یہ ملک و ملت کی بڑی خدمت ہوگی" (روزنامہ حریت - ۱۹ اگست ۱۹۶۶ء)

"وہ مسلمان کہ ایمان تھا جسکا اردو"

جمیل نقوی

دل سے اٹھتا ہے سلگتی ہوئی آہوں کا دھواں — کون یاد آ گیا اے مجمع صاحب نظراں
پھر تخیل میں سنورنے لگے ماضی کے نقوش — پھر تصور میں ابھرنے لگے عظمت کے نشاں
یاد آنے لگے پھر زلف و رسن بام و صلیب — پھر نگاہوں میں ہے اعلائے انالحق کا سماں
کس غم آگاہ نے دی ہے در دل پر دستک — دل میں رہ رہ کے کھٹکنے لگا غم کا پیکاں
جیسے کھو بیٹھے ہیں ہم کوئی متاع نایاب — کروٹیں لینے لگا روح میں احساس زیاں

کان میں آئی کدھر سے یہ انالحق کی صدا
جیسے وہ بندۂ حق ہو کہیں موجود یہاں

گرد و پیش

تصویر کا ایک رُخ

بلا تبصرہ صوبائی حکومت نے سال رواں کے لئے مغربی پاکستان لسانی تحقیقاتی اداروں کے لئے جو رقم مختص کی ہے۔ اس کی تفصیل ملاحظہ کیجئے۔

پشتو اکیڈیمی	۹۵ ہزار روپے
سندھی ادبی بورڈ	۹۵ " "
بلوچی اکیڈیمی کوئٹہ	۲۵ " "
پنجابی اکیڈیمی لاہور	۲۷ ہزار ۵ سو روپے
اردو اکیڈیمی لاہور	۴۷ " روپے
انجمن ترقی اردو	۴۸۰ روپے (چار سو اسی روپے صرف)

نقش فریادی ڈاکٹر سید عبداللہ کی قیادت میں انجمن ترقی اردو لاہور کے اراکین نے ایک تحریک شروع کی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ سرکاری اداروں میں جا کر یہ التجا کی جائے کہ وہ اپنے رجسٹروں، رسیدوں، طعام ناموں اور تختیوں کو اردو میں لکھوائیں اور انگریزی کو ترک کر دیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اعلان کیا ہے کہ اس مقصد کے لئے ایک ایسا جلوس نکالا جائے گا جو خاموش جلوس ہوگا جس میں ایک ہزار نمائندے رائے عامہ کو اردو کے لئے ہموار کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس تحریک کا نام انھوں نے کاغذی پیرہن تجویز کیا ہے۔

تصویر کا دُوسرا رُخ

برطانیہ کے انگریزی اخبار میں اردو خبریں برطانیہ کے مشہور علاقائی اخبار برمنگھم ایوننگ میل نے برطانیہ میں مقیم پاکستانی اور ہندوستانی باشندوں کے لئے اپنے اخبار

میں اردو سروس شروع کر دی ہے۔ ہر سنیچر کی شام کو اخبار میں اردو خبروں کے لئے ایک حصہ مخصوص کر دیا گیا ہے جس میں پاکستان اور ہندوستان کی اہم خبریں اردو میں شائع کی جائیں گی۔ اس اخبار کی اشاعت ۵ لاکھ ہے۔

طلبہ سے اپیل صدر انجمن ترقی اردو خواتین بیگم محمد شریف نے کراچی کے طلبہ سے اپیل کی ہے کہ وہ اپنی تعطیلات کا ایک ایک لمحہ اردو کی ترقی اور ترویج کے لئے وقف کر دیں اور ان اعلیٰ مقاصد کو پیش نظر رکھیں جن کے لئے بابائے اردو نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ انھوں نے خیال ظاہر کیا ہے کہ طلبہ ہی اپنی جدوجہد سے قومی زبان کو اس کا صحیح اور جائز مقام دلا سکتے ہیں۔

مغربی پاکستان اسمبلی کی تجویز انجمن ترقی اردو قصور نے مغربی پاکستان اسمبلی کی اس قرارداد کی پُرزور حمایت کی ہے کہ اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دینے کے سوال کا جائزہ لینے کے لئے مرکزی حکومت اس سال کے ختم ہونے سے قبل ایک کمیشن مقرر کرے جو چھ ماہ کے اندر اندر اپنی رپورٹ پیش کر دے انجمن کی طرف سے ایک قرارداد میں صدر پاکستان اور گورنر مغربی پاکستان سے اپیل کی گئی ہے کہ صوبائی مقننہ کی اس سفارش کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بلا تاخیر کارروائی کی جائے۔ قرارداد میں اس بات کو بے وزن اور ناقابلِ اعتنا قرار دیا گیا ہے کہ اردو کو اختیار کرنے میں کچھ حقیقی اور ناقابل عبور مشکلات حائل ہیں۔

ایبٹ آباد کی ادبی انجمنیں بزم علم و فن، انجمن ترقی اردو، انجمن احباب، بزم اردو، انجمن اساتذہ، انجمن ہندکو اور بزم اقبال ایبٹ آباد کے ایک مشترکہ اجلاس میں حکومت سے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ قومی زبان اردو سے متعلق ملک کے دستور اساسی میں ترمیم کے لئے صوبائی اسمبلی میں جو تجویز منظور کی گئی اسے فوری طور پر عملی جامہ پہنایا جائے۔ قرارداد میں ملک بھر کی انجمنوں سے اس تجویز کے حق میں جلسے منعقد کرنے کی اپیل کی گئی ہے۔ قرارداد میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ دفتری زبان کے لئے تمام اصطلاحات اردو میں منتقل کی جا چکی ہیں۔ اس لئے اب اسے قومی زبان کے طور پر نافذ کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔

تعلیمی، علمی، تہذیبی خبریں

انٹر یونیورسٹی بورڈ لاہور انٹر یونیورسٹی بورڈ لاہور نے ملک کی یونیورسٹیوں میں سائنس کی تدریس کے معیار کو مغربی ممالک کی یونیورسٹیوں کے برابر لانے کے لئے سائنسی علوم کے نصاب کو از سر نو مرتب کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس مقصد کے لئے بورڈ کی جانب سے تعلیمی ماہرین پر مشتمل چھ ذیلی کمیٹیاں بنائی گئی ہیں۔ بورڈ نے یونیورسٹی کے تمام مدارج میں اسلامی فکر کی تعلیم کو لازمی قرار دینے کا بھی فیصلہ کیا ہے اس مقصد کے لئے یونیورسٹی میں اسلامی فکر کی ایک فیکلٹی بھی قائم کی جائے گی

بنگالی اکیڈیمی کے لئے نیا علمی منصوبہ بنگالی اکیڈیمی نے دو مختلف انسائیکلوپیڈیا کی اشاعت کے ایک بڑے

منصوبے پر کام شروع کر دیا ہے اس منصوبے کے تحت ایک انسائیکلو پیڈیا اسلام کے عہد اول سے موجودہ دور تک کی اسلامی روایات اور ثقافت سے متعلق ہوگا جبکہ دوسرے کا تعلق ۱۹ ویں صدی سے اب تک کے بنگلا زبان و ادب سے ہوگا۔ اکیڈمی ڈاکٹر شہید اللہ کی مرتب کی ہوئی پانچ جلدوں پر مشتمل بنگالی انسائیکلو پیڈیا پہلے ہی شائع کر چکی ہے۔

نادر قلمی کتابیں بہاول پور کی سینٹرل لائبریری میں موجود بعض اہم موضوعات سے متعلق قدیم قلمی نسخوں کی اشاعت اور بعض نادر کتابوں کے اردو ترجمے شائع کرنے کا ایک منصوبہ تیار کیا جا رہا ہے۔ بہاول پور کے کمشنر جناب حسین احمد نے یہ بات لائبریری کا معائنہ کرتے وقت کہی۔ انھوں نے کہا کہ اگر ان قیمتی کتابوں کا ترجمہ کر دیا جائے تو نہ صرف ان کی افادیت بڑھ جائے گی بلکہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ بھی ہو جائیں گی۔

آئینہ خانے میں

ڈاکٹر سید عبداللہ کا بیان مغربی پاکستان اسمبلی نے دفتری زبان کی تبدیلی کے لئے اتفاق رائے سے قرارداد منظور کر کے ایک دیرینہ قومی مطالبے کے حق میں مثبت قدم اٹھایا ہے۔ صوبائی اور مرکزی حکومتوں کو رائے عامہ کا احترام کرنا چاہیئے کیونکہ قومی زبان کو نظر انداز کر کے قومی احساسات کو زندہ رکھنا مشکل ہو جاتا ہے" یہ بیان انجمن ترقی اردو لاہور کے ناظم اعلیٰ ڈاکٹر سید عبداللہ نے دیا ہے۔

چند تجاویز گورنمنٹ کالج شیخوپورہ کے پروفیسر جناب حافظ محمد اجمل نے چند تجاویز پیش کی ہیں۔ جن سے ملک کا نظام تعلیم بہتر ہو سکتا ہے۔ یہ تجاویز مندرجہ ذیل ہیں

۱:۔ نظام تعلیم میں مادہ پرستی اور الحاد و دہریت کے روز بروز بڑھتے ہوئے رجحانات کو ختم کیا جائے۔

۲:۔ سائنس کی تعلیم کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دی جائے۔

۳:۔ انگریزی زبان اور مغربی علوم کے ساتھ مغربی تہذیب کے مضر اثرات کو قبول نہ کیا جائے۔

۴:۔ سینما اور کلب جیسے اداروں کو مغربی اثرات اور مشغولیت سے بچایا جائے۔

۵:۔ سرکاری زبان اردو اور بنگالی ہو۔ اس کے بعد انگریزی اور عربی کو یکساں اہمیت دی جائے۔ عربی کو مذہبی زبان کی حیثیت سے اور انگریزی کو بین الاقوامی زبان کی حیثیت سے پڑھا جائے۔

۶:۔ قومی لباس کو لازمی طور پر اپنایا جائے۔ شلوار قمیص اور شیروانی کو ملکی لباس کی حیثیت دی جائے۔

۷:۔ مخلوط تعلیم کو ہر قیمت پر ختم کر دیا جائے اور طالبات کو آزاد رجحانات اور مغربی طور طریقوں سے محفوظ رکھا جائے۔

۸:۔ تعلیم نسواں کا نصاب الگ مرتب کیا جائے اور خواتین کی الگ یونیورسٹی قائم کی جائے۔

۹:۔ طلبہ کے لئے فوجی تربیت اور دفاعی کورس لازمی قرار دیا جائے۔

۱۰:- ناظرہ قرآن کی تعلیم پرائمری تک لازمی قرار دی جائے ۔

۱۱:- ایک اسلامی یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا جائے ۔

۱۲:- ہمارا نظام تعلیم دینی اور دنیوی علوم کی جامعیت رکھتا ہو ۔

ایک ہونہار طالبہ پاکستان کی بیس سالہ طالبہ فوزیہ فاطمہ علی دنیا کی سب سے کم عمر طالبہ ہیں جنھوں نے اتنی کم عمری میں کیمبرج یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔ مس علی پاکستان کے ممتاز سرجن ڈاکٹر منور علی کی صاحبزادی ہیں انھوں نے کیمبرج یونیورسٹی سے بیکٹالوجی میں ٹرائی پوز کے امتحان میں کامیابی حاصل کی ہے ۔

وزیر تعلیم کے ارشادات صوبائی وزیر تعلیم ملک خدابخش نے لاہور میں کہا ہے کہ اردو اور اسلامیات کی تعلیم قومی وحدت کے حصول کا ذریعہ ہے۔ وزیر تعلیم "شام ہمدرد" کی تقریب میں "نظام تعلیم اور آزادی کے تقاضے" کے موضوع پر تقریر کر رہے تھے ۔ اس اجتماع سے حکیم محمد سعید دہلوی اور حکیم احمد شجاع نے بھی خطاب کیا ۔

یادوں کے چراغ !

مولانا صلاح الدین کی یاد میں لاہور میں مولانا صلاح الدین کی دوسری برسی بہت خلوص اور عقیدت سے منائی گئی ملک کی مقتدر شخصیتوں نے مرحوم کی ادبی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا - اور اس بات کا تہیہ کیا کہ زبان اردو جس کے لیے مولانا نے اپنی زندگی اور اپنا پورا اثاثہ وقف کر دیا تھا ۔ اس کی ترویج اور ترقی کا کام اسی رفتار ، جوش اور جذبے کے ساتھ جاری رکھا جائے گا ۔ پنجاب لٹریری لیگ کے زیر اہتمام ایک جلسے میں جو سید جمیل حسین رضوی کی صدارت میں منعقد ہوا تھا یہ خراج تحسین پیش کیا گیا ۔ تنویر ادب پاکستان کی جانب سے جو برسی منائی گئی تھی ۔ اس کے نام ظہیرالدین ال میاں ۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی ۔ مولانا مودودی ۔ سید محمد تقی ۔ شاہد احمد دہلوی اور ماہرالقادری نے اپنے پیغامات میں مولانا کو عہد ساز ادیب اور اردو کے بہترین مثار اور شیدائی کے خطابات سے یاد کیا ۔

مولانا چراغ حسن حسرت کی برسی لاہور میں مولانا چراغ حسن حسرت کی گیارھویں برسی پر صوبائی وزیر تعلیم ملک خدابخش نے کہا ہے کہ مولانا چراغ حسن حسرت اور ان جیسے دوسرے بلند پایہ ادیبوں ، شاعروں ، صحافیوں کو ایسی صورت میں صحیح معنوں میں خراج عقیدت پیش کیا جا سکتا ہے کہ ہم سب مل کر اُن کے مشن کو زندہ رکھیں اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کریں جس کی تکمیل کے لئے وہ عمر بھر سرگرم عمل رہے ۔ انھوں نے اس پر گہرے دکھ کا اظہار کیا کہ ابھی تک کسی ادارے نے مولانا کی زندگی پر کتاب شائع نہیں کی ۔ اس موقع پر ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ، عبداللہ بٹ اور غلام محمد خاں لونڈخور نے بھی مولانا کو شاندار خراج عقیدت پیش کیا ۔ مولانا حامد علی خاں نے چراغ حسن حسرت کو اردو کا محبوب اور اردو کو اُن کا محبوب قرار دیکر کہا کہ اب ہمیں ان کی محبوب اردو کے لئے بہت کچھ کرنا چاہئے ۔

ماتم میں ہم شریک

راجہ مہدی علی خاں کی وفات

پاک و ہند کے ادبی حلقوں میں یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سُنی گئی کہ مشہور شاعر راجہ مہدی علی خاں کا ٢٧ جولائی ٦٦ ١٩ء کو بمبئی میں اچانک انتقال ہو گیا راجہ مہدی علی خاں ایک شاعر ہی نہیں تھے بلکہ بہت اچھے نثر نگار بھی تھے ان کی صلاحیتیں کسی ایک صنف تک محدود نہیں تھیں۔ اپنی انھیں صلاحیتوں کی وجہ سے وہ اردو ادب میں ایک خاص مقام کے حامل تھے ابھی کچھ دن ہوئے ان کا مجموعہ "اور پھر بیاں اپنا" شائع ہو چکا ہے۔ موت کے ظالم ہاتھوں نے اردو ادب سے ایک باصلاحیت اور منفرد صاحب قلم کو چھین لیا ہے۔ ادارہ "قومی زبان" راجہ مہدی خاں کی بے وقت موت پر دلی افسوس کا اظہار کرتا ہے اور پسماندگان اور اہل خاندان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

ایک افسوسناک موت

پنجابی کے مشہور شاعر جناب نندلال نورپوری نے جالندھر میں ١٨ مئی کو خودکشی کر لی۔ نندلال نورپوری اپنے گیتوں کی وجہ سے سارے پنجاب میں مشہور تھے۔ اور سارا پنجاب ان کے گیتوں، نظموں اور گانوں کا شیدائی تھا۔ حکومت ہند کی طرف سے انہیں ٥٧ روپے ماہوار وظیفہ ملتا تھا۔ جو ان کے لئے ناکافی تھا۔ اور یہ وظیفہ بھی کئی ماہ سے وصول نہیں ہوا تھا۔ انھوں نے نہایت کسمپرسی کے عالم میں خودکشی کرکے زندگی سے کنارہ کشی کر لی۔ انھوں نے اپنے پیچھے دو لڑکے اور چار لڑکیاں چھوڑی ہیں۔ اُن کی لاش ایک کنویں میں تیرتی ہوئی پائی گئی۔ ہمیں اس افسوسناک موت پر سخت افسوس ہے۔

آئینۂ ہند

اُردو اور ہندی

فراق گورکھپوری نے کہا ہے کہ اردو زبان میں عربی اور فارسی کے قاعدے سے بنائے ہوئے جمع کے چند الفاظ کے استعمال سے اسے ہندی سے دور تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بالکل برعکس اردو زبان نے ذاتی طور پر جمع کے متعدد الفاظ ایسے دیئے ہیں۔ جن کے بغیر آج ہندی کی شاعری ناممکن ہے۔ فراق صاحب اردو زبان کے جامع لغات پر اظہار کر رہے تھے۔ ان کے خیال میں اردو میں کم و بیش ٥٠ ہزار الفاظ ہندی کے تقریباً سات ہزار الفاظ فارسی کے اور چار پانچ ہزار الفاظ عربی کے ہیں۔ اور عربی فارسی کے ان الفاظ میں بھی صرف نصف محض وقت ضرورت استعمال کئے جاتے ہیں۔ اس طرح گویا اردو زبان کی شاعری بیشتر ہندی الفاظ کی مرہون منت ہے۔ اس لئے فراق صاحب کے خیال میں اردو کو ہندی کا حریف کہنا صحیح نہیں ہے۔

ابراہیم پرویز کی گرفتاری

یوپی صوبائی اسمبلی میں ایک ہنگامی اجلاس کے دوران اردو محافظ دستے کے ایک

رہنما جناب ابراہیم پرویز نے "اردو اور موت" کے عنوان کے ہینڈ بل ایوان میں پھینک دیئے جس پر اجلاس میں سناٹا چھا گیا اور اراکین ہینڈ بل لے لے کر پڑھنے لگے۔ اسی دوران سی۔ آئی۔ ڈی کے عملے نے جناب ابراہیم پرویز کو حراست میں لے لیا جناب ابراہیم پرویز اس موقع پر چلا چلا کر کہہ رہے تھے۔ "اردو ۱۸ سال سے موت اور زیست کی کش مکش میں مبتلا ہے جس طرح ریاستی ملازمین پر لاٹھی چارج سے ہیجان پیدا ہوا ہے۔ ایسا ہی ہیجان اردو کو اس کا جائز حق نہ ملنے پر پایا جاتا ہے"

مالک رام صاحب کا خطبہ

مشہور محقق اور ادیب جناب مالک رام صاحب نے ایک خطبۂ صدارت میں کہا ہے۔ کہ اردو زبان سیکولر نظریئے کی سب سے نمایاں، شاندار اور زندہ مظہر ہے۔ جو لوگ اس کی مخالفت کرتے ہیں وہ اپنے ملک کے ماضی کے کارناموں کو ملیا میٹ کرنے کے مجرم ہیں۔ انھوں نے کہا ہے کہ وہ وقت دور نہیں جب اردو زبان کو اس کا جائز حق حاصل ہو کر رہے گا، انھوں نے اس ذہنیت کے لوگوں پر سخت افسوس کا اظہار کیا جو رسم الخط بدلنے کی تحریک چلاتے ہیں انھوں نے کہا کہ اگر ہم نے اردو رسم الخط بدل ڈالا تو پچھلی تین چار صدیوں کے علم و ادب سے ہم ہاتھ دھو لیں گے۔ جو ہمارا قیمتی اور بیش بہا سرمایہ ہے۔

انجمن ترقی اردو پاکستان کے عہدے دار

انجمن ترقی اردو کی مجلس عاملہ نے اپنے ایک حالیہ اجلاس میں مندرجہ ذیل عہدے داروں کا انتخاب کیا ہے

صدر: جناب اختر حسین (ہلال پاکستان)

خازن: جناب شیخ عبدالخالق عبدالرزاق

معتمد اعزازی: جناب جمیل الدین عالی

یہ تمام عہدے دار بلا مقابلہ منتخب کئے گئے ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ

عربی کا مسئلہ

جناب پرنسپل صاحب وصدر انجمن عربی!

میں آپ کی نوازش کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اس کالج میں میں ایک مرتبہ پہلے بھی حاضر ہوا تھا، اب دوبارہ حاضر ہونے میں لطف مکرر محسوس کر رہا ہوں۔

مجھے بے حد خوشی ہے کہ کالج میں عربی کا مضمون خاصا مقبول ہے اور عربی کی انجمن اس کو مقبول بنانے کے لئے ہر ممکن اقدام کر رہی ہے۔ میں نے رپورٹ کو سن کر گہری خوشی محسوس کی ہے۔ عربی زبان و ادب کی ترقی یقیناً کالج کے مخلص پرنسپل صاحب کی ذاتی توجہ کی رہین منت ہے اس کے لئے ہم سب ان کے شکرگزار ہیں۔

حضرات! اس کالج میں عربی کی ترقی اور مقبولیت کی رپورٹ سے مجھے جہاں مسرت ہوئی ہے وہاں ملک میں عربی کے عام زوال کے بارے میں میرے دل میں بہت سے سوال بھی پیدا ہو گئے ہیں۔ اس لئے جہاں میں اس کالج کو مبارک باد پیش کر رہا ہوں وہاں میں عام حالت کے بارے میں تردد کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور میرا یہ تردد کسی ہیجان یا فوری جوش یا غیر معتدل جذباتیت کا نتیجہ نہیں بلکہ غور و فکر کے بعد اخذ کئے ہوئے نتائج پر مبنی ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ ملک کی اہم سرکاری درس گاہوں میں عربی ادب کے ماہرین کی تعداد ۱۹۲۰ء کے مقابلے میں اب ایک فی صد بھی نہیں۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ ملک کی ایک اہم دانش گاہ کئی برسوں سے کسی نامور عربی داں کی جستجو میں ہے مگر وہ اپنی تلاش میں ناکام رہی ہے، کیا یہ حقیقت نہیں کہ عربی علوم کی تحصیل جو فاضل سلسلے کے توسط سے ہو رہی تھی اب تقریباً متروک ہے اور جس قدر ہے وہ اس لئے بیکار ہے کہ یہ فارغ التحصیل حضرات زندگی کے کسی شعبے کے لئے کارآمد نہیں سمجھے جا رہے ہیں۔ یہ درست ہے کہ پرائیویٹ

اسلامیہ کالج گوجرانوالہ کے سالانہ جلسہ تقسیم اسناد کا خطبۂ صدارت۔

انجمنوں کی طرف سے دینی مدرسے جاری ہیں اور ان میں پڑھنے والوں کی تعداد اسی ہے مگر ان کا سرکار دربار میں اور زندگی کے کسی باقاعدہ شعبے میں کوئی درجہ اور کوئی مقام نہیں۔ بہاولپور میں ایک جامعہ ہے اور اس کی تعریف بھی سنی گئی ہے مگر اس جامعہ کے سوڈیڑھ سو طالب العلموں سے عربی کی بے رونقی دور نہیں ہوئی کیونکہ اس جامعہ کا پڑھا ہوا آدمی بہت لمبی چھلانگ بھی لگائے تو امام، زیادہ بڑھے تو کسی بڑے صحن والی مسجد کا خطیب۔ فقط۔

اللہ اللہ! ایک زمانہ وہ تھا جب ملا قطب الدین اور ملا نظام الدین سہالوی، علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی اور بحر العلوم، ملا جیون اور شاہ ولی اللہ عربی علوم کے راستے سے قوم کی روحانی اور دماغی زندگی کی رہنمائی کرتے تھے۔ اور سلاطین وقت ان سے انتساب کو اپنے لئے باعث فخر خیال کرتے تھے۔ اب وہی ہم ہیں کہ خطیب بھی ڈھونڈھنے پڑتے ہیں، اس کے لئے ہم اپنی حکومت وقت کے شکر گزار ہیں کہ اس نے گرتی ہوئی دیوار کو کچھ سنبھالا تو دیا ہے ورنہ یہ خطرہ بھی ہو سکتا تھا کہ موزوں خطیبوں کی کمی کی وجہ سے، سوشل ورک کے فارغ التحصیلوں سے خطیبوں کا کام لیا جاتا۔ جس طرح ایک ریاست کے بارے میں مشہور ہے کہ جب سول سرجن چھٹی پر جاتا تھا تو تحصیل دار کو حکم دیا جاتا تھا کہ وہ اس اثنا میں سول سرجن کے فرائض بھی انجام دے اور لطیفہ یہ کہ یہ تحصیل دار صاحب، اس کام میں سول سرجن سے زیادہ کامیاب پائے گئے!

میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ان عظیم ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے جو ہماری تاریخ نے عربی علوم سے وابستہ کر رکھی تھیں ایک جامعہ بہاولپور کافی نہیں۔ میں نے اس درس گاہ کا نصاب دیکھا ہے اور گزشتہ برسوں کی رپورٹیں بھی دیکھی ہیں، میں اس تجربے کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا اور حکومت کی نگرانی اور رہنمائی پر بھی تحسین و آفریں ہے۔ مگر تکلیف یہ ہے کہ قوم اپنی سہل انگاری کی وجہ سے، ہر بوجھ حکومت پر ڈالتی رہتی ہے، جو اچھا برا کام حکومت سے ہو سکتا ہے وہ کرتی ہے، اس پر شکوہ و شکایت کی کیا گنجائش ہے۔

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ یہ مسئلہ پوری قوم کے سوچنے کا ہے، یہ اس کے تعلیم یافتہ طبقے کا فرض ہے کہ تعلیمی نظام میں عربی کے مناسب مرتبے اور حیثیت کے بارے میں حکومت کو مشورہ دے اور کوئی معقول پروگرام پیش کر کے قومی حکومت کا ہاتھ بٹائے۔ اس وقت تک حکومت کو جتنے مشورے دیئے گئے ہیں، ان میں سے بیشتر یک طرفہ اور جانبدارانہ مشورے تھے۔

پرانے قومی تعلیم کے کمیشن نے عربی اور فارسی کی تحصیل کو محض کاروباری سوال کی حد تک اہمیت دی۔ اور اسی وجہ سے یہ سفارش کی کہ جدید عربی اور جدید فارسی پر زور دیا جائے اور اگر ہم جدید عربی

اور جدید فارسی اپنی جگہ ضروری ہے مگر اس سے عربی ادب اور عربی علوم کی تہذیبی اہمیت کا اعتراف نہیں ہوتا۔ گویا اس کمیشن کے فاضل ارکان اس بات کی تہہ تک پہنچ ہی نہیں سکے کہ عربی علم و ادب پر ہم اتنا زور کیوں دے رہے ہیں ۔ اور سچ پوچھیے تو اس کی ذمے داری بھی ہم عربی والوں پر عائد ہوتی ہے جو ابھی تک اپنے دعوے کو اچھی طرح مرتب ہی نہیں کر سکے ۔ تو اس صورت میں دوسروں کی بے التفاتی سے زیادہ ، اپنی ہی بے عملی اور جمود کا شکوہ کرنا مناسب ہوگا ۔

حال ہی میں ایک اور تعلیمی کمیشن نے اپنی رپورٹ پیش کی ہے اور اس کے صدر مسٹر جسٹس حمود الرحمان تھے ۔ اس رپورٹ میں عربی فارسی کی مخصوص اہمیت کا کوئی ذکر نہیں ۔ صرف مکتب اور مدرسے کی تعلیم کے تحت بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مشرقی پاکستان میں دو قسم کے مدرسے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں اور مغربی پاکستان میں فاضل کا سلسلہ قائم ہے ۔ کمیشن نے اس سے تعرض نہیں کیا اور کہا ہے کہ ان کے نصابوں میں جدید علوم کی کتابیں رکھی جائیں تاکہ " یہ مذہب کے لوگ " دنیا سے بھی باخبر رہیں ۔

ہم کمیشن کی نیک دلی کے معترف ہیں لیکن مجھے یہ عرض کرنے میں باک نہیں کہ عربی فارسی زبان کی تحصیل و تعلیم کے اصلی مقصد کو فاضل کمیشن نظر انداز کر گیا ہے ۔ مکتب اور مدرسے کے بارے میں یہ ہمدردانہ رویے کا بھی شکریہ ۔ ہے مگر کیا عربی کی کل غایت یہ ہے کہ اس کے ذریعے اچھے خطیب یا " مذہب کے لوگ " پیدا کئے جائیں ۔ کیا عربی کی تحصیل کی کل غرض یہ ہے ؟ کیا اس کے سوا اس کا کوئی اور مقصد نہیں ؟ ۔ یہ سب سوال ابھرتے ہیں اور ان کا اس رپورٹ میں کوئی تذکرہ نہیں !

وقت کی تنگی کے باوجود میں یہ بتانے کے لئے کہ ہم لوگ عربی کے مسئلے کو کیوں اور کیا اہمیت دیتے ہیں اس مسئلے پر تھوڑی سی گفتگو کرنا چاہتا ہوں ۔

عربی کا مسئلہ ہمارے نزدیک محض ایک زبان سیکھنے کا مسئلہ نہیں ، ہماری نظر میں یہ ایک تہذیبی مسئلہ ہے ، اس کا تعلق ہماری تعلیمی روایت سے ہے ۔ یہ شاندار تعلیمی روایت محمود غزنوی کے زمانے میں شروع ہوئی اور انگریزوں کے پنجاب پر قبضے تک جاری رہی ۔ نئی تعلیم سے پہلے اس سارے ملک میں (بہ شمول ہندوستان) بڑے بڑے دارالعلوم موجود تھے ۔ ان درس گاہوں کے فارغ لوگ دینی اور دنیوی دونوں قسم کے معاملات میں ماہر سمجھے جاتے تھے اور کل سلطنت انہی کی قابلیت سے چلتی تھی ۔ انگریزوں نے نئی تعلیم جاری کر کے دینی اور دنیوی تعلیم کے دو کیمپ بنا دیئے ۔ اور اپنی دسیسہ کاری سے ثابت کر دکھایا کہ دینی تعلیم صرف بیکار لوگوں کا مشغلہ ہے ۔ اصل تعلیم وہ ہے جو دنیوی نمونے کی ہے گویا دینی تعلیم کی حیثیت اچھوت تعلیم کی سی ہے ۔

پاکستان بن جانے کے بعد ہمیں توقع تھی کہ دینی اور دنیوی کا یہ فرق مٹا دیا جائے گا اور ہماری علمی و تعلیمی

روایت کا از سرِ نو احیا ہوگا اور اس میں مثل سابق عربی و دینی علوم کو مرکزی حیثیت دے کر دنیوی علوم کو ان کے ارد گرد جمع کر دیا جائے گا، تاکہ دو الگ الگ کیمپ باقی نہ رہیں۔ اور تخصیصی درس گاہوں کو چھوڑ کر باقی ساری تعلیم یک جا ہو، اس انداز میں کہ مرکزی طور پر، ہر آدمی محمود الرحمان رپورٹ کے الفاظ میں "مذہب کا آدمی" بھی ہوگا اور مذہب کا ہر آدمی دوسروں کی طرح دنیا کا آدمی بھی ہوگا کیونکہ وہ جدید تر علوم کا بھی عالم ہوگا۔

افسوس ہے کہ پاکستان کے ماہرینِ تعلیم انگریزی دور کی غلط روایتوں اور وراثتوں کو چھوڑ نہیں سکے۔ وہ عربی اور دینی علوم کو ایک بڑی کوٹھی کی محض انیکسی (ANNEXE) اور اب تو شاید بالکل فالتو گودام سمجھ رہے ہیں۔ حالانکہ قومی احیا کے لئے تعلیمی روایت کے احیا کی ضرورت تھی تاکہ ہمارے یہاں پھر شاہ ولی اللہ اور لطف اللہ مہندس پیدا ہو سکیں۔ پھر مردان خاں اور وزیر خاں نمودار ہوں اور وہ کچھ کر دکھائیں جو قدیم تعمیروں کے آثار سے ہمیں معلوم ہوتا ہے۔ عربی کو محض مُلّا پیدا کرنے کا ذریعہ بنانا، عربی علوم کی شدید ترین توہین ہے۔

خلاصہ یہ کہ ہماری نظر میں، عربی علوم کی تحصیل کا مقصد اس تعلیمی روایت کا احیا ہے جس کو انگریزی تعلیمی حکمتِ عملی نے ختم کر دیا تھا۔ ہم عربی زبان اور عربی علوم کو مرکزی اہمیت دلوانا چاہتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ اس کو محور بنا کر، باقی علوم کسی معقول منصوبے کے تحت اس محور کے گرد منظم کر دیے جائیں، تاکہ خطیب سازی اور ملا سازی کی یہ مضحکہ خیز مہم جو غلط زاویۂ نظر کی پیداوار ہے ختم ہو جائے۔

ظاہر ہے کہ یہ مقصد عربی کی موجودہ حیثیت کے ذریعے پورا نہیں ہو سکتا۔ اس وقت سرکاری نظامِ تعلیم میں عربی کی حیثیت وہ بھی نہیں جو انگریزوں کے زمانے میں تھی۔ نظامِ تعلیم میں، عربی کی پوزیشن ایک درماندہ اور زبوں حال مضمون کی ہے، انگریزوں کے زمانے میں، کم سے کم ایف۔ اے میں اس کی حیثیت لازمی مضمون کی تھی، اب یہ ایک گرا پڑا مضمون ہے۔ فقط۔

میں عربی کی حمایت میں اور عربی علوم کی مرکزی اہمیت کے جواز میں، بہت کچھ کہہ سکتا ہوں۔ مگر میں یہ سب کچھ کس لئے کہوں؟ یہ باتیں کس سے کروں؟ پرانے زمانے میں دیواروں پر لکھی ہوئی نصیحت کو بھی قبول کر لیا جاتا تھا۔ اور یہ بھی سنا ہے کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے تھے۔ اب افسوس ہے کہ آدمیوں کے بھی کان نہیں۔ تو ایسے میں یہ باتیں کسے سناؤں؟ بہت سے لوگ محض یہ سن کر ہی دل کی کھڑکیاں بند کر لیں گے کہ میں عربی علوم کو پھر رائج کرانا چاہتا ہوں حالانکہ وہ اب فرسودہ ہو چکے ہیں اور نئے مغربی علوم نے ان کی جگہ لے لی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہی غلط فہمی ساری سوء المزاجی کی جڑ ہے۔

حضرات! میں نئے علوم کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کر رہا ہوں۔ میں تو فقط یہ کہہ رہا ہوں کہ ملک کا ہر طالب العلم
ی علمی روایات اور اپنی علمی تاریخ سے باخبر ہو۔ اور اس کے ہمراہ نئی علمی ترقیات سے بھی شناسا ہو۔ اصل مقصد
زی نظر اور محور قائم کرنا ہے۔ محور کے گرد سارے علوم گھوم سکتے ہیں۔ مگر یہ ساری گفتگو جدید تعلیم یافتہ لوگوں
سمجھ میں نہیں آئے گی کیونکہ ان کی انگریزی تربیت نے انہیں سمجھا رکھا ہے کہ عربی علم سے آدمی ملّا ہو جاتا ہے۔
ور بے خبری ساتھ ساتھ سرگوشی کرتی جاتی ہے کہ تہذیب اس ملک میں صرف انگریز کے دم قدم سے آئی اس سے پہلے
م نرے جاہل تھے۔ بس یہی بے خبری سارے فساد کی جڑ ہے اور جس دن ہماری یہ بے خبری دور ہو جائے گی اسی دن
ہمارا نظام تعلیم بھی ٹھیک ہو جائے گا۔

ہمیں بار بار متنبہ کیا جاتا ہے کہ اسلام کے سلسلے میں بھی پہلے باہر دیکھو اور سوچو کہ دنیا میں سائنس کیا کیا معجزے
دکھا رہی ہے پھر اس سوچ کے سانچے میں اپنے اسلام کا ناک نقشہ درست کر لو یعنی پہلے اسلام کو نہ دیکھو کہیں سائنس
کے آئینے میں اس کا چہرہ ٹیڑھا نظر نہ آئے۔

ان واعظان با اقتدار کی خدمت میں عرض ہے، ہم آپ کے ارشاد کے برعکس باہر دیکھنے سے پہلے، اپنے
آپ کو دیکھیں گے، اسلام کے اندر پہلے جھانکیں گے۔ اس کے آئینے میں دنیا کو دیکھیں گے۔ اس آئینے میں دنیا کی
تاریخ قدیم اپنا چہرہ خود بخود دکھا دے گی۔ امریکی روسی سپٹنک سے پہلے ہم اپنی تاریخ پر نظر ڈالیں گے۔ دوسروں
کے سپٹنک دیکھتے دیکھتے، ہماری گردن کی رگیں ڈھیلی پڑ گئی ہیں اور آنکھیں پتھرا گئی ہیں مگر حاصل کچھ نہیں ہوا،
محتاجی اور لاچاری کی یہ مہم جس قدر جلد ختم ہو اتنا ہی ہمارے لئے اچھا ہو گا۔ کم از کم اقبال نے ہمیں یہی سکھایا ہے۔

عربی علوم کے جواز کی گفتگو سے میں اقبال کی خودی پر آگیا ہوں مگر یہ بے محل نہیں ہوا کیونکہ خود اقبال کو
سمجھنے کے لیے عربی علوم کی ضرورت مسلم ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم جس دن اقبال کو سمجھنے لگیں گے اسی دن عربی علوم
کی روایت پھر تازہ زندگی پالے گی، اسی دن ہمارا نظام تعلیم، صحیح بنیادوں پر استوار ہو جائے گا، اسی دن ہم اپنے
سپٹنک بنا بھی سکیں گے اور اڑا بھی سکیں گے، اسی دن یہ احساس جاگ اٹھے گا کہ ہم انگریزوں کے بنائے ہوئے
مہذب نہیں بلکہ چودہ سو سال سے مہذب ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ چھوٹا سا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا کہ غریب مگر
مقدس زبان عربی کو ملکی نظام تعلیم میں کہاں کہاں لازمی رکھا جانا چاہئے۔ دعا ہے کہ وہ دن جلد ہی آئے اور بہت
جلد آئے۔ اور اس دعا کے ساتھ شکریے پر میں تقریر کو ختم کرتا ہوں۔

صباح الدین عبد الرحمٰن

عرشی صاحب

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں شبلی، آزاد اور حالی جیسی دیو پیکر شخصیتوں نے مختلف قسم کی کتابیں لکھ کر علم و ادب پر جہاں اپنی قدرت اور مہارت کا ثبوت دیا، وہیں اردو زبان کو اپنی فکر و نظر کی گہرائی اور بلندی بھی عطا کی۔ یہ وہ دور ہے جب اردو ادب میں دریا کی وسعت اور کنوئیں کی گہرائی پیدا ہوئی۔ ان بزرگوں کی اور تصانیف سے قطع نظر کر کے کہا جا سکتا ہے کہ شبلی کا شعر العجم اور موازنۂ انیس و دبیر، آزاد کا آب حیات اور سخندانِ فارس اور حالی کا مقدمۂ شعر و شاعری اپنے رنگ کی بے مثال چیزیں ہیں۔ ان میں تحقیقی رنگ بھی ہے، تنقید بھی، کاوش و محنت بھی ہے، جدت و اختراع بھی، سفینے کا علم بھی ہے، سینے کا نور بھی۔ ان کے مقلدوں اور شاگردوں نے اس رنگ کو قائم رکھنے کی کوشش کی۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے خیام لکھی۔ اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دل کے ہر قطرۂ خون سے ان کے قلم کی مژگاں گل رنگ ہو رہی ہے۔ مولانا عبد السلام ندوی نے شعر الہند لکھنے کا ارادہ کیا تو پہلے مختلف جگہوں سے اردو شعراء کے دواوین اور تذکرے منگوا کر ایک بڑی الماری بھر لی اور پھر یہ دو جلدیں لکھنے بیٹھے ڈاکٹر عبد الحق نے کلام میر، باغ و بہار اور قواعد اردو پر جو مقدمے لکھے ہیں ان کی ایک ایک سطر سے ان کی محنت و جانفشانی کا اظہار ہوتا ہے۔ ان ہی کے الفاظ میں یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان کو بہت کچھ کھکھیڑ اٹھانی پڑتی اور کھڑاگ کرنا پڑتا، تب کہیں وہ کوئی کتاب مرتب کر کے شائع کرتے۔ انہیں کی غیر معمولی تلاش و جستجو کی بدولت آج متعدد شعراء کے کمیاب دیوان اور تذکرے ہمارے کتب خانوں کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ ان کی نگرانی میں جو کتابیں شائع ہوئیں ان میں ایک دیوانِ یقین بھی ہے، جس کے مرتب مرزا فرحت اللہ بیگ ہیں۔ معلوم نہیں، اس مزاح نگار نے کتنی عرق ریزی سے کام لیا ہوگا جو اس ۴۴ صفحے کے دیوان پر ۹۸ صفحے کا مقدمہ لکھا۔ جس کے پڑھنے کے بعد ان کی علمیت اور وسعتِ نظر کا بھی قائل ہونا پڑتا ہے۔ ۱۹۲۷ء میں محمود شیرانی مرحوم نے بڑی تحقیق سے پنجاب میں اردو لکھی تو اور صوبوں کے لئے اس راہ میں تحقیق کے دروازے کھل گئے۔ ۱۹۲۷ء میں پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کی کتاب ہماری شاعری لوگوں کے ہاتھوں

میں پہنچی تو کوئی اس رائے سے اختلاف نہ کرسکا کہ یہ کتاب ایک مدت کے غور و فکر، تلاش و تجسس اور وسیع و عمیق مطالعے کے بعد لکھی گئی ہے۔ ۱۹۲۹ء میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے اردو شہ پارے میں قدیم شاعروں اور نثر نگاروں کے انتخابات شائع کئے اور اس پر ایک مقدمہ لکھا تو ان کی اس کاوش کی داد دی گئی۔ رام بابو سکسینہ کی کتاب تاریخ ادب اردو میں وہ تحقیقی انداز نہیں جو ایسی کتابوں میں ہونا چاہیئے، لیکن اس کے باوجود یہ بھی سچ ہے کہ ہمارے ادب کی اس سے جامع تاریخ اب تک نہیں لکھی گئی۔ ۱۹۳۰ء میں مولانا احسن مارہروی کی کتاب نمونۂ منثورات نکلی تو وہ اپنے رنگ کی منفرد تالیف ثابت ہوئی۔ ۱۹۳۴ء میں پروفیسر ضیا احمد بدایونی نے دیوانِ مومن شائع کیا تو ایسا معلوم ہوا کہ مومن کے سمجھنے اور سمجھانے میں اس سے بہتر کام نہیں ہوسکتا تھا۔

ایسی تصانیف سے اردو زبان و ادب میں بڑا وقار اور وزن پیدا ہوا لیکن یکایک ایک ایسا دور آیا جب محنت، ریاضت، تجسس، تفحص، ژرف نگاہی اور باریک بینی کی جگہ ذہانت، ذکاوت، طباعی، تیزی، طراری اور شوخ بیانی نے لی اور انہی کے سہارے نظر و فکر کی راہیں سجائی جانے لگیں نئے چراغ روشن ہوئے، نئی منزلیں متعین کی گئیں نئی شاہراہ بنائی گئی، تنقید نگاری کا زاویۂ نظر بدل کر زبان و ادب کے ماہرین کو جھنجھوڑا گیا ان کے ذہن میں ایک خلش پیدا کی گئی۔ تحریروں کی رعنائی اور جدت آفرینی پر زیادہ زور دیا گیا۔ جو بات کسی نے نہ کہی ہو وہ کہی جانے لگی اور اسی کا نام "اوریجنیلٹی" (ایج) رکھا گیا، جس کی جلوہ سامانیوں میں تلاش و تحقیق اور محنت و مشقت پس پشت پڑ گئی، اور یہ تمام چیزیں یا تو قدامت پسندوں یا پھر ریسرچ کے طلبا کے لئے مخصوص کردی گئیں۔

لیکن کچھ ایسے اہل علم بھی تھے جو اپنے گوشۂ عافیت سے نہیں نکلے وہ ستائش سے بے پرواہ اور صلے سے بے نیاز ہو کر علم و فن کی خدمت میں لگے رہے۔ انہی میں جناب امتیاز علی عرشی ہیں۔ جنھوں نے رام پور کے کتاب خانے کے سفینے کے ذریعے سے اپنے سینے کو علم کے گہرہائے راز کا دفینہ بنا رکھا ہے۔ شروع میں وہ ایک عرصے تک زاویۂ خمول میں بیٹھے تحقیق و جستجو کے پروانے بنے رہے۔ اس زمانے میں لکھنے سے زیادہ مطالعہ اور گہرا مطالعہ ان کا مطمح نظر رہا۔

ان کے قلم کی گلکاریاں اس وقت ظاہر ہوئیں جب ۱۹۳۷ء میں انھوں نے مکاتیب غالب شائع کی۔ یہ غالب کے ان خطوط کا مجموعہ ہے، جو انہوں نے نوابانِ رامپور کو لکھے تھے۔ یہ خطوط ۱۲۱ صفحے میں آئے ہیں لیکن عرشی صاحب نے اس پر ۱۰۸ صفحے کا مقدمہ لکھا ہے جو لذت حضرت موسیٰؑ کو عصا ہاتھ میں لیے کوہ طور پر کھڑے ہونے میں ملی تھی، کچھ اسی طرح کا لطف عرشی صاحب کو قلم لے کر غالب کی لذیذ حکایت بیان کرنے میں حاصل ہوا ہے۔ ان کو غالب سے وہی محبت ہے جو فرہاد کو شیریں سے تھی۔ اسی لیے وہ غالب کی ہر تحریر سے اگر جوئے شیر نہیں، تو جاو شیریں ضرور کھود نکالتے ہیں۔ رامپور کے دار الانشاء میں غالب کے یہ خطوط برسوں سے کاغذوں کے انبار میں دبے رکھے تھے، دوسروں کی نظر میں بالکل غیر اہم اور بیکار، لیکن عرشی صاحب نے ان ہی خطوط سے غالب کی زندگی کے بعض ایسے پہلو واضح کر دیئے جو نہ صرف غالب کے

پرستار لطف و لذت سے پڑھتے ہیں۔ بلکہ غالب پر ریسرچ کرنے والے برابر ان سے استفادہ کرتے رہیں گے۔ ان کے مقدمہ میں "انشائے غالب" اور "متعلقاتِ انشا" کے عنوان سے جو کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ خاصے کی چیز ہے،

حالی نے یادگار غالب میں غالب کی جدت طرازیوں اور نرالے پن پر جو تبصرہ کیا ہے وہ اپنی جگہ بے مثال مزد ر ہے اسی طرح مرزا محمد عسکری نے ادبی خطوط غالب کے دیباچے میں غالب کے خطوط کی تقریباً بیس خصوصیتیں گنوائی ہیں، یہ بھی بہت ہی دلچسپ ہیں لیکن ان دونوں کتابوں میں جو کمی رہ گئی تھی اس کو عرشی صاحب نے نہ صرف پورا کیا ہے۔ بلکہ انہوں نے بڑی محنت و کاوش سے مگر دلچسپ انداز میں یہ بتایا ہے کہ غالب خطوط لکھکر خود لطف اٹھاتے اور دوسروں کے لئے سامانِ انبساط مہیا کرتے، خط نہ لکھنے تو غم غلط کرنے کو خطوط کے لفافے ہی بناتے رہتے۔ انہوں نے خطوط کی تحریر میں تقریر کا لطف پیدا کر کے محمد شاہی طرزِ مراسلت کو ختم کر دیا اور ان میں زندگانی پیدا کر کے ادب اردو کا دامن گوناگوں سدا بہار پھولوں سے بھر دیا۔ گو ان کے نوابانِ رامپور کے نام خطوط کا اسلوب اور طرز ادا ان کے عام خطوط سے کچھ مختلف ہے۔ ان میں بھی وہ سادگی اور شوخی اور ظرافت موجود ہے جن کے باعث غالب کی انشا دوسرے انشا پردازوں کی تحریروں سے گوئے سبقت لے گئی ہے وہ خطوط کے آخر میں اپنا نام صرف پُر تکلف مراسلت میں لکھتے ہیں ورنہ مساویانہ یا بزرگانہ خط و کتابت میں کبھی خط کے شروع میں یا درمیان میں اپنا نام لاکر اپنے آپ کو ظاہر کر دیتے تھے۔ اسی طرح ان کی تنوع پسند طبیعت تاریخ لکھنے میں بھی نئے نئے شگوفے کھلاتی۔ وہ کبھی شروع میں کبھی درمیان اور کبھی آخر میں تاریخ ثبت کر دیتے وہ خط لکھتے تو اس میں وقت کتابت کا ماحول بھی پیش کرنے کی کوشش کرتے تاکہ مکتوب الیہ اپنے آپ کو ان کے سامنے بیٹھا محسوس کرے۔ وہ خط و کتابت شفیعا آمیز نستعلیق میں لکھتے کیونکہ وہ ایسی اداؤں کے علاوہ تھے خط لکھنے کے لئے بالعموم باریک ولائتی کاغذ استعمال کرتے اور اس کو سادہ کاغذ کے مستطیل لفافے میں بھیجا کرتے۔ ڈاک کے قاعدوں کے سختی سے پابند تھے اور اپنے احباب سے بھی اسی کی توقع رکھتے۔ بیرنگ خطوط بھیجنا محبت و اخلاق کے خلاف جانتے تھے جواب دینے میں تاخیر نہ کرتے ان کی وسیع اور مسلسل مراسلت کی وجہ سے ڈاک خانے والوں کو ان کا نام اتنا ذہن نشین ہو گیا تھا کہ ان کا کوئی خط دہلی کے ڈاک خانے میں پہنچ کر کبھی ضائع نہ ہوتا۔ شدتِ مرض اور زیادتیِ ضعف کی حالت میں بھی وہ دوستوں کو جواب سے محروم رکھنا پسند نہ کرتے اور لیٹے لیٹے جواب لکھتے تھے۔

عرشی صاحب کی تحریر بتاتی ہے کہ ان تمام تفصیلات کے لکھنے میں انھوں نے غالب ہی کی طرح خود بھی لطف اٹھایا ہے اور دوسروں کے لئے بھی سامانِ انبساط مہیا کیا ہے۔ وہ جب غالب یا ان کے خطوط کے متعلق کچھ کہتے ہیں تو اپنی تحریروں میں غالب کی تحریریں اسی طرح لاتے ہیں جیسے طرح مرصع کار نگینہ جڑتا ہے یا کوئی مینت کار زیوروں پر نقش بناتا ہے۔ پورا مقدمہ پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غالب کے متعلق جو کچھ معلوم ہو چکا ہے وہ سب اس میں موجود ہے اور جو نہیں معلوم ہو سکا تھا وہ بھی اس میں موجود ہے۔

عرشی صاحب نے ۱۹۴۲ء میں اپنی غالب پرستی کا ایک اور ثبوت دیا جب انہوں نے غالب کے منتخب کلام کا ایک دیدہ زیب ایڈیشن انتخاب غالب کے نام سے شائع کیا۔ یہ سفید حاشیے کے ساتھ آسمانی رنگ کے کاغذ پر روشن ٹائپ میں

ت ہی اہتمام سے چھپا ہے۔ اس ایڈیشن کو دیکھکر غالب کے پرستار عرشی صاحب کے ذوق کی لطافت و نفاست کے قائل
گئے۔ اس خوش سلیقگی سے شاید ہی کسی اور شاعر کا دیوان آج تک چھپا ہو۔ غالب کو زندگی بھر دکھ رہا کہ جب بھی ان
دیوان چھپا۔ یہ ان کی پسند کے لائق نہیں تھا۔ اسی لیے وہ دلی اور اس کے بانی اور اس کے چھاپے پر لعنت بھیجتے رہے لیکن
کی روح عرشی صاحب سے ضرور خوش ہوگی کہ جو آرزو ان کی زندگی میں پوری نہ ہو سکی تھی وہ ان کے مرنے کے بعد عرشی
احب کے ذریعے پوری ہو گئی اس کتاب میں غالب کا فارسی اور اردو کلام ہے جو انھوں نے علیحدہ علیحدہ ۱۸۶۶ء
نواب کلب علی خاں والی رامپور کی فرمائش پر مرتب کیا تھا۔ فارسی کلام کا انتخاب تو رامپور کے کتاب خانے میں محفوظ
الیکن اردو کا انتخاب کتاب خانے کے ردی گھر میں ڈال دیا گیا تھا۔ عرشی صاحب نے اس متاع کاسد کا جائزہ لینے وقت
سے ڈھونڈھ نکالا اور پھر اسے زیور طباعت سے آراستہ کرکے ارباب ذوق کے لئے وقف کر دیا۔ انھوں نے اس پر
دیباچہ لکھا ہے اس کے لفظ لفظ سے ان کی غالب سے غیر معمولی عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔

اگرچہ عرشی صاحب کا محبوب موضوع غالبیات ہے لیکن اس بات کو تسلیم کرنے میں کسی کو تامل نہ ہوگا کہ اردو زبان
ادب پر بھی ان کی نظر بڑی گہری ہے اس کے ثبوت میں دستور الفصاحت کو پیش کیا جا سکتا ہے جسے انھوں نے ۱۹۴۳ء
مرتب کیا تھا۔ یہ کتاب ۱۲۱۳ھ سے پہلے سید احمد علی یکتا (خلف سید احمد علی لکھنوی) نے لکھی تھی۔ اس میں صرف
نحو، عروض و قوافی، معانی، بیان اور بدیع پر مفید مباحث ہیں جن کا علم اردو کے ہر ایک طالب علم کے لئے ضروری
ہے۔ اس کے آخر میں یکتا نے ان شاعروں کے حالات اور منتخب اشعار پیش کئے ہیں جن کا کلام کتاب میں بطور مثال جا بجا آیا
ہے۔ اگر اس کتاب پر عرشی صاحب کی نظر نہ پڑتی تو شاید یہ زینت طاق نسیاں ہی بنی رہ جاتی لیکن عرشی صاحب نے
۱۲۹ صفحے کی کتاب کو ایڈٹ کرکے اور اس پر ۱۷۱ صفحے کا دیباچہ لکھکر اس کے غیر معروف مصنف کو زندۂ جاوید
دیا۔ انھوں نے اس میں یہ دکھایا کہ اگرچہ یہ کتاب انشا کی دریائے لطافت کی طرح دلچسپ تو نہیں لیکن جہاں تک فن
فادی حیثیت کا تعلق ہے اس سے کسی طرح کم بھی نہیں۔ اس دیباچے کا بہت ہی اہم حصہ وہ ہے جہاں انھوں نے فارسی
اردو تذکروں سے متعلق پر مغز مفید اور قیمتی معلومات بہت ہی کاوش اور محنت اور علمی بصیرت سے فراہم
ہیں۔ جن سے تذکروں سے دلچسپی رکھنے والے حضرات ہمیشہ مستفیض ہوتے رہیں گے۔

عرشی صاحب رامپور کے کتاب خانے کے مہتمم ہیں۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ قدرت نے علم و فن کے ان
نادر پاروں کی نگرانی ان کے سپرد کر دی اور وہ بھی گھر بیٹھے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ کتاب خانے کو بھی ان انمول
جواہرات کا ان کے ایسا پارکھ شاید ہی کوئی اور ملتا۔ عرشی صاحب کو نادر چیزیں ڈھونڈ نکالنے کا فطری ملکہ ہے جنھیں
وہ زیور طباعت سے آراستہ کرکے اہل ذوق تک پہنچاتے رہتے ہیں۔ ۱۹۴۴ء میں نادرات شاہی کی اشاعت ان کی
سی جوہر شناسی کا نتیجہ ہے یہ ہندوستان کے آخری زمانے کے مغل فرمانروا شاہ عالم ثانی کے اردو، فارسی، ہندی اور

پنجابی کلام کا مجموعہ ہے۔ اس کے شروع میں عرشی صاحب نے ۴۲ صفحے کا جو مبسوط دیباچہ لکھا ہے اسے پڑھنے کے بعد ماننا پڑتا ہے کہ ہندوستان کی تاریخ پر بھی ان کی نظر وسیع ہے۔ انھوں نے شاہ عالم نامہ، وقائع عالم شاہی، تاج التواریخ، مرآۃ الاشیا، سیر المتاخرین، جام جہاں نما، مفتاح التواریخ، تاریخ تیمور اور دوسری کتابوں سے شاہ عالم کے منتشر حالات اس طرح جمع کر دیئے ہیں جس طرح کوئی چیونٹیوں کے منہ سے شکر کے دانے چن چن کر مٹھائی تیار کرلے۔ ان کو کتابوں میں بیانات کے جو اختلافات نظر آئے، ان پر بھی بحث کی ہے، دیباچے میں شاہ عالم کے ذوق شعری کے متعلق جو مفید معلومات دی ہیں۔ ان سے پہلی دفعہ تفصیل کے ساتھ اس بدنصیب فرمانروا کی سخن سنجی اور ادب نوازی کا علم ہوتا ہے، تیمور خاندان کی علم نوازی اور علم پروری کی تاریخ لکھنے والوں کے لئے ان کا یہ دیباچہ ہمیشہ ماخذ کا کام دیتا رہے گا۔ اس میں انھوں نے کثرت سے شاہ عالم کے ہندی اشعار بھی دئے ہیں، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اکبر نے ہندی شاعری سے جس رغبت کا اظہار کیا تھا اس کی نسل نے آخر وقت تک اسے برقرار رکھا جو اس خاندان کی رواداری علمی قدردانی اور وسیع المشربی کی بہت بڑی دلیل ہے،

اس کتاب کی اشاعت کے بعد وہ پھر اپنے محبوب موضوع (غالبیات) کی طرف مائل ہوئے اور ۱۹۴۷ء میں انھوں نے فرہنگ غالب کے نام سے ایک کتاب شائع کی۔ اس میں غالب ہی کے الفاظ میں فارسی، عربی، ترکی، سنسکرت، ہندی اور اردو لغات کی تحقیق و تشریح ہے جو عرشی صاحب نے بڑی دیدہ ریزی سے اردوئے معلیٰ، ابر گہربار، پنج آہنگ، انتخاب غالب، تیغ تیز، خطوط غالب، دستنبو، سبد چین، عود ہندی، ادبی خطوط غالب، درفش کاویانی، قاطع برہان، نامۂ غالب، مہر نیمروز، مکاتیب غالب، تیغ تیز، خطوط غالب اور دہلی اردو اخبارات سے جمع کئے ہیں۔ ان کتابوں کے نام یہاں اس لئے درج کئے گئے ہیں کہ ان کی فہرست دیکھکر آپ کو اندازہ ہو کہ اس کام میں عرشی صاحب کو کتنی ریاضت کرنی پڑی ہوگی، جب کہیں یہ گلدستہ تیار ہوا۔ اس کے دیباچے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ غالبیات کا یہ ماہر اپنے ذوق کی رنگارنگی کے سبب اردو اور فارسی کے قواعد اور لغات پر بھی گہری نظر رکھتا ہے انھوں نے اس دیباچے میں فارسی قواعد اور لغات کی کتابوں کی ایک لمبی فہرست دی ہے جس کا سرسری مطالعہ بھی فائدے سے خالی نہیں لکھتے لکھتے ایک جگہ عرشی صاحب کا جذبہ وطن دوستی جوش میں آگیا وہ ہندوستان میں قواعد فارسی کے متعلق لکھی ہوئی کتابوں کی ایک طویل فہرست دینے سے پہلے لکھتے ہیں:-

> "ایرانی آج تک ہندیوں کی خدمت زبانِ فارسی کا بقدرِ بایست شکریہ ادا نہیں کرتے، حالانکہ . . . . خالص لسانیاتی کام جس کیفیت وکمیت کا ہندوستانی علما نے انجام دیا ہے۔ ایران کے اہلِ زبان اس کا عُشرِ عشیر بھی نہ کرسکے۔"

پھر فارسی زبان کی صرف ونحو، معانی و بیان و بدائع اور عروض و قوافی پر جو کتابیں تالیف ہوئیں ان میں سے بعض نام گنانے کے بعد رقمطراز ہیں:-

"ہندوستانیوں کی سینکڑوں کتابوں میں سے یہ گنتی کے نام بھی اثباتِ مدعا کے لئے کافی ہیں کیونکہ یہ کتابیں ایرانیوں کے لئے بھی سنگِ میل کا کام دیتی رہی ہیں"۔

اس کے بعد وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ فارسی لغات پر بھی ہندوستان میں ایران سے زیادہ کام ہوا اور وہ فخر کے لہجے میں رقمطراز ہیں کہ "اگر لغت فرسِ اسدی طوسی، مجمع الفرس سروری کاشانی اور ایسی ہی ایک دو اور کتابوں کو الگ کر کے دیکھا جائے تو سارے عالم میں فارسی الفاظ کی تحقیق و تشریح کا دار و مدار انھیں مؤلفات پر نظر آتے گا جو یا تو ہندیوں نے لکھی ہیں۔ یا ہندوستانی سلاطین و اُمرا کی فرمائش پر لکھی گئی تھیں۔ ایرانیوں کے پاس لے دے کر ایک فرہنگ انجمن آرای ناصری ہے جو یکسر انہیں ہندیوں کی رہینِ منت ہے"۔ اسی سلسلے میں پھر لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں فارسی لغات میں جتنی کتابیں تصنیف ہوئی ہیں۔ ان کا احصا طویل فرصت چاہتا ہے، اسی لئے صرف ۳۸ لغات کے نام دینے پر اکتفا کیا ہے۔ عرشی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے۔ اس سے ایرانی جذبہ پندار کے تحت شاید اتفاق نہ کریں لیکن بہر حال یہ ہے حقیقت و صداقت کا مظہر۔

مرزا غالب کی طرح عرشی صاحب کی طبیعت بھی باغ و بہار ہے وہ بھی جدت، جودت اور نرالا پن کو بہت پسند کرتے ہیں، چنانچہ جب رامپور کے کتب خانے میں انشا اللہ خاں انشا کی تصنیف سلک گوہر کا نسخہ ملا، تو انھوں نے ۱۹۴۸ء میں اُسے شائع کر دیا۔ یہ ایک مختصر کہانی ہے، جسے انشا نے اپنی طبیعت کی اپج دکھانے کو بے نقطہ اردو میں لکھا ہے اس کے دیباچے میں عرشی صاحب لکھتے ہیں کہ انشا خوش بیانی اور ظرافت کے بھی پتلے تھے۔ جہاں بیٹھ جاتے۔ لطیفوں کے باغ اور چٹکلوں کے گل کھلاتے، بات میں بات ایسی پیدا کر دیتے کہ سُننے والے عش عش کر اٹھتے۔ یہی بات خود عرشی صاحب کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے وہ جہاں بیٹھ جاتے ہیں اپنی رنگین بیانی سے محفل گل و گلزار بنا دیتے ہیں اور پھر اپنی تحریروں میں بھی ایسی بات میں بات پیدا کرتے ہیں کہ پڑھنے والے سر دھنتے رہ جاتے ہیں۔ اس کی تائید ان کے مرتب کردہ دیوان غالب (اردو) کے دیباچے سے ہوتی ہے۔

عرشی صاحب نے رسالہ معارف اعظم گڑھ کی مارچ اپریل اور مئی ۱۹۴۹ء کی تین اشاعتوں میں "اردو زبان کی بناوٹ میں افغانوں کا حصّہ" کے عنوان سے ایک سلسلۂ مضامین لکھا تھا جو اب کتابی صورت میں شائع ہو گئے ہیں۔ اس میں انھوں نے دکھایا ہے کہ روہیلکھنڈ کے باشندوں کا رہن سہن، بول چال، رسم و رواج، وضع قطع ملک کے دوسرے حصّوں سے کسی نہ کسی حد تک جُدا ہے۔ اور یہاں کے لوگوں میں عام طور پر افغانستانی سادگی، بے باکی اور درشتی پائی جاتی ہے۔ افغانستانی اثرات ہی کی وجہ سے یہاں کے روزمرے میں پشتو کے بہت سے الفاظ داخل ہو گئے ہیں، عرشی صاحب نے ایسے ڈیڑھ سو الفاظ کی فہرست دی ہے جو روہیلکھنڈ میں عام طور سے بولے جاتے ہیں۔ لیکن وہاں کے علاوہ اور دوسری جگہوں پر یہ نہ بولے جاتے ہیں، نہ کوئی انھیں سمجھتا ہے۔ مثلاً اوبہ (ابرو) اور بل (بالوں کی لٹیں) برہنڈ (ننگا) بلاغنڈ (بیل) پوس (احمق) وغیرہ۔ ان الفاظ کے جمع کرنے میں بھی عرشی صاحب نے اسی محنت اور مشقت سے کام لیا ہے جو ان کی ہر تحریر کی نمایاں خصوصیت ہے۔

عرشی صاحب کے مرتبہ انتخاب غالب ۱۹۴۲ء کا ذکر ہو چکا ہے۔ دیوان غالب (اردو) کی طباعت اشاعت ۱۹۵۸ء میں

ہوئی گویا ۱۴ سال تک عرشی صاحب کے غور و فکر کا پروانہ ان کے محبوب موضوع غالبیات کی شمع کے گرد چکر لگاتا رہا اور جب ان کا مرتبہ دیوانِ غالب منظرِ عام پر آیا تو ایسا معلوم ہوا کہ عرشی صاحب نے نہ صرف سید علی حیدر نظم طباطبائی، حسرت موہانی آسی ہستیا، مفتی انوار الحق، مالک رام اور آغا محمد باقر وغیرہ کے مرتب کردہ دیوان اور ان کی شرحوں بلکہ چغتائی ایڈیشن اور اکرام کے غالب نامہ کی امتیازی خصوصیات سے بھی ہماری نظروں کو ہٹا کر اپنی طرف مائل کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

یہ دیوان تین حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصے کا نام "گنجینۂ معنی" رکھا گیا ہے اس میں وہ تمام اشعار ہیں جو غالب نے شروع میں کہے لیکن پھر ان سے بیشتر ۱۸۴۱ء کے پہلے ایڈیشن میں شامل نہیں کئے۔ اس حصے کا نام غالب کے اس شعر سے ماخوذ ہے۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

دوسرے حصے کا نام "نوائے سروش" ہے۔ اس میں غالب کا وہ متداول کلام ہے جو انھوں نے اپنی زندگی میں متعدد بار چھپوا کر تقسیم کیا اور جس کے متعلق یہ دعویٰ کیا تھا کہ۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

تیسرے حصے کا نام "یادگارِ نالہ" ہے، جو اس شعر سے لیا گیا ہے،

نالۂ دل نے دیے اوراقِ لختِ دل بباد یادگارِ نالہ یک دیوانِ بے شیرازہ تھا

اس حصے میں غالب کا وہ کلام ہے جو ان کے دیوان کے کسی نسخے کے حاشئے یا خاتمے یا ان کے نام سے کسی رسالے میں شائع ہوا ہے۔

اس طرح غالب نے اپنی زندگی میں اردو میں جتنے اشعار کہے وہ سب اس ایڈیشن میں مل جاتے ہیں، جن کو عرشی صاحب نے "حدیثِ زلف عنبر بار دوست" سمجھ کر یکجا کر دیا ہے لیکن ان کے جمع کرنے میں انھوں نے نہ صرف دودِ چراغِ نیم شبی کے سامنے خونِ جگر پیا ہے بلکہ کوچہ گردی اور آبلہ پائی سے بھی کام لیا ہے۔ انھوں نے اول تو غالب کی زندگی کے مطبوعہ دیوانوں کو اکٹھا کیا پھر جہاں جہاں اس کے قلمی نسخے ملے ان کو جا کر خود دیکھا یا ان کی نقلیں منگائیں، ان قلمی اور مطبوعہ نسخوں سے متعلق مفید معلومات حاصل کیں مختلف نسخوں کا مقابلہ کیا۔ ان میں اگر کوئی لفظی اختلاف یا کتابت کی غلطی یا غلط املے کی صحیح یا ساقط لفظوں کا اضافہ یا لفظوں یا مرکزوں کی اصلاحوں میں کچھ بھی فرق نظر آیا ہے تو ان کو بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ ۲۷ صفحوں میں واضح کیا ہے، یقیناً یہ حصہ قلمبند کرتے وقت وہ زبانِ حال سے کہہ رہے ہوں گے،

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

عرشی صاحب کا جو ادبی شعور انتخاب غالب کے دیباچے میں دبا رہ گیا تھا۔ وہ اس کتاب کے دیباچے میں اچھی طرح ابھر آیا ہے جہاں ان کا قلم طاؤس کی طرح رقص کرتا نظر آتا ہے۔ اس میں غالب سے متعلق بہت سی ایسی باتیں نظر آئیں جو شاید پہلے کسی نظر سے نہ گزری ہوں، میرے نزدیک اس کا اہم ترین اور مفید ترین حصہ وہ ہے جہاں انھوں نے طرزِ سخن، تعریفِ سخن، تعریفِ شعر

اوصاف شعر اور عیوبِ شعر کے عنوانات سے خود غالب کے خیالات پیش کئے ہیں یہ اس تفصیل کے ساتھ پہلے کسی اور نے نہیں لکھے تھے۔ ان کو پڑھ کر اختصار کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ غالب کا خیال تھا کہ شاعری معنی آفرینی ہے محض قافیہ پیمائی نہیں۔ اس میں دوشیزگی ہو لیکن مضمون اس کا زیور ہو اس طرح کہ وہ روکش ماہ تمام ہو۔ زبان پاکیزہ ہو، الفاظ متین ہوں، مضامین اچھوتے ہوں، معانی نازک ہوں، مطالب کا بیان دل نشین ہو۔ روزمرہ صاف ہو، بندش دل پسند ہو، سلاستِ فکر ہو حسن بیان ہو، تعقیدِ لفظی ہو تو ہو لیکن تعقیدِ معنوی نہ ہو۔ وہ غزل میں اتحادِ حروف والفاظ کو پسند نہیں کرتے۔ توارد کے متعلق لکھتے ہیں کہ اگر پیش رَو شاعر اپنے پیش رو سے مضمون آفرینی یا طرزِ ادا میں زیادہ لطف وخوبی پیدا کر دے تو یہ اس کے لئے قابل تحسینات ہے ایطا بھی ان کے نزدیک عیب تھا۔ وہ لفظی صنعتوں سے پرہیز کرتے سہل ممتنع ہی کو سحر یا اعجاز قرار دیتے تھے ان ہی تمام خصوصیات کی بدولت ان کا دیوان ان کے بعض عقیدت مندوں کی نظر میں ایک آسمانی صحیفے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر موجودہ دور کے شعرا ان ہدایات کا غور سے مطالعہ کریں تو یہ ان کے لئے ادبی اور فنی زبور اور انجیل کا کام دے سکتی ہیں۔

اس کتاب میں شرحِ غالب کے عنوان سے جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں دیدہ ریزی بھی ہے، جگر کاوی بھی۔ اس میں کہیں تو وہ تشریحیں ہیں جو غالب نے اپنے احباب کے استفسار پر تحریر کی تھیں، کہیں ان کے خطوط کے وہ حصے ہیں جن میں انہوں نے اپنا کوئی شعر استشہاداً لکھا تھا، کہیں کوئی قطعہ، رباعی، مثنوی اور شعر لکھنے کی تقریب ہے کہیں غالب کے شعر کے مقابلے میں خاقانی، اسمٰعیل اصفہانی امیر خسرو، سیف الدین اسفرنگی، فغانی، نظیری، عرفی، ہلالی ہروی، ذوق اور مومن کے ہم معنی اشعار ہیں، کہیں ان کی لذیذ تفصیل لکھی ہے کہ جو اشعار مطبوعہ یا قلمی نسخوں میں نہیں وہ انھیں کہاں سے اور کیسے ملے۔ تیسرے حصے "یادگار نالہ" میں بہت سے ایسے اشعار نظر آئے جن کو پہلی بار پڑھنے پر یقین نہ آیا کہ گنجینۂ معنی کا طلسم باندھنے والا اپنے صریر خامہ سے نوائے سروش بلند کرنے والا اور اعجاز مسیحا کو محض ایک بات سمجھنے والا ہو۔ ایسے ادنیٰ درجے کے شعر کہہ سکتا ہے لیکن ان کی شانِ نزول کی توضیحات کو پڑھ کر تکدر لطف میں بدل جاتا ہے اور پھر عرشی صاحب کو یہ کہکر داد دینے کو جی چاہتا ہے ــــ ع

نقش کو اس کے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں

عرشی صاحب نے دیوان غالب (اردو) کو جس محنت سے ایڈٹ کیا ہے اس سے نہ صرف ان کی غالب کی ذات سے شیفتگی ذرفتگی اور وارفتگی کا اظہار ہوتا ہے بلکہ یہ علم وادب کے میدان میں تحقیق اور تلاش کرنے والوں کے لئے مستقل مشعل ہدایت بھی ہے۔ تراوشِ خونابہ کو ظہور میں لانے کے لئے ایک لگن کی ضرورت ہوتی ہے۔ عرشی صاحب کو یہ لگن غالبیات کے ساتھ ہے غالب کی ہر عبارت، ہر اشارت اور ہر ادا ان کے لئے بلائے جاں ہے، غالب کی ہر چیز پر ان کا دم نکلتا ہے اگرچہ وہ اسی کے سہارے نہ صرف جیتے ہیں بلکہ ہمیشہ جیتے رہیں گے، مکاتیب غالب، انتخاب غالب اور دیوانِ غالب (اردو) کو مرتب کر کے انھوں نے شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار میں جگہ پالی ہے۔ غالب ہوتے تو عرشی صاحب ان کے پاس بے کھٹکے بے تکلف جا سکتے تھے۔

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

اور غالب بھی ان کو دیکھ سکتے تھے کہ میں اب اپنی شکست کی آواز نہیں رہا بلکہ گلِ نغمہ ہوں، پردۂ ساز ہوں، میرا سازِ ہستی بے صدا نہیں رہا، مجھے اس کی شکایت بھی نہیں رہی کہ لوگوں کے خبر ہونے تک میں ان کے تغافل سے خاک ہو کر رہ جاؤنگا میں اب پامالِ وطن کی بے مہری بھول گیا ہوں، اب مجھے رہگزر سے کوئی نہیں اٹھا سکتا۔ اب میری شاعری لکد کوبِ حوادث کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ میرا خیال غلط تھا کہ میرے سخن میں دم نہیں بلکہ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ اس کی آتش فشانی باقی ہے۔ میرا ریختہ رشکِ فارسی ہو رہا ہے۔ مائدۂ لذتِ درد بھی، دیدۂ پرخوں بھی، ساغرِ سرشارِ دوست بھی، شمعِ بزمِ بیخودی بھی اور بساطِ صحبتِ احباب بھی۔

عرشی صاحب نے ۱۹۶۳ء میں انگریزی میں رضا لائبریری رام پور کے عربی مخطوطات کی فہرست کی پہلی جلد شائع کی۔ اس میں ۴۲۰ مخطوطات کا ذکر ہے۔ جو سب کے سب قرآن پاک یا تفسیروں کے نسخے ہیں۔ ان میں بعض نسخے حضرت علی بن ابی طالب (م ۴۰ھ ۶۶۱ء) امام ابوعبداللہ جعفر (م ۱۴۸ھ ۷۶۵ء) ابوعلی محمد بن علی حسن بن مقلہ البغدادی (م ۳۲۸ھ/۹۴۰ء) کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ پوری فہرست ۶۵۷ صفحوں پر مشتمل ہے اپنی اتنادِ طبع اور خصوصیت کے مطابق عرشی صاحب نے ان مخطوطات کے مطالعے میں بے شمار گھڑیاں صرف کی ہونگی۔ جب کہیں یہ تمادشِ خونابہ ظہور میں آئی ہوگی۔ یہ فہرست نہ صرف رضا لائبریری ہی کی بلکہ مخطوطات کی فہرست نگاری کی بھی بڑی خدمت ہے اور یہ بھی انڈیا آفس برٹش میوزیم، بوڈلین، برلن اور پٹنہ کے کتاب خانوں کے عربی اور فارسی مخطوطات کی فہرستوں کی طرح ہمیشہ قابل قدر سمجھی جائے گی جس سے اہلِ علم برابر مستفید ہوتے رہیں گے رضا لائبریری میں چودہ ہزار مخطوطات ہیں۔ جن کی فہرست تیار کرنا بہت ہی صبر آزما کام ہے۔ عرشی صاحب کی زندگی میں محنت ریاضت اور مشقت کے ساتھ کاوش، تلاش، تحقیق، دیدہ ریزی اور دیدہ دری کچھ ایسی سرایت کر گئی ہے کہ کیا عجب انھی کے ہاتھوں یہ صبر آزما کام بھی انجام پا جائے۔ (نذرِ عرشی)

مجاز و حقیقت

ظاہر میں ہم فریفتہ حُسن بتاں کے ہیں
پر کیا کہیں نگاہ میں جلوے کہاں کے ہیں

واعظ - ہاں یہی محراب و منبر پر جلوہ کرنے والے واعظ - چاہے کچھ ہی کہیں، بت پرستی کے چرچے ہوتے ہی رہیں گے - یہ چرچے بعض دفعہ وعظ سے زیادہ اشاعتِ مذہب کرتے ہیں - کفر کی کالی کالی گھٹاؤں میں کسی کا چاند سا مکھڑا نورِ ایمان پھیلاتے کس نے نہیں دیکھا - اور بڑے بڑے پتھر دلوں کو کسی کی کافرادؤں کا کلمہ پڑھتے کس نے نہیں سُنا - حُسن ہر چند کہ "لا نبیّ بعدی" ایک پیغمبر ہے اور عین کفر میں تلقین ایمان اس کا مشن ہے - حسن عشق کے سہارے عشق جو بقول میر نیرنگ آئینۂ ہستی میں حُسن کا اپنا ہی عکس ہے - کعبۂ دل میں اپنا مندر بناتا ہے - اور اس کے فدائیوں کی ارادت اس کی مورت کے قدم چومنے کو دمبدم اُسی اشتیاق - اسی سوز و گداز سے کھینچی جاتی ہے - جو ایک خدا پرست مسلمان کو حج کے دنوں میں مقدس حجر اسود کی طرف کشاں کشاں لے جاتا ہے - یہ اشتیاق یہ سوز و گداز حسن نے عشق یا سچّی محبت کی پاکیزہ برقی طاقت کے ذریعے پیدا کر دیئے ہیں - اور پھر یہ سوز و گداز اپنی جبن کی محویت میں معبودِ حقیقی کے جلوے کبھی گل اندام محبوبہ کی موہنی صورت کبھی ننھے ننھے معصوم بچوں کی بھولی بھالی شکل، کہیں علم و ہنر کے معجز نما کرشموں اور کہیں موسیقی کے میٹھے میٹھے زمزموں کی روانی میں دیکھ رہے ہوتے ہیں اور دل ہی دل میں اس لذتِ نہاں کے مزے لیتے ہیں - یہ لذت بھی عجیب مزے کی ہوتی ہے - اور اس کے ڈھنگ نرالے - اگر مذاق صحیح ہو تو اس حظ کی جو اس سے نصیب ہوتا ہے کوئی حد نہیں - بچوں سے پیار کی باتیں - نازنینوں کی طرف الفت کی نگاہیں - موسم بہار کے دلولے، خزاں کے صدمے - دستِ قدرت کی شاندار روح افزائیاں اور حضرت انسان کے ہنر کی دلآویز مسرت آفرینیاں سب کی سب ساتھ ہی ساتھ ہمیں بتا رہی ہوتی ہیں کہ حسن و عشق کے ناپیدا کنار سمندر میں ان کی ہستی پانی کی ایک لہر سے زیادہ نہیں - ہمارے

جذبات عین جوش شباب میں بیان کے منہ پر مہر خاموشی لگا دیتے ہیں۔ اور ہماری محبت کا دریا امڈا ہوا طغیانی کے زور میں منزلِ مقصود سے کہیں پرے نکل جاتا ہے۔ اور میدانِ مجاز سے تجاوز کرتا ہوا حقیقت کے بحرِ بے پایاں میں ناپید ہو جاتا ہے۔

ان معنوں میں بت پرستی حق پرستی ہے۔ حسنِ تباں موسیقی کے دلکش نغموں کی طرح ظاہر کے تاروں سے باطن کے پردے ہلاتا ہے۔ اس کی اداؤں میں بھی وہی جادو کے انداز ہیں۔ اگر کوئی گا رہا ہو تو کان لگاؤ۔ دیکھو تو کس جادو کے انداز سے مست ترانوں کی ہوش رُبا مرلی آواز ہمارے دل کی ناسپردہ پیچ در پیچ راہوں میں سے ہوتی ہوئی اپنی اٹکھیلیوں سے اس کے نازک سے نازک پردوں کو چھیڑتی جاتی ہے۔ اور اپنی اس سحر اثر چال سے ہماری موجودہ اور گزشتہ زندگی کے تاروں میں ایک خاموش حرکت یگانگت پیدا کر رہی ہے۔ اس کے تھوڑے سے چھیڑنے سے آن کی آن میں ہماری عمر بھر کی سوز و الفت کی چنگاریاں جو محنت و کلفت کے سالوں میں بکھری پڑی تھیں۔ ہمارا دل گداز کئے دیتی تھیں۔ اور ہاں اس کی مقناطیسی کشش مروت و ایثار کے لوہے کے چنے جو وقت پر چبانے وبالِ جان ہو رہے تھے۔ ہماری زندگی کے چاروں طرف سے اکٹھے کر کے تسلیم و رضا کی علو ہمتی کے ہاتھوں موم کرتی نظر آ رہی ہے۔ اور یہ ساری کشمکش ہماری اس وقت کی راحت کو پہلی کلفتوں میں اور اس لحظے کی کلفت کو پہلی راحتوں میں ملا کر ایک لطف پیدا کر رہی ہے۔ جس کے مزے زبانِ قلم کو مجال کہاں کہ بیان کرے۔ ان سحر اثر ترانوں سے اس طرح متاثر ہونا کسی مذہب میں عجیب نہیں۔ اور نہ یہ ہمیں کسی قسم کی کمزوری کے الزام کا مورد بنا سکتا ہے۔ اس میں ہمارے ان واعظوں کو بھی اختلاف نہ ہوگا۔

حسن بھی ماہ جبینوں کے روئے روشن میں ان کی سُرخ و سفید مٹی سے کہیں ارفع و اعلیٰ چشمۂ نور کی تجلیاں دکھاتا ہے۔ البتہ ان تجلیوں کے دیکھنے کے لئے روشن ضمیری درکار ہے۔ اگر یہ ہو تو پھر ماہ رویوں کے پیرہ جسم کی مانگی ہوئی ضیا میں چہرہ پردازِ جہاں کا نقش جما ہوا دیکھ لینا کوئی مشکل امر نہیں۔

یہ نعمت اہلِ دل کے سوا دوسرے کو میسّر بھی نہیں۔ وہ دیکھ سکتے ہیں کہ جادو جو تسخیرِ قلوب کے لئے اعلیٰ علیّین سے آکر بتوں کی آنکھ میں جاگزیں ہوا ہے۔ اپنی فسوں سازیوں سے (اور ان فسوں سازیوں کی زبان اپنی فصاحت و بلاغت سے کچھ تائیدِ غیبی بھی لئے ہوتی ہے۔ جو ہماری بے خودی کے پیدا کرنے میں حکیمی اثر رکھتی ہے) ہماری محویت کو مجاز کے رنگ میں صورت حقیقت دے رہا ہے۔ نرگس چشم اور بوٹا سا قد ہمیں باغ باغ کئے دیتے ہیں اور اس لئے کہ یہ اسی بوستانِ الفت و محبت کے گل اور بوٹے ہیں جس کی خوشگوار ہوا میں ہمارا اپنا اور ہمارے ہم جنسوں کا غنچۂ دل کھلا۔ ہم اور ہمارے ہم جنس پھلے اور پھولے۔ پھل اور پھول رہے ہیں۔ جس کا پانی ہماری زندگی اور جس کی شادابی ہماری سرسبزی کا باعث ہے۔ ("مخزن"۔ جلد اوّل)

سیّد ساجد علی

ہماری شاعری

آج کل مشاعروں کی دھوم ہے۔ یہ کسی زمانے میں شائستہ اصلاحی صحبتیں ہوتی تھیں ان میں اگرچہ عوام و خاص شریک ہوتے تھے۔ مگر خواص کا اثر صحبت عوام پر بہت ہوتا تھا۔ مشاعروں میں آداب اور حفظ مراتب کا بہت خیال رکھا جاتا تھا۔ عوام میں یہ طریقے پھیل جاتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ کل معاشرے میں تہذیب پھیل جاتی تھی۔ زبان کی غلطیوں پر برسر مشاعرہ ٹوک دیا جاتا تھا۔ ان پر ردوقدح ہوتی تھی۔ مستند شعرا کے کلام سے سندیں پیش کی جاتی تھیں روزمرہ اور محاورات کی صحت پر بحث ہوتی تھی۔ ناموزوں جذبات اور ناقص خیالات کی اصلاح ہوتی تھی۔ تشبیہات اور استعارات کا برمحل استعمال بتایا جاتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ بعض اوقات شعرا میں باہم رنجشیں ہو جاتی تھیں مگر عموماً دل صاف ہوتے تھے۔ چنانچہ مصحفی نے انشا کی وفات پر کہا تھا ؎

مصحفی کس زندگانی پر بھلا میں شاد ہوں
یاد ہے مرگ قتیل و مردن انشا مجھے

موجودہ زمانے میں یہ حالت نہیں ہے۔ اول تو مشاعروں میں زیادہ تر غیر طرحی غزلیں ہوتی ہیں دوسرے تنقید کی اجازت نہیں ہوتی ہے اس کی وجہ سے نہ شاعری کی ترقی ہو رہی ہے اور نہ زبان کی اصلاح اور نہ اس میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اب حالات بدل گئے ہیں۔ تعلیم کی اشاعت نے معلومات میں اضافہ۔ خیالات و جذبات میں بلندی۔ گہرائی اور گیرائی پیدا کر دی ہے اب ضرورت ہے کہ ہماری شاعری کے معیاروں کو قائم رکھا جائے۔ اب تک ہماری شاعری میں ابہام بہت رہا ہے۔ اب اسے متعین کرنے کی ضرورت ہے۔

اب انسانی زندگی کے ہر پہلو کا مطالعہ کیا جا رہا ہے اور کوشش کی جا رہی ہے کہ اس کا ہر گوشہ روشن ہو جائے قلب یا دماغ کو اہل علم تفنن کہتے ہیں اور یہ نفسیات کا موضوع ہے۔ ہمارے اعمال کا محرک ہمارا نفس ہوتا ہے مثلاً ہمارا ایک ملاقاتی آتا ہے تو پہلے ہم اسے دیکھتے اور پہچانتے ہیں ہم کو اس کا علم ہوتا ہے کہ یہ فلاں دوست ہے۔ اس کے

بعد ہم ملاقات پر مسرت کا اظہار کرتے ہیں بعد ازاں اس سے مصافحہ یا معانقہ کرتے ہیں۔ نفس انسانی کے یہ تین پہلو ہیں۔ اول علم ہونا۔ دوسرے مسرت یا رنج ہونا۔ اور آخر میں عمل کرنا۔ نفسیات میں انہیں تعلم۔ تاثر اور ارادت کہتے ہیں۔ ہمارے ہر کام میں یہ تینوں پہلو عمل کرتے ہیں مگر ان میں مساوی شدت نہیں ہوتی ہے۔ بعض وقت تعلیم کا غلبہ ہوتا ہے۔ اور دوسرے دو پہلو ماند پڑ جاتے ہیں۔ بعض وقت تاثر دوسرے دو پہلوؤں کو دبا دیتا ہے۔ اور بعض وقت ارادت باقی دو پہلوؤں پر غالب آجاتی ہے۔ ایک فلسفی پر تعلم کا غلبہ ہوتا ہے ایک شاعر میں تاثر زیادہ ہوتا ہے اور ایک فوجی میں ارادہ قوی ہوتا ہے۔ فلسفی حادثات زمانہ سے کم متاثر ہوتا ہے البتہ ان کی کنہہ معلوم کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ ایک شاعر معمولی سانحے سے متاثر ہونے پر اپنے رنج کو ظاہر کرتا ہے۔ ایک کمانڈر کو میدان جنگ کی نقل و حرکت اتنی فرصت نہیں دیتی کہ وہ اطراف میں پڑی ہوئی لاشوں پر چار آنسو بہائے یا افسر کے دیئے ہوئے احکام پر چون وچرا کرے وہ تو حکم کی تعمیل کرتا ہے، اگر ہم نثر کو تعلم کی زبان کہیں اور شاعری کو تاثر کی زبان اور ان کی اشاعت کو ارادت کا مظہر کہیں تو ہمیں شاعری کے دائرۂ عمل کو معین کرنے میں مدد ملے گی۔ چونکہ اس مضمون میں صرف شاعری سے بحث کرنا مقصود ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تاثر کی وضاحت کر دی جائے۔

ادیبوں کی نثری تحریروں کے مدارج ہوتے ہیں۔ ایک ادیب خارجی واقعات کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ آپ کے سامنے اس کی تصویر کھنچ جاتی ہے مگر اس کے خیالات سطحی ہوتے ہیں وہ اشیا کا تجسس اور ادراک کرتا ہے دوسرا ادیب اپنی قوت متخیلہ سے ایسے پیکر تراشتا ہے کہ لوگ انہیں پوجتے ہیں۔ تاریخی واقعات کو بڑی خوبی سے بیان کرتا ہے اور ان کی وجوہ وقوع اور نتائج کو بیان کرتا ہے۔ یہ واقعات زمان و مکان کی قید میں ہوتے ہیں مگر جب ایک ادیب عالمگیر حقائق کو بیان کرتا ہے تو اس کا تعلم تفکر کی حد تک پہنچ جاتا ہے اس کی نظر تمام کائنات پر محیط ہوتی ہے وہ جزئیات سے بالاتر ہو کر کلیات کو بیان کرتا ہے یہ تعلم کے درجے ہیں اس طرح تاثر کے مدارج ہوتے ہیں۔ ایک معمولی لذت و درد کی کیفیت ہوتی ہے مثلاً ایک بچہ دھنک دیکھتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ اس طرح جب اس کا کوئی کھلونا ٹوٹ جاتا ہے تو اسے رنج ہوتا ہے یہ تاثر کا ابتدائی دور ہے۔ اسے احساس کہا جاتا ہے۔ جب اس احساس میں غور و فکر کا عنصر داخل ہو جاتا ہے تو یہ جذبے کے درجے پر پہنچ جاتا ہے۔ محبت، نفرت، رشک، حسد وغیرہ جذبات ہیں۔ ان میں تعلم کا دخل ہوتا ہے۔ خواہ وہ ادراک ہی کا ہو اب نفس کا یہ پہلو مرکب ہو جاتا ہے مگر تاثر کا غلبہ رہتا ہے۔ یہ احساس سے زیادہ قوی ہوتا ہے۔ اور عمل کا طاقتور محرک بن جاتا ہے۔ مگر اس میں استقلال اور استحکام نہیں ہوتا ہے۔ ہمارے اکثر شاعر جذبات ہی کے اثر سے شعر کہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ وقتی دلچسپی کے تو ہوتے ہیں مگر مستقل قدر کے نہیں ہوتے۔ جب یہ جذبات کسی مستقل تصور سے متعلق ہو جاتے ہیں۔ تو جذبات اعلیٰ کا درجہ اختیار کر لیتے ہیں۔ مثلاً حب وطن یا حب قوم۔ اگر کسی فن سے گرویدگی ہو جائے تو وہ فنا فی الفن کا جذبہ اعلیٰ

ہوگا

جب کسی شخص کا تعلق درجہ کمال کو پہنچ جاتا ہے تو اس پر علمی حقائق منکشف ہوتے ہیں اسے علمی بصیرت ہوجاتی ہے۔ اس کی آنکھ سے تعینات کے پردے ہٹ جاتے ہیں وہ استدلال کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ جب اس کے سامنے واقعات پیش آتے ہیں تو اسے ان کی حقیقت اس طرح نظر آتی ہے جس طرح آئینے میں چہرہ نظر آتا ہے۔ جب کوئی شخص تاثری صداقتوں میں کمال حاصل کر لیتا ہے وہ تاثری صداقتوں کو دریافت کرتا ہے اور اپنے اشعار میں ان کو پیش کرتا ہے وہ قادر الکلام شاعر ہوتا ہے اسے وجدان حاصل ہوتا ہے ایسے ہی شاعر کو تلمیذ الرحمان کہا گیا ہے اس کی شاعری جزو پیغمبری ہوتی ہے۔ جب کوئی شخص ارادت میں درجہ کمال کو پہنچ جاتا ہے تو وہ اپنے زمانے کا خالد، طارق، نپولین ہنی بال ہوتا ہے۔ بعض لوگ ان تینوں پہلوؤں میں کمال حاصل کر لیتے ہیں۔ ان میں توازن قائم رکھتے ہیں۔ وہ پیغمبر کہلاتے ہیں یہی لوگ انقلابات کا سبب ہوتے ہیں۔ وہ اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لئے تن من دھن کی بازی لگا دیتے ہیں اور جب تک اسے حاصل نہیں کر لیتے چین سے نہیں بیٹھتے۔

ایک عالم کی دریافت کی ہوئی حقیقتیں خشک ہوتی ہیں۔ وہ حلقہ علما تک محدود رہتی ہیں۔ کیونکہ ان میں تاثر کا پہلو دبا ہوا رہتا ہے۔ اور انسانوں کی اکثریت پر تاثر ہی غلبہ رکھتا ہے وہ تو جذبات ہی کے تحت عمل کرتے ہیں۔ شاعر کی صداقتیں تاثر میں رنگی ہوئی ہوتی ہیں عام الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں یہ دل سے نکلتی ہیں اور دل میں اترتی ہیں شاعر ایک واقعے کو دیکھتا ہے : اس کا اس کے دل پر اثر ہوتا ہے۔ حسب استعداد شاعر میں کیفیت پیدا ہوتی ہے یا جذبات برانگیختہ ہوتے ہیں یا وجدان حرکت میں آتا ہے۔ وہ واقعہ نفس کی کٹھالی میں ترکیب پاکر ایک ایسی صداقت کی شکل میں رونما ہوتا ہے جو ایک عالم کی دریافت کی ہوئی حقیقت سے زیادہ دل پذیر اور دل نشیں ہوتا ہے۔ یہ شاعر کی اپنی صداقت ہوتی ہے یہ ظاہر ہے کہ واقعے یا حادثے سے متعلق شاعر کا ذاتی تجربہ ہو اور اس کی قوت متخیلہ ایسی تیز ہو کہ وہ لکھے پڑھے ہوئے یا سنے ہوئے حالات کا ممکنہ صحت سے تصور کر سکے اور پر اثر طریقے سے دوسروں کے سامنے پیش کر سکے معمولی شعرا تو تاثر کے ابتدائی درجے میں رہ کر اپنے لذت والم کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے بیانات کو صداقتیں کہنا مشکل ہے۔ صداقت شاعری کے لئے ضروری ہے کہ عالمگیر ہو۔ زمان ومکان کی قید سے آزاد ہو۔ ایسی کائناتی صداقتیں انہی شعرا کے اشعار میں پائی جاتی ہیں۔ جن کا مشاہدہ وسیع۔ مطالعہ عمیق اور غور وفکر میں گہرائی اور گیرائی ہوتی ہے۔ کالیرج نے کہا ہے کہ کوئی شاعر اس وقت تک بڑا شاعر نہیں ہوتا ہے جب تک کہ وہ ایک کامل فلسفی بھی نہ ہو۔ ایسے شعرا کے اشعار کل عالم کے لوگوں کو اپیل کرتے ہیں وہ ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ایسے شعر دل کو اپنی تہذیب کا جز بنا لیتے ہیں۔ اقبال اور ٹیگور ایسے ہی شاعر ہیں۔ ہمارے بعض صوفی شعرا بھی اسی صف میں نظر آتے ہیں۔

تاثر کیفیات، جذبات اور وجدانیت انفرادی لفظوں سے ظاہر نہیں ہوتے ہیں اگرچہ بعض تنہا الفاظ بڑے جاندار اور پر معنی اور کیف انگیز ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ شعر میں مل جل کر اپنی ترتیب و نشست سے ظاہر ہوتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر تاثر کا اظہار شعر کے الفاظ سے نہیں بلکہ پورے شعر سے ظاہر ہوتا ہے اسی لئے انتخاب الفاظ کے ساتھ ساتھ ان کی موزوں بندش کی بھی ضرورت ہے۔ چکبست کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

ہوائے شوق میں غنچے بکس نہیں سکتے
ہمارے پھول بھی چاہیں تو ہنس نہیں سکتے

اس کے علیحدہ علیحدہ لفظ کے معنی ہیں مگر پورا شعر جس دنیائے مایوس کو اپنے میں لئے ہوئے ہے اس میں الفاظ کے دروبست اور "استعارے کی موزونیت نے ایسی کیفیت پیدا کر دی ہے کہ جو سنتا ہے سر دھنتا ہے۔ وہ اس کی وقتی داد ہی نہیں دیتا بلکہ وردِ زبان کر لیتا ہے اور دل ہی دل میں دہراتا رہتا ہے پھر بھی یہ شعر ایک وقتی حالت کا ترجمان ہے ازلی و ابدی حقیقت کا مظہر نہیں ہے

خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی
ہزاروں اٹھ گئے لیکن وہی رونق ہے مجلس کی

اس شعر میں جذبہ حیرت کا اظہار کیا گیا ہے یہ حیرت عام ہے۔ دنیا میں شاید ہی کوئی مقام ہو جہاں اس دنیا میں موت و حیات پر غور کرنے والے کو یہ حیرت نہ ہوتی ہو۔ شاعر کا یہی کمال ہے کہ اس نے اس جذبے کو اس خوبی سے ظاہر کیا ہے۔

الغرض شاعری کی زبان جذبات ہونے میں اب کسی ابہام کی ضرورت نہیں ہے اشعار کا معیار یہی یہ ہونا چاہیئے کہ وہ نفس انسانی کے تاثری مدارج کو کس انداز سے ادا کرتا ہے۔ ان مدارج کا انتہائی درجہ وجدان ہوتا ہے جس کے ذریعے سے بھی زندگی کی صداقتیں بلا استدلالی مدارج طے کئے ہوئے منکشف ہوتی ہیں البتہ اس کے لئے نفس کی تربیت اور ریاضت کی ضرورت ہے۔ سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ شاعر انھیں تاثرات کو ظاہر کرے جن کو وہ محسوس کرے۔ دوسروں سے مستعار لئے ہوئے نہ ہوں دوسرے کامل شاعر وہی جسے وجدان حاصل ہو۔ اس کی بیان کردہ صداقتیں عام ہوں ان کا انطباق عالم گیر ہو۔ تیسرے اسلوب بیان ایسا ہو کہ ان صداقتوں نے جس طرح شاعر پر اثر کیا ہے وہی اثر سننے والوں پر بھی ہو۔ یہ بہت دشوار ہے۔ اس کیلئے بڑے غور و فکر۔ بڑی مشق، بڑے مشاہدے، بہت مطالعے۔ زبان پر کامل وعبور اور ادب کی باریکیوں سے واقفیت کی ضرورت ہے۔ اب قارئین فیصلہ کر سکتے ہیں اردو کے کتنے شعرا حقیقی معنوں میں شاعر کہلانے کے مستحق ہیں اور وہ ہماری شاعری کی ترقی میں کتنی مدد کر رہے ہیں۔

محمد اکبرالدین صدیقی

رسالہ "افتخار" جاورہ

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستان میں شعر و شاعری کا جو چرچا رہا اس کا اظہار ان گلدستوں اور رسائل سے ہوتا ہے جو صرف طرحی غزلیں شائع کرتے تھے، چنانچہ اس سلسلے میں آخر انیسویں صدی میں ۔ کلکتہ سے نتیجۂ سخن آگرہ سے گلدستہ سخن شائع ہوتے تھے اور بیسویں صدی کے اوایل میں لکھنؤ سے پیام یار بھوپال سے حسن خیال میرٹھ سے جلوۂ یار حیدرآباد سے خیال محبوب، دبدبہ آصفی محبوب الکلام، جلوۂ محبوب اور حیات سخن وغیرہ شائع ہوئے ۔ انیسویں صدی کے آخر میں گلدستہ فیض نواب مشرف جنگ فیاض کے زیر نگرانی حضرت شمس الدین فیض کے عرس کے سلسلے میں منعقدہ مشاعرہ کی غزلیں لئے پابندی سے شائع ہوتا ۔ ڈاکٹر زور مرحوم اپنے والد حافظ غلام محمد زعم کے عرس کے موقع پر مشاعرے منعقد کرتے اور اس کی غزلیں گلدستہ زعم کی شکل میں شائع کرتے تھے ۔

جو رسائل پابندی سے ماہانہ شائع ہوئے وہ تین تین چار چار مہینے پیشتر طرحی مصرعے ہر مہینے کے لئے دے دیا کرتے اور پابندی سے شائع ہوتے انہیں میں ایک رسالہ افتخار ہے جو جاورہ اسٹیٹ صوبہ متوسط سے نکلتا تھا ۔ یہاں اس کے ایک شمارہ کا تعارف مقصود ہے ۔ یہ ایک شمارہ پروفیسر سید محمد (صاحب ارباب نثر اردو و گلشن گفتار) نے ادارہ ادبیات اردو کے کتب خانے کو عنایت فرمایا ہے ۔ یہ رسالہ دلگداز یا اردوئے معلی کی تقطیع پر مئی ۱۹۱۰ء سے ریاست جاورہ سے نکلنا شروع ہوا ۔ اس کو نواب فخرالدولہ سر محمد افتخار علی خاں بہادر صولت جنگ کی سرپرستی حاصل تھی اور دارالطبع سرکار عالی واقع جاورہ سنٹرل انڈیا میں چھپا تھا ۔

اس کے صفحہ اول کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہر مہینے کی ۱۷ ارکو جو حضور (صولت جنگ) کی سالگرہ کا دن ہے شائع ہوتا تھا ۔ اس رسالے کے دو حصے تھے ۔ پہلے حصے میں ہم طرح کلام چھپتا تھا اور دوسرا حصہ معرکہ کے نام سے موسوم تھا جس میں شعراء کے مقابلے کا کلام شائع ہوتا تھا آخر میں دو صفحے متفق نظم اور غزلیات بھی درج ہوتیں ۔ چندہ سالانہ عوام سے ۱۲؍ امراء سے للعہ، والیان ریاست جو عنایت فرمائیں ۔ خریداران شہر جاورہ سے ۱۰؍ اور نمونہ کا

پرچہ ۲ ر

غزلوں کی وصولی کے لئے مختلف شہروں میں ذی مرتبت شعرا کی خدمات حاصل کی گئی تھیں چنانچہ :۔

رام پور میں ۔ حضرت رسا وکیل و شاعر دربار و حضرت شررؔ پرائیویٹ سکریٹری

حیدرآباد میں ۔ حضرت جلیلؔ ۔ حضرت ضیاؔ دہلوی ۔ حضرت ثاقبؔ بدایونی

دہلی میں ۔ حضرت سائلؔ ۔ حضرت بے خود ۔ حضرت آغا شاعرؔ قزلباش

گوالیار میں ۔ حضرت مضطرؔ خیرآبادی

جودھ پور میں ۔ حضرت بے خودؔ بدایونی

ٹونک میں ۔ حضرت عاشق

جاورہ میں ۔ حافظ بیدل ۔ نظمی ۔ رشکؔ ۔ محشرؔ ۔ شبابؔ

پیش نظر رسالہ پہلی جلد کا چھٹا شمارہ ہے جو اکتوبر میں شائع ہوا ۔ ٹائیٹل پر گل بوٹے اور نقش و نگار بنے ہوئے ہیں ۔ درمیان میں رسالہ کا نام افتخار لکھا ہے اور اس کے اطراف بیل کی شکل میں یہ عبارت تحریر کی گئی ہے ۔

"بہ یادگار خطاب یابی انجم خدم داراحشم حضور پر نور قدر قدرت
فلک رفعت اعلیٰ حضرت بندگان عالی دام اقبالھم ہز ہائینس فخرالدولہ
نواب سر محمد افتخار علی خاں بہادر صولت جنگ کے سی آئی ای فرمانروائے جاورہ"

نام کے نیچے دائرہ نما چاند تارہ دو پرچموں پر دھرا ہے اور ہر پرچم پر قطعہ کا ایک ایک شعر تحریر ہے ۔ قطعہ یہ ہے ؎

یہ رسالہ ہے یادگار خطاب — کیوں نہ اکبر سرور حاصل ہو
ہے یہ تاریخ بھی دعا بھی ہے — باعث افتخار بیدل ہو

۱۹۱۲ء

نیچے مرتبہ بیدل ایڈیٹر رسالہ افتخار جاورہ سنٹرل انڈیا لکھا ہے اور آخر میں مطبوعہ دارالطبع سرکار عالی واقع جاورہ تحریر ہے ۔ ٹائیٹل کی پشت پر نصف صفحے میں قواعد ہیں جن کا ذکر کیا گیا ہے اور نصف میں شعرا کرام سے خواہش کی گئی ہے کہ اپنی طرحی غزلیں مختلف شہروں میں نمائندہ حضرات تک پہنچا دیں ۔

ابتدا میں افتخار علی خاں صولت جنگ کی شان میں ایک قصیدہ ہے جس کو ابوالظفر حضور نعیمی مرادآبادی نے لکھا ہے اس کے بعد طرحی غزلیں ہیں ۔ طرح مصرعہ حضرت سائل دہلوی نے دیا ہے ۔ ع

آنکھوں پہ رکھ لے زلف جو میں اشکبار ہوں

اس طرح میں اہم شعرا کی غزلیں ہیں جن میں شاد میرٹھی اور نوح ناروی کی غزلیں شامل ہیں۔ غزلوں کے بعد معرکے عنوان کے تحت علامہ اقبال اور حضرت جلیل کی ہم طرح غزلیں پیش کی گئی ہیں۔ دونوں غزلیں کالم وار لکھی گئی ہیں۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے دونوں غزلیں پیش ہیں۔

قافیہ والے

علامہ اقبال

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کون سی بستی کے یارب بسنے والے ہیں

بیابانوں میں اے دل اہل دل کی جستجو کیسی
کریں جو پیار انساں سے وہی اللہ والے ہیں

غضب کے من چلے ہیں جنس دل کے بیچنے والے
یہ اپنے مال کے ساتھ آپ ہی بک جانے والے ہیں

پتہ یوں تو بتاتے ہیں وہ سب کو لامکاں اپنا
ہمیں معلوم ہے اے دل جہاں کے رہنے والے ہیں

نہیں بیگانگی اچھی رفیق راہ منزل سے
ٹھہر جا اے شرر آخر تو[1] ہم بھی مٹنے والے ہیں

حضرت جلیل

خدا کے سامنے کہہ دیں یہ بت سب دیکھے بھالے ہیں
تمہارے منہ لگے تو یہ کہیں چپ رہنے والے ہیں

گلے شکوے کریں دشمن جنہیں جینے کے لالے ہیں
ہم اس پر جان دیتے ہیں کہ تم پر مرنے والے ہیں

جو لکے ابر کے اٹھتے ہیں کیسے کالے کالے ہیں
سرور آ گئے ہوں گے انہیں جو پینے والے ہیں

جگر تھامے ہوئے بیٹھے ہیں جتنے سننے والے ہیں
مرے پر درد نالے بھی بڑے بے درد نالے ہیں

سنا ہے وہ سوئے گور غریباں آنے والے ہیں
شہیدان محبت ہاتھ تربت سے نکالے ہیں[2]

محبت نے بت بے درد سے یہ کہلوا چھوڑا
کہ وہ جیتے رہیں یارب جو ہم پر مرنے والے ہیں

تمہارے مرمٹوں پر ہائے رے عالم قیامت میں
ہر اک کہتا ہے یارب یہ کہاں کے رہنے والے ہیں

قافیہ نکالے

علامہ اقبال

علاج درد میں بھی درد کی لذت پہ مرتا ہوں
جو تھے کانٹوں[3] میں چھالے نوک سوزن سے نکالے ہیں

---

[1] ہم بھی تو آخر۔ بانگ درا صفحہ ۱۰۴۔ [2] شاید مصرعہ اول کی رعایت سے شریک ہے۔ [3] سہو کاتب ہے اصل میں "جو تھے چھالو

دعا دیتا ہوں روتا ہوں گلہ کرتا ہوں قسمت کا ہزاروں ڈھنگ اظہار تمنا کے نکالے ہیں
نشان ماہ کنعاں اے زلیخا پوچھ لے مجھ سے کہ میں نے چاہ دل سے سینکڑوں یوسف نکالے ہیں

حضرت جلیل

علاج درد کو میں درد سے بڑھ کر سمجھتا ہوں چبھے ہیں دل میں وہ کانٹے جو تلووں سے نکالے ہیں
جھجکتے آج کیوں ہو کیا کوئی بیگانہ بیٹھا ہے وہی ارمان ہیں دل میں جو کل تم نے نکالے ہیں
کوئی کیا جانے کیا چنتی ہے لیلیٰ اپنی پلکوں سے یہ وہ کانٹے ہیں جو مجنوں کے تلووں سے نکالے ہیں

قافیہ چھالے

علامہ اقبال

پلادی اس کو کیا اے ساقیٔ بادِ بہاری نے زبان برگ گل پر قطرۂ شبنم کے چھالے[1] ہیں

حضرت جلیل

جدھر گزریں تمھارے دشت پیما چھپ نہیں سکتے زمیں پر نقش پا کہتے ہیں ان تلووں میں چھالے ہیں
جنوں لیلیٰ کے آگے قیس کو اس وضع سے لایا ہے پھٹے کپڑے ہیں، منہ پر خاک ہے تلووں میں چھالے ہیں
دعا کی ہے مقدر نے کہاں غربت نصیبوں سے ادھر رستے میں کانٹے ہیں، ادھر تلووں میں چھالے ہیں
ٹپکتی جاتی ہیں بوندیں لہو کی چشم مجنوں سے کہیں چھالوں میں کانٹے ہیں کہیں کانٹوں میں چھالے ہیں
جنوں کے دن چلے کانٹے پھپھولے پھوڑلیں دل کے غنیمت ہے مرے تلووں میں جو دو چار چھالے ہیں
مزے کی چیز کیا ہے اے جنوں! تو فیصلہ کردے کھٹک کہتی ہے کانٹے ہیں، تپک کہتی ہے چھالے ہیں

قافیہ لالے

علامہ اقبال

نہ دیکھ اے دیدۂ خونبار دل کو کم نگاہی سے ترے آنسو اسی اجڑے ہوئے گلشن کے لالے ہیں

---

[1] یہ شعر کلیات اقبال مرتبہ عبد الرزاق راشد میں موجود ہیں مگر بانگ درا میں حذف کر دیئے گئے ہیں۔

الٰہی کون سا مالی ہے اس دل کے گلستاں کا
امیدوں کے شجر زخموں کے گل، داغوں کے لالے ہیں

حضرت جلیل

تمہارا وعدہ سچا، قول سچا اور تم سچے
مگر اس سے وہ کیا خوش ہو جسے جینے کے لالے ہیں

قافیہ ڈالے

علامہ اقبال

نہ پوچھو مجھ سے لذت خانماں برباد رہنے کی
نشیمن سینکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں

حضرت جلیل

یہ تھوڑا ظلم ہے اے محتسب تجھ سے خدا سمجھے
پٹک کر ایک شیشہ سینکڑوں دل توڑ ڈالے ہیں

ستایا حسرت پرواز نے اتنا اسیروں کو
کہ تنگ آ کے اپنے بال و پر خود نوچ ڈالے ہیں

بلاقید قوافی

علامہ اقبال

پھلا پھولا رہے یارب چمن میری امیدوں کا
جگر کا خون دے دے کر یہ بوٹے میں نے پالے ہیں

امید حور نے سب کچھ سکھا رکھا ہے واعظ کو
یہ حضرت دیکھنے میں سیدھے سادے بھولے بھالے ہیں

مرے اشعار اے اقبال کیوں پیارے نہ ہوں مجھ کو
کہ اک ٹوٹے ہوں دل کے یہ دردانگیز نالے ہیں

حضرت جلیل

برا ہو درد دل کا بات کرنا ہو گئی مشکل
اگر دو حرف مطلب میں تو لب پر چار نالے ہیں

جلیل ایسے بھی دو ہی چار نکلیں گے زمانے میں
بتوں کو گھورتے ہیں اور پھر اللہ والے ہیں

رسالے کے آخر میں ایک نوٹ ہے جس میں معاصر ایڈیٹر صاحبان "کمال" دہلی، "زبان اردو" شاہجہانپور، "مرقع شاہجہانپور"

ﷺ یہ دونوں شعر کلیات اقبال میں شریک ہیں لیکن بانگ درا میں نہیں۔

مستے آگرہ، جلوہ یار میرٹھ سے اپنی جنوری کی خاص طرح شائع کرنے کی درخواست کی گئی ہے۔ رسالے میں دو جگہ اگلے مہینوں کے لئے حسب ذیل طرحی مصرعے دیئے گئے ہیں۔ خط کشیدہ الفاظ قافیے ہیں۔

نومبر کے لئے۔ عطیہ حضرت سایل دہلوی

دشمن ہر ایک بات میں کیوں ہمزباں رہے

دسمبر کے لئے۔ عطیہ حضور پر نور (صولت جنگ)

لو، وہ تمہارا ہی کہا ہوگیا

جنوری ۱۳ء کے لئے۔ عطیہ وقار الاعظم مرزا اشرف

خیر! نواب کی مناتے ہیں

فروری کے لئے۔ عطیہ حضور پر نور (صولت جنگ)

ہم نشیں! ہم چلے، سنبھال ہمیں

ٹائیٹل کے تیسرے صفحے پر اعتبار الملک خان بہادر سید محمد افتخار حسین صاحب مضطر خیر آبادی کے حمدیہ دیوان الموسوم بہ "نذر خدا" کا اشتہار ہے جو اس وقت شائع نہیں ہوا تھا۔ آخری صفحے پر کلکتے کے ڈاکٹر ایس۔ کے برمن کی دواؤں کا اشتہار ہے۔

ممکن ہے کہ اس کا فایل کسی کتب خانے میں نکل آئے اور مرحے میں اساتذہ سخن کی جو غزلیں انتخاب کی گئی ہیں ان پر روشنی پڑ سکے۔

غیورعالم

باغ وبہار کا تنقیدی مطالعہ

باغ وبہار دبستان نثر میں پہلی ادبی بغاوت تھی جو اپنے زمانے کے مروجہ انداز تحریر کے خلاف فورٹ ولیم کالج کے زیر اثر وجود میں آئی یہ ایک ادبی المیہ بھی ہے کہ ایک فنکار در در کی ٹھوکریں کھانے کے بعد کلکتے پہنچا اور ہاں گلکرسٹ کے ہاتھوں مجبور ہو کے اپنا قلم اور ذہن بیچ دیا۔ میں نے ابھی باغ وبہار کو ادبی بغاوت اور ادبی المیہ ہا ہے اس سے میری مراد یہ ہے کہ یہ زبان جو میرامن نے باغ وبہار میں استعمال کی ہے یہ اس دور کی ادبی نمائندگی نہیں رتی اور نہ یہ اس دور کے انداز تحریر کی زبان ہے یہ تو" ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو جو اردو کے لوگ ہندو مسلمان عورت رد لڑکے بالے خاص و عام آپس میں بولتے چالتے ہیں" میں ہے

۱۸۰۱ء میں انہوں نے گلکرسٹ کی فرمائش پر چہار درویش کا ترجمہ کرنا شروع کیا اور اپنی اس کتاب میں فارسی قصے کے حوالے دیتے ہوئے لکھا ہے کہ" یہ قصہ چہار درویش کا ابتدا میں امیر خسرو دہلوی نے اس تقریب سے کہا کہ حضرت نظام الدین اولیا زری زر بخش جو ان کے پیر تھے اور درگاہ ان کی دلی میں قلعے سے تین کوس لال دروازے کے باہر ٹیا دروازے سے آگے لال بنگلے کے پاس ہے ان کی طبیعت ماندی ہوئی تب مرشد کے دل بہلانے کے واسطے میر خسروؒ ہمیشہ یہ قصہ کہتے اور تیمارداری میں حاضر رہتے اللہ نے چند دن میں شفا دی تب انہوں نے غسل صحت کے دن دعا دی کہ جو اس قصے کو سنے گا خدا کے فضل سے تندرست رہے گا جب یہ قصہ فارسی میں مروج ہوا" اس طرح میرامن باغ و بہار" کی بنیاد فارسی قصہ چہار درویش کو بتاتے ہیں جو حضرت امیر خسرو دہلوی کا لکھا ہوا ہے لیکن بعض محققین کی رائے کے مطابق چہار درویش کا نام امیر خسروؒ کی تصانیف میں نہیں ملتا دوسری بات یہ کہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اپنے عالمانہ مقدمے میں میرامن کے اس بیان کو غلط ٹھیرایا ہے انہوں نے ثابت کیا کہ باغ و بہار کی بنیاد فارسی قصہ نہیں بلکہ تحسین کی" نو طرز مرصع "ہے اور اس سلسلے میں بابائے اردو نے واضح مثالیں دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ جہاں کہیں بھی نو طرز مرصع اور فارسی قصے میں اختلاف واقعات ہے وہاں میرامن نے نوطرز مرصع کا تتبع کیا ہے۔

غرض - باغ و بہار ایک دلچسپ قصہ ہے مجھے ان حضرات کی رائے سے اختلاف ہے جو باغ و بہار کو داستان یا مختصر نثری داستانوں میں شمار کرتے ہیں ہمیں کہانی - قصہ - افسانہ - ناول اور داستان میں فرق کرنا چاہیئے باغ و بہار میں ان عناصر کی کمی نظر آتی ہے جو داستان میں پائے جاتے ہیں نہ وہ مناسب طوالت ہے نہ وہ رزم و بزم کا بیان ہے نہ وہ فضا ہے نہ وہ کردار ہیں اور اس میں کوئی ہیرو (ذات کامل) ہے اور بغیر ہیرو کے تصور کے کوئی داستان ہو نہیں سکتی اس میں تمام لوگ کرداروں کی طرح ملتے ہیں -

باغ و بہار سادہ قصوں کا ایک مجموعہ ہے جس میں داستان کی پیچیدگیاں نہیں ملتیں وہ داستانی فضا نہیں ملتی جو بعید از قیاس واقعات کو قرین قیاس بننے میں مدد دیتی ہے اور ایک ایسی فضا پیدا کرنے میں مدد ملتی ہے جو ناممکنات کو ممکنات بناکر پیش کرنے میں مدد دے

باغ و بہار کے کرداروں میں بہادر انسانوں کی سی خواہشات بھی نہیں ملتیں اس کے چاروں اہم کردار دل شکستہ اور دنیاوی اعتبار سے مایوس انسان ہیں جنہوں نے بزدلوں کی طرح خودکشی کی کوشش کی ہے انتہا یہ ہے کہ بادشاہ آزاد بخت بھی ہمیں ایک مایوس انسان نظر آتا ہے اس میں بھی عام انسانوں سے بلند وہ بہادری نہیں ملتی جو داستانوں کے کرداروں میں پائی جاتی ہے -

باغ و بہار میں ہمیں دوسرے قصوں اور کہانیوں وغیرہ کے اثرات ملتے ہیں لیکن اس سے قصے کی اہمیت اور مقبولیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا میرامن کے اسلوب بیان کا بہاؤ ہمیں سوچنے کی مہلت نہیں دیتا ہم ان کے اسلوب بیان کی دلکشی میں کھو جاتے ہیں اور یہ دلچسپی اور آسان عبارت ایک قصے یا داستان کی کامیابی کی بڑی وجہ ہوتے ہیں

میرامن نے باغ و بہار کو داستان نہیں کہا بلکہ جب وہ قصے کا آغاز کرتے ہیں تو اس طرح کہ "اب آغاز قصے کا کرتا ہوں ذرا کان دھر کے سنو اور منصفی کرو سیر میں چہار درویش کے یوں لکھا ہے اور کہنے والے نے یوں کہا ہے" اس کے بعد وہ اپنے مخصوص انداز میں سادے اور پرکار جملوں کی مدد سے ایک بادشاہ کا قصہ شروع کرتے ہیں یہ بادشاہ نوشیرواں کی سی عدالت اور حاتم کی سی سخاوت رکھتا ہے اس کے عہد حکومت میں اس کی "رعیت" اور "لشکر" "غربا" "غربا" چین آرام اور خوشی سے رہتے ہیں یہ بادشاہ آزاد بخت ایک وسیع سلطنت کے باوجود اولاد سے محروم ہے ایک روز شیش محل میں ڈاڑھی میں سفید بال دیکھ کر ترک سلطنت اور ترک دنیا کرتا ہے لیکن اپنے وزیر خردمند کے سمجھانے پر دوبارہ کاروبار سلطنت میں دلچسپی لیتا ہے ایک روز کتاب میں لکھا دیکھا کہ اگر کسی شخص کو غم یا فکر لاحق ہو کہ اس کا علاج نہ تدبیر سے ہو سکے تو چاہیئے تقدیر کے حوالے کردے اور آپ گورستان کی طرف رجوع کرے - بادشاہ یہ بات سوچ کر ایک رات فقیرانہ لباس پہن کر نکلتا ہے اور ایک چراغ کی روشنی کے سہارے ایک قبرستان میں پہنچتا ہے جہاں یہ چار درویش پہلے سے موجود ہیں -

پہلے درویش کا قصہ بادشاہ چپ کر سنتا ہے اور جب یہ درویش اپنی تباہی کی داستان شروع کرتا ہے تو میر امن دلی کی ٹکسالی زبان، رسم و رواج، گفتگو، زنانے و مردانے محاورے، تہذیبی اور معاشرتی آداب اور رہن سہن کی جھلکیاں دکھلاتے جاتے ہیں پہلا درویش تباہ حال اپنی بہن کے گھر پہنچتا ہے تو میر امن مخصوص دلی کی زبان استعمال کرتے ہیں" مکان پر پہنچا تو وہ ماں جائی میرا یہ حال دیکھ کر بلائیں لے اور گلے مل کر بہت روئی، تیل، کالے ماش، ٹکے مجھ پر سے صدقے کئے" اور یہی درویش جب اپنی بہن سے رخصت ہوتا ہے تو میر امن اس زمانے کے بعض رسم و رواج کا ذکر کرتے ہیں" امام ضامن کا روپیہ میرے بازو پر باندھا دہی کا ٹیکہ ماتھے پر لگا کر آنسو پیکر بولی سدھارو تمہیں خدا کو سونپا پیٹھ دکھاتے جاتے ہو اسی طرح جلد منہ دکھانے آئیو" یہ خالص دلی کی زبان تھی۔

یہ درویش تجارت کے لئے نکلتا ہے لیکن شہر پناہ کے دروازے پر ایک صندوق میں ایک زخمی عورت کو دیکھتا ہے اور عاشق ہو جاتا ہے یہ عورت بعد میں سلطان دمشق کی لڑکی ثابت ہوتی ہے درویش اس کی تیمارداری کرتا ہے اور وہ صحتیاب ہو جاتی ہے درمیان میں ایک یوسف سوداگر کا کردار آتا ہے جسے مع اس کی محبوبہ کے قتل کرا دینے کے بعد کچھ دن شاہزادی درویش سے خفا رہتی ہے اور بعد میں خاموشی سے شادی کر لیتی ہے اپنے ملک سے فرار ہونے کی غرض سے درویش کے ساتھ نکلتی ہے یہاں تک کہ ایک دریا کے کنارے پہنچتے ہیں درویش شہزادی کو تنہا چھوڑ کر ناؤ کی تلاش میں جاتا ہے اور واپس آکر شہزادی کو غائب پاتا ہے۔ میر امن نے ایک فنکار اور ایک ادیب کی طرح اس وقت کی درویش کی پریشانی کی تصویر کھینچی ہے۔ یہ درویش تمام زمانے میں شہزادی کو تلاش کرنے کے بعد ایک پہاڑ پر چڑھ کر خودکشی کرنا چاہتا ہے کہ ایک سوار سبز پوش آکر سہارا دیتے ہیں اور خوشخبری سناتے ہیں کہ ملک روم میں تین درویش تجھ سے ہی ملے ہیں اور وہاں کا بادشاہ آزاد بخت ہے اس کو بڑی مشکل درپیش ہے جب وہ تم چاروں کے ساتھ ملے گا تو ہر ایک کے دل کا مطلب اور مراد بخوبی حاصل ہوگی۔

قصے کے شروع سے پہلے درویش کی داستان تک کوئی طلسمی دنیا نہیں داستانی فضا نہیں داستانی کردار نہیں و بعید از قیاس واقعات نہیں جو ممکنات میں بدل جائیں ایسا ماحول نہیں۔ یکساں نثر دلچسپی کے ساتھ قصہ سیدھے سادے الفاظ میں پڑھتے چلے جائیے کہیں داستان کا احساس نہیں ہوتا میر امن کی پرکار اور سادہ نثر کا بہاؤ قصے کا برابر دلچسپی قائم کئے ہوئے ہے ان کی جزئیات نگاری کا فن واقعات کا تسلسل اور قصے کو اصل کے مطابق بیان کرنے کے فن پر قادر ہے اس میں ایک جگہ مکان کی آرائش کا بیان میر امن نے کیا ہے۔

تمام حویلی میں فرش مکلف لائق ہر مکان کے بچھا ہے اور مسندیں لگی ہیں پاندان۔ گلاب پاش۔ عطردان۔ پیکدان۔ چنگیریں قرینے سے دھری ہیں طاقوں پر رنگترے کولے نارنگیاں گلابیاں رنگ برنگ کی چنی ہیں ایک طرف الماس آمیز ابرک کی ٹٹیوں میں [illegible]

طلائی شمع دانوں پر کافوری شمعیں روشن ہیں اور جھاڑ فانوسیں اوپر دھری ہیں اور سب آدمی اپنے عہدوں پر مستعد ہیں آبدار خانے کی ویسی ہی طیار ہے کوری کوری ٹھلیاں روپے کی گھڑونچیوں پر صافیوں سے بندھی اور کچپروں سے ڈھکی رکھی ہیں آگے چوکی پر ڈونگے کٹورے مع تھالی سرپوش دھرے برف کے آبخورے لگ رہے ہیں شورے کی صراحیاں ہل رہی ہیں۔

یہ اس دور کے ایک مکان کی تیاری کی تصویر ہے جس سے اس دور کی معاشرت تہذیب رسم و رواج مہمانداری ضیافت رہن سہن کا پتا چلتا ہے یہ تہذیبی دستاویزیں ہمیں مورخ کا قلم نہیں دیتا یہ دستاویزیں ہمیں ادب عطا کرتا ہے۔

دوسرے درویش کے قصے میں قدرے پیچیدگی اختیار کی گئی ہے اس میں درویش حاتم طائی کا قصہ سن کر اس کی سی سخاوت کرتا ہے اور ایک فقیر کی زبانی بصرے کی شہزادی کی سخاوت سن کر بصرے کا سفر اختیار کرتا ہے اس قصے کے ساتھ ہی بصرے کی شہزادی کا قصہ شروع ہوتا ہے اور اسی قصے میں سے ملک نیمروز کے شاہزادے کی دیوانگی اور تباہی کا قصہ سامنے آتا ہے یہ درویش انسانی ہمدردی کے تحت ملک نیمروز کے شاہزادے کی محبوبہ کو ملانے کا وعدہ کرتا ہے اور پریشان ہو کر ایک پہاڑ سے گر کر خودکشی کرنا چاہتا ہے ایک سوار برقعہ پوش آکر منع کرتے ہیں اور کامیاب ہونے کی بشارت دے کر روم جانے کی ہدایت کرتے ہیں۔ اس درویش کی سرگزشت میں یہ جن و پری ہمارے لئے نئے نہیں انھیں ہم اپنی چھوٹی چھوٹی کہانیوں میں پہلے سے جانتے ہیں اس میں بھی میرامن نے اپنی سادہ نگاری کا جادو برقرار رکھا ہے ہلکے پھلکے جملے دلچسپ اور فصیح انداز بیان بزم کی بھرپور اور دلچسپ تصویریں ہمیں اس درویش کی سیر میں مل جاتی ہیں میرامن نے جزئیات نگاری کا فن یہاں دو موقعوں پر برتا ہے اس دسترخوان پر دیکھئے کتنے قسم کے کھانے نظر آتے ہیں۔

"بکاول نے ایک تورے کا تورہ چن دیا چار مشقاب ایک میں یخنی پلاؤ
دوسری میں قورمہ پلاؤ تیسری میں متنجن پلاؤ چوتھی میں کوکو پلاؤ اور
ایک قاب زردے اور کئی طرح کے قلیے دو پیازے نرگسی بادام
روغن جوش اور روٹیاں کئی قسم کی باقرخانی تنکی شیرمال گاؤ دیدہ
گاؤ زبان نان نعمت پراٹھے اور کباب کوفتے کے تکے مرغ کے
خاگینہ ملغوبہ شب دیگ دم پخت حلیم هریسہ سنبوسے ورقی قبولی
فرنی شیر برنج ملائی حلوہ فالودہ پن بھتا نمش آب شورہ ساق
عروس لوزیات مربا و اچار دان دہی کی قلفیاں"

دوسرے موقع پر ایک مکان میں اس دور کے مطابق برتن اور دوسری ضروری چیزوں کا بیان کیا ہے۔ میرامن کا قلم ہمیں چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی دکھاتا چلتا ہے۔

"شطرنجی چاندنی قالینیں سیتل پاٹی منگل کوٹی دیوارگیریں چھت
پردے چلونیں سائبان نمگیرے چھپر کھٹ مع غلاف اوقچہ توشک
بالاپوش سیج بند چادر تکئے تکینی گل تکئے مسند گاؤ تکئے دیگ دیگچی
پتیلے طباق رکابی بادیئے تشتری چمچے بکاؤلی کفگیر طعام بخش سرپوش
سینی خوان تورہ پوش آبخورے بجھرے صراحی لگن پاندان چوگھڑے
چنگیر گلاب پاش عود سوز آفتابہ سلپچی"

یہ تمام چیزیں ایک دور کی یادگار ہیں یہ چیزیں تاریخ محفوظ نہیں کرتی تہذیبی اور معاشرتی طور طریقے ہمارے ان ہی ادبی فن پاروں میں محفوظ ہوتے ہیں میر امّن کی اس تفصیل نے ہمارے سامنے اس دور کی پوری تصویر کھینچ دی ہے۔

ان دونوں درویشوں کے قصے کے بعد بادشاہ آزاد بخت جس سے ہم پہلے ہی مل چکے ہیں اپنا قصہ شروع کرتا ہے اس میں بھی پیچیدگی نظر آتی ہے وزیر اور وزیرزادی سے نکل کر قصہ خواجہ سگ پرست کا شروع ہو جاتا ہے اسی قصے سے ملک زیرباد کی رانی اور سراندیپ کی شاہزادی کا قصہ شامل ہے۔

تیسرا درویش جو عجم شہزادہ ہے اپنا قصہ شروع کرتا ہے اور درمیان میں نعمان سوداگر کا قصہ شروع ہوتا ہے شہزادہ فرنگ کی شاہزادی پر عاشق ہوتا ہے اور آخر میں فرنگ کی شاہزادی سے شادی کر لیتا ہے اور اپنے ملک کی طرف روانہ ہوتا ہے لیکن دریا پر شاہزادی غرق ہو جاتی ہے یہ درویش مجبور ہو کر دریا میں ڈوبنے کا ارادہ کرتا ہے لیکن وہیں سوار برقع پوش آکر منع کرتے ہیں اور ملک روم کی طرف جانے کی ہدایت کرتے ہیں۔ تیسرے درویش کے قصے میں ایک جگہ رزم کا بیان آجاتا ہے میر امّن کا قلم رزم کی تصویر کھینچنے میں بیجان نظر آتا ہے بہزاد خاں جس نے شہزادے کو پناہ دی ہے وہ میدان جنگ میں معمولی انسان کی طرح دکھائی دیتا ہے میر امّن تو اپنے اس کردار کی زبان سے کسی جنگ جو انسان کی طرح گالی بھی نہیں دے سکتے وہ جب شہر کے دروازے پر پہنچا ہے تو "ایک نعرہ مارا اور تیسرے قفل کو توڑا اور نگہبانوں کو ڈانٹ ڈپٹ کے للکارا کہ بڑچو دو اپنے خاوند سے جاکر کہو کہ بہزاد خاں ملکہ مہر نگار اور شہزادہ کامگار کو جو تمہارا داماد ہے ہانکے پکارے لئے جاتا ہے" میر امّن کا قلم رزم کی تصویر کھینچ نہیں سکتا۔ ہاں دلی کی خالص ٹکسالی زبان ایک بڑھیا کے منہ سے سنئے اور حلیہ دیکھیے " ایک بڑھیا شیطان کی خالہ اس کا خدا کرے منہ کالا ہاتھ میں تسبیح لٹکائے برقعہ اوڑھے دروازہ کھلا پاکرندھڑک چلی آئی اور سامنے ملکہ کے کھڑی ہوکے ہاتھ اٹھاکے دعا دینے لگی کہ الٰہی تیری نتھ چوڑی سہاگ کی سلامت رہے اور کماؤ کی پگڑی قائم رہے میں غریب رنڈیا فقیرنی ہوں ایک بیٹی میری ہے کہ وہ دو جی سے پورے دنوں ہے دردزہ میں مرتی ہے اور مجھ کو اتنی وسعت نہیں کہ ادھی کا تیل چراغ میں جلاؤں کھانے

پینے کو کہاں سے لاؤں اگر مرگئی تو گور و کفن کیونکر کروں گی اور جی تو دائی جنائی کو کیا دوں گی اور زچا کو سہتو سا چھوانی کہاں سے پلاؤں گی آج دو دن ہوئے کہ بھوکی پیاسی پڑی ہے اے صاحبزادی اپنی خیر کچھ ٹکڑا پارچہ دلاؤ تو اس کو پانی پینے کا ادھار ہو"

چوتھا درویش جو چین کا شاہزادہ ہے جس کی سلطنت پر اس کے چچا نے قبضہ کر لیا ہے وہ جنوں کے بادشاہ ملک صادق سے مدد لینے کے لئے جاتا ہے ملک صادق اس شہزادے کو ایک لڑکی کے لانے پر معمور کرتا ہے لیکن شاہزادہ لڑکی کو پانے کے بعد خود اس پر عاشق ہو جاتا ہے اور جنوں کے بادشاہ کے غضب میں مبتلا ہو کر ناچار خودکشی کا ارادہ کرتا ہے کہ سوار برقع پوش آکر منع کرتے ہیں اور روم جانے کی ہدایت کرتے ہیں درویش اپنا قصہ بیان کرتا ہے کہ محل سے بادشاہ آزاد بخت کے لڑکا ہونے کی خبر آتی ہے، لیکن جلد ہی شہزادہ غائب ہو جاتا ہے اور اس کے بعد ابر کا ایک ٹکڑا دوبارہ شہزادے کو واپس لاتا ہے بادشاہ درویشوں کے مشورے سے ملک شہپال سے جو دیووں پریوں اور جنوں کا بادشاہ ہے ملاقات کرتا ہے ملک شہپال کے ذریعے ان چاروں درویشوں کی مشکل حل ہوتی ہے اور ہر درویش کی محبوبہ اس کو مل جاتی ہے اور باغ و بہار کا یہ قصہ کامرانی کی فضا میں ختم ہو جاتا ہے۔

باغ و بہار، کہانی سے داستان تک ارتقائی سفر میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے میر امن کا موضوع کے اعتبار سے سادہ اسلوب بیان ہلکے پھلکے جملے عبارت میں موجوں کی روانی ایک مانوس قسم کی ہمواریت فصاحت و سلاست مانوس تشبیہیں اور استعارے دلچسپ انداز اظہار رسوم و قواعد تمدن و معاشرت آداب و اخلاق وغیرہ یہ تمام چیزیں ایک کامیاب قصے کی ضمانت ہوتی ہیں اور باغ و بہار ایسی ہی کامیاب اور دلچسپ قصہ ہے۔

(بقیہ از صفحہ ۶۵)

مولانا محمد سعید صاحب کے چھوٹے بھائی مولوی محمد بشیر صاحب نے پہلے مدرسہ صولتیہ میں قرآن مجید پڑھا اور دینیات کی تکمیل کی، پھر ہندوستان چلے گئے تو منشی محمد علی سے نقشہ نویسی کا فن حاصل کیا۔ انگریزی بہت اچھی طرح جانتے تھے،

ابتداء میں مولوی محمد بشیر صاحب ریاست بھوپال کے محکمہ تعمیرات میں ملازم ہوئے ۔ اس کے بعد بہاولپور میں منتقل ہوئے، اور ہندوستان کے تاریخی و خطرناک بخار کا شکار ہو کے فوت ہوئے۔ ان کی ایک صاحبزادی جمیلہ بیگم تھیں جو مقفہ بھوپال میں اپنے عزیزوں میں بیاہی گئی تھیں۔ یہ بھی فوت ہو چکی ہیں۔

مولانا محمد سعید صاحب کے دوسرے بھائی مولوی محمد عتیق صاحب نے بھی بھوپال میں ملازمت کی۔ بھوپال کی گورنمنٹ کے اسٹور کا انتظام ان کے ہاتھ میں تھا ان کے کوئی نرینہ اولاد نہیں ہوئی۔ صرف ایک صاحبزادی زہرہ خاتون ہوئیں جو فوت ہو چکی ہیں۔ ان کی نشانی ایک صاحبزادے اور ایک صاحبزادی ہیں، جو مقفہ بھوپال میں آباد ہیں۔

خواجہ غلام احمد پنڈت

کشمیر میں اردو

(انجمن ترقی اردو مظفرآباد (آزاد کشمیر) کے تیسرے سالانہ اجلاس میں پڑھا گیا)

دہلی میں کل ہند اردو کانفرنس کے سامنے اپنی سالانہ رپورٹ میں بابائے اردو نے اردو کی ہمہ گیر ترقی کا جائزہ لیتے ہوئے ریاستِ جموں و کشمیر کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا۔

"کشمیر کا حال دیکھ کر مجھے خاص مسرت ہوئی۔ شاید ہندوستان کے کسی صوبے میں اردو اس قدر مقبول اور رائج نہیں جس قدر کشمیر میں ہے۔ کشمیر میں مدت سے اردو رائج ہے مدارس میں اردو پڑھائی جاتی ہے اور ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ دفاتر کی زبان بھی اردو ہے اور بہت اچھے اردو کے ادیب اور شاعر موجود ہیں۔ وہاں کی اسمبلی کے اجلاس کو جا کر دیکھا ہے سب ممبر بلا استثناء اردو میں بولتے تھے۔ تقریریں کرتے ہیں۔ یہ سن کر آپ کو تعجب ہوگا کہ پنجاب اسمبلی میں ایسی اچھی تقریریں نہیں ہوتیں جیسی کشمیر اسمبلی میں"

یہ ۱۹۳۹ء کی بات ہے۔ کشمیر کی راج گدی پر مہاراجہ ہری سنگھ براجمان تھے مگر فرمانروائی کانگرس نواز وزیر اعظم سر گوپالا سوامی آئنگر کر رہے تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب مسلم کانفرنس کی ہمہ گیر اور مستحکم ترین تنظیم اور قوت کو متحدہ قومیت کے سانچے میں ڈھالنے کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ اس تشکیل نو سے ریاست میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کی مساعی پر کیا اثر پڑا؟ یہ تجربہ کہاں تک چلا اور مسلم کانفرنس کی تجدید کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ ان سب سوالات کو یہیں چھوڑ کر ہم براہ راست کشمیری عوام کی لسانی مفاد و ضرورت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہی آئنگر کا دور ہے۔ مدارس میں اردو کے دوش بدوش دیوناگری رسم الخط رائج کیا جاتا ہے ملازمین کے لئے اردو کے ساتھ ساتھ دیوناگری جاننا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ لیکن قانون اور طاقت دونوں عوام کی اردو دوستی کے مقابلے میں بے بس ہو کر رہ جاتے ہیں اور دیوناگری کی گاڑی ایک قدم بھی آگے سرکنے نہیں پاتی۔

میں نے اٹھارہ لاکھ ابنائے وطن کی طرح کشمیری زبان ماں کے دودھ کے ساتھ پی ہے۔ اسی کی باہوں میں لوریاں

کی ہیں۔ لیکن جب مدرسے کے احاطے میں قدم رکھا تو اردو نے انگلی پکڑ کر چلنا پھرنا سکھایا، علم کی روشنی دکھائی،
تہذیب کی جلابخشی اور جینے کا اسلوب بتایا۔ واعظ نے خدا سے ہمارا دامن جوڑا تو اسی زبان کے ذریعے، شعور
جذبات اور احساسات نے نطق کا یارا پایا تو اسی زبان میں اور شخصیت کا اظہار ہوا تو اسی زبان میں ہوا۔
چین، روس، بھارت، افغانستان اور پاکستان کے درمیان گھرے ہوئے اس ۸۴ ہزار مربع میل رقبے میں،
جسے جموں و کشمیر کہا جاتا ہے۔ پنجابی، ڈوگری، شینا، مدتی، گوجری، پہاڑی اور کشمیری بولیاں بولی جاتی تھیں اور اب
بھی بولی جاتی ہیں، لیکن جب فارسی کی جگہ زبان کے چناؤ کا سوال آیا تو کسی نے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ کسی محدود زبان کو محض
مقامی اور مادری زبان ہونے کی بنا پر باقی سب زبانوں پر ٹھونس دیا جائے۔ کسی نے کسی پر پتھر نہیں پھینکے اور کسی نے علیحدگی
کی دھمکی نہیں دی۔ سب نے متفقہ طور پر اردو ہی کو ایک مرکزی، قومی اور مشترکہ زبان ہونے کی حیثیت سے منتخب کر لیا
مسلمانوں نے ہی نہیں، ہندوؤں، سکھوں، بدھوں اور عیسائیوں نے بھی بلا تامل اور بغیر کسی عصبیت یا غیریت کے احساس
کے اسے قومی زبان کے طور پر اپنا لیا۔ کیونکہ اس کے ماتھے پر تلک کا نشان تھا نہ ہاتھ میں سبحۂ صد دانہ اور نہ کسی خاص
رنگ و خون سے اسے نسبت ہی تھی۔ اسے ہر نسل، ہر مذہب اور ہر علاقے کے لوگوں کے میل جول اور ان کی بولیوں
کے امتزاج نے جنم دیا۔ یہ پراکرت کی کوکھ سے نمودار ہوئی۔ ہندی نے اسے دیا کرن دی، سوز و گداز، لطافت و چاشنی
دی اور عربی اور فارسی نے اسمار، صفات اور تشبیہات کی سج دھج اور اس طرح اس البیلی دلہن کا سولہ سنگار تیار ہوا۔
اردو ریاست میں سر پر تاج پہن کر داخل نہیں ہوئی تھی نہ اس کی جلو میں کوئی لشکر ہی تھا۔ یہ تو بس سیاحوں
تیرتھ یاتریوں، علما اور مشائخ کے ساتھ آتی جاتی رہی۔ نگر نگر گھومتی پھرتی رہی۔ کہیں گلاب اور یاسمین کی مخمل سجائی، کہیں
چیدہ نوں کا گیت بن گئی اور کہیں شکاروں میں بیٹھ کر ڈل کی نیلاہٹوں پر سرمست خرام رہی۔ یہ دولت کے کانوں میں تو
نہیں، کلبۂ افلاس میں بھی حاضر ہوئی، منبر و محراب تک رسوخ حاصل کر لیا، کلیسا میں گھس گئی حتیٰ کہ دیر یا دول
بت کدے میں بھی جا بیٹھی اور اپنی سلاست، لوچ، گھلاوٹ اور ادائے دلبری سے ہر کہ و مہ کا من موہ لینے میں کامیاب
ہوگئی۔ رفتہ رفتہ اس کے حسن دارا کا چرچا ڈوگرہ دربار تک بھی جا پہنچا اور اسے فارسی کی جگہ راج سنگھاسن پر بٹھا دیا گیا
شاید اس لئے کہ یہ برصغیر کی مختلف زبانوں کا مرقع تھی اور شاید اس لئے بھی کہ برصغیر کے باقی حصے میں اظہار ذات کا
عملی اور طبعی ذریعہ بن چکی تھی اور تاریخ کے دھارے کا تقاضا بھی یہی تھا کہ اسے کھلے دل سے قبول کر لیا جاتا اور اس پر سا
دروازے وا کر دیئے جاتے۔

اردو نے ریاست میں پہلی بار کب قدم رکھا، اس کا سراغ تو محققین ہی لگا سکتے ہیں اور یوں بھی اس دریاد
بیہ ان مسائل کے سلجھانے میں کوئی مدد نہیں مل سکتی جو اس کی ترویج کے معاملے میں عصر حاضر کو درپیش ہیں، ا
اتنا پتہ آسانی سے مل جاتا ہے کہ اس نے ڈوگرہ خاندان کے سلسلے کے تیسرے حکمران یعنی مہاراجہ رنبیر سنگھ کے

میں دفتری، عدالتی اور درسی زبان کا درجہ حاصل کرلیا تھا۔

مواصلات کی ترقی نے کشمیر اور ہندوستان کے دوسرے حصوں کے درمیان آمد و رفت میں اضافہ کردیا۔ پنجاب اور یو۔پی وغیرہ سے پُرانے کشمیری تارکانِ وطن بکثرت کشمیر آنے جانے لگے۔ حسنِ فطرت کے رنگین مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لئے اطراف و جوانب سے سیاحوں کا تانتا بندھ گیا۔ اس اختلاط اور پھر رسل و رسائل اور بیرونی اخبارات کی باقاعدہ فروخت نے کشمیر کے سیاسی، لسانی، ادبی اور فکری رجحانات پر گہرے اثرات ڈالے۔ سرکاری زبان بننے کے بعد اردو نے ترقی کے کچھ اور مرحلے طے کر کے ادبی میدان میں قدم رکھا اور متعدد انجمنیں معرضِ وجود میں آئیں جن کی سرگرم مساعی سے شعر و سخن کا ذوق نشو و نما پاتا رہا۔ ان انجمنوں میں "مفرح القلوب" "بزم سخن" اور "بزم ادب" کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ہندوستان سے جو لوگ لبسلسلۂ ملازمت کشمیر آئے ان میں ممتاز مفکر، دانشور، ادیب اور شاعر بھی شامل تھے۔ ان محسنین میں جنھوں نے گلشنِ ادب کی آبیاری کی اور اردو کی اشاعتی سرگرمیوں کی سرپرستی کی لالہ کنور سین جج ہائی کورٹ مولوی محمد حسین عارف جج ہائی کورٹ۔ پنڈت اُودھے چند گورنر جموں۔ چوہدری خوشی محمد ناظر ریونیو منسٹر، پنڈت اقبال کشن در، جسٹس بودھراج ساہنی، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی، برج نرائن چکبست، اطہر ہاپوڑی حکیم طغرائی، نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی، خواجہ غلام السیدین، ڈاکٹر تاثیر، بابائے اُردو مولوی عبدالحق، منشی سراج الدین میر منشی ریذیڈنسی، منشی معراج الدین احمد، صاحبزادہ محمد عمر، خلیفہ ڈاکٹر عبدالحکیم، سرسپرو اور حفیظ جالندھری کے علاوہ متعدد نامور شخصیتوں کے نام آتے ہیں جن کے فیضانِ صحبت سے کشمیر، دہلی، لکھنؤ، پنجاب اور حیدر آباد کی طرح دبستانِ اردو بن گیا۔ ریاست میں منشی محمد دین فوق، غلام محمد خادم، منشی غلام نبی مسکین، مرزا مبارک بیگ، سردار محمد عبداللہ خاں، لالہ رام کشن رام، پنڈت رام کشن غافل، اثر صہبائی، لالہ پریم داس پریم، عبدالکریم اختر، درگا سہائے شوق، منشی غلام نبی قریشی، پنڈت نرنجن داس غبار، قمر قزلباشی، ڈاکٹر عمادالدین سوز، پنڈت نند لال طالب، دینا ناتھ مست، غلام جیلانی اثر، مرزا کمال الدین، بلبل کاشمیری، کیف اسرائیلی، دیا کشن گردش، ساغر، نسیم رضوی۔ غلام رسول نازکی، قیس شیروانی، آذر عسکری۔ غلام حیدر چشتی، حسین علی انصاری، سردار محمد خاں عالم۔ خورشید احمد خورشید غلام حیدر خاں انور، منشی غلام علی حسرت، غلام حسین بیتاب اور حبیب کیفی وغیرہ اسی دور کی پیداوار ہیں۔ کشمیری لال ذاکر نے کشمیر کے افسانوی ادب میں ندرت فن کا خوب خوب مظاہرہ کیا۔ یہ سرگرمیاں کچھ شہروں تک ہی محدود نہ تھیں بلکہ کٹھوعہ ایسے سنگلاخ اور بے برگ و گیاہ علاقے میں بھی ماسٹر احمد دین اختر جیسے سلجھے ہوئے شاعر موجود تھے، اور ادھر بھدروہ کے دور دراز گوشے میں عبدالرشید رسا ایسے صاحب دیوان شاعر شمع انجمن بنے ہوئے تھے۔ پونچھ، جس نے چراغ حسن حسرت اور کرشن چندر ایسے آسمان ادب کے تابندہ ستارے پیدا کئے ہوں، بانجھ کیسے رہ سکتا تھا۔ اربابِ ذوق نے یہاں بھی گرمئ محفل کا پورا پورا سامان بہم پہنچایا اور یعقوب ہاشمی، ضیاءالحسن ضیا اور نظامی وغیرہ بڑے ذوق و شوق

سے ہفتہ وار مشاعروں کا اہتمام کرتے رہتے تھے۔ اُردو صحافت کے میدان میں بھی کشمیریوں نے طبع رسا کے جوہر دکھائے اور منشی محمد دین فوق، چراغ حسن حسرت، پریم ناتھ بزاز، مولانا محمد سعید مسعودی، مولوی عبدالواحد، اے۔آر۔ ساغر، سردار بدھ سنگھ اور پنڈت کشب بندھو ایسے ممتاز دانشور ادیب اور صحافی پیدا کئے۔ ان کے علاوہ جو نام عہد ان صحافت میں اُبھرے، ان میں غلام احمد کشفی، سید غلام حسین کاظمی، عبدالمجید قرشی، گلزار احمد فدا، کے۔ایچ۔ خورشید، منشی معراج الدین احمد، نندلال واتل، میر عبدالعزیز اور غلام رسول پنڈت وغیرہ شامل ہیں۔ کلکتہ سے "الہلال" اور پنجاب سے "کشمیری میگزین" "کشمیری اخبار، زمیندار، انقلاب، نوائے وقت، ملاپ، پرتاب اور ویر بھارت نے اردو کو فروغ دیا۔ یہ اور بات ہے کہ موخرالذکر تین اخبارات نے فرقہ وارانہ منافرت کا بیج بویا۔ خود ریاست میں بیسیوں اردو اخبارات جاری ہوئے، مثلاً ہمدرد، خدمت، رہبر، صداقت، حقیقت، البرق، دیش، سچ، اصلاح، جادید، پاسبان، صادق، وتستا، پرتاب، مارتنڈ، رتن، پھول اور محمد دین فوق کا جدید کشمیر۔

ریاست میں اردو کو قریے قریے تک پہنچا کر اسے عوام کی زبان بنانے میں سیاسی تنظیموں نے مسلم ینگ مینز ایسوسی ایشن، انجمن نصرۃ الاسلام، اور فتح کدل ریڈنگ روم سے لے کر تحریک کی موجودہ ہیئت تک جو کردار ادا کیا اس کی روداد کسی سے مخفی نہیں۔ شاعر مشرق کے کلام نے تو کشمیر کے تن مردہ میں زندگی کی تب و تاب اور حرارت ایمانی پیدا کردی۔ لہٰذا اگر میں یہ کہوں کہ اُردو ہی ہماری قومی جدوجہد کی زبان اور انقلاب کی ترجمان ہے تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔

۱۹۴۷ء کے خونیں انقلاب کے بعد اردو کشمیری ادب پر پوری طرح سے چھا گئی۔ ۱۹۴۸ء میں ایک تڑک سے پہلی آواز شعلۂ جوالہ بن کر لپکی۔ وہ آزاد کشمیر ریڈیو کا پہلا نعرۂ مستانہ تھا۔ اس ریڈیو نے آزاد کشمیر کی انقلابی حکومت کا پیغام ریاست کے گوشے گوشے میں پہنچانا شروع کیا اور برہمنی سامراج کی مسخ صورت کو بے نقاب کر دیا۔ پانچ چھ سال قبل آزاد کشمیر کا دوسرا اسٹیشن مظفر آباد میں قائم ہوا اور اس طرح یہ دونوں نشرگاہیں جذبۂ حب الوطنی سے سرشار ہوکر اُردو کی قابل قدر خدمات سرانجام دے رہی ہیں۔ انھوں نے انقلاب اور حریت کے جذبات کے اظہار کے لئے نئے نئے اسلوب اور پیرائے اختیار کئے۔ اچھوتی راہیں دریافت کیں اور نئے خطوط کھینچ کر اردو ادب کے سرمائے میں رنگینی اور تنوع پیدا کیا۔ مسلسل مہاجرت کے باعث یہ تو ممکن نہ تھا کہ صحافی تارکانِ وطن یہاں روزنامے جاری کر لیتے البتہ انھوں نے اپنے ذوق اور فن کو ترک کرنے کی بجائے ڈیڑھ درجن ہفت روزہ جرائد جاری کر لئے ہیں جو انیس بیس برس سے اپنے مقدور کے مطابق زندہ دلان کشمیر کے جذبات کی عکاسی کر رہے ہیں مگر چونکہ یہ قالب اُن کی آتش نفس کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا لہٰذا ریاست کے ممتاز صحافیوں نے اپنے آپ کو پاکستان کی خبررساں ایجنسیوں اور انگریزی اخبارات کے علاوہ اردو روزناموں، نشریاتی صحافت اور ٹیلی ویژن سے وابستہ کر

ہے اور اب تو کشمیری شعراء و ادبا کی ایک بہت بڑی کھیپ پیدا ہو چکی ہے جس نے ہر صنفِ ادب میں اپنی زوردار تخلیقات سے خاصی مقبولیت حاصل کر لی ہے۔

شاید یہ بات اکثر لوگوں کے علم میں نہیں کہ کانگرس کی آزمائشی وزارتوں میں اس مشترک زبان کو مسلمانوں کی تہذیبی زبان قرار دے کر اس سے جو ناروا سلوک روا رکھا گیا اور "ہندو" "ہندی" اور "ہندوستان" کے متعصبانہ نعرے نے کشمیری مسلمانوں کو اردو کے معاملے میں بے حد جذباتی بنا دیا تھا۔ اور وہ مذہبی، نسلی، اقتصادی اور جغرافیائی روابط کے علاوہ لسانی یعنی اردو کے رشتے کی بنا پر بھی پاکستان سے الحاق کے متمنی تھے کیونکہ یہ ان کے سیاسی شعور کی زبان ہی نہیں بلکہ تہذیبی سرمایے کی آئینہ دار بھی ہے۔

قومی وحدت کے لئے مذہبی یگانگت بے شک بڑی پائدار اساس کا کام دیتی ہے لیکن بھانت بھانت کی بولیوں سے جو معاشرتی اور نسلی اجنبیت کی دیواریں عوام میں آپ سے آپ کھڑی ہو جاتی ہیں ان سے لسانی طائفے تو پیدا ہو سکتے ہیں۔ متجانس قومیت کا خمیر نہیں اُٹھ سکتا۔ اور پھر اس سے یہ توقع کہ اتحادِ فکر بھی پیدا ہو، بہت مشکل ہے۔ یعنی ؎

زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم

مانا کہ مغربی پاکستان کی زبان اُردو اور مشرقی پاکستان کی بنگلہ سرکاری طور پر تسلیم کی جا چکی ہیں مگر بین الصوبائی روابط کے لئے کیا ہم بدستور ایک ایسی زبان کا سہارا لیتے رہیں گے جسے دونوں صوبوں میں پانچ فیصد سے زیادہ لوگ سمجھ نہیں پاتے۔ اگر پاکستان ایک وحدت ہے اور ابدالآباد تک رہے گا تو اس کے بنیادی لوازم سے قطع نظر نہیں کیا جا سکتا۔ اگر مجھے تھوڑی بہت انگریزی کی شُد بُد نہ ہوتی تو کھلنا اور راجشاہی کی شناختی تختیوں سے تو مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں اپنے ملک میں نہیں کسی دور پردیس میں بھٹک رہا ہوں۔ لیکن پلٹن میدان کے عظیم الشان اجتماع میں پہنچ کر یہ وحشت اور قنوطیت کا طلسم ٹوٹا جبکہ ایک بنگالی سیاسی رہنما نے اُردو میں اپنے زورِ خطابت سے مجھے محوِ حیرت بنا دیا۔ ان کے ہر فقرے پر تالیاں گونجتیں اور پاکستان زندہ باد کے فلک شگاف نعرے بلند ہو رہے تھے۔ اُردو فہمی کے اس زندہ مظاہرے کے بعد ہی مجھے یقین ہوا کہ اردو لکڑی کی تختیوں پر نہ سہی لوحِ دل پر تو ضرور کندہ ہے۔ جو اسے زود یا بدیر اپنا مقام دلا کر رہے گی ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما، لسانی بنیادوں پر حدبندی کر کے بھارت نے آپ ہی اپنے لئے ایک لامتناہی فتنے کا دروازہ کھول دیا ہے اور اس پر طرفہ یہ کہ اپنی یعنی اردو زبان پر اسلامی علامت ہونے کا الزام دھر کر ایک جناتی بولی کو ہندی کے لیبل کے ساتھ فوج کے کس بل پر جنتا کے سر منڈھ دیا ہے۔ تخریب کے لئے نسلی علاقائی اور مذہبی خلفشار کیا کافی نہ تھا کہ اس نے اپنے لئے زبان کا ایک اور دردِ سر اور ایک اور خلجان خرید لیا۔

بہر حال اپنی زبان کو دیس نکالا دینے پر ہم بھارت کو اگر کچھ کہہ نہیں سکتے پر اس سے بھارت جس مصیبت

میں گرفتار ہوگا اس سے درسِ عبرت تو لے سکتے ہیں ۔ اگر اردو کے دامن پر پاکستان کی تہمت ہے تو پاکستانیوں کو اسے اپنے سینے سے لگا لینا چاہیئے ۔ پاکستان ہی اب اردو کا وطن ہے اور جموں وکشمیر نے جو بھی سرمایہ پیدا کیا ہے وہ اب پاکستان کا سرمایہ ہے ۔ کشمیر کے ادبا، شعرا، صحافی اور موسیقار اب اسی چمنستانِ علم و ادب کی بلبلیں ہیں ۔ ہمیں پاکستان کی طلب ہے اور پاکستان کو ہماری جستجو ۔ دونوں طرف طلب صادق ہو تو دنیا کا کوئی سامراج اور کوئی نوآبادیاتی طاقت انھیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتی ؎

آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
اور چمن کی ہمنفس بادِ صبا ہو جائے گی

(بقیہ از صـ۴۲)

بابائے اردو کے اصل مقصد یعنی اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے پر زیادہ سے زیادہ توجہ کی جائے گی تاکہ یہ زبان اپنا صحیح مقام حاصل کر سکے ۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ہم نے اُردو کالج کو کُل پاکستان بنیادوں پر توسیع دینے کا منصوبہ تیار کیا ۔ تاکہ اس درس گاہ سے صرف کراچی ہی کے نہیں بلکہ پورے پاکستان کے طالب علم مستفید ہو سکیں اردو کالج ، موجودہ حالت میں محدود پیمانے پر ہی تدریسی سرگرمیاں قائم رکھ سکتا ہے کیونکہ اس کی عمارت اور دیگر وسائل ایسے نہیں ہیں کہ بیرون کراچی کے طالب علم بھی یہاں تعلیم حاصل کر سکیں اس مقصد کے لئے اقامتی اردو کالج کا منصوبہ بنایا گیا ہے جس کے لئے بیس ایکڑ زمین حاصل کر لی گئی ہے ۔ کچھ عرصے قبل صدر مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں اس کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھ چکے ہیں اور تعمیری کام بھی شروع کر دیا گیا ہے اگر حکومت سے مدد ملتی رہی اور عوام کی دلچسپی قائم رہی تو توقع ہے کہ انشاء اللہ کچھ عرصے تک عمارت کی تکمیل ہو جائے گی اور اس طرح پاکستان کا سب سے بڑا اقامتی کالج وجود میں آجائے گا ۔ جہاں اُردو کے ذریعے جملہ علوم و فنون کی تعلیم دی جاتی ہو ۔

اس کالج کی تعمیر اور دیگر انتظامات کے لئے تقریباً تین کروڑ روپے خرچ ہوں گے ۔ میری رائے میں عوامی اداروں کی تشکیل میں عوام ہی کا زیادہ سے زیادہ حصہ ہونا چاہیئے اس طرح ملک کے ہر شخص کو یہ احساس رہتا ہے کہ ان اداروں کی تعمیر میں وہ بھی شریک ہے ۔ ہم نے یہ ارادہ کر لیا ہے کہ یہ کالج عوام ہی کے زیادہ سے زیادہ تعاون سے قائم کیا جائے گا اس مقصد کے لئے مناسب اقدامات کئے جا رہے ہیں ۔ یہ کالج جب مکمّل ہو جائے گا تو ہم کہہ سکیں گے کہ ہم نے بابائے اُردو کے اصل مقصد کی تکمیل کے لئے ایک اہم مرحلہ طے کر لیا ہے ۔

امداد صابری

مولانا محمد سعید مرحوم

حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی کے حالات زندگی پر ایک کتاب "آثار رحمت" مرتب کر رہا تھا۔ اس سلسلے میں میرا مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ میں جانا۔ اور مولانا محمد سلیم صاحب مہتمم مدرسۂ صولتیہ سے معلومات حاصل کرنا ضروری تھا چنانچہ جب مکہ معظمہ جانے کا ارادہ کیا تو خیال آیا کہ جن ہندوستانی علما، صوفیا اور تاجروں نے حجاز میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اور انہوں نے وہاں کے علمی دینی اور تجارتی زندگی پر اثر ڈالا ہے ان کے بھی حالات قلمبند کئے جائیں چنانچہ حجاز پہنچنے کے بعد ان حضرات کے حالات معلوم کئے۔ یہ مضمون اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ (صابری)

مولانا محمد سعید صاحب کا خاندانی سلسلہ حضرت کبیرالاولیا مخدوم جلال الدین پانی پتی سے ملتا ہے۔ حضرت مولانا رحمت کیرانوی کے مولانا محمد سعید صاحب برادر زادہ تھے۔ مولانا رحمت اللہ صاحب کے دو بھائی مولوی عبدالجلیل صاحب اور حکیم علی اکبر صاحب تھے۔

مولوی عبدالجلیل صاحب کی زندگی کا بیشتر حصہ زمینداری کے کاموں میں گذرا۔ ان کے صاحبزادے مولوی بدرالاسلام صاحب تھے جن کو مولانا رحمت اللہ صاحب نے کیرانہ سے مکہ معظمہ بلا کر خود ہی تعلیم اور تربیت فرمائی۔ اور مولانا صاحب ان کو قسطنطنیہ کے دوسرے سفر میں اپنے ہمراہ سلطان عبدالحمید کی خدمت میں لے گئے۔ سلطان نے ان کے لئے حکم دیا کہ میرے پاس رہیں گے اور کتب خانہ حمیدیہ (سلطان عبدالحمید خاں کا شاہی دارالکتب جو دنیا کے خاص کتب خانوں میں شمار ہوتا ہے اور اس میں سلاطین آل عثمان کی تمام کتابوں کو جمع کیا گیا ہے) قصر یلدز کا ان کو مہتمم بنا تا ہوں حضرت مولانا مرحوم نے اس قدر افزائی کا شکریہ ادا کیا۔ اور مولانا بدرالاسلام صاحب اس خالص علمی خدمت پر مامور ہوئے اور آخر وقت تک سلطان کے معتمد علیہ بنے رہے۔ قصر یلدز اور سلطان عبدالحمید کی معزولی کے پُرخطر وقت میں صرف تین اشخاص سلطان کی خدمت میں باقی رہے تھے جن میں مولانا بدرالاسلام صاحب بھی تھے۔

مولانا بدرالاسلام صاحب سیاسی آدمی نہیں تھے۔ ان کو کافی نظر بندی کے بعد رہا کر دیا۔ رہائی کے بعد یہ اپنے وطن کیرانہ واپس آ گئے۔

سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم شروع ہوئی۔ تو ان کو انگریزی سرکار مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ چونکہ ان کے علماء ترکی سے بھی دوستانہ مراسم تھے۔ اور ان کے پاس ترکی کے تقریباً سب ہی اخبارات آتے تھے۔ اس اشتباہ کو دور کرنے اور ان کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا جائے اس کے لئے انہوں نے لکھنؤ جانا بہتر سمجھا جب یہ لکھنؤ پہنچے تو ان کو ندوۃ العلماء میں ادب عربی کا مدرس مقرر کیا گیا۔

مولوی بدرالاسلام صاحب کے مولانا الطاف حسین حالی سے بہترین تعلقات تھے چنانچہ مولانا حالی اکثر ملاقاتوں میں فرمایا کرتے تھے تم بڑے بدنصیب ہو کہ اتنی عظیم الشان لائبریری کے مدیر عام ہوتے ہوئے بھی اس خزانے سے استفادہ نہیں کیا۔ نہ کوئی کتاب مرتب کی اور نہ ہی لائبریری

کی کتابوں کے بارے میں کچھ لکھا۔

مولانا بدرالاسلام کا انتقال غالباً لکھنؤ میں ہوا۔ ان کے ایک صاحبزادے مولوی عبدالہادی صاحب اور تین صاحبزادیاں تھیں۔

مولوی عبدالہادی صاحب نے منشی محمد اعلیٰ سے رڑکی میں تعلیم پائی اور نقشہ نویسی میں امتحان دیا۔ مولانا بدرالاسلام صاحب کافی جائیداد اورنہ میں چھوڑ گئے تھے۔ ان کا انتظام بھی فرماتے تھے۔

۱۳۴۵ھ میں جب مولانا محمد سعید صاحب مدرسہ صولتیہ کے کسی کام کے سلسلے میں ہندوستان تشریف لے گئے تھے تو آپ کی کوششوں سے آپ محکمہ تعمیرات حیدرآباد دکن میں ملازم ہوئے اور ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں پاکستان چلے گئے اور آج کل وہیں مقیم ہیں۔

مولانا عبدالہادی صاحب کے صاحبزادے عبدالباقی اور انوارالاسلام ہوئے۔ دونوں پاکستان میں مختلف محکموں میں سرکاری ملازم ہیں۔ ان کی بہن رضیہ خاتون کی شادی مولانا احتشام الحسن صاحب خلیفہ حضرت مولانا الیاس صاحب سے ہوئی۔

مولوی عبدالہادی صاحب کی دوسری اہلیہ سے عارف الاسلام بی۔ اے اور عبدالولی صاحب اور ایک صاحبزادی عطیہ سلطانہ ہوئیں دونوں صاحبزادے جودھپور میں رہتے ہیں۔ عطیہ سلطانہ پاکستان میں سرگودھا میں اپنے خاوند سید عزیز زیدی کے ساتھ رہتی ہیں۔

حکیم علی اکبر صاحب اپنے زمانہ کے مانے ہوئے طبیب تھے۔ جن کا دور دور تک شہرہ تھا۔ ہندوستان کے شہرہ آفاق حکیم عبدالمجید خانصاحب دہلوی ان کی بے پناہ عزت کرتے تھے اور ان کی صلاحیت و قابلیت کے معترف تھے کیرانہ یا کیرانہ کے گردو نواح کا کوئی مریض ان کے ہاں چلا جاتا تو آپ اس سے دریافت فرماتے تھے کہ تم نے حکیم علی اکبر سے رجوع کیا یا نہیں اگر وہ انکار کرتا تو آپ فرماتے ان کے علاقہ کے مریضوں کو دیکھنا مناسب نہیں سمجھتا آپ پہلے ان سے رجوع کریں جبکہ وہ آپ کے علاقہ کے مسلم طبیب ہیں تو آپ نے میرے ہاں آنے کی تکلیف کیوں گوارا کی۔ اس زمانہ کے حکیموں کے دستور کے مطابق آپ بھی دمڑیوں کا نسخہ لکھتے تھے۔ تہجد گذار بزرگ تھے اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھ میں شفا دی تھی۔ عام طور پر ان کا مریض شفا پاتا۔ اور جلد اچھا ہو جاتا تھا۔ آپ کے پاس قلمی ذخیرہ بہت تھا۔ بہترین خطاط تھے جو کتاب آپ پڑھتے اس کی نقل کرنا ضروری سمجھتے تھے، چنانچہ آپ نے بڑی ضخیم کتابیں نقل کی تھیں۔ قلمی کتابیں آپ کے پاس کافی تھیں۔ جن میں کا بہت سا حصہ مدرسہ صولتیہ کو فتح پوری روڈ قرول باغ دہلی میں ہنگامہ ۱۹۴۷ء میں لٹ گیا۔ آپ کیرانہ میں فوت ہوئے

حکیم علی اکبر صاحب کے دو صاحبزادے محمد صدیق اور محمد سلیمان تھے۔ ان دونوں صاحبزادوں کی تعلیم اور تربیت آپ نے ہی کی محمد صدیق صاحب کلکٹری کے محکمہ میں پیشکار تھے۔ وہیں سے ریٹائر ہوئے۔ زیادہ وقت انبالہ میں گذارا۔ محمد سلیمان صاحب زمینداری کا انتظام اور خانگی معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ بڑے اچھے منتظم تھے۔ کسان ان سے خوش رہتے تھے۔

محمد صدیق صاحب کے تین صاحبزادے۔ مولانا محمد سعید صاحب حافظ محمد بشیر اور حافظ محمد عتیق تھے۔ محمد صدیق صاحب جبکہ انبالہ میں سررشتہ داری پر مامور تھے۔ ان کا مکان ایک مشن اسکول کے قریب تھا جس میں منشی نہال الدین صاحب فارسی کے طلباء کو پڑھاتے تھے۔ محمد صدیق صاحب اور منشی نہال الدین صاحب دونوں گہرے دوست تھے۔ چنانچہ اسی بنا پر محمد صدیق صاحب نے اپنے بڑے صاحبزادے مولانا محمد سعید کو مشن اسکول میں داخل کر دیا تھا۔ جن کی عمر تقریباً اس وقت دس سال کی تھی۔

جب اس بات کا علم مولانا رحمت اللہ صاحب کو ہوا تو ان کو بہت رنج اور افسوس ہوا۔ کہ مسلمانوں کے جن دشمنوں کے خلاف میں نے آواز اٹھائی اور ان کی شیطنیت و مکاری سے مسلمانوں کو آگاہ کیا اور ان کے زہریلے جراثیم سے بچنے کی تلقین کی اور جس کی بدولت مجھ کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔ آج میرے ہی خاندان کا بچہ ان سے تعلق جوڑے ہوئے ہے اور ان کی خطرناک و مہلک تعلیم پا رہا ہے چنانچہ مولانا رحمت اللہ صاحب نے فوراً اپنے خاندان کے ہر ایک بزرگ کو علیحدہ علیحدہ چٹھیاں روانہ کیں اور اس بات کی سخت مذمت کی اور سختی کے ساتھ تحریر فرمایا کہ فوراً محمد سعید کو مشن اسکول سے نکال کر مکہ معظمہ روانہ کیا جائے آپ کے والد محمد صدیق صاحب کچھ جھجکے لیکن ان کی والدہ حضرت مولانا کے حکم کی تعمیل پر تیار ہوگئیں کہ ایسے بزرگ کی شخصیت اور ایسا مقدس مقام لوگوں کو کہاں نصیب ہوتا ہے۔ میں محمد سعید کو مولانا کی خدمت میں ضرور بھیجوں گی چنانچہ اس وقت مولانا محمد سعید صاحب کی عمر بارہ سال کی تھی جب آپ کو مکہ معظمہ روانہ کیا گیا تھا۔

مولانا محمد سعید صاحب کی حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے اپنی نگرانی میں تعلیم و تربیت فرمائی۔ اور فارسی و عربی کی کتب مولانا نے پڑھائیں۔ درسی کتابیں مولانا حضرت نور صاحب سے تحصیل کیں۔ اور معقول کی کتابیں ملا نواب صاحب سے پڑھیں

مولانا رحمت اللہ صاحب نے تعلیم سے زیادہ آپ کی تربیت کا خیال رکھا جس وقت آپ نے اپنی نواسی کی شادی مولانا محمد سعید صاحب سے کی تو اس وقت مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے علماء کے ہمراہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی تشریف فرما تھے نکاح سے فارغ ہونے کے بعد حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے مولانا محمد سعید صاحب کو دعائیں دینے کے بعد ان حضرات سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

" میں نے اس بچے کی اس طرح تربیت کی ہے جس طرح سنار سونے کو بھٹی میں ڈال کر تپاتا ہے اور کھوٹ نکھار کر پھینک دیتا ہے۔ اسی طرح میں نے اس کو بھٹی میں تپا کر نکھارا ہے۔"

جس زمانہ میں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کی بصارت میں ضعف آگیا تھا اس وقت ان کے خطوط کے جوابات لکھنے کا کام مولانا محمد سعید صاحب کو سونپا گیا۔ اسی طرح حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کے ایما اور خواہش پر مغرب و عشاء کے درمیان حضرت حاجی صاحب کے خطوط سنائے جس کی وجہ سے انہوں نے اسلام کی خدمت بڑی عمدگی کے ساتھ انجام دی۔

مولانا محمد سعید صاحب کو حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے اپنی زندگی میں مدرسہ کا انتظام سپرد کر دیا تھا۔ اور اپنا جانشین بنا کر مدرسہ مہتمم مقرر فرما دیا تھا۔

مولانا رحمت اللہ صاحب نے اپنی زندگی میں مسجد، پرانے مدرسہ کی عمارت اور دارالاقامہ کی عمارت تعمیر کرا دی تھی مولانا محمد سعید صاحب نے مولانا کے انتقال کے بعد مدرسہ کی نئی عمارت کا آغاز ۱۹۱۴ء میں کیا اور تکمیل ۱۳۳۲ھ میں ہوئی مولانا کی ایک بڑی یادگار اور ان کے پچاس سالہ دور نظامت کی ایک خاص نشانی یہی مدرسہ کی نئی عمارت ہے۔ جو اپنی شان اور وسعت کے لحاظ سے بے مثل ہے۔

مولانا رحمت اللہ صاحب کے انتقال کے بعد آپ مولانائے مرحوم کے وظیفہ کی رقم کی وصولیابی کے سلسلے میں استنبول گئے سلطان عبدالحمید نے مولانا محمد سعید کو تمغہ مجیدی درجہ پنجم عطا فرمایا اور قصر یلدز میں شاہی مہمان رکھا ۔

مولانا محمد سعید صاحب علمائے حق کی صحبت یافتہ اور تجربہ کار اور جہاندیدہ لوگوں کے تربیت یافتہ تھے ۔ ان کی رائے و مشورہ میں خوشامد اور غیر معقولیت نہیں پائی جاتی تھی آپ نے مولانا آزاد کی شکل صورت تک نہیں دیکھی تھی الہلال جب جاری ہوا اور جنگ بلقان وغیرہ کے سلسلے میں جو حریت پرور مضامین اس میں شائع ہوئے اس کی تائید آپ نے مدرسہ صولتیہ کی روئیداد میں فرمائی اور پسندیدگی کا اظہار کیا ۔

کس قسم کا امیر و قائد ملک اور عوام کے لئے مفید ہوتا ہے اس کے بارے میں آپ کی یہ ٹھوس رائے تھی ۔

" جو لوگ مسلمانوں کی ترقی کو کسی ترقی یافتہ قوم کی تقلید و اتباع اور نقالی میں یا علوم مغربیہ کی تعلیم اور یورپ کی تہذیب و تمدن اور جاپان و امریکہ کی وطنیت میں سمجھے ہوئے ہیں ۔ وہ ہماری بیماری اور مرض کے حقیقی اسباب و علل سمجھنے سے قاصر ہیں ۔

مولانا محمد سعید صاحب ہر اس فعل و حرکت و عمل کو جو ملک و ملت کے لئے مفید ہوتا تھا ۔ اس کی تائید کرنے میں کبھی تامل نہیں فرماتے تھے اور خاص طور پر تعلیم کے پھیلانے کے مسئلہ میں کبھی تنگ نظری کا ثبوت نہیں دیا چنانچہ ۱۳۳۱ھ میں ترکی حکومت نے دنیا کے مسلمانوں کی تعلیم دینے کے لئے مدینہ منورہ میں مدینہ یونیورسٹی تعمیر کرنے کی ابتداء کی تھی مولانا نے اس کا خیر مقدم کیا ۔ اور یہاں تک لکھ دیا اگر یہ یونیورسٹی کامیاب ہو گئی تو ہم مدرسہ صولتیہ کی ضرورت نہ سمجھتے ہوئے اس کو ختم کر دیں گے ۔

شریف حسین والئ حجاز کی غداری سے دنیا پوری طرح واقف ہے جو شخص انگریزوں کو خوش کرنے کے لئے خانۂ کعبہ کی بےحرمتی کا باعث بنا ہو اور جس نے ترکی حکومت سے بیوفائی کی ہو ۔ اس کے اقتدار اور حکومت کے زمانہ میں اس کی ظلم و زیادتی کے خلاف سخت الفاظ کہہ میں نکتہ چینی کرنا معمولی بات نہیں تھی ۔ وہی شخص جو موت کو لبیک کہتا ہو اور موت سے نہ ڈرتا ہو ایسے وقت میں نکتہ چینی کر سکتا تھا ۔ چنانچہ مولانا محمد سعید صاحب نے مدرسہ صولتیہ کی روئیداد ابتدائے ۱۳۳۲ھ لغایت ۱۳۳۶ھ میں شریف حسین کے مظالم کا ذکر " زمین حرم کا خونریز ہنگامہ قیامت " کے عنوان کے تحت کیا ہے ۔

. . . . تاریخ اسلام کا چودھویں صدی میں یہ انقلاب کس قدر درد انگیز ہے کہ تیرہ سو برس گذر جانے کے بعد اسی سرزمین پاک سے انہی ناموروں اور فدائیانِ اسلام، اسلاف کے اخلاف ہونے کے دعویدار ذراسی دنیاوی طمع (۳۰ لاکھ ماہوار) اور تاجداری کی امید موہوم پر جو درحقیقت اطاعت اور غلامی کا طریق لعنت ہے ۔ اسلام کی بیخکنی اور مسلمانوں کا شیرازہ بکھیرنے پر تیار اور آمادہ نظر آتے ہیں کس قدر عبرت انگیز منظر ہے کہ جن کے اسلاف نے حرمت حرم پر جانیں دے دیں ۔ ان کی جانشینی کے مدعی آج سرزمین حرم کو غیر مسلموں کی جولاں گاہ بنا دینے پر فخر کرتے ہیں جس سرزمین کی یہ عظمت و حرمت ہو کہ وہاں حلال جانور شکاری کی اور سرسبز درخت حطاب کے تیشہ کے جور سے مامون و محفوظ ہوں ۔ وہاں بےگناہ مردوں اور شیرخوار بچوں کے قتل و خونریزی اور غارتگری کا بازار گرم کیا جائے ۔ خواتین اسلام کی پردہ دری ہو اور مردوں ہی کو نہیں بلکہ پردہ نشین اور عصمت و عفت کی مجسمہ

بچیوں عورتوں کو حریم کعبہ سے پکڑ کر غیر مسلموں کی قید میں دے دیا جائے کہ وہ جہاں چاہیں لے جائیں۔ وہ معصوم بچے جو ماؤں کے ساتھ حرم کعبہ سے نکال کر عیسائیوں کی قید میں دئے جاتے ہیں۔ وہ ماؤں کے آغوش شفقت سے اس بنا پر علیحدہ کر کے پادریوں کے حوالے کئے جاتے ہیں کہ اسیران جنگ کے کیمپ میں بچے رکھے جا سکتے ہیں۔ نیرنگی عالم دیکھنی ہو تو اس واقعہ میں دیکھئے کہ جس قوم نے چھ سو برس تک شجر اسلام کو اپنے خون سے سینچا ہو۔ اس قوم کو آج وہ لوگ جو حرام و حلال میں تمیز کرتے ہوں، قطاع الطریق و رہزنی لوٹ مار جن کا ذریعہ معیشت ہو ملحد و مرتد بتائیں۔ ۱۰ محرم ۶۱ھ کے دلگداز واقعہ کی یاد کو زندہ رکھنے کے لئے اسلامی دنیا میں ماتم کیا جاتا ہے اور سید الشہدا کی مصیبت کو یاد کر کے محبانِ اہلبیت آنسو بہاتے ہیں۔ یہ درد انگیز واقعہ خاندانِ نبوت اور اہل بیت پر جیسا کچھ گذرا اس کو ہر مسلمان جانتا ہے۔ ۱۰ محرم کی طرح ۹ شعبان ۱۳۳۴ھ کا دن بھی جس روز زمینِ حرم پر اعلان بغاوت کیا گیا ملتِ اسلامیہ اور امت محمدیہ کے لئے کچھ کم جاں فرسا نہ تھا۔ "شریف مکہ نے ترکی حکومت سے جو غداری کی تھی اور قتل و غارتگری کا بازار گرم کیا تھا۔ اس سے مدرسہ کی مالی و انتظامی حالت پر بہت برا اثر پڑا تھا۔ آمدنی بہت کم ہو گئی تھی۔ ان پر آشوب حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شریف حسین نے اپنے جال میں پھنسانے کے لئے مدرسہ کو مالی امداد کی پیشکش کی۔ لیکن خوددار انسان پریشانیوں اور برے وقت سے گھبراتے نہیں۔ مولانا محمد سعید صاحب نے یہ پیشکش منظور نہیں کی۔ اور صبر و استقلال کے ساتھ تمام مشکلات کا مقابلہ کیا۔

مولانا محمد سعید صاحب نے نصاب تعلیم، اور طریقۂ تعلیم کے سلسلے میں کافی سے زیادہ مطالعہ کیا تھا۔ ان کے سامنے مغربی طریقۂ تعلیم بھی تھا اور اسلامی نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم سے بھی بخوبی واقف تھے علاوہ آپ قدیم و جدید اساتذہ کے طریقۂ تعلیم کا بالغور مطالعہ کر چکے تھے۔ قدیم زمانہ کی خوشحالی، علم پروری، علم دوستی اور قدر شناسی کا بھی علم تھا۔ اور موجودہ اقتصادی بدحالی اور علم سے بے تعلقی کے حالات بھی ان کے پیش نظر تھے۔

ان تمام حالات کو مدِنظر رکھ کر مولانا محمد سعید صاحب نے مدرسہ کی روئیداد ۱۳۴۹،۵۲ھ میں نصاب تعلیم پر ناقدانہ تبصرہ کے عنوان کے تحت ایک جامع مدلل اور پر از معلومات مقالہ تحریر کیا تھا اور انہی نظریات کے تحت آپ نے مدرسہ صولتیہ کا نصاب تعلیم مرتب فرمایا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس مدرسہ کے طالب علم آج بھی ممالک اسلامیہ کی علمی دنیا میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں اور علم کو فروغ دینے میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔

مولانا رحمت اللہ صاحب کی طلبہ کے بارے میں یہ رائے تھی کہ تعلیم کے ساتھ ان کی تربیت پر زیادہ توجہ دینی چاہیئے تاکہ علم پاکر یہ طبقہ اعلیٰ اخلاق و سیرت و کردار کا حامل بنے۔ اگر طلبہ کی صحیح تربیت نہیں ہوگی تو ان کے لئے علم بے کار ہے چنانچہ مولانا محمد سعید صاحب بھی اسی نظریہ کے حامل تھے۔ وہ بھی طلبہ کی تربیت کو بمقابلہ تعلیم کے مقدم سمجھتے تھے۔ وہ ہر ایک طالب علم کے کردار کا جائزہ لیتے تھے۔ اور جس میں کمزوری پاتے اس پر زیادہ توجہ دیتے تھے۔

چنانچہ مولانا محمد علی مونگیری جو ندوۃ العلماء کے ناظم بھی تھے۔ اور جن کا ہندوستان کے مشہور عالموں اور اولیاء میں شمار

ہوتا تھا۔ جب حج کے لئے تشریف لائے تو مدرسہ میں قیام فرمایا۔ سالانہ امتحان میں شریک ہوئے اور طلبہ کا امتحان لیا امتحان لینے کے بعد جو رائے انہوں نے اساتذہ اور طلبہ کے بارے میں دی وہ یہ تھی۔

"مولوی محمد سعید صاحب کی خوش نظمی اور مردم شناسی ہے کہ ایسے مستعد اور صلحا مدرس رکھے ہیں کہ بایدوشاید تعلیم اطفال کے لئے بہت ہی محنت کش اور بافیض مدرس ہونا چاہئے سوالحمد اللہ قاری عبد اللہ صاحب ایسے محنتی اور بافیض ہیں کہ ان کے تعلیم یافتہ ہندوستان اور دور دراز ملکوں میں اس فیض کو جاری کر رہے ہیں اس مدرسہ کے تمام مدرسین اور طلبہ کے خیالات میں نہ افراط و تفریط ہے اور نہ جدال و نزاع سے انہیں شوق ہے اور نہ کسی مسلمان کی تکفیر و تفسیق کا انہیں خیال ہے۔"

مولانا رحمت اللہ صاحب کے زمانے میں مکہ معظمہ وغیرہ میں ڈاک تقسیم کرنے کا کوئی انتظام نہیں تھا نہ کوئی ڈاک خانہ تھا۔ اُس زمانہ میں جو ڈاک آتی تھی حرم شریف کے دروازہ کے سامنے رکھ دی جاتی تھی۔ جس کا خط ہوتا تھا وہ تلاش کر کے لے جاتا تھا۔ مولانا رحمت اللہ صاحب نے ڈاک کے انتظام کے لئے سعی فرمائی، زندگی میں تو اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا البتہ ان کی وفات کے بعد مولانا محمد سعید صاحب نے اس جد و جہد کو جاری رکھا۔ اور سلطان عبد الحمید کو توجہ دلائی تو انہوں نے باب الوداع پر ڈاک خانہ کی عمارت تعمیر کرائی اور ایک ہندوستانی اور ایک جاوی پوسٹ مین مقرر کیا۔ اس کے بعد سے ڈاک کی طرف توجہ دی جانے لگی اور انتظام کا سلسلہ جاری ہو گیا۔

سلطان عبد الحمید خان کے عہد میں جب دمشق سے مدینہ منورہ تک حجاز ریلوے جاری کرنے کی سکیم بنائی گئی۔ تو اس میں مولانا محمد سعید صاحب نے بھی حصہ لیا اور مسلمانانِ ہند کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔ جب اسٹیشنوں کے نام رکھے جانے لگے تو اس وقت شیخ عبد الصمد صاحب الہ آباد کے رئیس حج کرنے کے لئے مکہ معظمہ میں آئے ہوئے تھے۔ مولانا نے ان کو اس میں حصہ لینے کو کہا تو انہوں نے یہ شرط رکھی کہ ایک اسٹیشن کا نام الہ آباد رکھا جائے۔ چنانچہ ان کی یہ شرط منظور ہوتی اور ایک اسٹیشن کا نام الہ آباد اسٹیشن رکھا گیا چنانچہ شیخ عبد الصمد نے اسٹیشن کی پوری رقم مولانا محمد سعید صاحب کو بھیجی جو انہوں نے قسطنطنیہ روانہ کر دی تھی۔

مولانا محمد سعید صاحب نے نہر زبیدہ کی توسیع کے سلسلے میں بھی حصہ لیا چنانچہ آپ نہر زبیدہ کمیٹی کے لائف ممبر تھے مولانا محمد سعید صاحب مدرسہ کی روئیداد اور سالانہ حساب کتاب تقریباً ہر سال شائع فرماتے تھے۔ یہ روئیداد اردو کے علاوہ عربی زبان میں بھی چھ سال تک شائع ہوئی۔ عربی روئیداد کا نام صدا العلم من الحجاز (حجاز کی علمی آواز) تھا۔

اسی کے ساتھ آپ مدرسہ کا سالانہ اجلاس فرمایا کرتے تھے جس میں ہندوستان کے علاوہ دیگر ملکوں کی مقتدر ہستیاں اور علما شامل ہوتے تھے اور مدرسہ کا معائنہ کرنے اور امتحان لینے کے بعد اپنے خیالات کا اظہار فرماتے تھے جس میں ہندوستان کے مجاہد حضرت مولانا رحمت اللہ کے تاریخی و انقلابی کارناموں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ اور لوگ علم کو پھیلانے

کے لئے آمادہ ہو جاتے تھے۔

مولانا محمد سعید صاحب بہت اچھے خطاط تھے یہ فن منشی ممتاز علی صاحب کی صاحبزادی فاطمہ بیگم سے مکہ معظمہ میں حاصل کیا تھا۔ منشی ممتاز علی صاحب مطبع مجتبائی دہلی کے مالک تھے۔ ہندوستان سے ہجرت کر کے مکہ میں سکونت پذیر ہوئے تھے جبل عمر میں رہتے تھے۔ ان کا مکان مولانا رحمت اللہ صاحب کے مکان کے قریب تھا۔ انہوں نے مکہ میں ایک پریس جاری کرنے کا ارادہ کیا تھا جو بعض وجوہات سے جاری نہ ہو سکا۔ فاطمہ بیگم کی خطاطی کے نمونے حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب خود بھی سلطان عبدالحمید خاں کو دکھائے جسے وہ دیکھکر بہت خوش ہوئے۔

مدرسہ صولتیہ مولانا رحمت اللہ صاحب کی وجہ سے ایک مرکزی مقام بن گیا تھا۔ حج کے ایام میں علماء و فضلاء صوفیاً و مشائخ کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ چنانچہ مولانا رشید احمد گنگوہی مولانا قاسم نانوتوی مولانا محمد حسین الہ آبادی۔ مولانا محمد علی منگیری مولانا شوکت علی محمد علی مفتی کفایت اللہ جیسے برگزیدہ علماء جب مکہ معظمہ تشریف لاتے۔ تو مہتمم مدرسہ سے ملتے تھے۔

ایک مرتبہ محمد حسین الہ آبادی تشریف لائے ان کے ہمراہ بلا مزامیر کے قوال تھے سماع ان کی روحانی غذا تھی۔ چنانچہ آپ کا انتقال حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے عرس کے موقعہ پر قوالی میں ہوا۔ آپ حضرت حاجی سعد اللہ صاحب کے خلفاء میں سے تھے۔ جب آپ مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ واپس ہوئے۔ راستے میں بدؤوں کا گانا سن چکے تھے۔ اس لئے آپ نے مولوی محمد سعید صاحب سے فرمایا میاں (رسول خدا) نے شاید ان بدؤوں کی کریہہ آواز سنکر گانے کو پسند نہیں فرمایا ہوگا۔ اگر میرے میاں ان خوش الحان قوالوں کا گانا سن لیتے تو کبھی ناپسند نہ فرماتے۔

مولانا رحمت اللہ صاحب کی شخصیت سے ترکی حکومت کے مرکزی اور حجاز کے حکمران متاثر تھے اور ان کی ذات مدرسہ کے لئے ایک رحمت غیر مترقبہ تھی۔ اگر مرکزی یا حجاز حکومت کا حکمراں طبقہ مدرسہ کے خلاف کچھ ریشہ دوانیاں کرنا یا نقصان پہنچانے کے منصوبے بناتا تھا تو مولانا صاحب کو اس کا مداوا اور تدارک کرنے میں کوئی زیادہ دقت پیش نہیں آتی تھی۔ لیکن مولانا صاحب کے انتقال کے بعد مولوی محمد سعید صاحب کو ان معاملات میں کافی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔

حجاز میں دو قوتیں تھیں ایک گورنر اور دوسرا شریف مکہ جیسے ایک میان میں دو تلواریں سما نہیں سکتیں۔ ایسے ہی دو حکمرانوں کو بیک وقت خوش و راضی رکھنا آسان کام نہیں تھا۔ لیکن مولانا محمد سعید صاحب اس پریشانی کو بڑی خوش اسلوبی سے دور کر لیا کرتے تھے اور اپنی دانشمندی سے دونوں سیاسی قوتوں کو مدرسہ سے برگشتہ و بدظن نہیں ہونے دیتے تھے۔ مگر کبھی ایسا ہوا بھی تو بڑی حکمت عملی کے ساتھ ان کی بدظنی کو دور کر دیا کرتے تھے۔ حجاز میں اس دوعملی کے باوجود متصادم حالات میں مدرسہ کو باقی رکھا اور ترقی دینے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

مولانا محمد سعید صاحب کے پچاس سالہ دور نظامت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے انتہائی صبر آزما حالات

پیہم مالی مشکلات اور گوناگوں انقلابات و سیاسی حوادث میں بھی مولانا رحمت اللہ صاحب بانی مدرسہ صولتیہ کی ہدایات پر کاربند رہے۔

چنانچہ جب ترکی حکومت کے خلاف شریف مکہ نے انگریزوں کے ساتھ مل کر بغاوت و غداری کر کے حجاز پر ترکی اقتدار و حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ یہ پہلی عالمگیر جنگ ۱۹۱۴ء کا زمانہ تھا۔ سترہ مہینے تک دنیا کے ہر مقام کے رسل و رسائل کے تمام ذرائع بند ہو گئے تھے جس میں حجاز بھی داخل تھا۔ اس وقت گرانی کا یہ عالم تھا کہ حجاز میں گیہوں کی ایک بوری پانچ سو روپیہ میں فروخت ہوئی اور مہینوں تک لوگوں نے جوار، باجرا، شکرکندی سے شکم پوری کی۔ شکر تقریباً ناپید ہو گئی تھی۔

ان حالات میں جبکہ مدرسہ کی آمدنی کے کل ذرائع مسدود ہو گئے تھے۔ مدرسہ کا انتظام، مدرسین کی تنخواہوں کی ادائیگی اور بقایا تمام ضروریات کی تکمیل کرنا مولانا محمد سعید صاحب جیسے اولوالعزم انسان کا کام تھا۔

ایسے پر آشوب زمانے میں برسر اقتدار طبقے نے مدرسہ کو مالی امداد کی پیش کش کر کے اپنے شکنجوں میں کسنے کی کوشش کی مگر مولانا محمد سعید صاحب نے بڑی خوبصورتی سے انکار کر کے مولانا رحمت اللہ صاحب کی ہدایت پر عمل کیا

مولانا محمد سعید صاحب بعض وجوہات کی بنا پر مکہ معظمہ سے اپنے وطن کیرانہ میں چلے گئے تھے لیکن وہاں سے تمام ہدایات اپنے صاحبزادے مولانا محمد سلیم صاحب کو دیتے رہے اور مدرسہ کے لئے ہندوستان میں بھی کام سرانجام دیا۔

کیرانہ میں مولانا محمد سعید صاحب کا انتقال ۱۳۵۷ھ میں ہوا۔ اور اپنے خاندانی قبرستان میں مدفون ہوئے مولانا محمد سعید صاحب کی پہلی شادی مولانا رحمت اللہ صاحب کی نواسی مریم بنت مولانا حکیم محمد اسمٰعیل صاحب سے ہوئی۔ جن سے ایک صاحبزادی عائشہ بیگم زوجہ حکیم عبدالباسط صاحب کیرانوی ہوئیں۔

مولانا محمد سعید صاحب کی دوسری شادی پہلی بیوی کے انتقال کے بعد ام کلثوم بنت مولوی حافظ عبدالحلیم صاحب سے ہوئی جس سے مولانا محمد سلیم صاحب حکیم محمد نعیم صاحب اور ایک صاحبزادی نعیمہ بیگم زوجہ حکیم محمد یامین صاحب کاندھلوی ہوئیں۔

مولانا محمد سلیم صاحب اور حکیم محمد نعیم صاحب مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے۔ مولانا محمد سلیم صاحب نے مدرسہ صولتیہ میں قاری عبداللہ صاحب سے تجوید کی مشق کی۔ اور قرآن مجید حفظ کیا۔ اس کے بعد ابتدائی درسی کتابیں مدرسہ کے مدرسین مولانا محمد اصغر صاحب، شیخ داؤد دہلان اور مولوی عبدالحق صاحب مدنی سے اور اعلیٰ درسی کتابیں مولانا مشتاق احمد صاحب کانپوری اور مدرسہ صولتیہ کے شیخ الحدیث شیخ حبیب اللہ شنقیطی سے پڑھیں یہ مولائی عبدالحفیظ سلطان مراکش کے استاد تھے اور اپنے زمانہ میں شیخ الحدیث مانے جاتے تھے۔

مولانا محمد سلیم صاحب نے تعلیم سے فراغت پانے کے بعد ۱۳۴۳ھ سے مختلف اوقات میں پندرہ بیس برس تک مدرسہ صولتیہ میں تعلیم دی اور ۱۳۴۶ھ سے ۱۳۵۷ھ تک نائب ناظم کے فرائض انجام دینے کے بعد ۱۳۵۷ھ سے اب تک نظامت

کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ مولانا محمدؐ سلیم صاحب علم دوست دور اندیش خلیق ہونے کے ساتھ تعلیمی تجربہ کافی رکھتے ہیں۔ مدرسہ کے چلانے میں ان کو بھی دشواریاں پیش آئیں انہوں نے اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چل کر حکمت عملی سے مقابلہ کیا۔ اور مدرسہ کو چار چاند لگاتے۔

مولانا محمدؐ سلیم صاحب کی شادی ۱۳۲۶ھ میں ذکیہ سلطانہ بنت مولوی عبدالحمید صاحب کاندھلوی سے ہوئی جن سے محمدؐ مسعود المعروف محمدؐ شمیم صاحب ہوئے۔

مولوی شمیم صاحب کیرانہ محلہ دربار میں ۱۳۳۱ھ میں پیدا ہوئے۔ پانچ سال کی عمر میں اپنے جدامجد حضرت مولانا محمدؐ سعید صاحب کے ہاتھ پر بسم اللہ اور تعلیم کی ابتدا کی۔ اور تین سال تک گھریلو طریقہ پر تعلیم انہی کے زیر سایہ ہوئی۔ ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ میں اپنے دادا صاحب کی وفات کے بعد اپنے والد مولوی محمدؐ سلیم صاحب کے ہمراہ دہلی پہنچے۔ قرول باغ میں قیام کیا اور ۱۹۴۱ء میں پانچویں جماعت میں جامع ملیہ میں داخل ہوئے۔ ڈیڑھ سال کے بعد کاندھلہ میں منتقل ہوئے اور وہاں ساتویں جماعت میں نیشنل سکول میں داخلہ لیا۔ ایک سال وہاں تعلیم حاصل کی۔ پھر دہلی آگئے۔ پرائیویٹ طور پر انگریزی پڑھی اور فتحپوری مسلم ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان دے رہے تھے۔ دو پرچے کر بھی چکے تھے کہ نومبر ۱۹۴۳ء میں مکہ معظمہ جانا پڑا یہاں ان کے والد صاحب نے گھر پر صرف و عربی کی ابتدائی تعلیم دلوائی۔ اس کے بعد ۱۱ محرم ۱۳۶۵ھ کو مدرسہ کے شعبہ ثانوی کے پہلے سال میں داخلہ لیا۔ اور ۱۳۷۱ھ میں فارغ التحصیل ہوئے اس کے بعد مدرسہ میں تعلیم دی۔ ۱۳۷۲ھ ہی سے مدرسہ کی دفتری لائن میں کام شروع کیا جو اب تک جاری ہے انتہائی ملنسار، متواضع ہیں اور خدمت خلق کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں۔

مولوی محمدؐ شمیم صاحب کی شادی صادقہ بیگم بنت حافظ محمدؐ ضیاء الدین عثمانی سے ہوئی جن سے محمدؐ حشیم صاحب، محمد زعیم صاحب محمدؐ حلیم صاحب اور ایک صاحبزادی خدیجہ ہوئیں۔ تینوں صاحبزادے نوعمر ہیں اور زیر تعلیم ہیں۔

مولوی محمدؐ سعید صاحب کے دوسرے صاحبزادے محمدؐ نعیم صاحب نے مولوی محمدؐ عمر صاحب کیرانوی سے گھر میں اردو فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ مسجد بنگلہ بستی نظام الدین دہلی میں عربی کی ابتدائی کتابیں تحصیل کیں۔ اس کے بعد طب کی طرف رجوع کیا جو خاندانی فن تھا۔ جامعہ طبیہ دہلی میں حکیم الیاس صاحب سے سند لی۔ اور حکیم فرید احمد عباسی کے مطب میں ایک سال تک استفادہ کیا اس کے بعد مکہ چلے آئے مطب و دواخانہ قائم کیا۔ جدہ ریڈیو کے اردو کے پروگرام کے اناؤنسر مقرر ہوئے چنانچہ یہ ذمہ داری پانچ سال تک نبھائی۔ آپ سعودی عرب ریڈیو کے اردو کے پروگرام کے سب سے پہلے اناؤنسر تھے۔ اس سے قبل ریڈیو پر اردو پروگرام نہیں ہوتا تھا۔

مولوی محمدؐ نعیم صاحب کی شادی طاہرہ خاتون بنت پروفیسر حافظ محمدؐ عثمان صاحب ایم۔ اے پرنسپل اسلامیہ کالج لیتاوہ سے ہوئی۔ جن سے ایک صاحبزادے محمدؐ سعید صاحب مکہ چیف رجسٹرار کے سیکریٹری اور دو صاحبزادیاں صبیحہ بیگم زوجہ احمد شجاع الدین عثمانی اور فائزہ بیگم اہلیہ مظہر حسین صاحب کیرانوی ہوئیں۔

ابوسلمان شاہجہانپوری

نئے خزانے

پیشِ نظر اشاریہ مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت ترتیب دیا گیا ہے

- آپ بیتی
- ادب
  - اردو ادب ــ تحقیق و تنقید
  - ادبی اجتماعات
  - دیگر زبانوں کا ادب
- تاریخ
- تعلیمات
- تہذیب و معاشرت
- سائنس
- سیاسیات
- سیر و سیاحت
- شخصیات
  - آزاد، مولانا ابوالکلام
  - اقبال، علامہ
  - غالب
  - دیگر شخصیات
- طب
- فلسفہ و نفسیات
- فنون لطیفہ
- کتابیات و کتب خانہ
- لسانیات
- مذہبیات
- تفسیر قرآن مجید
- سیرت و سنت نبوی
  - مسائل و مباحث
- معرکہ ہائے جنگ و جہاد اور افواج پاکستان
- مکاتیب
- وفیات
- مطبوعات جدیدہ (نئی کتابوں اور رسالوں پر تبصرے)

اس اشاریئے کی ترتیب میں ماہ فروری ۱۹۶۶ء کے مندرجہ ذیل رسائل و اخبارات سے مدد لی گئی ہے بعض رسائل پچھلے مہینوں کے ہیں جو بعد میں دستیاب ہوئے ہیں

ماہنامہ	اردو زبان	سرگودھا	فروری ۶۶ء	ماہنامہ	گل خنداں	لاہور	فروری ۶۶ء
"	اردو ڈائجسٹ	لاہور	"	"	ماہ نو	کراچی	"
"	الرحیم	حیدرآباد	"	"	نقش	"	نمبر ۲
"	الشجاع	کراچی	"	"	نقوش	لاہور	جنوری ۶۶ء
"	بنیات	"	"	"	نئی قدریں	حیدرآباد	جلد نمبر ۷ انمبر ۱۲
"	پیام عمل	لاہور	"	"	ہندوستانی ادب (سلور جوبلی نمبر)	حیدرآباد دکن	اکتوبر تا دسمبر ۶۵ء
"	ترجمان القرآن	"	"	پندرہ روزہ	صحیفہ اہل حدیث	کراچی	فروری ۶۶ء
"	جام نو	کراچی	"	ہفت روزہ	آئین	لاہور	۲۸ فروری ۶۶ء
"	چراغ راہ	"	"	"	المنبر	لائل پور	فروری ۶۶ء
"	زاویے	حیدرآباد	جنوری فروری ۶۶ء	"	چٹان	لاہور	"
"	ساقی	کراچی	فروری ۶۶ء	"	خدام الدین	"	"
"	سیارہ	لاہور	"	"	شہاب	"	"
"	صحیفہ	"	جنوری ۶۶ء	"	صدق جدید	لکھنؤ	۱۸، ۲۵ فروری
"	طلوع اسلام	"	فروری ۶۶ء	"	قندیل	لاہور	فروری
"	عارف	"	"	"	لاہور	"	"
"	عالمی ڈائجسٹ	کراچی	"	روزنامہ	انجام	کراچی	اشاعتہائے جمعہ و اتوار
"	فاران	"	"	"	جنگ	"	"
"	قومی زبان	"	"	"	حریت	"	"
"	کتابی دنیا	"	"				

آپ بیتی

سہروردی، حسن شہید	سہروردی کی کہانی ان کی اپنی زبانی	جنگ، ص ۲، ۷ر فروری
"	" "	" " ۲، ۲۱ر "
"	" "	" " ۲، ۲۸ر "
گاندھی، موہن داس کرم چند	میری کہانی خود میری زبانی	ہندوستانی ادب، ص ۱۹۸ تا ۱۹۹، اکتوبر تا دسمبر

ادب

اردو ادب - تحقیق و تنقید

ابوذر عثمانی	زبان اردو اور اہل الہ آبادی[1]	عارف، ص ۳۳ تا ۳۸، فروری
اعجاز نقوی، ڈاکٹر	سرشار بحیثیت انشائیہ نگار	نقوش، ص ۲۶۱ تا ۲۷۲، جنوری
احسان دانش	شورش سے زیادہ اس جنگ کے متعلق	چٹان، ص ۱۲، ۷ر فروری
احسان فاروقی، ڈاکٹر	شعوری رو اور ناول نگاری	نقوش، ص ۱۸۲ تا ۱۹۳، جنوری
اختر، پروفیسر بشیر احمد	نذیر احمد کے اسلوب نثر کا جائزہ	چٹان، ص ۷ تا ۸، ۲۸ر فروری
اختر حسین، صدر انجمن ترقی اردو	ادیب اور قومی یکجہتی[2]	قومی زبان، ص ۳ تا ۶، فروری
اکبر علی خاں	رشید حسن خاں کی تحقیقی غلطیاں	نقوش، ص ۲۳۹ تا ۲۵۴، جنوری
انیس فاطمہ، سیدہ	کشفی اور روحانی ادب	عارف، ص ۵۲ تا ۳۱، فروری
انیس الرحمٰن	انجمن ترقی اردو	ہندوستانی ادب، ص ۸۸ تا ۸۹، اکتوبر تا دسمبر
تنویر علوی، ڈاکٹر	ادب میں سماجی شعور	الشجاع، ص ۴۴ تا ۴۶، فروری
جمیل جالبی	شیفتہ اور کلام شیفتہ	صحیفہ، ص ۵ تا ۷۲، جنوری
جمیل واسطی، پروفیسر	اردو میں سانیٹ	زاویے، ص ۲۰ تا ۲۵، جنوری فروری
حنیف، امیر محمد	رباعی اور اس کی اہمیت	ہندوستانی ادب، ص ۸۴، اکتوبر تا دسمبر
خان، جی ام	ہاشمی اور یوسف زلیخا	" " ۶۵ تا ۶۷، " "

---

[1] منقول از ہفت روزہ ہماری زبان علی گڑھ　[2] رائٹرز گلڈ کے جلسہ مورخہ ۱۴ر نومبر ۶۵ء کی تقریر کا متن

مصنف	عنوان	ماخذ
شجاع، حکیم احمد	لاہور کا چیلسی[1]	نقوش، ص ۹ تا ۴۴، جنوری
طاہر، ایم سید	عہد جدید کے شاعر کا ماڈل ۔ شاعر ندیم	〃 〃 ۲۵۵ تا ۲۶۰، 〃
عبدالحلیم چشتی	سید احمد شہید کی تحریک کا اثر اردو ادب پر	الرحیم، ص ۶۳۴ تا ۶۵۸، فروری
عصمت اللہ	ڈاکٹر سید عبداللہ کے دو نظریئے	اردو زبان، ص ۱۸ تا ۲۱، 〃
فرخی، ڈاکٹر اسلم	متفرقات آزاد (محمد حسین)	قومی زبان، ص ۴۰ تا ۴۶، 〃
کلیم اللہ حسینی، ڈاکٹر قاری	فارسی زبان کا اثر دکن میں	ہندوستانی ادب، ص ۲۲ تا ۴۲، اکتوبر تا دسمبر ۶۵
محمود احمد	حالی کی شاعری پر ایک اچٹتی نظر	〃 〃 ۵۶ تا ۵۷، 〃 〃
مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر غلام	فن تحقیق	نقوش، ص ۱۷۵ تا ۱۸۵، جنوری
نسرین حبیب	اردو کی نشو و نما میں ٹیڈیوں کا حصہ	جام نو، ص ۱۷ تا ۴۸، فروری
نیرنگ نیازی	گنج معانی ہے تہہ خاک	انجام، ص ۹، ۲۸ فروری
وزیر آغا	ادبی مسائل	اردو زبان، ص ۸ تا ۱۰، 〃

ادبی اجتماعات

مصنف	عنوان	ماخذ
سجاد میر	منٹگمری نامہ	اردو زبان، ص ۵۴، فروری
مرزا ادیب	ان دنوں لاہور	〃 〃 ۴۳ تا ۴۴، 〃
سلیم اختر	ملتان میں ادبی سرگرمیاں	〃 〃 ۳۹ تا ۴۲، 〃
مشتاق قمر	پنڈی ایک شہر ہے	〃 〃 ۴۳ تا ۴۸، 〃
کلیمی، رسول احمد	طلبا کا مشاعرہ	انجام، ص ۱۱، ۲۶ فروری
ظہور الحسن بھوپالی	مشاعرہ ۔ ریڈیو پاکستان سے	جنگ، ص ۷، ۲۶ 〃
——	مشاعرہ	حریت، ص ۳، ۲۷ 〃

دیگر زبانوں کا ادب

مصنف	عنوان	ماخذ
ضیا، علی حسنین	ہندوستان زبان کے ناول نگار	ہندوستانی ادب، ص ۴۴ تا ۶۲، اکتوبر تا دسمبر

[1] لاہور کے بھاٹی دروازے کی علمی شخصیات اور علمی و ادبی زندگی کے بارے میں

مصنف	عنوان	ماخذ
حمید اللہ خاں	بھارت میں ہندوستانی ادب	عارف، ص ۴۴ تا ۵۴، فروری
ناز، ایم ایس	پشتو ادب	قندیل، ص ۱۰ تا ۱۱+۱۸، ۲ر "

تاریخ

مصنف	عنوان	ماخذ
اختر رضوی	سندھ میں عربوں کا فیصلہ کن معرکہ	ماہ نو، ص ۳۵ تا ۴۰+۶۷، فروری
اشتیاق حسین قریشی، ڈاکٹر	حصول پاکستان کی جدوجہد	اردو ڈائجسٹ، ص ۱۴۱ تا ۱۴۴، "
انور قریشی، منظور	جب چینی گوریلوں نے آزادی کی جنگ لڑی	انجام، ص ۵، ۱۲ر فروری
ایم پولینو مترجم: مناظر صدیقی	وہ رات — جب امریکیوں نے سوئیکارنو کو اغوا کرنے کی کوشش کی	جنگ، ص ۹+۱۱، ۷ر فروری
جعفری، رئیس احمد	تحریک پاکستان سے قبل کی مسلم قیادت کا تعارف (۱)	انجام، ص ۱۲، ۲۲ر "
جواہر لال، لالہ	فصلی سن کی کہانی	ہندوستانی ادب، ص ۳۸ تا ۴۱، اکتوبر تا دسمبر ۹۵ء
حبیب الرحمان، حکیم	ڈھاکہ اب سے پچاس برس پہلے	عالمی ڈائجسٹ، ص ۱۲۱ تا ۱۲۹، فروری
رحمت فرخ آبادی	ہم اور ہماری تاریخ — آج کے چند مسائل	جنگ، ص ۱۱، ۵ر فروری
سراج الدین احمد	علاء الدین خلجی کی تخت نشینی کے وقت سلطنت دلی کی حالت	ہندوستانی ادب، ص ۴۳ تا ۵۲، اکتوبر تا دسمبر ۹۵ء
سیادت علی خاں، ڈاکٹر سید	حجاج بن یوسف کی فتوحات سندھ	" ، ص ۱۱۲ تا ۱۱۳، " "
عبدالعزیز قادری، مولانا حکیم ابوعبید	میدان بدر یا میدان فرقان	خدام الدین، ص ۱۰ تا ۱۱+۱۴، ۱۱ر فروری
عبدالغفور	فرنٹیئر کور (ملیشیا)	حریت، ص ۶، ۵ر فروری
غازی اجمیری، محی الدین	تحریک خلافت	جنگ، ص ۵، ۲۸ر "
مختار احمد الحسینی، مولانا حکیم	حق کی فتح مندی کا پہلا نشان — بدر	خدام الدین، ص ۱۴ تا ۱۵، ۴ر فروری
نیر مسعود رضوی، ڈاکٹر سید	لکھنؤ کا عروج و زوال	نقوش، ص ۲۱۸ تا ۲۴۸، جنوری
مترجم: عمران کاظمی	ہٹلر کا اغوا — دوسری عالمی جنگ	جنگ، ص ۷، ۱۲ر فروری
----	آخری مغل تاجدار کی عید	گل خنداں، ص ۴ تا ۶، دسمبر جنوری
----	صلح حدیبیہ — اصل حقیقت، پس منظر اور ردعمل	چٹان، ص ۱۳ تا ۱۴+۱۹، ۱۷، ۲۴ر فروری

تعلیمات

خالد علاؤ الدین	اردو درسی کتابیں — ماضی و حال	کتابی دنیا، ص ۱ تا ۳، فروری
خدا بخش بچہ، ملک	خطبہ تقسیم اسناد پنجاب یونیورسٹی	سیارہ، ص ۲۶ تا ۳۲، "
"	"	قومی زبان، ص ۷ تا ۱۴، "
علی اکبر، سید	نظام تعلیم میں ہندوستانی کی اہمیت	ہندوستانی ادب، ص ۸۶ تا ۹۲، اکتوبر تا دسمبر ۶۵

تہذیب و معاشرت

احتشام حسین	مرشار کا لکھنؤ	ہندوستانی ادب، ص ۱۳۹ تا ۱۴۱، اکتوبر تا دسمبر ۶۵
مہدی نظمی	حقے کا عروج و زوال	عالمی ڈائجسٹ، ص ۴۰ تا ۴۳ + ۹۶، فروری
———	ہڑپہ کی قدیم تہذیب	قندیل، ص ۲ + ۱۹، ۶ فروری

سائنس

ادریس خاں، محمد	سائنسداں چیونٹیاں	اردو ڈائجسٹ، ص ۵۶ تا ۶۴، فروری
پرویز	سائنس اور ایمان	طلوع اسلام، ص ۴۹ تا ۵۶، "
خان، ایم - این	پراسرار سیارہ مریخ	عالمی ڈائجسٹ، ص ۱۰۲ تا ۱۰۴ + ۱۴۶، "
	جدید ایجادات — سائنس کے حیرتناک کارنامے	جنگ، ص ۱۱، ۲۶ فروری
	چاند — زمین کا قریب ترین ساتھی	حریت، ص ۱۰، ۱۲ "

سیاسیات

ابن نذیر	اعلان تاشقند	چراغ راہ، ص ۳ تا ۱۰، فروری
اشرف، حکیم عبدالرحیم	اعلان تاشقند، حزب اقتدار اور حزب اختلاف	المنبر، ص ۳ تا ۴، ۴ فروری
"	نیشنل کانفرنس	" " ۹ تا ۱۰، ۱۱ "
"	صحت مندانہ طرز فکر	" " ۳ تا ۴، ۱۸ "
بصیر عالم	دنیائے عرب	نقوش، ص ۴۹۰ تا ۵۰۴، جنوری

راشدی، پیر علی محمد	مشرق و مغرب	جنگ، ص ۱۲، ۵ رفروری
〃 〃	〃 〃	〃 〃 ۱۲، ۱۲ ر 〃
〃 〃	〃 〃	〃 〃 ۱۲، ۲۶ ر 〃
سلطان احمد	کیا واقعی جماعتیں متحد ہیں؟	حریت، ص ۳ + ۸، ۱۲ ر 〃
کوثر نیازی	اعلان تاشقند پر	شہاب، ص ۱۱ تا ۱۲، ۹ ر 〃
〃	اپوزیشن پارٹیوں کی کل پاکستان نیشنل کانفرنس	〃 〃 ۳ + ۱۲، ۱۳ ر 〃
〃	اعلان تاشقند کے بعد	〃 〃 ۱۳ تا ۱۴، ۲۰ ر 〃
محمد تقی، سید	جمہوریت ـ سامراجیت اور فاشیت	جنگ، ص ۵، ۷ رفروری
〃	سرمایہ داری نظام تہذیب کی کسوٹی پر	عالمی ڈائجسٹ، ص ۲۴ تا ۳۸ + ۱۴۶، فروری
محمد عثمان، پروفیسر	پاکستان اور دین اور سیاست	چٹان، ص ۷ تا ۸، ۱۲ رفروری
محمود اعظم فاروقی	الزامات اور حقائق (جماعت اسلامی کے بارے میں)	آئین، ص ۵، ۲۸ ر 〃
	بھارت کی اسلحہ بندی	المنبر، ص ۵ تا ۸، ۴ ر 〃
〃	۶ ستمبر سے ۱۰ ستمبر تک	چراغ راہ، ص ۷ تا ۱۲، 〃

سیر و سیاحت

احمد فاروقی، خواجہ	سفر ایران کے تاثرات	ہندوستانی ادب، ص ۱۴۹ تا ۱۵۰، اکتوبر ۶۵ء
ٹوین، مارک مترجم: مرشدی، محمد حبیب اللہ	مارک ٹوین کا سفرنامہ ـ ہندو پاکستان کی ستر سال پہلے کی تصویر	انجام، ص ۷، ۲۸ رفروری
رشیدہ رضویہ	برسلز	الشجاع، ص ۵۴ تا ۵۸، 〃
شمیم اختر	تخت سلیمان کی وادی میں	جام نو، ص ۵۲ تا ۵۴، 〃
عاشق حسین	برطانیہ کی سیر ـ فلیٹ اسٹریٹ	قندیل، ص ۱۲، ۶ ر 〃
محمد اسماعیل، مولانا حافظ	ایران و عراق کی سیاحت	الرحیم، ص ۱۷ تا ۲۵، ۶۶ 〃
وجاہت علی، سید	۱۰ روپے میں سیر جہاں (۳۰)	انجام، ص ۱۲، ۱۲ ر 〃
〃 〃	〃 〃	〃 〃 ۲، ۲۶ ر 〃

شخصیات

آزاد، مولانا ابوالکلام

ابو سلمان شاہجہانپوری	مولانا آزاد کا فلسفۂ تعلیم	ہندوستانی ادب اکتوبر تا دسمبر ۶۵ء
آزاد، مولانا ابوالکلام	علم کو وسیلۂ معاش نہ بناؤ![1]	المنبر، ص ۸، ۱۱ر فروری
احسن گیسو دراز پاکستانی، محمد		
مرزا منور علی بیگ	مولانا ابوالکلام آزاد اور فوٹو	المنبر، ص ۵ تا ۶ + ۸، ۴ر فروری
جوہر، نربھے رام	غبار خاطر کے آخری مکتوب پر ایک نظر	نئی قدریں، ص نمبر ۵-۶ ۱۹۶۵ء
عبدالغفار، قاضی	مولانا ابوالکلام آزاد	ہندوستانی ادب، ص ۳۳ تا ۵ ۱۷، اکتوبر تا دسمبر ۶۵ء
عبدالماجد دریابادی	یادیں :- ابوالکلام آزاد[2]	صدق جدید، ص ۵ تا ۶، ۱۸ر فروری

اقبال، علامہ

بیگم باجی	اقبال کا فطری مطالعہ	انجام، ص ۱۵، ۲۸ر فروری
خورشید، ڈاکٹر عبدالسلام	اقبال ایک مستقبل شناش سیاست داں	نقوش، ص ۱۴۸ تا ۱۵۱، جنوری
رشید احمد خاں	اقبال کی شاعری اور اس کا پیغام	ہندوستانی ادب، ص ۱۰۶ تا ۱۰۰، اکتوبر تا دسمبر ۶۵ء
عبدالمغنی	اقبال کی انسان دوستی	نقوش، ص ۱۵۲ تا ۱۶۷، جنوری
کیمی، مولانا غلام رسول	حضرت فاطمہؓ کی خدمت میں علامہ اقبال کا نذرانۂ عقیدت	پیام عمل، ص ۱۳ تا ۱۴، فروری

غالب

بادشاہ حسین، سید	کچھ کبھی ہم مرزا نوشہ کا کلام سننے کو جی چاہتا ہے۔	انجام، ص ۲، ۲۸ر فروری
تحسین سروری	دیوان غالب کی چوتھی اشاعت کا	ماہ نو، ص ۷۰ تا ۷۵، "

---

[1] دارالعلوم دیوبند کے طلبہ سے مولانا مرحوم کا خطاب - [2] ۱۶ر جنوری ۱۹۵۸ء کو لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے ایک نشریہ

تحسین سروری	غالب ـ شخصیت اور شاعری کے آئینے میں	جنگ، ص ۱۱، ۲۸ر فروری
حقی، شان الحق	مرزا غالب لندن میں	ماہ نو، ص ۲۱ تا ۲۶ + ۷۷، "
راز، اطہر	ہائے بیچارے مرزا غالب	انجام، ص ۹، ۲۸ر فروری
سرور، پروفیسر آل احمد	غالب کا ذہنی ارتقا	" " ۱۵، " "
سلیم اختر	مرد عاشق کی مثال	ماہ نو، ص ۱۳ تا ۱۶، "
عبدالحق، بابائے اردو	مرزا غالب ـ خود نوشت سوانح کا ایک ورق	جنگ، ص ۲، ۲۸ر "
مدنی، افتخار احمد خاں	غالب اور سپہ گری	انجام، ص ۵، ۲۸ر "
عرشی، امتیاز علی	کچھ غالب کے متعلق	" " ۱۵، ۲۸ر "
عنقا بلوچ، نیر محمد حسین	غالب کے سیاسی افکار	ماہ نو، ص ۷ تا ۲۰ + ۷۸، "
قدرت نقوی	درفش کاویانی	ماہ نو، ص ۹۱ تا ۹۹ "
مہر، مولانا غلام رسول	مرزا غالب کی صد سالہ برسی	" " ۷ تا ۱۱، "
ــــــ	غالب اور فرہاد	انجام، ص ۲، ۲۸ر "

دیگر شخصیات

اختر علی	اعتبار الملک حضرت دل شاہجہانپوری	ہندوستانی ادب، ص ۱۵۱، اکتوبر تا دسمبر ۶۵ء
آزاد، مولانا محمد حسین	راجہ بیر بر	صحیفہ، ص ۵۹ تا ۶۴، جنوری
اسرار احمد سہاروی	شاہد بھائی	سیارہ، ص ۶۶ تا ۷۱، فروری
اعجاز حسین، ڈاکٹر	اکبر الہ آبادی	ہندوستانی ادب، ص ۱۵۳ تا ۱۶۴، اکتوبر تا دسمبر ۶۶ء
امید فاضلی	جگر مراد آبادی	نقوش، ص ۱۶ تا ۷۶، فروری
ثاقب زیروی	راغب مراد آبادی	ہندوستانی ادب، ص ۱۹۲ تا ۱۹۴، اکتوبر تا دسمبر ۶۶ء
حسنین کاظمی	ازبکستان کے داستان گو	جام نو، ص ۱۳ تا ۱۶، فروری
خان، جی ایم	سبھاش چندر بوس	ہندوستانی ادب، ص ۱۵۸ تا ۱۸۷، اکتوبر تا دسمبر ۶۹ء
خان رشید، ڈاکٹر	ایک عوامی شاعر (محسن بھوپالی)	زاویے، ص ۹ تا ۱۷، جنوری، فروری
خورشید ہمایوں	مصطفیٰ زیدی	نئی قدریں، ص ۵ تا ۸،

[1] آزاد کا ایک نایاب مضمون جناب ارشد کیانی صاحب کے تمہیدی نوٹ کے ساتھ

پرویز	ایک چراغ اور لاکھ اندھیرے[1]	طلوع اسلام، ص ۵۴ تا ۶۴، فروری
دانش، حکیم محبوب احمد	شیخ بوعلی سینا	چٹان، ص ۱۲، ۷ر فروری
راشدی، پیر حسام الدین	ڈاکٹر عترت حسین زبیری	لاہور، ص ۶ تا ۷ + ۱۳، ۸ر فروری
سری نواس لاہوٹی	سروجنی نائیڈو کی شخصیت	ہندوستانی ادب، ص ۹۹ تا ۱۰۱، اکتوبر تا دسمبر ۶۵ء
سکسینہ، رام راج	ٹیگور کے حالات	〃 〃 ۱۲۷ تا ۱۳۱، 〃 〃
شاہد عشقی	جگر مراد آبادی	〃 〃 ۱۵۸ تا ۱۵۹، 〃 〃
شمیم احمد	رئیس امروہوی	قومی زبان، ص ۲۹ تا ۳۲، فروری
شورش کاشمیری	مولانا عبدالہادی دین پوری	چٹان، ص ۵ + ۶، ۲۱ر 〃
شوق امرتسری، عبدالرحمٰن	ملک سراج الدین	گل خنداں، ص ۱۰ تا ۱۲، دسمبر ۶۵ء جنوری ۶۶ء
صابر، محمد عبدالکریم	شیخ التفسیر مولانا احمد علی	خدام الدین، ص ۱۱ + ۱۰، ۴ر فروری
طفیل، محمد	جوش صاحب (ملیح آبادی)	نقوش، ص ۱۱۷ تا ۱۲۴، جنوری
عارج ماینگانوی، محمد ابراہیم	نواب فصاحت جنگ جلیل	ہندوستانی ادب، ص ۷۹ تا ۸۱، اکتوبر تا دسمبر ۶۵ء
عرش ملسیانی	محمد حسین آزاد	〃 〃 ۱۲۰ تا ۱۲۱، 〃 〃
فرقت کاکوروی، غلام احمد	انشاء اللہ خاں انشاء	〃 〃 ۱۳۲ تا ۱۳۳، 〃 〃
قمر یورش	افغانستان کی سترہ سالہ قید کے بعد عزیز ہندی کی رہائی	چٹان، ص ۷ تا ۸، ۷ر فروری
مجید شاہد	سر عبدالقادر	قندیل، ص ۲، ۲ر 〃
غازی، عبدالحمید	اندرا گاندھی	لاہور، ص ۶ تا ۷ + ۱۱ تا ۱۴، ۲۸ر فروری
محمد حسین خاں	اردشیر بابکان	عالمی ڈائجسٹ، ص ۱۹۴ تا ۱۹۸، 〃
محمد انور	مولانا سید افقر موہانی وارثی لکھنوی	ہندوستانی ادب، ص ۱۰۱ تا ۱۰۲، اکتوبر تا دسمبر ۶۵ء
ممتاز حسن	مولانا سید مرتضیٰ ادیب	نقش، ص ۹ تا ۲۰، فروری
نادم سیتاپوری	مدار الدولہ نواب علی نقی خاں	نقوش، ص ۱۹۴ تا ۲۱۷، جنوری
نجم الدین احمد	اشتراکی چین کا انقلابی رہنما ماوزے تنگ	شہاب، ص ۷ + ۱۰، ۶ر فروری

---

[1] یوم پیدائش قائداعظم پر غلام احمد پرویز کی ایک تقریر

قمر یورش	جلیانوالہ باغ کا ہیرو — چچا محمدی[1]	چٹان، ص ۲۲ + ۲۶، ۱۴ ر فروری
قمر رضی، سید	وہ شخص جو سیاسی لطیفے بیچتا ہے[2]	عالمی ڈائجسٹ، ص ۱۱۰ تا ۱۱۸، "
شورش کاشمیری	قلمی چہرے[3]	چٹان، ص ۱۰ تا ۱۱، ۷ ر "
مجید، حمید اصغر	مولانا احمد علی لاہوری	" " ۱۰ تا ۱۱، ۲۸ ر "
نصرت نوشاہی	حضرت میاں اللہ دتا صاحبؒ خزانے والے	عارف، ص ۹ تا ۱۴، فروری
نیرنگ نیازی	مصور غم — علامہ راشد الخیری	انجام، ص ۵، ۲ ر "
———	سالم کاشمیری — کشمیر کا ایک دردمند فارسی گو شاعر	قندیل، ص ۱۵+۱۸، ۹ ر "
———	علی مردان خاں (تاج محل کا معمار)	عالمی ڈائجسٹ، ص ۹۳ تا ۹۶، فروری
———	ابو جعفر منصور	گل خنداں، ص ۷ تا ۹، دسمبر ۶۵ جنوری ۶۶

طب

..ر، حکیم عطاء الرحمٰن	طب چین — طب مشرق	انجام، ص ۵، ۲۶ ر فروری
محمد سعید، حکیم	علم الجراحت کی ترقیاں	جنگ، ص ۱۲، ۲۶ ر "
	دواؤں کے بغیر عصبی تناؤ کا علاج	اردو ڈائجسٹ، ص ۷۰ تا ۷۲+۷۷، فروری

فلسفہ و نفسیات

رئیس امروہوی	ایک نظر	جنگ، ص ۵، ۷ ر فروری
" "	خودکار تحریر و تقریر	" " ۵، ۱۴ ر "
" "	واہمہ یا حقیقت	" " ۵، ۲۱ ر "
" "	ہمزاد شخصیت	" " ۵، ۲۸ ر "
منظور حسن جعفری، ڈاکٹر سید	روح اور حیات (فلسفہ)	انجام، ۸، ۲۸ ر "

---

[1] ۷ ر فروری ۶۶ء کو لاہور میں انتقال ہو گیا۔

[2] مشہور امریکی صحافی "آرٹ بوخوالد" سے متعلق ایک مضمون

[3] اس نمبر میں خواجہ محمد رفیق، طاؤس خاں، مہر علم دین، خواجہ محمد شفیع، ملک محمد اکبر، سردار محمد ظفر اللہ، اور سید مغیث الدین کے قلمی چہرے ہیں۔

فنون لطیفہ

پرویز، مسعود	امیر خسروؒ اور اصناف موسیقی	نقوش، ص ۲۹۲ تا ۳۰۳، جنوری
سرور نیازی، سجاد	کلاسیکل موسیقی سے	" " ۲۸۶ تا ۲۹۱، "
شاہد احمد دہلوی	ہماری کلاسیکل موسیقی	" " ۲۷۹ تا ۲۸۵، "
عابد، سید عابد علی	موسیقی اور ہماری ثقافت کی ترجمانی	" " ۲۷۳ تا ۲۷۸، "
مہر، سلطانہ	صفیہ حیدر	انجام، ص ۷، ۲۶ فروری

کتابیات وکتب خانے

ابوسلمان شاہجہانپوری	نئے خزانے (اگست ۶۵ء کے رسائل کا اشاریہ)	قومی زبان، ص ۴۳ تا ۴۷، فروری
اشرف علی	برصغیر کے معدوم کتب خانے	" " ص ۵۴ تا ۶۰، "
افسر صدیقی امروہوی	گنج ہائے گراں مایہ (مخطوطات انجمن ترقی اردو کی وضاحتی فہرست)	" " ص ۴۷ تا ۵۳، "
برنی، ضیاء الدین احمد	رسالوں پر طائرانہ نظر	کتابی دنیا، ص ۲۳ تا ۲۶، "
قاسمی، مولانا غلام مصطفیٰ	شاہ ولی اللہ کی تالیفات پر ایک نظر	الرحیم، ص ۵۸۱ تا ۵۹۳، "
ہوش ترمذی	مضامین کا تعارف	صحیفہ، ص ۸۶ تا ۱۰۷، جنوری
محمد حسن، ڈاکٹر	سالار جنگ میوزیم — دنیا کا عظیم ترین شخصی ذخیرہ	کتابی دنیا، ص ۵ تا ۹، فروری

لسانیات

آفتاب اصغر	"یہ ہیں تعارف رہ ......"	ماہ نو، ص ۳۷ تا ۳۹ + ۴۸ + ۷۷، فروری
سروری، عبدالقادر	ہندوستانی	ہندوستانی ادب، ص ۱۷ تا ۲۰، اکتوبر تا دسمبر ۶۵ء
سہیل بخاری، ڈاکٹر	اردو "تھا" کا ماخذ	اردو زبان، ص ۱۱ تا ۱۷، فروری
شوکت سبزواری	اردو کی اصل اور اس کی ابتدا	قومی زبان، ص ۱۵ تا ۲۰، "
عارف، فضل الٰہی	اپنے تلفظ کی اصلاح کیجیے	اردو ڈائجسٹ، ص ۱۵۷ تا ۱۵۸، "

مذہبیات

سیرت و سنت نبویؐ

ابو طاہر فارانی	ہمارا آقا (صلی اللہ علیہ وسلم)	لاہور، ص ۵، ۱۴ر فروری
" "	" " (" " ")	" " ۵ + ۱۰، ۲۸ر "
اصفہانی، حافظ ابوالشیخ		
مترجم :- مولوی محمد احمد	اخلاق النبی صلی اللہ علیہ وسلم	بنیات، ص ۷۲ تا ۷۹، "
ذاکر دہلوی، حافظ	خلق محمدی " "	انجام، ص ۲، ۵ر "
محمد رضی، علامہ سید	پیغمبر اسلام ـــ ایک سالار کی حیثیت سے	" " ۲، ۱۲ر "
مصطفیٰ الحسنی السباعی	مستشرقین کا تصور سنت	بنیات، ص ۷۴ تا ۷۵، "

قرآن

احتشام الحق تھانوی، مولانا	درس قرآن (الفاتحہ)	جنگ، ص ۵، ۵ر فروری
" " "	" (")	" " ۵، ۱۲ر "
" " "	" (")	" " ۵، ۲۶ر "
عبدالماجد دریابادی	سورۂ قریش (۱)	صدق جدید، ص ۲، ۲۵ر "
علی نقی النقوی، علامہ	تفسیر قرآن	پیام عمل، ص ۱۱ تا ۱۲، "
محمد شفیع، مولانا	معارف القرآن (سورہ ہود آیت ۱۱۱ تا ۱۱۴)	شباب، ص ۲، ۲ر فروری
" "	" " (سورہ ہود)	" " ۸، ۱۳ر "
مودودی، مولانا سید ابوالاعلیٰ	الفتح (۲)	ترجمان القرآن، ص ۷۱ تا ۹۲، فروری

مسائل و مباحث

ابو سلمان شاہجہانپوری	ذو القرنینؑ	عارف، ص ۱۹ تا ۲۴، فروری

ابوسلمان شاہجہانپوری	الدفاع فی الاسلام	چٹان، ص ۷ تا ۸ + ۱۶، ۱۴ فروری
"	" " (۲)[1]	" " ۵ تا ۱۷، ۲۸ "
انور، مولانا عبیداللہ	حق تعالیٰ کی رضا . . .	خدام الدین، ص ۵ تا ۶، ۴ "
" "	اسلام میں حلال و طیب غذا کی اہمیت	" " ۵ + ۱۹، ۱۱ "
برق، ڈاکٹر غلام جیلانی	مذہب سے ہمارے نوجوانوں کی بے رخی	نقوش، ص ۱۶۸ تا ۱۷۵، جنوری
جعفری، رئیس احمد	منصور حلاج کا اسلامی تصوف پر اثر	انجام، ص ۲، ۵ فروری
رشدی، محمد حبیب اللہ	عیسائی اور اسلامی اخلاقیات کا تقابل	" ۲، ۱۲ "
ذکریا بنوری، مولانا سید محمد	روح کا حدوث و قدم	بنیات، ص ۳ تا ۴، "
طاسین، مولانا محمد	وطن دوستی اور اسلام	" " ۳۰ تا ۳۵، "
عبدالحمید صدیقی	مذہب اور تجدید مذہب	ترجمان القرآن، ص ۴ تا ۵۷، فروری
عبداللہ، پروفیسر محمد	اسلام اور قومی دفاع	ماہ نو، ص ۵۰ تا ۵۲، فروری
قریشی، حکیم محمد حسن	اسلام ایک عظیم موثر اور کارفرما قوت ہے	المنبر، ص ۷، ۱۸ فروری
محمد اسلم، قاضی	اسلام اور دنیا کے دیگر مذاہب	لاہور، ص ۱۰ تا ۱۳، ۱۴ "
محمود الحق	شیخ محمد عبدہ کی اصلاحی تحریک	الرحیم، ص ۶۰۹ تا ۶۱۶، "
ملا واحدی	اسلامی آزادی	فاران، ص ۱۰ تا ۱۲، "
مودودی، مولانا سید ابوالاعلیٰ	امام ابویوسف اور ان کا کام	ترجمان القرآن، ص ۳۰ تا ۵۴، فروری
نجیب، حمید اصغر	چاند بھی مسخر ہو گیا ـــــ اہل اسلام کے دعوت فکر	چٹان، ص ۹، ۱۴ فروری
نذیر احمد کاشمیری، صوفی	وشو ہندو دھرم سمیلن (۱)	صدق جدید، ص ۷، ۲۵ "
ـــــــــ	افادات شاہ عبدالرحیم (ترجمہ از فارسی)	الرحیم، ص ۵۹۳ تا ۶۰۸، "
ـــــــــ	انڈونیشیا میں قرأت کا فن ـــــ تاریخ کی روشنی میں	انجام، ص ۲، ۱۲ فروری
معصومی، ڈاکٹر صغیر حسن	مسئلہ سود[2]	فاران، ص ۳ تا ۲۲، "

---

[1] مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی مشہور تصنیف "مسئلہ خلافت" سے ماخوذ۔ [2] منقول از فکر و نظر کراچی

محمد شفیع، مولانا مفتی	رویت ہلال کے جدید انتظامات[۱]	شہاب، ص ۱۰ تا ۱۱، ۲۷/فروری
محمد نقی، سید	مشرق کے مذاہب اور مغرب کا فلسفہ[۲]	جنگ، ص ۵، ۱۲/فروری

معرکۂ جنگ و جہاد اور افواج پاک

احمد، این ڈی	فرنٹیر کور	جنگ، ص ۱۳، ۱۳/فروری
اختر ہاشمی	صف شکنوں کو سلام	انجام، ص ۹، ۱۴/ "
اسلم، ایم	کیم کرن اور بڈیارہ	ساقی، ص ۷۳ تا ۸۰، جنوری فروری
اقبال، سردار محمد	وطن سے دور	اردو ڈائجسٹ، ص ۹۷ تا ۱۰۲، "
امداد نظامی	ہماری افواج ہماری فوجی عظمت	انجام، ص ۲ تا ۱۴/فروری
پروین سرور	دشت وفا	ساقی، ص ۳۰ تا ۹۳، جنوری فروری
چراغ، ذکاءالدین	قیامت کے چودہ دن	اردو ڈائجسٹ، ص ۴۷ تا ۵۹، "
خدابخش بچہ، ملک	سیالکوٹ کی زندہ و پاینده سرزمین	شہاب، ص ۸، ۶/فروری
سرور خاں، خان غلام	شہریوں کی تنظیم — دفاع پاکستان کی دوسری لائن	جنگ، ص ۵، ۱۴/فروری
سلہری، کرنل زیڈ اے	اسلام کا سپاہی	انجام، ص ۵، ۱۴/ "
" " "	" "	حریت، ص ۹، ۱۴/ "
" " "	" "	جنگ، ص ۱۵، ۱۲/ "
شاہد احمد دہلوی	جاگ اٹھا ہے پاکستان	ساقی، ص ۵۰ تا ۷۱، جنوری فروری
شفیع عقیل	ہماری منزل — غازی یا شہید	جنگ، ص ۲، ۱۷/فروری
" "	غازی یا شہید	" " ۷، ۱۳/ "
" "	ہماری منزل — غازی یا شہید	" " ۷، ۱۴/ "
" "	" " "	" " ۴، ۲۱/ "

۱۔ وزیر داخلہ کے نام مفتی صاحب کا ایک خط

۲۔ ہندو مذہب پر ڈاکٹر رادھا کرشنن کی "مشرقی مذاہب اور مغربی فلسفہ" نامی کتاب پر تبصرہ

شفیع عقیل	ہماری منزل — غازی یا شہید	جنگ، ص ۲، ۲۶ فروری
" "	" " (آخری قسط)	" " ۶، ۲۸ "
صدیقی، اے آر	جنگ لاہور	" " ۱۵، ۱۴ "
عنایت اللہ	عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے....	طلوع اسلام، ص ۱۳تا ۴۸، فروری
فرید اللہ شاہ	ملکی وسائل کی ترقی	جنگ، ص ۵، ۱۴ فروری
مسعود احمد	پاک فوج	" " ۲، ۱۴ "
" "	دنیا کی بہترین فوج	حریت، ص ۷تا ۷، ۱۴ "
نیرنگ نیازی	پاکستانی افواج اور شعراء	انجام، ص ۴، ۱۴ "
———	پاک بحریہ	حریت، ص ۴، ۱۴ "
———	پاک فضائیہ	" " ۳، ۱۴ "

مکاتیب

امین الحسینی	ٹیپو سلطان کا ایک اہم خط	ہندوستانی ادب، ص ۹۸ تا ۱۰۹، اکتوبر تا دسمبر ۶۵
رشید حسن خاں	امیر مینائی کے ادبی خطوط	صحیفہ، ص ۴۸تا ۵۵، جنوری
جلیل قدوائی	انشائے ہاشمی فرید آبادی	قومی زبان، ص ۱۷تا ۲۸، فروری

وفیات

برنی ضیاء الدین احمد	قاری عباس حسین	کتابی دنیا، ص ۳، فروری
خلیل حامدی	مرحوم احمد بیلو کی شہادت	ترجمان القرآن، ص ۵۸تا ۶۴، فروری

مطبوعات جدیدہ (نئی کتابوں اور رسالوں پر تبصرے)

نام	مصنف	تبصرہ نگار	حوالہ
آزادی	جان اسٹورٹ مل		
	مترجم: سعید انصاری، مقدمہ محمد مجیب	محمد احسن	کتابی دنیا، ص ۱۳تا ۲۲، فروری

نام	مصنف	تبصرہ نگار	حوالہ
آفتاب ہجویر	پیام شاہجہانپوری		فاران، ص ۵۳ تا ۵۴، فروری
احمد ندیم قاسمی کے بہترین افسانے	مرتب:۔ مظفر علی سید	وحید قریشی	اردو ڈائجسٹ، ص ۱۴۰، 〃
ادب کی آڑ میں	رشید احمد	فضل من اللہ	سیارہ، ص ۸۴، 〃
〃 〃	〃 〃	ا۔ ا	چراغ راہ، ص ۵۶، 〃
اردو، سہ ماہی		شبیر حسین قریشی	انجام، ص ۵، ۲۱ر 〃
آسان بنگلہ تعلیم	سید وحید قیصر ندوی	فضل من اللہ	سیارہ، ص ۸۶، فروری
اقبال ریویو	مدیر:۔ بشیر احمد ڈار	تحسین سروری	انجام، ص ۵، ۷ر 〃
امام ابن ماجہ اور علم حدیث	محمد عبد الرشید	محمد منور	صحیفہ، ص ۸۳ تا ۸۴، جنوری
انوار الباری قسط نمبر ۶ و ۷	مولانا سید احمد رضا بجنوری	—	صدق جدید، ص ۴، ۱۸ فروری
اوراق لاہور	مدیران: وزیر آغا، عارف عبد المتین	عاشق جعفری	اردو زبان، ص ۵۰+۵۲، 〃
〃 〃	〃 〃 〃		لاہور، ص ۱۳، ۲۱ر 〃
بزم خیال (مجموعہ کلام)	تاج محمد خیال	رئیس احمد جعفری	صحیفہ، ص ۸۰ تا ۸۲، جنوری
بہار آرزو (〃 〃)	نذیر حسین نسیم چغتائی	〃 〃	〃 〃 ۷۹ تا ۸۰، 〃
بینا نابینا	ہیلن المیراویٹ مترجم:۔ سید ابو الخیر کشفی	محمد احسن	کتابی دنیا، ص ۲۰ تا ۲۱، فروری
پروگیسو پریکٹیکل طبیعات	ایم شفیع الدین دہلوی	م۔ع۔ر	انجام، ص ۵، ۲۱ر 〃
تذکرۃ المفسرین	قاضی محمد۔ زاہد الحسینی	محمد سرور	الرحیم، ص ۶۵۹ تا ۶۶۲، 〃
تعارف مدنیت	محمد امین جاوید	فضل من اللہ	سیارہ، ص ۸۵، 〃
تعلیم کا مسئلہ	ظہور احمد، مختار احمد اور عارف الحق	فضل من اللہ	سیارہ، ص ۸۶، فروری
تفسیر معارف القرآن	مولانا محمد ادریس کاندھلوی	—	شہاب، ص ۱۶، ۲۷ر 〃
تنقیدی نقوش	عبد القیوم	—	فاران، ص ۵۷ تا ۵۸، 〃
جامعہ کی کہانی	عبد الغفار مدہولی	—	〃 〃 ۵۱ تا ۵۳، 〃

نام	مصنف	تبصرہ نگار	حوالہ
جب ملت بیدار ہوتی ہے	اسعد گیلانی	ل۔ ل	چراغ راہ، ص ۵۵، فروری
جلیس (ماہنامہ) مہاراشٹر	ایڈیٹر:۔ حبیب الرحمٰن	—	صدق جدید، ص ۵، ۲۵ ″
جہاد	مفتی محمد شفیع	—	شہاب، ص ۱۵، ۲۷ ″
جہاد قلم (نظموں کا مجموعہ)	غافل کرنالی	—	″ ″ ۱۵تا۱۶، ۲۷ ″
چپکے سے (افسانوں کا مجموعہ)	لطیف فاروقی	ح۔ ا۔ ن	چٹان، ص ۱۸، ۶ ″
حقیقت المسیح	سید عبدالقیوم	—	طلوع اسلام، ص ۶۷تا۷۳، ″
دیوان عشق اورنگ آبادی	مرتب:۔ محمد اکبر الدین صدیقی	—	فاران، ص ۶۰تا۶۱، ″
رباعیات غریب	حاجی محمد خاں غریب	ح۔ ا۔ ن	چٹان، ص ۱۸، ۶ ″
رسالہ تہلیلہ	شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی مترجم:۔ رشید احمد ارشد	ل۔ ل	چراغ راہ، ص ۵۶، فروری
روح اسلام اقبال کی نظر میں	ڈاکٹر غلام عمر خاں	—	فاران، ص ۴۴تا۴۵، ″
سدا بہار	خادم کیتھلی	—	چٹان، ص ۱۸، ۶ ″
سرور دو عالم کا پیغام آخریں	محمد صادق سیالکوٹی	—	فاران، ص ۵۸تا۵۹، ″
سفر	جسٹس ایس اے رحمٰن	—	طلوع اسلام، ص ۷۴تا۷۵، فروری
سوز دروں (مجموعہ کلام)	سلیمان آصف	—	فاران، ص ۵۹تا۶۰، ″
سیرت الاخوین (حضرت عثمانؓ و حضرت علی رضی اللہ عنہ)	خالد گھرجاکھی	—	شہاب، ص ۱۶، ۲۷ فروری
صنم اندر صنم	پرل ایس بک مترجم:۔ ایس اے علوی	محمد احسن	کتابی دنیا، ص ۲۰، فروری
ضرب قلم	سہیل اقبال	م۔ ع۔ ر	انجام، ص ۵، ۲۱ ″
ضیاء القرآن (جلد اول)	محمد اکرم شاہ	ا۔ ح۔ ق	اردو ڈائجسٹ، ص ۱۵۹، ″
فیض نمبر (افکار کراچی)	مرتب:۔ صہبا لکھنوی	محمد منور	صحیفہ، ص ۸۴تا۸۵، جنوری
کان پارسی	مولانا سید ابوذر بخاری	—	النبر، ص ۱۱، ۱۱ فروری

نام	مصنف	تبصرہ نگار	حوالہ
کائنات (مجموعہ کلام)	شریف اشرف	—	چٹان، ص ۱۹، ۲۸ ر فروری
کتاب الروح	امام ابن قیم		
	مترجم: مولانا راغب رحمانی	—	شہاب، ص ۱۵، ۲۷ ر "
کچکول نامہ	ابوالحسن واہری نقشبندی	—	طلوع اسلام، ص ۷۰ تا ۷۱، "
" "	"	—	فاران، ص ۵۱، "
کشت زار غزل	عزیز حاصل پوری		" " ۵۵ تا ۵۷، "
کشمیر ہمارا ہے	غلام احمد کشفی	ا۔ ح۔ ق	اردو ڈائجسٹ، ص ۱۹۰، "
کلام سودا	مرتب: ڈاکٹر خورشید الاسلام	رئیس احمد جعفری	صحیفہ، ص ۷۸ تا ۸۲، جنوری
کلیات غالب	—	وحید قریشی	اردو ڈائجسٹ، ص ۱۵۹، فروری
ملی ترانے	مرتب مسافر جالندھری	ن۔ ش	انجام، ص ۵، ۷ ر فروری
موضح القرأت فی السبع المتواترات	قادری محمد حبیب اللہ خاں	محمد سرور	الرحیم، ص ۶۶ تا ۶۹، "
میکالے کا نظریہ تعلیم	مترجم: عبدالحمید صدیقی	ل۔ ل	چراغ راہ، ص ۵۵ تا ۵۶، "
نشان راہ (مضامین)	حافظ مظہرالدین	فضل من اللہ	سیارہ، ص ۳۸، فروری
ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں	ڈاکٹر سید عابد حسین	—	فاران، ص ۴۶ تا ۵۰، فروری

انجمن کی مطبوعات

کتاب	قیمت
تاریخ پنجاہ سالہ انجمن ترقی اردو - ہاشمی فریدآبادی	۳—۵۰ روپے
ئس کیپٹال (جلد اول)، مارکس مترجم سید محمد تقی	۷—۵۰ "
جنوبی یورپ پر عربوں کے حملے - امیر شکیب ارسلان - مترجم نجم الدین شکیب	۴—۵۰ "
فرہنگ اصطلاحات بینکاری	۴—۵۰ "
" " فلکیات	۱—۵۰ "
" " کیمیا	۲—۲۵ "
" " جغرافیہ	۱—۰۰ "
ردو زبان میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ - بابائے اردو	۰—۵۰ "
ردو بحیثیت ذریعہ تعلیم سائنس - بابائے اردو	۱—۰۰ "
ضافیت - ڈاکٹر رضی الدین صدیقی	۳—۰۰ "
طبیعیات کی داستان - پروفیسر نصیر احمد عثمانی	۸—۷۵ "
وائے طبیعیہ - ڈاکٹر صادق حسین	۲—۲۵ "
جدید معلومات سائنس - میجر آفتاب حسن	۷—۵۰ "
جراثیمیات - محمد احمد حامی	۲—۰۰ "
حیوانیات - پروفیسر محشر عابدی	۲—۲۵ "
باتی دباغت - سید امداد علی	۵—۲۵ "
سیر افلاک - مرزا محمد رشید	۳—۵۰ "
ماہ و انجم - مارٹن ڈیوڈسن - مترجم ثناء الحق صدیقی	۴—۵۰ "
جیتا جاگتا - ابن طفیل - مترجم ڈاکٹر محمد یوسف	۳—۵۰ "
لسفۂ نفس - ضامن نقوی	۳—۰۰ "
ر جواہر - حضرت عبداللہ بن ابوبکر العیدروس	۰—۷۵ "
ردو کی فضیلت - بنگالی اہل نظر کے خیالات کا مجموعہ	۱—۰۰ "
تقویم سنہ ہجری و عیسوی	۱—۵۰ "
ردو کا قاعدہ	۰—۲۵ "

انجمن ترقی اردو۔ بابائے اردو روڈ کراچی

انجمن کا علمی و ادبی جریدہ

جنوری ۱۹۶۶ء سے شائع ہو رہا ہے۔ اب تک دور نو کے تین شمارے شائع ہو چکے ہیں جن میں ہند و پاکستان کے ممتاز اہل قلم کی نگارشات شامل ہیں۔

جولائی ۱۹۶۶ء کے شمارے کی ایک جھلک

- سرسید کا ایک غیر مطبوعہ مکتوب بنام نواب وقار الملک
- خطاطی کے چند نادر نمونے - یاقوت مستعصمی - آغا میرزا اور دیگر باکمال خطاطوں کے آٹھ نمونے، اصل رنگوں میں، مع حالات خطاطاں
- حیدری کا تذکرہ گلشن ہند - ڈاکٹر اقتدا حسن
- لغت کبیر اردو (دوسری قسط) بابائے اردو
- اشاریۂ اردو (دوسری قسط)
- مولانا حامد حسن قادری اور مولوی نصیر الدین ہاشمی کے غیر مطبوعہ مضامین

قیمت فی پرچہ تین روپے پچاس پیسے
قیمت سالانہ بارہ روپے

پتے کی بات
منافع میں اضافہ

کھاتے کی قسم	موجودہ شرح	پرانی شرح
معمولی	۴ نیصد	۳½ نیصد
ایک سال کی مقررہ مدت کیلئے	۴½ نیصد	۴ نیصد
دو سال کی مقررہ مدت کیلئے	۵ نیصد	۴½ نیصد
تین سال کی مقررہ مدت کیلئے	۵½ نیصد	۵ نیصد

جمع کی حد میں اضافہ
اب
پہلے
انفرادی
مشترک
انفرادی
مشترک
معمولی کھاتے
مقررہ مدت کے کھاتے
پوسٹ آفس سیونگ بینک میں جمع کی جانے والی تمام رقموں پر
نہ صرف منافع کی شرح میں یکم جولائی ۱۹۶۶ء سے اضافہ
ہوگیا ہے۔ بلکہ تمام کھاتوں میں جمع کی جاسکنے والی رقموں
کی زیادہ سے زیادہ حد بھی دگنی کردی گئی ہے۔
پوسٹ آفس
سیونگ بینک
اپنے گھر بار کیلئے
بچت کیجئے
اپنے وطن کیلئے
D.F.P. 112/66
MAKFA

اب دس روپے والے انعامی بونڈ کی قرعہ اندازی (۵ روپے والے بونڈ کی طرح) ہر دوسرے مہینے ہوا کرے گی۔ سال بھر میں ہر سلسلے کے ہر بونڈ پر شاندار انعامات حاصل کرنے کے ۶۶۶ مواقع ہوتے ہیں۔ اور پھر لطف یہ کہ آپ ایک ہی بونڈ پر بار بار انعام حاصل کر سکتے ہیں۔

۱۵ اکتوبر کی قرعہ اندازی میں شریک ہونے کیلئے دس روپے والے انعامی بونڈ ۱۵ ستمبر سے پہلے خرید لیجئے۔

دس روپے والے بونڈ کے ہر سلسلہ پر انعامات

تعداد	رقم
۱	۲۰،۰۰۰ روپے
۱	۵،۰۰۰ "
۲	۲،۰۰۰ " فی انعام
۳	۱،۰۰۰ " "
۴	۵۰۰ " "
۱۰	۲۰۰ " "
۹۰	۱۰۰ " "

۱۵ اکتوبر کی قرعہ اندازی میں تقریباً ۳۶ سلسلے شامل ہوں گے۔ ۳۹۹۶ انعامات آپ کے منتظر ہیں!

انعامی بونڈ
وطن کی ترقی اور حفاظت کے لئے

اپنے گھربار کے لئے بچت کیجئے اپنے وطن کے لئے

تمام منظور شدہ بینکوں اور ڈاکخانوں سے ملتے ہیں۔

D.F.P./ ORIENT

انجمن ترقی اردوئے پاکستان کا ماہوار ترجمان

قومی زبان

جلد ۲۹ شمارہ ۴

اکتوبر ۱۹۶۶ء

سالانہ قیمت دس روپے

فی پرچہ ایک روپیہ

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ
کراچی

فہرست مضامین

زیرِ تعمیر اردو کالج کے لئے عطیات

۱۶ اگست ۱۹۶۶ء کو بابائے اردو مرحوم کی پانچویں برسی کے موقع پر صدر انجمن جناب اختر حسین (ہلالِ پاکستان) نے زیرِ تعمیر اردو کالج کے لئے مالی امداد کی جو اپیل عوام سے کی تھی، اس پر اردو دوستوں نے لبیک کہا ہے اور یہ خوشی کی بات ہے کہ اب تک مبلغ گیارہ ہزار آٹھ سو تراسی روپے جمع ہو چکے ہیں - رقم کی فراہمی کے لئے انجمن نے ایک روپے اور پانچ روپے کی خوبصورت رسیدیں چھپوائی ہیں تاکہ اس کارِ خیر میں زیادہ سے زیادہ لوگ حصہ لے سکیں جناب صدر نے اپنی ذاتی نگرانی میں یہ رسیدیں مختلف حضرات میں تقسیم کر دی ہیں جو ان کی فروخت کے ذمے دار ہیں جوں جوں رسیدیں فروخت ہوتی جا رہی ہیں، ان سے حاصل شدہ رقم اردو کالج کے تعمیری فنڈ میں جمع کی جا رہی ہے رسیدوں کی فروخت کے علاوہ بھی رقم وصول ہو رہی ہے - اب تک جن حضرات کے عطیات وصول ہو چکے ہیں ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں -

جناب عبدالمنعم خاں صاحب - گورنر مشرقی پاکستان	ایک ہزار روپے
جناب چودھری علی اکبر صاحب - وزیر داخلہ و امور کشمیر - حکومت پاکستان	پانچ سو روپے
جناب این - ایم عقیلی صاحب وزیر مالیات حکومت پاکستان	پانچ سو روپے
علی آٹو موبائیلز	دو ہزار روپے
جناب اشرف ریاض صاحب - کراچی	دو سو روپے
جناب جی معین الدین صاحب - چیف الیکشن کمشنر - راولپنڈی	پچاس روپے

بذریعہ رسائد مندرجہ ذیل حضرات کے عطیات موصول ہوئے ہیں -

پرنسپل و اساتذہ اردو کالج	دو ہزار ایک سو روپے
پروفیسر خلیل اللہ صاحب - اردو کالج کراچی	پانچ سو روپے
ڈاکٹر فیروز عباسی صاحب - کراچی	ایک ہزار چار سو اکیاون روپے
یعقوب پٹیل صاحب - کراچی	سات سو روپے
جناب حامد حسین صاحب - کراچی	دو سو انہتر روپے
جناب محمد بھائی صاحب - صدر آغا خاں کونسل ڈھاکہ -	دو سو پانچ روپے
خان بہادر رشید احمد خاں صاحب -	ایک ہزار روپے
بیگم رضیہ غلام علی صاحبہ - کراچی	دو سو روپے
جناب زاہد حسین صاحب -	پینتالیس روپے

بقیہ تفصیلات آئندہ شمارے میں شائع کی جائیں گی -

اردو کے سپاہی

ڈاکٹر سید عبداللہ

جسٹس ایس، اے رحمان

اختر شیرانی کا رسالہ "خیالستان" جب شائع ہوا تو اس میں منجملہ دوسرے ارباب قلم کے ایک نام خاص طور سے جاذب توجہ ہوا "ایس، اے، رحمان، سیشن جج"۔ اس شاعر کی غزل یا نظم اس رسالے میں اکثر نظر سے گزرتی تھی اور تعجب ہوتا تھا کہ منصب دار ہوکر یہ دلجمعی اور فکر شعر و سخن کی یہ فرصت؟۔ اس ذوق و شوق اور غیر معمولی استعداد کی وجہ سے رحمان صاحب کے لئے میرے دل میں جگہ پیدا ہوگئی۔

جب تک "خیالستان" جاری رہا اس میں ایس، اے، رحمان صاحب سیشن جج کی غزل یا نظم چھپتی اور میری نظر سے گزرتی رہی، اور ان کے متعلق میری دلچسپی کہ بربنائے شعر و سخن میرے دل میں پیدا ہوئی تھی، روز بروز بڑھتی گئی۔ مگر یہ تعلق ان کی ذات سے نہ تھا، ان کی صفات سے تھا کیونکہ میں نے صرف اس وقت شاعر کو اس کے شعر کے صفاتی آئینے میں دیکھا تھا۔ اُسے روبرو دیکھنے کا موقع کم و بیش دس برس کے بعد ملا، اور اس مرتبہ بھی بہت دور سے۔ پنجاب یونیورسٹی کے انتخابات کے دوران میں کسی نے کہا کہ جسٹس رحمان صاحب کا بھی ووٹ حاصل کرنا چاہیئے، تب معلوم ہوا کہ "خیالستان" والے رحمان صاحب لاہور میں منتقل ہو آئے ہیں۔ یونیورسٹی کے سینٹ روم میں سامنے کے بنچوں پر انھیں دیکھ کر، سابقہ غائبانہ دلچسپی کی بنا پر ان کا وجود خاصا مانوس محسوس ہوا، مگر میں اپنی عادت کے مطابق ملا تب بھی نہیں، اگرچہ انھیں یونیورسٹی کے حلقۂ انتظام میں شریک دیکھ کر، ایک مبہم اور بے جہت سی خوشی ضرور ہوئی۔ تا آنکہ وائس چانسلر ڈاکٹر عمر حیات ملک نے یونیورسٹی میں انجمن اردو کی بنیاد رکھی اور مجھے مشورہ دیا کہ صدارت کے لئے ایس، اے، رحمان سے درخواست کی جائے۔ اس سلسلے میں میری ان کی پہلی ملاقات ہوئی اور تعلقات بڑھتے گئے، تا آنکہ رفتہ رفتہ اُنس و لحاظ نے ارادت و عقیدت کی صورت اختیار کرلی جو بحمداللہ آج تک قائم ہے۔

شخصیت نگاری محض فن نہیں اس کے لئے استحقاق کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ حق ذاتی واقفیت اور مسلسل تعلقات و روابط سے حاصل ہوتا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس اصول کے تحت مجھے کوئی حق حاصل ہوا یا نہیں۔ تاہم یہ تو بالکل ممکن ہے کہ میں صرف اپنی نظر کے تاثرات بیان کردوں، اور اس طرح شخصیت کی ایسی نشان دہی ہو جائے جس کی اجازت میری حدِ نظر

نے سمجھ دی ہے۔ ہر چند کہ اس میں یہ ترغیبِ نفس بھی موجود ہے کہ چلو اور کچھ نہیں تو اس پردے میں اپنی کہانی کے بھی ایک دو باب بیان ہو جائیں گے۔ ؎

کسی قصے کے ساتھ اے داستاں گو
سُنا دے اُن کو میری بھی کہانی

اس شخصیے میں رحمان صاحب کے حالاتِ زندگی کی کوئی گنجائش نہیں، مَیں صرف ان تاثرات کو قلم بند کرونگا، جن سے رحمان صاحب کی تصویر اُبھرتی ہے۔ اس تصویر کے رنگ مَیں نے اپنے مشاہدات سے حاصل کئے ہیں۔

مجھے رحمان صاحب کی اس خصوصیت نے اکثر متاثر کیا کہ وہ ہمیشہ تازہ دم نظر آئے۔ جس زمانے میں وہ ہائی کورٹ کے جج تھے اور اس کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور متعدد جامعات کے کسٹوڈین بھی تھے، اُن کی مصروفیات قدرتی طور پر بہت زیادہ تھیں مگر اس زمانے میں بھی وہ علمی و ادبی جلسوں کی سرپرستی کرتے رہے۔ اور جب بھی اور جہاں کہیں بھی ہوتے، کھلے ہوتے معلوم ہوتے پروقار تبسم اُن کے لبوں پر اور اس سے زیادہ ان کی آنکھوں میں کھیلتا نظر آتا۔ دل کی کشادگی ان کے چہرے سے ظاہر ہوتی اور اُن کا ماتھا جو یوں بھی شکن سے فارغ البال ہے، اس طرح کھلا کھلا نظر آتا جیسے وہ ابھی ابھی ٹینس کھیل کر آئے ہوں۔ دن بھر کی ساری کوفت غائب۔ زندگی کا ہر لمحہ جس طرح تازہ تازہ نظر آتا ہے وہ بھی تازہ تازہ نظر آتے اور مجلس کو اپنی موجودگی سے تازہ دم بنا دیتے۔

میں اخلاق کی اس جوانی اور کردار کی اس سدا بہار گل فشانی پر اکثر تعجب کرتا اور دل میں سوچتا کہ باغوں میں پھول کھلتے ہیں تو گلوں کی یہ رعنائی بے سبب نہیں ہوتی۔ گلبن کی اپنی سرشت، مٹی کی تاثیر، باغبان کی پرورش اور آب و ہوا کے اثرات۔ یہ سب اسباب در پردہ پھول کے پودے کو ہرا رکھ کر گلوں کے چہرے کو آب و تاب بخشتے رہتے ہیں، انسانی شخصیتوں کا حال بھی ایسا ہی ہے۔

رحمان صاحب کی ہر دم جوانی و شگفتگی کا راز ان کی داخلی زندگی کی بعض ریاضتوں میں مضمر ہے۔ یہ ریاضت اس زمانے میں شروع ہوئی جب وہ ایک عام طالب علم تھے اپنے دوسرے بھائی کے ہمراہ (وزیرآباد کے اسکول میں) پڑھتے تھے۔ اس زمانے میں انھوں نے زندگی کے نشیب و فراز کا پہلا تصور لیا اور محسوس کیا کہ زندگی کا مزہ ہر اُس آدمی کے لئے تلخ ہوتا جو اس تلخابے کو شیریں بنانے کی ہمت اور صلاحیت نہیں رکھتا۔ حساس اور ہونہار طالب علم چمک اُٹھا بجلی کا لیمپ میسر نہ تھا مگر مٹی کا تیل بھی تو روشنی دے سکتا ہے۔ شیخ عبدالرحیم اور شیخ عبدالرحمان (جڑواں بھائی) تیل کی روشنی میں دماغ کو روشن کرتے اور اندھیروں میں چراغ روشن کرنے کے ارادے سے، تاریکیوں سے بے نیاز ہو کر علم کے جگنو چنتے رہتے۔

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
سیلیِ دہر کم از لطمۂ استاد نہیں ؎

رحمان صاحب کے والد اپنے شہر کے خوبصورت لوگوں میں شمار ہوتے تھے، اُن کی وجاہت میں ایک چمک تھی۔ آسودہ اور مطمئن چاندنی کی چمک جس سے ماحول کے قلب سیراب ہو جاتے۔ شیخ صاحب کی والدہ شفیق اور مہربان تھیں، اور ہر ماں شفیق اور مہربان ہوتی ہے۔ لیکن بہت سی ماؤں کی تقدیر یہ ہوتی ہے کہ انھیں اپنے بچوں کی تربیت تنہا کرنی پڑتی ہے۔ رحمان صاحب کے والد کا جلد انتقال ہو گیا اور ان دونوں بھائیوں کی ساری ذمے داری شفیق ماں کے کندھوں پر آپڑی۔ صلاحیت ادھر موجود اور ماں کی شفقت ادھر حاضر۔ اندھیرے میں شمع روشن ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ اندھیرے اتھاہ ہوں تب بھی جگنو نور بکھیرتے رہتے ہیں۔ یہ انسانی قابلیت کا معجزہ ہے کہ وہ اندھیرے کو اُجالا بنا سکتا ہے۔ کبھی علم کا دیا جلا کر، کبھی جذبے کے چقماق روشن کر کے۔ اندھیرے کو نور اور نور کو حرارت بنا لینے سے زندگی کی ہر خوش دلی اور دل کی ہر مسرت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس مسرت سے ہمدردی طبیعت کے شگوفے اور ہمواری طبیعت سے اُمید دائمی کے پھول کھل جاتے ہیں۔ ؎

قطعِ اُمید کردہ نہ بیند نعیم دھر
شاخِ بُریدہ را نظرے بر بہار نیست

بیگم رحمان نے مجھے بتلایا کہ شیخ صاحب ہر حال میں مطمئن رہتے ہیں۔ فرائضِ زندگی کو اس طرح انجام دیتے ہیں، گویا یہ بھی تفریح ہے۔ اور مکروہات میں اس طرح پرسکون کہ جو کچھ ہو رہا ہے، ہوا کرتا ہے اور ہوتا رہے گا، گھبرانا کیا۔ عبادت سے دل کو شاداب رکھتے ہیں۔ صبح اور عشا کی نمازوں کی خاص پابندی کرتے ہیں۔ جو نماز قضا ہو جاتی ہے اس کا افسوس رہتا ہے۔ بیگم صاحبہ نے فرمایا، شیخ صاحب کا ذاتی خرچ بہت کم ہے، سادہ زندگی ان کا شعار ہے۔ تکلفات کے ہر رنگ سے الگ۔ نمود و نمائش کی ہر بات سے دُور۔ رنج و راحت دونوں میں شاکر۔ بلکہ خوش۔ جس شخص نے اپنے شب و روز کو ایسے روحانی فلسفے میں ڈھال رکھا ہو اُس کی ہر حال میں شگفتگی اور تازگی پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔ بیگم صاحبہ کے ارشاد سے پہلے بھی میرا یہ خیال تھا کہ ہو نہ ہو رحمان صاحب کسی لگن میں مگن آدمی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ لگن خدائی رابطے کی ہے، جس سے دلوں کا سیراب ہونا اور عادات کا شاداب رہنا لازمی ہے۔

خدائی رابطے سے شاعری کا خیال آیا۔ بعض لوگ شاعری اور خدا پرستی کے مابین ایسے فاصلے تجویز کرتے ہیں جنھیں ملاپ کبھی ممکن ہی نہیں۔ لیکن کیا سچ مچ شاعری اور خدا پرستی کے درمیان کوئی ناقابلِ عبور خلیج حائل ہے۔ میرا اپنا احساس یہ کہتا ہے کہ شاعری اور خدا پرستی دونوں کا سرچشمہ ایک ہے۔ یہ دونوں قلب کی ایک کیفیت سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور سچی شاعری سچی خدا پرستی کے ساتھ لازم ہے۔ جس طرح سچے مذہب اور سچی فن پرستی کا باہمی چولی دامن کا ساتھ ہے اسی طرح خدا کی لگن اور جذبے کی لگن باہم شناسا جذبے ہیں۔ آسمانی دوست کی بے نام اور بے معلوم محبت کے اندر سے وہ تشنگی پیدا ہوتی ہے جو محسوس محبت کے جذبے کو ابھارتی ہے۔ اسی تشنگی سے دراصل وہ تمام تقاضے نمودار ہوتے ہیں جو کر

انسان کو دل کی دُنیا سے باخبر اور اپنے علاوہ دوسروں کے وجود کو نہ صرف تسلیم کراتی ہیں بلکہ دوسروں کے لئے قربانی کا،
جذبہ پیدا کرتی ہیں۔ رحمان صاحب دوسروں کے لئے کیا کچھ کرتے ہیں، یہ تو وہی شخص جان سکتا ہے جس نے دوسروں کے
لئے اپنے عیش و آرام کو کبھی قربان کیا ہو۔ ایک فارغ البال آدمی، کھاتا پیتا، راحت کے جملہ سامان میسّر—— اسے کیا ضرورت
ہے کہ کبھی علوم مشرقی کے لئے بیقرار، کبھی اُردو کی ترقی کے لئے کوشاں، کبھی اسلامی علوم اور اسلامی نظریۂ حیات کے لئے
سرگرم عمل، کبھی فروغ فنکار کا آرزومند کبھی ادبیات ملکی کے لئے فکرمند اور اس کی ترقی کا خواہاں، کبھی تعلیمات کے صحیح
تصور کو اُبھارنے کے لئے سرگرداں، کبھی مذاکروں اور صدارتوں کے لئے اسی وجہ سے وقت نکالنا کہ یہ محفلیں کسی سر
سرپرستی کے بغیر مر نہ جائیں—— علم و عرفان کے لئے یہ ایثار، ادب و فن کے لئے یہ قربانی محبّت کے جذبے کے بغیر
بغیر ممکن ہی نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ بے غرض محبت سچی خدا پرستی کے بغیر پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ مگر رحمان صاحب کے
پاس محبت، شاعری اور خدا پرستی کے علاوہ توازن بھی ہے۔ یعنی عمل اور جذبوں کے درمیان ایک توازن انھوں نے
قائم کر رکھا ہے۔

رحمان صاحب سوتے کس وقت ہیں؟ مَیں نے بیگم صاحبہ سے پوچھا۔ رحمان صاحب خود بول اُٹھے، مَیں
اپنے کام کی طرح اپنی نیند کے ساتھ بھی پورا انصاف کرتا ہوں، رات کو عموماً دس ساڑھے دس بجے کے قریب
سو جاتا ہوں اور صبح ساڑھے پانچ، پانچ بجے اٹھ بیٹھتا ہوں۔

کیا بچوں کے ساتھ بات چیت کے لئے بھی کوئی وقت نکال سکتے ہیں؟ بیگم صاحبہ نے جواب دیا۔ اکثر
کھانے کے اوقات میں جج صاحب کھانے کی میز پر جمع ہونے کو دل سے پسند کرتے ہیں۔ اور جہاں تک ممکن ہو
ایسی راحت کو حاصل کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ جہاں بھی ہوں حتی الامکان کھانے کے وقت گھر پہنچنے کا خاص
اہتمام کرتے ہیں۔ عادات کی باقاعدگی ان کا ایک وصف خاص ہے۔ اس کی وجہ سے وہ ان بے شمار کاموں کو خوش
اسلوبی سے انجام دے پاتے ہیں، جو ایک نسبتہً کم مصروفیت والے آدمی کو بھی پریشان کر دیتی ہیں۔ مگر رحمان صاحب نے
زندگی کی ایسی تنظیم کر رکھی ہے کہ ہر کام اپنے وقت پر ہو جاتا ہے اور کسی قسم کی پریشانی انھیں یا دوسروں کو نہیں ہوتی۔

مجھے یہ سعادت حاصل ہے کہ میں نے کئی ایسی کانفرنسیں کرائیں جن کی صدارت رحمان صاحب نے کی۔ مجھے ایسا
ایک موقع بھی یاد نہیں جب کانفرنس کا خطبۂ صدارت وقت پر نہ مل گیا ہو۔ مجھے یاد نہیں کہ کسی ایک موقع پر بھی یاددہانی
کی ضرورت محسوس ہوتی ہو۔ ٹھیک مقررہ دن، ٹھیک مقررہ وقت پر ایک بند لفافہ مجھے مل جاتا۔ خوبصورت خط میں
سلیقے سے لکھی ہوئی مناسب طول کی تحریر جس میں ہر ضروری بات موجود، غیر ضروری مواد سے یکسر خالی—— مسائلِ
زیرِ بحث پر تعمیری، نتیجہ خیز، مگر محکم اظہار رائے۔ ایسے کئی خطبے دیکھے۔ شروع شروع میں مَیں یہ سمجھتا رہا کہ یہ مبیضہ کئی مرتبہ
صاف ہو کر تیار ہوا ہو گا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ اکثر یہ پہلا ہی مسودہ ہوتا تھا۔ اگرچہ اس کی تنظیم کے لئے ذہناً وہ کافی

غور و فکر کرتے ہوں گے۔

میں نے قوم کے کسی بڑے آدمی کو اپنے دائرے کے قومی مسائل سے متعلق تنظیمات کے لئے دعوتِ شرکت پر اس قدر جلد آمادہ و رضامند ہوتے نہیں دیکھا۔ میں نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ ایسے قومی مسائل کے سلسلے میں جن میں اظہارِ رائے میں خطرے بھی ہوتے ہیں کوئی شخص اتنی بے خوفی اور ایمانی یقین کے ساتھ اپنی بات کہتا ہو۔ آزاد لوگوں کی اور بات ہے لیکن ایک منصب دار آدمی کو ہر گام پر ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے۔ اور یہ احساس ایسے معاملات میں بھی آدمی کو، بے زبان کر دیتا ہے جن میں کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ رحمان صاحب نے ان خیالی خطروں کی کبھی پروا نہیں کی۔ اگرچہ انھوں نے ان آداب کو ہمیشہ ملحوظ رکھا جو ملازمت کے ساتھ لازم ہیں۔ ان کی یہ بے خوفی کچھ ان کی صحیح قوتِ جائزہ کا اور کچھ عقائد کے متعلق ان کے پختہ ایمان کا نتیجہ ہے۔

گزشتہ پچاس برس کی تاریخ میں سر عبدالقادر ہی ایک ایسے بزرگ نظر آتے ہیں جو ہمہ رنگی، خلق و تواضع، عام لحاظ داری، علمی قدر دانی اور فنی سرپرستی میں رحمان صاحب کی طرح کے آدمی تھے۔

یہ یاد رہے کہ انتظامی امور میں رحمان صاحب اپنی شفقتوں کے باوجود محکم رائے اور محکم اقدام کے بھی قائل ہیں۔ مجھے وہ زمانہ یاد ہے جب رحمان صاحب کی وائس چانسلری کے دور میں پنجاب یونیورسٹی کے طلبہ نے امتحانات کے التوا کا ہنگامہ اٹھایا تو میرے جیسے اکثر لوگوں کی توقع کے خلاف رحمان صاحب نے اپنی شفقتوں کو غیر موثر پاکر وہ آنکھیں دکھائیں کہ طلبہ بالآخر اپنے کئے پر پچھتائے۔

رحمان صاحب ننانوے فی صد تک تو روٹھتے نہیں لیکن جب روٹھتے ہیں تو ان کا روٹھنا محسوس ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ مگر یہ بھی حد کے اندر ہے۔

رحمان صاحب کی قلبی کشادہ دلی نے ان کے نظریئے میں بھی وسعت پیدا کر رکھی ہے۔ یہ اسی وسعت کا نتیجہ ہے کہ ان کے تصورات کسی تنگنا میں مقید نہیں ہوتے۔ ادبیاتِ مشرقی اور اس کی کلاسیکی روایتوں کے محافظانہ احترام سے لے کر مغرب کے جدید ترین مجرد فن کی ناقابلِ فہم باریکیوں تک ذہنی اور روحانی زندگی کے جو بے شمار اور بعض اوقات باہم متضاد مظاہر ہیں ان سب کو ایک وسیع فلسفیانہ نقطۂ نظر اور وسعت پسند قدر شناسی کے ذریعے ایک ہمہ رنگ ذوق میں ڈھالنا کوئی معمولی اور آسان کام نہیں۔ اور نہ ہر شخص کو جذب و رفعِ تضاد کی یہ استعداد میسّر ہے۔ حسن کا ادراک ہر شخص کو حاصل ہوتا ہے۔ نیکی کی برکتوں کا ہر شخص کو علم ہوتا ہے، سچائی ہر دل کو عزیز ہوتی ہے۔ مگر یہی حسن، خیر اور سچائی کی جستجو اور پرستش ہے کہ اس نے صدہا جھگڑے بھی اٹھائے ہیں اور تفریق پیدا کی ہے۔ اور یہ سب رفعِ تضاد کی استعداد کی کمی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ فساد ایک ہی رنگ کو سب کچھ سمجھ لینے سے کھڑا ہوتا ہے۔ حالانکہ محبت پسند دل اور جمال دوست آنکھ کو حسن (جہاں بھی ہو) حسن ہی نظر آتا ہے۔ نیکی اپنے ہر روپ میں نیکی ہوتی ہے۔ سچائی جس لباس میں آئے سچائی ہے۔

ع عباراتنا شتی وحسنک واحد —

ہر ذرۂ عالم میں ہے خورشیدِ حقیقی
یوں پوچھ کہ بلبل ہوں میں ہر غنچہ دہاں کا
(دردؔ)

رحمان صاحب اس نکتے سے باخبر ہیں۔ وہ ہر نظریئے کے قریب قریب رہتے ہیں۔ دوری اور مخاصمت ان کی طبیعت کے خلاف ہے۔ اسی وجہ سے ذوق و عمل کی ہر سرگرمی سے اُن کی قربت، ہمدردی اور قدرشناسی کا جذبہ پیدا کئے رکھتی ہے۔ ذوق کی ترتیب جہاں بھی ہوتی ہو، علم کی ترقی کا جہاں بھی چرچا ہو، نیکی، دین اور فن کا جو ہنگامہ ہو، اُس سے ہمدردی کرنا اس کی ترقی میں شریک ہونا رحمان صاحب کی طبیعت ثانیہ ہے۔ ان کے نزدیک الحمرا اور مسجد وزیر خاں کے درمیانی فاصلے ناقابلِ عبور نہیں مگر اس قرب کو محسوس کرنے کے لئے کشادہ دلی اور بلند نظری درکار ہے۔ جس کے بغیر انھی درمیانی راستوں میں کئی قلب مجروح و پامال ہو جاتے ہیں۔ اور وسیع النظری ہو تو ذوق و عرفان کی اس بکھری ہوئی دُنیا کو پارہ پارہ ہونے سے بچایا جا سکتا ہے۔ زندگی کے انھی منتشر ٹکڑوں کو باہم ملا کر ایک ایسا کلچر پیدا کیا جا سکتا ہے جو سمندر کے مانند وسیع بھی ہو اور گہرا بھی۔ سمندر کے اندر کی چٹانیں اور اس کے گہرے غار پانی کی ایک وسیع چادر کے نیچے پہنچ کر ایک ہو جاتے ہیں۔ ع

از یک چراغ کعبہ و بُت خانہ روشن است

ریاضی کی کانفرنس سے علوم مشرقی کی کانفرنس تک —— اور اس منزل سے فان گاگ کی تصویروں کی نمائش تک —— اور اس نمائش سے اسلامی قانون کمیشن بلکہ اسلامی آیڈیا لوجی سمپوزیم تک کتنے مختلف قسم کے ذوقی و علمی مفاد سامنے آتے ہیں مگر رحمان ہر جگہ برمحل اور صحیح الاستحقاق نظر آئے۔ ۱۹۶۲ء کی لسانی کانفرنس کے موقع پر ایک دوست نے کہا "کیا رحمان یہاں بھی؟" میں نے کہا۔ ہاں، یہاں بھی۔ اور بالاستحقاق۔ اور یہ اس لئے کہ رحمان اپنا خطبہ خود لکھ سکتے ہیں اور جو شخص اپنا خطبہ خود لکھ سکے وہ بالاستحقاق اس مفاد کا جائز علمبردار، شناسا اور محافظ ہو سکتا ہے۔

—— رحمان صاحب کی ہمہ رنگی اور اس کے باوجود یک رنگی ان کی طبیعت بلکہ قابلیت کا نمایاں وصف ہے۔ بہت سے لوگ مفادات اور اشخاص کی کش مکش میں یک رُخ ہو جاتے ہیں۔ مگر رحمان کی صلح جو اور تعمیر پسند طبیعت انھیں جھگڑوں سے بچاتی ہے۔ انھیں جس جماعت میں بھی کام کرنا پڑا، اس کے ساتھ تعمیر پسندانہ تعاون کیا۔ جھگڑوں سے الگ رہ کر اور تعمیری باتوں میں پورا ساتھ دیا۔ جو کام ہو رہا ہو وہ اس کے ساتھ ہیں۔ جو کوئی کام کر رہا ہو وہ اس کے معاون و سرپرست ہیں۔ جہاں کسی کی کوئی بات، یا کسی جماعت کا کوئی آدمی دل کے موافق نہ ہوا خاموشی سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ وا[illegible]

مروا باللغو مروا کراما۔ مگر درجنوں انجمنوں کی سرپرستی کے باوجود یہ بہت کم سُنا کہ رحمان صاحب کا کسی سے اختلاف ہوا ہو۔ خیالات کے اختلافات کے باوجود لوگوں کو ان کا مدّاح پایا۔ اور دل اور ذوق کی ناموافقت کے باوجود کسی پر ضروریات یا التماس کے وقت یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ اس کے کام نہیں آسکتے جو کچھ ہوسکا ہر شخص کے لئے کیا اور دل سے کیا۔

ہمہ رنگی کے باوجود کوئی نہیں کہہ سکتا کہ رحمان صاحب مستقل ارادوں کے آدمی نہیں۔ وہ خاص عقائد کے مالک ہیں اور وفاداری بشرطِ استواری ان کا ایمان ہے۔ اور ایمان کے ان معاملوں میں وہ ہمواری قائم رکھتے ہیں۔ اور دل شکنی گوارا نہیں رکھتے۔ یوں عارضی غلط فہمیاں پیدا ہوسکتی ہیں اور ہوئی بھی ہونگی۔ نرمی اور کمزوری کی گنجائش کہاں نہیں ہوتی۔

اُردو سے رحمان صاحب کی محبت ہر کسی کو معلوم ہے۔ اس کی ترقی اور پیش رفت کے ہر معاملے میں ان کی آواز اور ان کا قدم مقصد کا موید نظر آتا ہے۔ اور جب کبھی اُردو کا مسئلہ کسی نہ کسی جہت سے اختلافی بن جاتا رہا، ایسے موقعوں پر بھی انھوں نے اپنے عقیدے کی بات برملا کہی ۱۹۶۲ء کی لسانیاتی کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے پرائمری میں، پنجابی کو ذریعہ تعلیم بنانے کی کھُلی مخالفت کی۔ ذریعہ تعلیم کانفرنس لاہور میں صدر کانفرنس کے اختلاف کے باوجود اُردو کو دفتری اور تعلیمی زبان بنانے پر زور دیا۔ مارشل لا کے زمانے میں "اسلامک آئیڈیالوجی" کے مذاکرے میں اس عقیدے کا اعادہ کیا کہ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے اور اس کا نظام ملکی اور نظام زندگی۔ اسلامی اصولوں پر چلنا چاہیئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے جلسۂ تقسیم اسناد (۱۹۶۳ء) میں ٹیڈی ازم کے رجحانات کی پُرزور مذمت کی۔ یہ سب معاملات اختلافی تھے۔ اس منصب کا کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو ایسے مواقع پر پہلو بچا کر نکل جاتا مگر اپنے بلند منصب کے باوجود رحمان صاحب نے اپنی رائے کا صاف صاف اظہار کیا۔ یہ سب وفاداری بشرطِ استواری کے رنگ ہیں۔

رحمان صاحب کی وفاداری اس وقت خاص طور سے متاثر کرتی ہے جب وہ اُن مفادات کے ساتھ برتی جائے جو دنیوی لحاظ سے بے اثر، بے رسوخ، اور غیر مقبول ہوں۔ علوم مشرقی (عربی، فارسی، اُردو اور اُن سے متعلق ادب علم) کے ساتھ رحمان صاحب ہمدردی نہ بھی کریں، فنون کی سرپرستی نہ بھی کریں، انجمنوں کی قدر افزائی نہ بھی کریں تو اُن کا فرض نہیں۔ مگر سوال محبت، شفقت، عقیدے اور ایمان کا ہے۔ اس میں کسی چیز یا آدمی کے با اثر یا بارسوخ ہونے کا معاملہ سامنے آتا ہی نہیں۔ اور استواری کا یہ عالم ہے کہ ۱۹۴۸ء سے آج تک ان مفادات کی حفاظت اور نگہبانی کا فریضہ اپنے ذمے لے رکھا ہے اور اس کو اس طرح نباہ رہے ہیں گویا یہ ان کا منصبی فرض ہے۔

تعلقات میں استواری اور نباہ کا بھی یہی عالم ہے۔ مَیں نے آج تک کسی سے نہیں سُنا کہ رحمان صاحب کے کسی کے ساتھ تعلقات تھے اور اب نہ رہے۔ جس سے راہ و رسم ہوئی جاری رکھی۔ بظاہر یہ چیز آسان نظر آتی ہے لیکن

یہ آسان ہے نہیں۔ یہ دُنیا مفادات کی دُنیا ہے۔ لوگوں کو کام پڑتے ہیں اور ایسے موقعوں پر ہر ایک کو مطمئن کرنا بہت مشکل کام ہے۔ مگر رحمان صاحب کی خوش اخلاقی، ہمدردی اور صداقت تقریباً ہر شخص کو مطمئن کر دیتی ہے۔ وہ ہر کسی کی جائز امداد کے لئے ہر وقت آمادہ رہتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں حیا ہے اور دل میں شفقت۔ جہاں تک ممکن ہوتا ہے ہر کسی کے لئے کر گزرتے ہیں۔

رحمان صاحب کی زندگی میں سادگی ایک وصف خاص ہے۔ یہ وصف ان کے ذوق و ذائقہ کے سب مظاہر میں نمایاں ہے۔ اُن کے ڈرائنگ روم میں ایسی سادگی ہے جس سے بے ساختگی اور حُسن دونوں کی شان نمودار ہوتی ہے۔ بھڑکیلے رنگوں سے خالی۔ ایک منقش قالین۔ دیوار پر چغتائی کی بنی ہوئی دو تصویریں۔ ہلکے مگر دلکش رنگ کے صوفے۔ خاص نوادر کی ایک الماری جس کا نصف شیشہ دار، دوسرا حصہ لکڑی کا سادہ مگر رعب دار یہی سادگی اور وقار کا امتزاج زندگی میں بھی ہے۔ ملاقاتیوں کا کمرہ بھرا بھرا معلوم ہوتا ہے۔ گویا اس میں سب کچھ ہے۔ خصوصاً جب رحمان صاحب اس میں تشریف فرما ہوں۔

رحمان صاحب کو کون سے پھول سب سے اچھے لگتے ہیں۔ میں نے محترمہ بیگم رحمان سے دریافت کیا۔ وہ کچھ فرمانا چاہتی تھیں مگر رحمان صاحب نے جلدی سے یہ شعر پڑھ دیا۔

ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ گل پھول کے معاملے میں رحمان صاحب کسی تکلف میں مبتلا نہیں۔ میں نے عرض کیا گلوں کی ہزار اقسام میں سے بعض کے بارے میں ان کی پسند ترجیحی ضرور ہوگی۔ معلوم ہوا کہ اس معاملے میں وہ کسی تکلف میں مبتلا نہیں۔ ہر رنگ کا پھول اور ہر پھول کا رنگ ان کی طبع ہمہ رنگ میں سما جاتا ہے۔ وہ سب سے خوش ہیں اور جمالِ قدرت کے ہر روپ میں اُن کے لئے دلکشی ہے۔

میں بیگم صاحبہ سے رحمان صاحب کے ترجیحی مرغوبات کا حال معلوم نہ کر سکا۔ انھوں نے بس یہی فرمایا کہ اس بلائے میں (ماسوا ان چیزوں کے جو تکلیف دیتی ہیں) وہ ہر ڈِش کو بخوشی قبول کر لیتے ہیں۔ اور کسی قسم کی کوئی شکایت، انکار یا بحث نہیں کرتے۔ کھانے کے وقت لطیفہ و گفتگو کے ذریعے خوشی کی فضا قائم کرتے ہیں۔ اور مطلقاً تنگیٔ دل کا اظہار نہیں کرتے۔

رحمان صاحب کی نثر اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ادیبانہ ہوتی ہے۔ جس طرح اُن کی تحصیلات میں ادب و ریاضی کے اجتماع نے ایک مخصوص رنگِ قابلیت نمایاں کیا ہے، اسی طرح ان کی نثر کا ادبی اور منطقی رنگ، دلکشی اور توانائی، دونوں کا سرچشمہ ہے۔ ان کے خطبات فکری مضامین کے باوجود ادب پارے ہیں۔ ان خطبات کا ایک مجموعہ

(باقی صفحہ ۱۰ پر)

شیخ ضیاء الحق مرحوم

ادبی نوادر

مضمون نویسی

شیخ ضیاء الحق بابائے اردو مولوی عبد الحق کے برادر بزرگ تھے وہ اپنے زمانے کے مشہور صحافی اور اہل قلم تھے۔ اگرچہ انھوں نے باقاعدگی سے ادبی و علمی مضامین بہت کم لکھے تاہم ان کی جو تحریریں دستیاب ہوئی ہیں ان سے اعلیٰ درجے کے علمی مذاق کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کا ایک مضمون ذیل میں شائع کیا جاتا ہے۔ یہ مضمون آج سے پینسٹھ سال قبل مخزن بابت ستمبر ۱۹۰۱ء میں شائع ہوا تھا۔

(مدیر)

مضمون نویسی کوئی ایسی آسان اور سہل چیز نہیں ہے جیسا کہ لوگوں میں آج کل اس کا عام مفہوم ہو رہا ہے۔ کہ آنکھ بند کی اور صفحے کے صفحے لکھ ڈالے۔ اکثر اخبارات اس مرض میں مبتلا ہوتے ہیں کہ عنوان بامعنی ومعقول دیکھ کر خوش ہو گئے۔ اور مضمون اوّل سے آخر تک بے دیکھے بھالے چھاپ دیا۔ خواہ نامہ نگار صاحب نے عنوان کے خلاف خامہ فرسائی کر کے رطب و یابس ہی بھر دیا ہو۔ جب تک کسی شے کے متعلق قواعد و فرائض سے پوری واقفیت نہ ہوا اور نفس مدعا پر غور و خوض کر لے اور ترتیب کی قابلیت بلحاظ اصول و قواعد حاصل نہ ہو۔ طبع آزمائی کرنا آنکھ بند کر کے رستہ چلنا ہے۔ حقائق و معارف اسی وقت بیان کر سکتے ہیں جب کہ تشریح و توضیح حقائق و معارف کے اصول پر حاوی ہوں۔ مضمون نویسی بغیر مضمون نویسی کے اصول و فرائض اور اس کی اہمیت سے واقف ہونے کے بے سود اور بے سلیقگی ہے۔ ورمحض قابلیت اور علمیت کا اظہار بغیر خوش سلیقگی اور ترتیب کے بھدا پن ہے۔

یہ دوسری بات ہے کہ بعض ایسے اشخاص ہوں جو فطرتاً خداداد قابلیت سے اصول و قواعد کے مطابق مضمون نویس واقع ہوئے ہیں - تو بھی ہر ایک شے قدرتاً منازل و مدارج رکھتی ہے - اور اعلیٰ ترقی و کامیابی اور باکمال ماہر فن ہونے کے لئے ان کا طے کرنا لازمی ہے -

مضمون نویسی کے متعلق چند مختصر اصول و قواعد نہایت کوشش و محنت سے انتخاب کر کے ہدیہ ناظرین کئے جاتے ہیں - ممکن ہے کہ وہ کسی پہلو پر نامکمل ہوں - یا ان میں کسی قسم کی فروگزاشت ہو - مگر وہ بحیثیت مجموعی ایک مضمون نویس کے لئے مفید اور اصول مضمون نویسی کے لئے ایک حد تک قابل عمل ہدایتیں ہیں -

جہاں تک ہمارا خیال ہے ان اصول سے عام واقفیت نہیں ہے - اور ہمارا مقصد واقفیت عامہ ہے - اور اسی لئے انھیں مخزن کے ذریعے اہل وطن تک پہنچانے کی ضرورت محسوس ہوئی -

داکر صاحب مضمون کی تعریف اس طرح کرتے ہیں :-

۱- مضمون ایک غیر مسلسل تکمیل ہے -

۲- مضمون ایک آزادانہ قسم کا مسودہ ہے -

انحصار مضمون نویسی

۱- نفس مضمون یا مادہ بحث -

۲- مضمون کی وضع -

۳- طرز تحریر جو اجمالی حالت سے پیدا ہوتی ہے -

نئی حقیقت صرف اصلی ذخیرہ ذہنیات کی ترقی ہی نہیں کرتی بلکہ ہر مرتبہ ایک زینہ تیار کرتی ہے جس کے ذریعے سے غیر منکشف اور غیر محقق امور تک پہنچ سکتے ہیں -

ابتدائی حالت میں عام فہم اور گرد و پیش افتادہ نفس مضمون منتخب کیا جائے جس میں سہولت ہو -

جین پال ایجر کہتا ہے کہ "کسی مضمون پر کچھ نہ لکھو، جب تک پہلے خود اس کو کافی طور پر نہ پڑھ لو- اور کسی مضمون کو نہ پڑھو، جب تک اپنے آپ کو اس کا بدرجۂ غائت مستبد نہ پاؤ -

ایک کتاب یادداشت ضروری ہے - جس میں :

۱- روز مرہ کے خاص واقعات -

۲- کتابوں کے دلچسپ و ضروری پتے ، تعریفات

۳- عجیب خیالات -
۴- خاص طور کا فسانہ -
۵- کتابوں کے نام مع مصنف -
۶- تاریخ دار حالات -
۷- اہم تبدیلیاں -

درج رہیں -

اوپی ایک مشہور مصور کے شاگرد نے اس سے بکمال اصرار پوچھا کہ براہ مہربانی فرمایئے - کہ آپ اپنے رنگ میں کیا ملا دیتے ہیں - اس نے کہا کہ

" میں اس میں دماغ کو ملا دیتا ہوں "

مضمون کی وضع یعنی - (۱) تمہید - (۲) مضمون کی بطور کافی تشریح و توضیح - (۳) نتیجہ مضمون نویسی کے ذاتی فوائد -

۱- وسعت معلومات -
۲- واقعات کا ترتیب دینا آتا ہے -
۳- مضمون کے لکھنے سے بہت لوگوں کا جہل ٹوٹ جاتا ہے جو کسی غلط علم و اطلاع پر اصرار کرتے ہیں -

لارڈ بیکن کہتا ہے کہ " پڑھنے سے انسان معقول ہوتا ہے اور مباحثے سے مستعد اور لکھنے سے کامل ہو جاتا ہے -

توضیح اور تشریح میں اعتدال اور ضبط ضروری ہے -

اول غور کرنے کی عادت ڈالو - ان باتوں کی تلاش کرو جن پر غور ہونا چاہیئے -

عمدہ مضمون نویس ہونے کے لئے مناسب ہے کہ عالم و فاضل مصنفوں اور قابل انشا پردازوں کی تحریرات بغور مطالعہ کیا کرو -

سسرو کہتا ہے کہ " قلم فصاحت کا صانع اور معلم ہے " اس لئے جہاں تک ممکن ہو احتیاط کے ساتھ لکھنا چاہیئے - کیونکہ جس طرح زمین کو جتنا گہرا کھودا جاوے اسی قدر بیج کی عمدہ پرورش ہوتی ہے اور زیادہ بار آور ہوتا ہے - اسی طرح تحریر میں جس قدر غور سے کام لو مطالب و معانی کے پھل پھول دامن تلاش کو گوہر مقصود سے بھرتے ہیں -

اگر تم زبان سیکھنا چاہتے ہو تو اوروں کو سکھلاؤ - اور اگر تم عمدہ منشی ہوا چاہتے ہو تو مضمون لکھو -

اقسام مضامین

۱- مضامین متعلق اخلاق - مثلاً راست بازی - دیانت داری، فیاضی، اور دوسرے اوصاف حمیدہ۔
۲- علم قواعد باطنی - مثلاً تمیز، خواہش، حافظہ و دیگر قوا رعقلی و دماغی۔
۳- معاملات ملکی - جیسے قوت دولت، آزاد تجارت، مال گزاری، حکام، اور دوسری بحثیں متعلق حکومت اعلیٰ۔

طرز تحریر وہ طریقہ ہے جس میں واقعات کی ترتیب بیان کی جاتی ہے یا جس میں مسلسل خیالات ظاہر کئے جاتے ہیں - یہ صحیح و موزوں الفاظ کے جمع کرنے اور ان کو جملوں، فصلوں، اور ابواب میں ترتیب دینے کا ہنر ہے۔

عمدہ طرز تحریر کی علامتیں:

۱- عمدہ منتخب باموقع الفاظ۔
۲- ترتیب الفاظ۔
۳- مناسب رنگینی۔

پلینی نے اپنے ایک دوست کو لکھا کہ۔
"مجھے مختصر لکھنے کی فرصت نہ تھی - اس لئے میں نے آپ کو یہ طول طویل خط لکھا"
بٹلر اختصار کی تعریف میں یوں مبالغہ کرتا ہے:
"اختصار بہت خوب ہے، چاہے ہماری بات کوئی سمجھے یا نہ سمجھے۔

(بقیہ صفحہ ۱۲)

"حدیث دل" کے نام سے شائع ہو چکا ہے - ان میں سے ہر خطبے میں متعلقہ مضمون کے متعلق تشفی بخش معلومات موجود ہیں۔ مگر معلومات میں دلکشی کا رنگ پایا جاتا ہے - اختصار کے باوجود مدعا کی جامعیت اور بے تکلفی کے باوجود اسلوب کی پرکاری تقریباً ہر نثری تحریر میں موجود ہے۔

میں نے رحمان صاحب کی نظم و نثر کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، موجودہ مضمون کی ایک ضمنی جھلک کے طور پر لکھا ہے، یہ باقاعدہ اور جامع تنقید نہیں - یہ اشارے ان کی شخصیت کے مظاہر کو نمایاں کرنے کے لئے ضروری تھے۔

سید احمد علی

ببلوگرافیا اردو ڈراما

آج مجھے " ببلوگرافیا اردو ڈراما " کا تعارف کرانا ہے لیکن پیشتر اس کے کہ کتاب کا تعارف کرایا جائے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ببلوگرافی کے مولف کا تعارف بھی کرا دیا جائے۔

" ببلوگرافیا اردو ڈراما " کے مولف لفٹننٹ کرنل ڈاکٹر عبدالعلیم نامی صاحب ہیں۔ میری ان سے پہلی ملاقات ۷ رمئی ۱۹۶۶ء کو دہلی یونیورسٹی کے فیکلٹی آف آرٹس میں ہوئی جہاں ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے اردو پروفیسر " کل ہند کانفرنس انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند " میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی۔ صدر شعبہ اردو۔ دہلی یونیورسٹی کی دعوت پر جمع ہوئے تھے۔

میں نے پروفیسر نجیب اشرف ندوی صاحب سے درخواست کی کہ وہ میرا تعارف ڈاکٹر نامی صاحب سے کرا دیں۔ چنانچہ انہوں نے مناسب الفاظ میں میرا تعارف کرا دیا لیکن۔ ابھی تک ڈاکٹر صاحب سے تفصیلی ملاقات نہ ہو سکی۔ ۸ رمئی کو جب ڈاکٹر صاحب موصوف کی اردو تھیٹر میوزیم کی تصویریں نمائش کے لئے پیش ہوئیں جن کی تعداد کم و بیش چار سو تھی تو میرے ذوق سلیم نے مزید رہنمائی کی۔

میں ۱۱ رمئی کو جب کروڑی مل کالج پہنچا تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب اپنے کسی دوست کے یہاں منتقل ہو گئے ہیں۔ واپسی پر رشید نعمانی صاحب سے ملاقات ہو گئی اور انہوں نے ڈاکٹر اشتیاق احمد صاحب کے یہاں پہنچا دیا جہاں ڈاکٹر نامی صاحب کا قیام تھا۔

میں نے دو گھنٹے ڈاکٹر نامی صاحب سے باتیں کیں اور جو معلومات حاصل کیں وہ میں اپنے الفاظ میں یہاں پیش کرتا ہوں۔ ممکن ہے کہ الفاظ کے ہیر پھیر میں کوئی بات رہ گئی ہو ورنہ جو کچھ میں نے سنا یا سمجھا اسے بے کم و کاست یہاں قلمبند کر دیا۔

لفٹننٹ کرنل عبدالعلیم نامی۔ ایم۔ اے۔ بی ٹی۔ پی ایچ ڈی کا تعلق سندیلہ ضلع ہردوئی۔ یو پی کے ایک معزز زمیندار خاندان سے ہے۔ آپ نے سترہ سال تک علی گڑھ میں تعلیم پائی (۱۹۱۶ء سے ۱۹۳۳ء تک)

۱۹۳۳ء میں علی گڑھ سے بی اے اور ۱۹۴۲ء میں بی ٹی - ۱۹۴۳ء میں ناگپور سے ایم اے اور ۱۹۵۲ء میں بمبئی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کیا - ۱۹۳۹ء میں نواب افتخار علی خاں ' والی ریاست جاورہ کی بھتیجی سے شادی کرلی -

ڈاکٹر صاحب کا موضوع مطالعہ " اردو تھیٹر " ہے اور اس موضوع پر آپ نے اپنا مقالہ لکھا ہے جو انجمن ترقی اردو پاکستان کی جانب سے شائع ہو رہا ہے - یہ مقالہ چھ جلدوں پر مشتمل ہے - ہر جلد ۱۸×۲۲/۸ تقطیع کے تقریباً چار سو صفحات کی ہے - پہلی جلد اردو تھیٹر کا تعارف ہے - اس میں پرتگالی - برطانوی - ہندوستان میں انگریزی اسٹیج ، مرہٹی اور گجراتی کے اردو اسٹیج پر اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے - دوسری اور تیسری جلدیں ڈراما نویسوں کی سوانح عمریوں اور ان کی تصانیف کی تفصیلات پر مشتمل ہیں - چوتھی جلد (زیر طبع) میں اردو تھیٹریکل کمپنیوں اور ان کے عروج و زوال کا ذکر ہے - پانچویں جلد میں اردو اسٹیج کے اداکاروں اور ڈائرکٹروں کا تذکرہ ہے چھٹی جلد میں اردو اسٹیج کی تدریجی ترقی کا تفصیلی مطالعہ ہے -

ڈاکٹر صاحب انڈین تھیٹر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ، بھارتیہ ناٹک منڈلی کے جنرل سکریٹری اور اورینٹل کالج کے پرنسپل ہیں - ڈاکٹر صاحب " اردو تھیٹر میوزیم " کے بھی بانی ہیں (جس کا ذکر میں انشاء اللہ آیندہ کروں گا) اور وہ کافی عرصے سے اس سلسلے میں کام کر رہے ہیں - ڈاکٹر صاحب نے مخطوطات و مطبوعات اردو ڈراما - اوپرا اور سنگیت کا جو بے نظیر مجموعہ اپنی لائبریری میں جمع کیا ہے وہ کم و بیش ڈیڑھ ہزار کتب پر مشتمل ہے - اس میں سینکڑوں ڈرامے ایسے ہیں جو گجراتی سے منتقل کئے گئے ہیں - ایسے بھی ہیں جو پیشہ ور کمپنیوں سے حاصل کئے گئے ہیں - میوزیم کا ایک شعبہ " فوٹوز " پر مشتمل ہے - اس میں پرتگالیوں اور انگریزوں کے زمانے سے اب تک کے تاریخی نوادر موجود ہیں - پرتگالی عہد کے مبلغین تثلیث کی کوششیں برطانوی عہد کے درجنوں تھیٹروں کے نقشے - اداکاروں ، ڈائرکٹروں اور ڈراما نویسوں کی شبیہیں - ان کے علاوہ ۱۸۵۳ء اور ۱۸۵۵ء کے اولین اردو اشتہارات کے عکس بھی ہیں - ان نوادر کی تعداد کم و بیش چار سو ہے -

ڈاکٹر صاحب نے ان کے علاوہ سینکڑوں اشتہارات اور پراپرٹی کی چیزیں بھی جمع کی ہیں - کسی زمانے میں ڈرامے کی پوششیں بھی جمع کی تھیں لیکن جگہ نہ ہونے کے باعث نکال دیں -

اب وہ کئی سال سے " ببلوگرافیا اردو ڈراما " پر کام کر رہے ہیں جو مشرق کی جملہ زبانوں میں ایک نادر روزگار ادبی سرمایہ ہے - ہند و پاک کی زبانوں میں تو اس قسم کی کسی چیز کا وجود ہی نہیں ہے - ببلوگرافیا تقریباً تین ہزار ڈراموں ، اوپرا اور سنگیتوں کا تفصیلی مطالعہ ہے - ہر ڈراما کی عام ببلوگرافی کے علاوہ اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس کے کتنے اڈیشن شائع ہوئے ہیں اور وہ دنیا کی کس کس لائبریری میں موجود ہیں - ڈاکٹر صاحب نے کم و بیش ایک سو لائبریریوں سے یہ معلومات جمع کی ہیں کہ اگر طلبہ ایک ڈرامے پر بھی تحقیق

رنا چاہیں تو ان کو وافر مواد ایک ہی جگہ بہ آسانی دستیاب ہو جائے ۔
یہ ببلوگرافی جو سالہا سال کی محنت شاقہ اور یکسوئی کا نتیجہ ہے آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے ہر جلد " اردو تھیٹر "
ے سائز کی ہے

جب میں نے ببلوگرافی دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا " آپ ایک طالب علم کو کیوں کانٹوں
ں گھسیٹ کر زبردستی کا ادیب بنا رہے ہیں " جب میں نے اصرار کیا تو فرمایا ۔ " یہ اول تین جلدیں رکھی ہوئی ہیں
یکھ لیجئے " جب میں نے ضروری اقتباسات کی اجازت چاہی تو ہنس کر فرمایا ۔ جو مناسب سمجھئے ، کیجئے ۔

میں نے ببلوگرافی کا " دیباچہ " بڑے غور سے پڑھا ۔ مجھے جس چیز نے بے حد متاثر کیا وہ ڈاکٹر صاحب کا
لوص اور مولوی عبدالحق صاحب سے بے پناہ عقیدت ہے ۔ " اردو تھیٹر " کی طرح ڈاکٹر صاحب نے
کتاب بھی مولوی صاحب کے نام معنون کی ہے ۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے دیباچے میں بار بار مولوی صاحب کا ذکر
یا ہے گویا ڈاکٹر صاحب کا جو کچھ ہے وہ سب مولوی صاحب کا مرہون منت ہے حالانکہ واقعہ اس کے بالکل
رخلاف ہے ۔ پاکستان کے قیام کے بعد سے مولوی صاحب کی ملاقات ڈاکٹر صاحب سے کبھی نہیں ہوئی ۔
اکٹر صاحب پہلی بار ۱۹۶۲ء میں پاکستان گئے اس وقت مولوی صاحب کا انتقال ہو چکا تھا ۔

اصل یہ ہے کہ ۱۹۵۳ء میں جب ڈاکٹر صاحب کو " اردو تھیٹر " پر پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی تو بمبئی
ے بعض انگریزی اخبارات نے " اردو تھیٹر " کے مصنف کی تصویریں اور مقالے کی خبریں شائع کیں ۔ بمبئی
ونیورسٹی میں یہ " تھیٹر " پر پہلا مقالہ تھا ۔ پاکستانی اخبارات نے بھی یہ خبریں نقل کیں ۔ مولوی صاحب نے
روفیسر نجیب اشرف ندوی کو لکھا کہ مقالے کی ایک کاپی ان کو بھیج دی جائے ۔ ندوی صاحب نے ڈاکٹر صاحب
و مجبور کیا کہ وہ اپنی کاپی روانہ کر دیں چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے ایک کاپی روانہ کر دی ۔ اس طرح مولوی صاحب
و " اردو تھیٹر " کے مطالعے کا موقع ملا ۔

یں نے جتنی بار مولوی صاحب کا ذکر کیا یہ محسوس کیا کہ ڈاکٹر صاحب ہونٹ دبا کر اور چند سیکنڈ
نتظار کے بعد جواب دیتے ہیں ۔ میں نے وجہ معلوم کرنی چاہی لیکن ڈاکٹر صاحب کافی دیر تک ٹالتے رہے
پھر فرمایا کہ میں نے جو کچھ کیا یا کر رہا ہوں ، اس میں مولوی صاحب کا ہی خلوص کارفرما ہے ۔ اگر مجھے معلوم ہوتا
ہ مولوی صاحب اس قدر جلد مجھے داغ مفارقت دے جائیں گے تو میں اپنے لئے کوئی دوسرا پیشہ منتخب
رتا ۔ اوّل تو دنیا سے بیزار ہو کر کتابیں لکھنا ہی ایک جان لیوا سودا ہے اس پر کتابوں کی چھپائی کا مسئلہ
ہ تو انسان کو بالکل ہی نیم جان کر دیتا ہے ۔ خیر چھوڑیئے ان باتوں کو ۔

میں نے بات بڑھانی مناسب نہ سمجھی اور خاموش ہو گیا ۔ ڈاکٹر صاحب ایک اور صاحب سے مخاطب

ہو گئے اور میں دیباچے کے اقتباسات میں منہمک ہو گیا۔

ملاحظہ ہو ڈاکٹر صاحب کس عقیدت سے دیباچے کی ابتدا کرتے ہیں:۔

"مولوی صاحب کے انتقال کے بعد یہ بتلانا مشکل ہے کہ "قاموس الکتب" کی ترتیب و تدوین و اشاعت میں اُن کا کس قدر حصہ تھا۔ یہ قاموس اردو کی پہلی ببلوگرافی ہے۔

"مرحوم اردو کے ہر موضوع پر ایک ببلوگرافی تیار کرانا چاہتے تھے - وہ جب کبھی حیدر آباد یا دہلی سے بمبئی تشریف لائے اور ڈاکٹر بندل الرحمان پرنسپل اسماعیل کالج کے دولت کدے پر قیام فرماتے تو محبان اردو کو جمع فرماتے اور بہ حسرت و یاس اُن سے کہتے کہ اگر اہم اصناف اردو کی مخطوطات و مطبوعات کی فہرستیں شائع ہو جائیں تو ایک بڑا کام انجام پائے۔

"اُس وقت بمبئی میں فدایان اردو کی کمی نہ تھی - سر ہدایت اللہ - پروفیسر شیخ عبدالقادر - محمد یاسین نوری (وزیر حکومت بمبئی) غلام السیدین (مشیر تعلیمات حکومت بمبئی) - اے اے آصف فیضی (پرنسپل کالج) سید نور اللہ (پرنسپل ٹیچرز ٹریننگ کالج) سید عبداللہ بریلوی (مدیر - بمبئی کرانیکل) جیسے لوگ موجود تھے لیکن بعض خود غرض لوگوں کی ریشہ دوانیوں کے باعث قاموس الکتب کی تیاری کا مسئلہ آگے نہ بڑھ سکا اور مولوی صاحب مرحوم کے جمع کردہ گیارہ ہزار روپے خُرد بُرد ہو گئے۔

"ہندوستان سے عدن، برما اور سیلون کی علیحدگی کے بعد جب ملک چوتھی بار "ہند" و "پاک" میں تقسیم ہوا تو مولوی صاحب کراچی تشریف لے گئے لیکن وہاں رفیقوں نے اُن سے دغا کی - مولوی صاحب اُس وقت خاموش ہو گئے لیکن جیسے ہی حالات نے خوشگوار صورت اختیار کی وہ پھر میدان میں آ گئے - قاموس الکتب کا کام شروع کر دیا اور آخری سانس سے پہلے ایک جلد شائع کر دی - دوسری تقریباً تیار ہے۔

"مولوی صاحب کی خواہش کے مطابق اردو ڈرامے کی ببلوگرافی کا کام میں نے اپنے ذمے لیا اور کوشش کی کہ ملکی و غیر ملکی لائبریریوں کی امداد سے یہ ببلوگرافی بحسن و خوبی انجام پائے - ہر ڈرامے کے متعلق ضروری معلومات بہم پہنچانے کے علاوہ اس تالیف کا مقصد یہ بھی ہے کہ ان صاحبان علم و دانش کو جو اپنی عدم واقفیت کے باعث اردو ڈرامے کو حقیر سمجھتے ہیں بتلایا جائے کہ ہند و پاک کی ہر زبان سے زیادہ اردو میں ڈرامے، اوپرا، اور سنگیت موجود ہیں اور ہمارے ادب میں ایسے ڈراموں کی وافر تعداد موجود ہے جو یورپ کے بہترین ڈراموں کے مقابلے میں پیش کئے جا سکیں - اس ببلوگرافی کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اردو ڈرامے اسٹیج اور تھیٹر کو وہی اہمیت دی جائے جو متمدن ممالک کے تھیٹرز کو حاصل ہے۔"

(باقی صفحہ ۳۳ پر)

گرد و پیش

بین الملکی تنظیم طلبہ کا جلسہ بین الملکی تنظیم طلبہ کا ایک جلسہ کراچی میں ۱۸ اگست کو منعقد ہوا۔ اس کے صدر نے کراچی کے طالب علموں کی مختلف تنظیموں کے عہدیداروں اور نمائندوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ وہ اردو کی جلا و بقا کے لئے ہر ممکن جدوجہد کریں۔ اور جب تک اس کو صحیح مقام نہ مل جائے اس وقت تک اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ انھوں نے طلبہ و طالبات سے امید ظاہر کی کہ وہ قومی زبان کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر مستقل مزاجی، خلوص اور اولوالعزمی سے کام لیتے ہوئے اردو کو پروان چڑھائیں گے۔

اردو کا نیا ٹائپ رائٹر ۱۹ اگست کو لاہور میں مرکزی بورڈ کی جانب سے اعلان کیا گیا ہے کہ ایک بیرونی فرم کے فنی اشتراک سے ایک سال کی محنت کے بعد نئے کلیدی تختے کے ساتھ ایک اردو ٹائپ رائٹر تیار ہو گیا ہے۔ کلیدی تختے بناتے وقت پنجابی، پشتو اور سندھی زبانوں کی ضروریات کا خیال بھی رکھا گیا ہے۔ ان زبانوں کے ماہرین پر مشتمل ۹ ارکان کی سب کمیٹی نے اس کلیدی تختے کو تیار کیا ہے اس ٹائپ رائٹر کے افتتاح کے موقع پر وزیر تعلیم قاضی انوار الحق نے فرمایا کہ حکومت ملک کی قومی زبانوں کی نشو و نما کو زبردست اہمیت دے رہی ہے۔

اردو انسائیکلوپیڈیا کی اشاعت مغربی پاکستان کی حکومت نے اس سال پنجاب یونیورسٹی کو چوبیس ہزار روپے کی رقم دی ہے جو اردو انسائیکلوپیڈیا کی تدوین پر صرف کی جائے گی۔ پنجاب یونیورسٹی نے متمول افراد کی مالی امداد سے اردو زبان میں اسلامی انسائیکلوپیڈیا کی ذمہ داری قبول کر لی ہے۔ یہ انسائیکلوپیڈیا مکمل ہونے پر اسلام اور اردو دونوں کے لئے ایک اہم دستاویز ہو گی۔

بنگلہ زبان کا مطالبہ ڈسٹرکٹ کونسل لائل پور نے صوبائی حکومت سے سفارش کی ہے کہ پرائمری اسکول کے نصاب میں بنگلہ زبان کو لازمی مضمون کی حیثیت سے شامل کیا جائے ۔ یہ سفارش ایک قرارداد کے ذریعے عمل میں آئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ دونوں صوبوں کے عوام میں مزید رابطہ کی سہولتیں مہیا کرنے کے لئے اس پر عمل ہونا بہت ضروری ہے ۔

زرعی بینک اور قومی زبانیں زرعی ترقیاتی بینک کے خبرنامے میں بتایا گیا ہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان میں بینک کے تمام ملازمین کو اردو اور بنگالی زبانوں کا امتحان دینا ہوگا ۔ خبرنامے میں کہا گیا ہے کہ جو ملازمین مشرقی پاکستان میں تعینات ہیں اُن کا امتحان ڈھاکہ میں اور مغربی پاکستان کے ملازمین کا امتحان بینک کے صدر دفتر کراچی میں لیا جائے گا ۔

ادبی ، تہذیبی ، تعلیمی ، علمی خبریں

سعودی عرب میں تعلیم سعودی عرب نے تعلیمی میدان میں جو ترقی کی ہے ، اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ گزشتہ گیارہ برسوں میں وزارت تعلیم کے بجٹ میں دو ہزار فی صد کا اضافہ ہوا ہے ۔ ۱۹۵۷ء میں تعلیمی بجٹ ۸ کروڑ ۷۰ لاکھ ریال تھا جو اب ۲۴ کروڑ ۵۴ لاکھ ۱۱ ہزار ریال ہو گیا ہے ۔ اس عرصے میں ملک کے پرائمری اسکولوں کی تعداد ۳۰۶ سے بڑھ کر ۱۳۴۷ اور طلبہ کی تعداد ۳۹۹۲۰ سے بڑھ کر ۱۵۶۷۸۰ ہوگئی ہے ۔

شاہ فیصل کا انعام سعودی عرب کے شاہ فیصل نے لاہور کے ایک شاعر حمید کوثر کو اُن کی ایک نظم پر ۵ سو روپے کا انعام دیا ہے اس نظم کا عنوان ہے " سرزمین پاک تجھ کو سلام " اس نظم میں اُن مجاہدین کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے جنھوں نے پاکستان کے دفاع کے لئے اپنی جانیں قربان کی تھیں ۔ یہ نظم شاہ فیصل کے دورۂ لاہور کے موقعے پر پڑھی گئی تھی ۔

ایک دلچسپ مقدمہ کراچی میں ایک تمثیلی مقدمہ پیش ہوا ۔ جو اپنی نوعیت کا دلچسپ ترین اور انوکھا مقدمہ تھا ۔ یہ مقدمہ ایک ادبی عدالت میں پیش ہوا جو ملک کے مقتدر ادیبوں اور شاعروں پر مبنی تھی ۔ اس کی صدارت ملک کے ممتاز دانشور مہدی علی صدیقی کر رہے تھے جو پہلے سشن جج رہ چکے ہیں ۔ دیگر ججوں میں فیض احمد فیض اور ہاجرہ مسرور کا نام شامل ہے یہ مقدمہ مشہور ڈیرہ دار طوائف امراؤ جان ادا کی طرف سے اردو کے مشہور مصنف مرزا رسوا کے خلاف دائر کیا گیا تھا ۔ اس میں ادا کی شہرت کو نقصان پہنچانے اور توہین کے الزام بھی لگائے گئے تھے ۔ مدعیہ کی طرف سے ڈاکٹر شوکت سبزواری

نے اپنے دلائل پیش کئے۔ جب کہ مرزا رسوا کی جانب سے سبط حسن نے وکالت کی۔ معزز عدالت نے مقدمے کی پوری کارروائی نہایت غور و خوض سے سننے کے بعد مقدمہ خارج کرنے کا فیصلہ کر دیا ہے۔ یہ تمثیلی مقدمہ کیتھو سوفیکل ہال بندر روڈ میں پیش کیا گیا تھا شاعروں اور ادیبوں کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔

چین اور اسلام کا تعلق

چین کے ایک صوبے شنسی میں جو سکے برآمد ہوئے ہیں۔ اُن کے پیش نظر یہ بات اب یقین کو پہنچ گئی ہے کہ چین کا تعلق مسلمانوں سے ظہور اسلام کے ابتدائی زمانے سے ہے۔ سونے کے یہ تین سکے ۳۰۸ھ ۱۵۵ھ اور ۱۲۹ھ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے دونوں طرف کوفی رسم الخط میں قرآن مجید کی آیات کے علاوہ ایک سکے پر یہ فقرہ درج ہے "یہ دینار خدا کے نام پر ۳۰۸ھ میں بنایا گیا ہے" پہلے سکے کے درمیان میں کلمہ ہے اور اس کے چاروں طرف نویں سورت کی ۳۳ ویں آیت ہے۔ دوسری جانب سورۂ اخلاص تحریر ہے۔ باقی دونوں سکوں پر صرف سنہ مختلف ہیں باقی عبارات وہی ہیں۔ چینیوں اور عربوں کے تعلقات اُن عرب تاجروں کے مرہون منت ہیں جو چودہ سو سال پہلے ساری دنیا میں تجارتی مال لے جایا کرتے تھے۔

آئینہ خانے میں

احمد ندیم قاسمی کی نظمیں چینی زبان میں

معلوم ہوا ہے کہ پیکنگ کا غیر ملکی زبانوں کا ادارہ اردو کے مشہور شاعر احمد ندیم قاسمی کی نظموں کا مجموعہ چینی زبان میں شائع کر رہا ہے احمد ندیم قاسمی پاک و ہند کے پہلے شاعر ہیں جنھیں یہ اعزاز دیا گیا ہے۔ اس کتاب کی تقریباً ۵۰ لاکھ کاپیاں شائع ہوں گی۔ قاسمی صاحب کے علاوہ اردو اور بنگالی کے دوسرے شعرا اور ادیبوں کے مجموعے بھی چینی زبان میں ترجمہ کئے جا رہے ہیں اور انھیں بھی یہی ادارہ شائع کرے گا۔

احمد علی کا لیکچر

پاکستان امریکی کلچر سینٹر کے زیر اہتمام ایک ادبی نشست میں اردو کے مشہور ناول نگار اور نقاد پروفیسر احمد علی نے ایک مقالہ پڑھا۔ جس کا عنوان تھا "میر کی شاعری اور اس کا سوز" جناب احمد علی نے میر کی زندگی اور شاعری پر بصیرت افروز خیالات کا اظہار کیا جس میں امریکی شہریوں کے علاوہ مقامی طلبہ اور اہل قلم حضرات نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔

زیڈ اے سلیری کے خیال میں

مشہور صحافی جناب زیڈ اے سلیری نے ایک مقالے میں یہ تجویز پیش کی ہے کہ پاکستان کی دونوں قومی زبانوں کا رسم الخط قرآنی حروف میں ہونا چاہیئے۔ انھوں نے اپنے مقالے میں کہا ہے کہ پاکستان برصغیر میں اسلامی تہذیب کا آئینہ دار

ہے۔ اور اسلامی ہندی امتزاج اردو میں ظاہر ہوا ہے۔ آپ نے مزید فرمایا ہے کہ" اردو کو واحد قومی زبان کی حیثیت سے چھوڑ کر ہم نے مشرقی اور مغربی پاکستان میں باہمی اتحاد کے جذبے کو کمزور کیا ہے۔ اب اس کمی کو پورا کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ بنگالی کو قرآنی رسم الخط میں لکھا اور پڑھا جائے۔ اس کا ایک قابل عمل طریقہ یہ ہے کہ مغربی پاکستان میں بنگالی کو قرآنی رسم الخط میں پڑھا جائے بعد ازاں مشرقی پاکستان میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے" آپ نے کہا ہے کہ رسم الخط لوگوں کو متحد اور منقسم کرنے میں بہت بڑا کردار ادا کرتا ہے۔

یادوں کے چراغ

بابائے اردو کی یاد میں حیدر آباد میں فن کدہ کے زیر اہتمام یوم بابائے اردو منایا گیا جس کی صدارت نظر کامرانی صاحب کر رہے تھے۔ جلسے میں محسن بھوپالی۔ حسن ظہیر اور قاضی سراج نے اپنی تخلیقات پیش کیں۔ اس کے بعد ایک مشاعرہ ہوا جس میں بابائے اردو کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا گیا۔ ادارۂ عرفان القرآن ایجوکیشنل سوسائٹی کراچی میں لیاری کے طلبہ کی جانب سے بابائے اردو کی یاد میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں میر محمد ابراہیم بزرگ زادہ نے فرمایا کہ اردو چونکہ ہماری قومی زبان ہے اس لئے قومی زبان میں بہتر تعلیم اور اعلیٰ شخصیت کے فروغ کے لئے آسانیاں بہم پہنچانے کی وجہ سے ملک کو بہت فائدہ پہنچے گا اور ہمارے نوجوان تعلیم کے میدان میں زیادہ بہتر اور مفید کام کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ پاکستان اسٹوڈینٹس فیڈریشن کراچی کا ایک اجلاس بابائے اردو کی پانچویں برسی کے موقعے پر منعقد ہوا جس میں نائب صدر فیڈریشن اور جنرل سکریٹری نے بابائے اردو کی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ موجودہ انجمن ترقی اردو جو اردو کو فروغ دینے کا پاکستان بھر میں واحد ادارہ ہے بابائے اردو کے کارناموں میں سے ایک ہے۔ آخر میں فاتحہ خوانی بھی ہوئی۔

یوم شہدائے پاکستان یوم شہدائے پاکستان کے موقعے پر ماہنامہ نقش کی جانب سے "جنگ نمبر" شائع کیا گیا۔ اس نمبر کے افتتاح کے موقعے پر جناب ممتاز حسن نے جو اس تقریب کے خصوصی مہمان تھے فرمایا کہ نقش کا جنگ نمبر ایک ایسی دستاویز ہے جو برس ہا برس کتب خانوں میں محفوظ رکھی جائے گی۔ اس موقعے پر اجلاس کو جن حضرات نے خطاب کیا۔ ان میں جناب شاہد احمد دہلوی اور جناب نصر اللہ خاں کے نام قابل ذکر ہیں۔

آئینۂ ہند

بمبئی میں اردو حکومت مہاراشٹر نے مردم شماری کی ایک رپورٹ میں بتایا ہے، کہ بمبئی کی کل آبادی ۴۱ لاکھ ۵۲ ہزار ہے۔ اور پورے علاقے میں ۴۲ زبانیں بولی جاتی ہیں جن میں اردو تیسری بڑی زبان ہے۔ سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان مراٹھی ہے اور دوسری گجراتی۔ رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی چھوٹی زبانوں کو بولنے والوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔

بھارتی پارلیمنٹ کے ممبر بھارتی پارلیمنٹ کے ایک آزاد رکن مسٹر چٹرجی نے آل انڈیا اسٹوڈنٹس لینگویج کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کلکتے میں کہا انگریزی کو ایسے علاقوں میں جہاں ہندی نہیں بولی جاتی سرکاری زبان کی حیثیت سے قائم رکھا جائے۔ انھوں نے کہا کہ ملک کی یکجہتی، ثقافتی، سیاسی اور نظریاتی ترقی کے لئے انگریزی کا برقرار رہنا ضروری ہے۔

اردو کے ۴۲ جرائد کا حشر! ایک اطلاع کے مطابق بھارتی حکومت نے اردو کے ۴۲ جرائد بند کر دیئے ہیں۔ ان اخبارات میں صحیفہ۔ شعور (آندھرا) ندائے ملت، سیاست جدید اور ہماری آواز (یوپی) سنگم (بہار) نئی دنیا (دہلی) انصاف (مغربی بنگال) شامل ہیں۔ یہ رسالے ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت بند کئے گئے ہیں۔

مقبوضہ کشمیر میں سری نگر کی اطلاعات کے مطابق بھارتی حکومت نے مقبوضہ کشمیر کے تمام اسکولوں میں اردو کی بجائے ہندی کو ذریعۂ تعلیم بنا دیا ہے۔ یہ خیال رہے کہ پورے ہندستان میں صرف مقبوضہ کشمیر میں ہی ریاست کی سرکاری زبان اب تک اردو تھی۔ اور اردو کو ہر سطح پر مقبولیت حاصل تھی۔ ریاست کے اس فیصلے پر سارے بھارت کے مسلمان پریشان ہو گئے ہیں۔

ہفت روزہ "رہنما" حکومت ہند نے ہفت روزہ "رہنما" پر سے پابندی اٹھالی ہے۔ اور اس کو پھر سے جاری کئے جانے کی اجازت دے دی ہے "رہنما" کو پچھلے سال بند کر دیا گیا تھا اخبار کے مالک و مدیر حاجی مبارک اس کی دوبارہ اشاعت کے لئے کوشاں ہیں۔

صدر جمہوریۂ ہند کا ارشاد بھارتیہ ساہتکار پریشد کے زیر اہتمام ایک تقریب میں صدر جمہوریۂ ہند سرِ رادھا کرشنن نے ارشاد کیا ہے۔ "ہندوستان میں اردو اور سندھی زبان پر معقول توجہ نہیں کی گئی ہے۔ ان زبانوں کو قومی اتحاد اور قومی یکجہتی کے لئے زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جانا چاہیئے"

محمد ایوب قادری

مولوی عبدالاحد مرحوم
صاحب مطبع مجتبائی

مولوی عبدالاحد مالک مطبع مجتبائی دہلی، ۱۸۵۰ء میں بنارس میں پیدا ہوئے ان کے والد کا نام "غلام محمد" تھا۔ ابھی ان کی عمر چھ ماہ کی تھی کہ ان کے والد ماجد کا انتقال ہوگیا۔ ان کے علاوہ بیوہ والدہ اور ایک تین سال کی بڑی بہن تھیں، اس زمانے میں بنارس کالج میں مولانا محمد احسن نانوتوی مدرس اول فارسی تھے۔ انھوں نے ان بیوہ خاتون سے نکاح کرلیا۔ مولوی عبدالاحد نے مولانا محمد احسن کی سرپرستی میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔

یہاں مولانا محمد احسن کا مختصر سا ذکر ضروری ہے، مولانا محمد احسن نانوتوی، نامور عالم مدرس اور مصنف تھے وہ نانوتہ (ضلع سہارنپور) میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم اپنے والد حافظ لطف علی سے حاصل کی پھر دہلی گئے دہلی کالج میں تعلیم حاصل کی، مولانا مملوک العلی، مولوی سبحان بخش، مولانا احمد علی سہارنپوری اور شاہ عبدالغنی مجدد دہلوی ان کے اساتذہ تھے، مولانا محمد احسن بریلی کالج اور بنارس کالج میں عربی و فارسی کے پروفیسر رہے مولانا محمد احسن کے سرسید احمد خاں سے تعلقات تھے انھوں نے سرسید کی فرمائش پر گاڈفری ہگینس کی کتاب "اپالوجی" کا ترجمہ اردو میں حمایت الاسلام کے نام سے کیا۔ بریلی میں انھوں نے مطبع صدیقی قائم کیا جس سے علوم اسلامی کی بہت سی کتابیں طبع اور شائع ہوئیں۔ انھوں نے ۱۸۷۲ء میں ایک مدرسہ "مصباح التہذیب" کے نام سے قائم کیا جو اب تک مصباح العلوم کے نام سے بریلی میں موجود ہے۔

مولانا محمد احسن نانوتوی تصانیف کثیرہ کے مالک ہیں تحفۃ المحصلین، اصول جر ثقیل، نافع خریداران، قواعد اردو حصہ چہارم، رسالہ عروض، زاد المخدرات، مفید الطالبین (عربی) مذاق العارفین (اردو ترجمہ احیاء العلوم) تہذیب الایمان (اردو ترجمہ اغاثۃ اللہفان از حافظ ابن قیم) احسن المسائل (اردو ترجمہ کنز الدقائق) حمایت الاسلام، کشف (اردو ترجمہ انصاف از شاہ ولی اللہ) سلک مروارید (اردو ترجمہ

عقد الجید از شاہ ولی اللہ) نکات نماز وغیرہ ان سے یادگار ہیں۔

غایۃ الاوطار، خیر متین (اردو ترجمہ حصن حصین) حجۃ البالغہ، ازالۃ الخفا، شفا قاضی عیاض، کنوز الحقائق، نفحۃ الیمن، خلاصۃ الحساب، قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین، فتاوی عزیزی، جواہر القرآن وغیرہ کو مرتب و مہذب کرکے شائع کیا۔

مولانا محمد احسن نانوتوی کا انتقال ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۵ء میں دیوبند میں ہوا اور وہیں قبرستان قاسمی میں دفن ہیں[1]۔

مولانا محمد احسن مولوی عبدالاحد کی پرورش و پرداخت اور تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دیتے تھے اور ان کا ہر طرح خیال رکھتے تھے اور ان کے لئے کپڑے اکٹھے سلوائے جاتے تھے۔ روزانہ جیب خرچ ملتا تھا بیماری کی حالت میں نہایت توجہ اور غور سے علاج کرایا جاتا تھا۔ رمضان شریف میں مولوی عبدالاحد کے ختم قرآن پر اہتمام کے ساتھ شیرینی تقسیم ہوتی تھی۔ مولوی عبدالاحد چودہ سال کی عمر میں حفظ قرآن کریم سے فارغ ہوئے۔ مولانا محمد احسن سے درس نظامی کی تکمیل کی۔ اور ۱۸۶۹ء میں بریلی کالج سے انٹرینس پاس کیا ۱۸۷۰ء میں گورنمنٹ اسکول بدایوں میں تھرڈ ماسٹر مقرر ہوگئے اس زمانے میں بدایوں میں کوچہ عباس میں قیام کیا ۱۸۷۸ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے وکالت کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔ اسی سال انبالے میں "رسالہ نمبر ۵ انبگال"، کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ ۱۸۸۴ء میں ملازمت کا سلسلہ منقطع کردیا اور میرٹھ میں وکالت کرنے لگے[2]۔

۱۸۸۶ء میں مولوی عبدالاحد نے منشی ممتاز علی بن شیخ امجد علی سے مطبع مجتبائی دہلی پانچ سو روپے میں[3] خریدا کیونکہ منشی ممتاز علی حجاز مقدس کو ہجرت کرگئے۔ مولوی عبدالاحد مرحوم نے مطبع مجتبائی کو بہت ترقی دی اور دراصل یہی مطبع ان کی شہرت و نیک نامی اور دولت و امارت کا سبب بنا پہلے یہ ایک معمولی سا مطبع تھا مولوی صاحب مرحوم نے اس کو بہت ترقی دی اور جلد ہی یہ مطبع برصغیر پاک و ہند کے مشہور مطابع میں شمار ہونے لگا اور ایسا شہرت پذیر ہوا کہ آج تک اس کی ساکھ قائم ہے اور لوگ مطبع مجتبائی دہلی کی مطبوعات تلاش کرتے ہیں بلکہ بعض اوقات کئی گنا قیمت ادا کرکے مطبع مجتبائی کی مطبوعات حاصل کی جاتی ہیں۔

---

[1] مولانا محمد احسن نانوتوی کے حالات پر راقم الحروف کی ایک کتاب زیر طبع ہے۔

[2] یادگار دہلی از سید احمد دلی اللّٰہی ص ۸۲ - ۸۳

[3] اس مطبع کا بیعنامہ [illegible]

مولوی عبدالاحد مرحوم کا نام مطبع مجتبائی دہلی کی بدولت ہمیشہ زندہ رہے گا اس مطبع سے عربی، فارسی اور اردو کی ہزارہا کتابیں طبع و شائع ہوئیں اس طرح اس مطبع نے علوم اسلامی کی بڑی خدمت انجام دی ہے مولوی عبدالاحد مطبع کا ہر کام خود دیکھتے تھے چھوٹی چھوٹی چیزوں پر بھی نظر رکھتے تھے مطبع کے ملازمین کا خاص طور سے خیال رکھتے تھے اور ان کی ضرورت کی اشیا فوراً فراہم کی جاتیں۔ مطبع مجتبائی میں ایک شخص کالے خاں کا تقرر ہوا۔ مولوی عبدالاحد نے اپنے صاحبزادے عبدالعزیز کو تحریری ہدایت دی کہ یہ شخص ضعیف العمر ہے اس سے وزنی چیز نہ اٹھوائی جائے اور نہ دوڑ دھوپ کا کام لیا جائے[1]

مطبع مجتبائی دہلی میں نہایت مستند علما تصحیح و تالیف اور حواشی کا کام انجام دیتے تھے۔ مولانا محمد احسن نانوتوی، مولانا محمد منیر نانوتوی، مولوی فضل الرحمان (پسر مولانا محمد احسن نانوتوی) مولوی نظام الدین کیرانوی مولوی عطیل الرحمان برہان پوری، مولوی محمد اسحاق اور مولوی محمد بیگ کے نام قابل ذکر ہیں ماہر دہلویات یوسف بخاری لکھتے ہیں[2]

> "مطبع نول کشور لکھنؤ کے بعد اگر کسی مطبع نے لازوال شہرت پائی تو وہ واحد مطبع مجتبائی دہلی تھا..... انھوں نے اپنے حسن انتظام سے اس مطبع کو ایسی خوبی سے چلایا کہ سینکڑوں مذہبی، تاریخی اور بعض ادبی کتابوں کے درجنوں اڈیشن اور لاکھوں نسخے چھاپ ڈالے، ان دونوں بزرگوں کی تنہا یہ ایک خدمت ہی ایسا عظیم کارنامہ ہے کہ صدیوں ان کا نام زندہ اور باقی رہے گا یہ انھیں بزرگوں کا صدقہ جاریہ ہے کہ آج ہمارے کتب خانے مختلف علوم و فنون کی نایاب کتابوں سے معمور نظر آتے ہیں۔"

مولوی عبدالاحد نہایت نیک نفس، منکسر المزاج، ملنسار اور خلیق تھے۔ نقشبندیہ سلسلے میں بیعت تھے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں مولوی عبدالاحد نے ایک کتاب "حالات و مقالات مجدد الف ثانی" مرتب کی جو ۱۳۰۹ھ میں مطبع مجتبائی میں چھپی ہے۔

---

[1] قلمی بیاض مولوی عبدالاحد مرحوم (قلمی) مملوکہ حاجی عبدالمتین

[2] "یہ دلی ہے" از سید یوسف بخاری دہلوی ص ۱۰۲ (کراچی ۱۹۶۳ء)

مولوی عبد الاحد مرحوم اعزہؒ نانوتہ کی ہمیشہ مدد کرتے تھے قومی کاموں میں دل کھول کر حصہ لیتے تھے دہلی کے عمائد میں ان کا شمار ہوتا تھا مولوی بشیر الدین احمد (ف ۲۵ راگست ۱۹۲۷ء) مولف واقعات دار الحکومت دہلی لکھتے ہیں [1]

"دلی کے نہایت سربر آوردہ اشخاص میں آپ کا شمار ہے قومی کاموں میں بہت دلچسپی لیتے ہیں علی گڑھ کالج کے ٹرسٹی ہیں۔ آنریری مجسٹریٹ ہیں اسی سال (۱۹۱۸ء) آپ کو خان بہادر کا خطاب ملا ہے دہلی میں ایسا کوئی قومی جلسہ یا اہم کام نہ ہوگا جس میں آپ سب سے آگے نہ ہوں دل کھول کر قومی کاموں میں جان و مال سے شرکت کرتے ہیں جامع مسجد، مسجد فتح پوری، عربک اسکول، یتیم خانوں وغیرہ کے ممبر ہیں"

شمس العلما سید احمد امام جامع مسجد دہلی (خط ۲۰ ربیع الثانی ۱۳۶۷ھ م ۹ ستمبر ۱۹۴۷ء) کا بیان ہے [2]

"خان بہادر عبد الاحد مطبع مجتبائی کے مالک تھے ان کی جفاکشی اور مصروفیتوں کا اندازہ لگانا امر محال ہے معمولی سرمائے سے یک و تنہا کام شروع کیا اور لاکھوں روپے پیدا کیے مگر اس کے باوجود انکسار سادہ مزاجی اور ٹکا گز کی چال رہی۔ البتہ قوم کے کاموں اور تعلیمی اداروں میں انھوں نے بڑی فراخ دلی سے چندے دیئے۔ علی گڑھ کالج عربک دہلی کالج، اور انجمن موئد الاسلام[3] کے بے حد دلدادہ تھے اور ہمیشہ ان کی مالی امداد کرتے رہے حکیم اجمل خاں

---

[1] "واقعات دار الحکومت دہلی" از بشیر الدین احمد جلد دوم ص ۱۹۱ (شمسی پریس آگرہ ۱۹۱۹ء)

[2] بحوالہ "یہ دلی ہے" از یوسف بخاری ص ۱۱۳

[3] انجمن موئد الاسلام منشی محمد کرم اللہ خاں صاحب رئیس اعظم دہلی نے ۱۳۱۰ھ میں قائم کی تھی تفصیل کے لئے دیکھئے "واقعات دار الحکومت دہلی" جلد دوم ص ۱۷۰ (محمد ایوب قادری)

کے طبیہ کالج میں جو شاندار خدمات ان سے انجام پائیں حکیم صاحب
ان کا عمر بھر اعتراف کرتے رہے۔"

پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء میں مولوی عبدالاحد نے حکومت برطانیہ کی بے مثال خدمت انجام دی انہوں نے وار فنڈ میں دل کھول کر چندہ دیا اور تقریباً تین لاکھ روپیہ قرضۂ جنگ میں دیا۔ انہوں نے سٹی ریکروٹنگ کمیٹی اور پبلسٹی کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے بھی نمایاں خدمات انجام دیں۔ ان خدمات کے صلہ میں گورنمنٹ برطانیہ نے مولوی عبدالاحد مرحوم کو خلعت، سند اور خان بہادر کے خطاب سے نوازا۔

۲ر دسمبر ۱۹۲۰ء کو مولوی عبدالاحد کا انتقال ہوا، اس زمانے میں خلافت کی تحریک زوروں پر تھی حکام رس اور خطاب یافتہ حضرات کو لوگ اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے لہٰذا بعض لوگوں نے مولوی عبدالاحد مرحوم کی میت کی تدفین میں سخت رکاوٹیں ڈالیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، شمس العلما سید احمد امام جامع مسجد دہلی لکھتے ہیں [۱]

"۲ر دسمبر ۱۹۲۰ء مطابق ۲۰ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ یوم جمعرات کو شب کے وقت مولوی عبدالاحد کا انتقال ہوا، دوسرے روز جمعہ کو عبداللہ چوڑی والے، عزیز حسن بقائی، عارف ہسوی (ف ۱۹۳۶ء) عزیز الدین چوڑی والے اور چند لوگوں نے مولوی صاحب مرحوم کی نعش کی توہین کی اور قبرستان میں دفن ہونے کے مانع اور مستعد فساد ہوئے ناچار راہ قبرستان سے واپس مکان پر جنازہ آیا حکام وغیرہ پولیس لے کر آئے انجام کار باہمی سمجھوتہ ہوا اور تمام مسلمان نماز جنازہ جامع مسجد میں ادا کر کے قبرستان مہندیاں قبل مغرب لے گئے اور وہاں دفن کیا۔"

حکومت نے مولوی عبدالاحد مرحوم کی نعش کی توہین کرنے کے سلسلے میں ان لوگوں پر مقدمہ چلایا جس میں عبداللہ چوڑی والے اور عزیز حسن بقائی کو تین تین ماہ قید ہوئی اور عارف ہسوی بری ہوئے [۲]۔

---

[۱] بیاض شمس العلما سید احمد امام جامع مسجد دہلی ص ۱۸ (قلمی) (مملوکہ سید یوسف بخاری)
[۲] " " " " ص ۱۸

اس واقعے کی تفصیل سید یوسف بخاری کے قلم سے سنیئے [1]

"یہ واقعہ ہے کہ مسلمان ایک مردہ پرست قوم ہے لیکن اس مردہ پرست قوم کی مردہ پرستی کا ذرا یہ رنگ بھی ملاحظہ ہو، ۱۹۲۰ء میں جب تحریک خلافت اپنے شباب پر تھی حکیم اجمل خاں ترک موالات کے سلسلے میں اپنا خاندانی خطاب "حاذق الملک" ایسے وقت اور ایسی صورت میں حکومت کو واپس کر چکے تھے جب کہ ہندوؤں میں کوئی ایک متنفس بھی اپنی "رائے صاحبی" اور "رائے بہادری" سے دست بردار نہ ہوا تھا حکیم صاحب کے خطاب واپس کرتے ہی امام صاحب (جامع مسجد دہلی) پر یورش ہوئی ان کی اقتدا میں نماز ترک کی گئی، ان کے برادر خورد، راقم کے والد سید حامد (ف ۲۵ رجمادی الاول ۱۳۵۵ھ م ۱۴ اگست ۱۹۳۶ء) کو ممبر مسجد کے روبرو حوض میں نہلایا گیا۔ کم و بیش یہی جرم مولوی عبدالاحد مرحوم کا بھی تھا کہ وہ حکام رس تھے، خطاب یافتہ تھے لہٰذا ۲۵ دسمبر ۱۹۲۰ء کو جب مولوی صاحب نے اپنا سفر آخرت اختیار کیا تو اس مخدوم ملت کے متعلق زبانی اور پوسٹر چسپاں کر کے اعلان کیا گیا کہ مرحوم انگریز پرست تھا خطاب یافتہ تھا، ٹوڈی تھا، کافر تھا، مسلمان اس کی نماز جنازہ نہ پڑھیں۔ اس کی میت بھی دفن نہ ہونے پائے۔ چنانچہ ابھی جنازہ قبرستان کی راہ ہی میں تھا کہ اسے روک دیا گیا مجبوراً جنازہ مکان پر واپس آیا، بلوہ عام کا اندیشہ اتنا غالب تھا کہ حکومت کو فی الفور مداخلت کرنی پڑی۔ ادھر پولیس اور فوج

---

[1] یہ تقریر مولوی محمد محمود تھانوی (ف ۱۹۳۶ء) بن مولانا شیخ محمد تھانوی نے کی تھی مولوی محمد محمود، مولوی عبدالاحد مرحوم کے برادر نسبتی تھے (محمد ایوب قادری)

نے محلہ چوڑی والان کی ہر طرف سے ناکہ بندی کر کے
مجمع کو منتشر ہونے کا حکم دیا ادھر مولوی عبد اللطیف مرحوم
خلف مولوی عبد الاحد نے اپنے مکان کی چھت پر
چڑھ کر تقریر کی - مولوی صاحب کی خدمات کو یاد دلایا
شکوک اور الزامات کی صفائی پیش کی - یوں خدا خدا کر کے
غلط فہمی کا ازالہ ہوا - پھر نعش کی توہین کرنے والے لوگوں
ہی نے عوام کے سامنے جامع مسجد میں ان کی نماز جنازہ
پڑھی اور بعد مغرب قبرستان مہندیاں (مدفن شاہ عبد العزیز)
میں سپرد خاک کیا یہ تھا وہ صلہ جو اس مردہ پرست قوم نے
اپنے اس سربرآوردہ خیر خواہ قوم و ملت مولوی عبد الاحد
کو ان کے مرنے کے بعد دیا تھا "

مولوی عبد الاحد کی دو شادیاں ہوئیں پہلی بیوی سکینہ دیوبند کی تھیں ان سے سات لڑکے اور دو لڑکیاں ہوئیں لڑکوں کے نام عبد اللطیف، عبد العلیم، عبد الحمید، عبد المجید، عبد الحفیظ، عبد المتین اور عبد الوحید ہیں اور لڑکیوں کے نام رابعہ بیگم اور خدیجہ بیگم (امت العزیز) ہیں لڑکوں میں عبد المتین اور خان بہادر عبد المجید زندہ ہیں - حاجی عبد المتین صاحب مکتبہ احدیہ (مشن روڈ کراچی) کے مالک ہیں -

---

(بقیہ صفحہ)

ڈاکٹر صاحب نے اس کے بعد ان تمام پرائیویٹ اور پبلک لائبریریوں کا ذکر کیا ہے جن سے انھوں نے استفادہ کیا - اس فہرست میں احمد آباد، بانکی پور، بلگام، بمبئی، بیجا پور، پٹنہ، پونہ، حیدر آباد، ڈھاکا رام پور، ستارہ، علی گڑھ، کپور تھلہ، کراچی، کلکتا، لاہور، مدراس کے علاوہ آکسفورڈ. لندن کی اڈنبرا یونی ورسٹی اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز - انڈیا ہاؤس - برٹش میوزیم - بوڈلین - رائل ایشیاٹک اور کیمبرج یونیورسٹی کی لائبریریوں کا جائزہ ہے - مزید برآں ببلوتھک نیشنل - میونخ - پیرگ - ڈرسڈن - وینا - گوتھا بینٹ پیٹرس برگ - تورن - آپ سولا - لیڈن - وغیرہ لائبریریوں کی مطبوعہ فہرستوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے

ڈاکٹر صاحب نے اپنی لائبریری کے لئے ڈیوی اعشاری تقسیم کو اپناتے ہوئے ایک نیا سسٹم پیش کیا ہے جو ڈیوی سے بہت آسان ہے -

احمد رفاعی

ذوق کی قصیدہ نگاری

ذوق کی قصیدہ نگاری کے باب میں ان کے عزیز شاگرد مولانا محمد حسین آزاد کی رائے ہے :۔

"نظم اردو کی نقاشی میں مرزائے موصوف (سودا) نے قصیدے پر دست کاری کا حق ادا کر دیا ہے ان کے بعد شیخ موصوف کے سوا کسی نے اس پر قلم نہیں اٹھایا اور انھوں نے مرقع کو ایسی اونچی محراب پر سجایا کہ جہاں تک کسی کا ہاتھ نہیں پہنچتا۔ انوری، ظہوری، عرفی، فارسی کے آسمان پر بجلی ہو کر چمکتے ہیں لیکن ان کے قصیدوں نے اپنی کڑک دمک سے ہند کی زمین کو آسمان بنا دیا ہے"[1]

مولانا آزاد کی اس رائے کو ناقدین نے کسی قدر مبالغہ آمیز گردانا ہے لیکن اس حقیقت سے انکار کی گنجائش نہیں ہے کہ سودا کے بعد اردو قصیدہ گوئی کے سنہری سلسلے کی اہم ترین کڑی ذوق ہی ہیں، قصیدہ نگاری ذوق کے بعد بھی جاری رہی لیکن یہ واقعہ ہے کہ اردو ادب کی پوری تاریخ میں سودا کو چھوڑ کر کوئی اور قصیدہ نگار ان کا مدمقابل نہیں ہے۔

ذوق کے مطبوعہ قصائد جو میری نظر سے گزرے ہیں ان کی مجموعی تعداد چوبیس[2] ہے اس کے علاوہ دو قصائد غیر مطبوعہ دریافت ہوئے ہیں، علاوہ ازیں کچھ رباعیات اور مخمسات ہیں جو مدحیہ شاعری کے دائرے میں آتے ہیں، کچھ بکھرے ہوئے مطلعے اشعار اور فردیات کا سراغ بھی لگا ہے جو ان نامکمل یا گم شدہ قصائد کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ذوق کے ممدوحین کی تعداد بہت محدود ہے، ان کے بیشتر قصائد اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ہیں، ایک مختصر سا قصیدہ سید عاشق بیا...

[1] آب حیات ص ۴۸۵

کی مدح میں ملتا ہے اور ایک غیر مطبوعہ قصیدہ حمید الدولہ مرزا مغل کی تعریف میں پایا جاتا ہے۔ ایک روایت کے مطابق ان کے وہ قصیدے جو اکبر شاہ کی مدح میں ہیں وہ بھی دراصل بہادر شاہ کی مدح میں کہے گئے ہیں، اس بارے میں مولانا آزاد نے ایک جگہ صراحت کرتے ہوئے کہا ہے:-

> "جب تک اکبر شاہ زندہ تھے تب تک ان کا یہ دستور تھا
> کہ قصیدہ کہہ کر لے جاتے اور اپنے آقا ولی عہد بہادر کو
> سناتے، دوسرے دن ولی عہد ممدوح اس میں اپنی جگہ
> بادشاہ کا نام ڈال کر لے جاتے اور دربار شاہی میں سناتے[۱]"

مولانا آزاد کی اس رائے سے قطع نظر جب ہم ذوق کے مطبوعہ قصائد کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان میں بارہ[۱۲] قصائد اکبر شاہ کی مدح میں ہیں، دس[۱۰] قصائد بہادر شاہ ظفر کی اور ایک قصیدہ کسی بزرگ سید عاشق نہاں کی تعریف میں ملتا ہے، ان قصائد کے علاوہ ایک قصیدہ جو کسی جشن نوروز کی تقریب میں پیش کیا گیا وہ بھی غالباً اکبر شاہ ثانی کی مدح میں ہے۔ اس موخذ الذکر قصیدے کا مطلع شعر یہ ہے ؎

طرب افزا ہے وہ نوروز کا نارنجی رنگ   دیکھ کر بھاگے جیسے رنج ہزاروں فرسنگ

ذوق کے قصائد کا مطالعہ کرتے وقت ان کے سن تصنیف کا تعین دشوار ہے صرف ایک قصیدہ جو اکبر شاہ ثانی کی مدح میں ہے ان کے فرزند جہانگیر شاہ کی تقریب شادی کے موقع پر پیش کیا گیا اس کے ایک شعر سے تاریخ تصنیف ظاہر ہوتی ہے۔ جو ذیل میں درج ہے۔

کہو سر لب بستہ سے شادیٔ فرزند   مبارک آپ کو اے شہ سپہر وقار

اس شعر میں تعمیہ کے طریق پر اس شادی کے سن نکلتے ہیں۔ یعنی مصرع ثانی کے اعداد ہوئے ۱۱۹۴۔ لب بستہ کا سر ہوا۔ ل۔ اور ۔ ب۔ جس کے ہوئے ۳۲ عدد۔ اب کل جمع کئے تو ہوئے ۱۲۲۶ھ۔

البتہ مولانا آزاد نے بعض قصائد کے باب میں سن تصنیف کا تعین کر دیا ہے جس کے سبب ہماری دشواری کسی قدر کم ضرور ہو گئی ہے لیکن چونکہ ہر قصیدے کے ضمن میں یہ التزام نہیں کیا جا سکا ہے لہٰذا ذوق کے زور طبیعت اور ان کے فکر و خیال کی بدلتی اور پروان چڑھتی ہوئی نہج کا

---

[۱] آب حیات ص ۴۸۵

اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ صرف از روئے قیاس یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے ایسے قصائد جن میں سادگی و روانی اور طبیعت کا فطری جوش موجود ہے وہ ان کی شعرگوئی کے دور اوّلین کی تخلیقات میں سے ہوں گے اور ایسے قصائد جن میں تکلف و تصنع اور مشاقانہ پختگی و پائیداری کے عناصر گھلے ملے ہوں وہ ان کے دور ما بعد کی یادگار ہیں۔ اس قیاس کو تقویت اس وجہ سے بھی ملتی ہے کہ دور ما بعد میں جب شاہ نصیر سے قطع تعلق۔ نیز معرکہ آرائی کے سبب طبیعت مشکل پسندی، صناعی اور صورت گری کی طرف مائل ہوئی تو اس کا اثر بالواسطہ ان کی قصیدہ گوئی پر بھی مترتب ہوا۔

ذوق کے دربار شاہی میں باریاب ہونے کے متعلق مولانا آزاد کا یہ بیان قابلِ لحاظ ہے فرماتے ہیں:۔

"کسی دوست نے فرمائش کی کہ زمین مرقومتہ الذیل (مے پلا کر ساقیا نے سامری فن آب میں) آج کل طرح ہوئی ہے آپ بھی غزل کہیئے، آغاز شباب تھا اور طبیعت میں ذوق و شوق۔ غزل کہی۔ اس کا جا بجا چرچا ہوا۔ یہاں تک کہ اکبر شاہ جنت آرام گاہ ان دنوں بادشاہ تھے۔ انھوں نے فرمائش کی کہ میاں ابراہیم سے کہو کہ ہمیں خود آکر غزل سنائیں یہ ولی عہد یعنی مرزا ابوظفر کے ملازم خدمت تھے لیکن حضور بھی ان کے کلام کو سنتے تھے اور خوش ہوتے تھے، ایک قصیدہ ان کی مدح میں کہہ کر شامل کر دیا"[1]

اکبر شاہ کی تعریف میں کہے گئے ایک قصیدے کی تشبیب میں اپنی برگشتہ طالعی کا ذکر کرتے ہوئے ذوق نے اس طرح گریز کیا ہے ؎

یہ کہہ رہا تھا میں جو یکبار عقل بولی	وہ بات کہہ کہ جس میں میری بھی دلبری ہو
مجھ کو خبر نہیں کیا ہے دورِ شاہ اکبر	رفعت سے پست جس کے شان سکندری ہو
ہے فکر کیا جب ایسا فیاض ہو جہاں میں	اور دل کا اس کے مقصد خود بندہ پروری ہو
مثل سحاب جا کر باندھے ہو افلاک پر	جس پر کہ اس کی چشم الطاف سرسری ہو
دربار میں تو اس کے ہو بہرہ یاب جا کر	بہروزی ہووے میری اور تیری بہتری ہو

---

[1] دیوان ذوق مرتبہ آزاد ص ۱۴۸

ان اشعار کی روشنی میں اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً یہی وہ قصیدہ ہے جس کا حوالہ مولانا آزاد نے دیا ہے، اس قصیدے کا مطلع شعر اور بعد والے اشعار سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے مثلاً ؎

خضر نصیب کی گردنیا میں رہبری ہو ۔۔۔ اور شاہ راہ دل پر چشم ہنروری ہو
منظور ہر نظر میں تب مثل آئینہ ہوا ۔۔۔ روشن قلم سے میرے تاج سکندری ہو
تارے کی طرح چمکے ذرہ مرے سخن کا ۔۔۔ اور نام میرا روشن جوں مہر مشتری ہو

ذوق کو دراصل اس حقیقت کا شعوری طور پر احساس تھا کہ مقدر کے ساتھ ساتھ ہنرمندی ضروری ہے اس کے بغیر قربِ شاہ ممکن نہیں، اسی قصیدے میں آگے چل کر اس خیال کی مزید صراحت کر دی گئی ہے ؎

لیکن رہ رسائی اس وقت ہو گی روشن ۔۔۔ جب خضر راہ تیری طبع سخنوری ہو

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذوق کے فکروفن کو نکھارنے میں قربِ شاہ کی خواہش نے خاص طور پر حصہ لیا ہے، غالباً ذوق کی یہ امید بر آئی اور اس قصیدے کی پیش کش کے بعد وہ باقاعدہ طور پر دربار شاہی سے منسلک ہو گئے۔ قرائن کی رو سے یہ ۱۲۲۱ھ سے ۱۲۲۲ھ کے درمیان کا واقعہ ہو سکتا ہے۔

۱۲۲۶ھ میں شہزادہ جہانگیر کے جشن شادی کے موقع پر ذوق نے ایک تہنیتی قصیدہ پیش کیا ہے ؎

قلم جو صفحۂ کاغذ پہ ہووے نکتہ نگار ۔۔۔ تو اپنے نقش مٹا دیں جہاں کے جادو نگار

اس قصیدے کی پیش کش کے کچھ ہی عرصے بعد شہزادۂ سلیم کے جشنِ شادی کے موقع پر ذوق نے ایک اور زوردار قصیدہ نذر گزرانا ؎

اُفقِ دل پہ مرے عیش وطرب دونوں ہم ۔۔۔ آج یوں آئے سحر جیسے دو پیکر توام

اس قصیدے کا سن تصنیف بھی ۱۲۲۶ھ کے لگ بھگ بتایا جاتا ہے۔ ان دونوں قصائد کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ذوق کا فن تیزی کے ساتھ ارتقائی مدارج طے کرتا رہتا ہے۔ مولانا آزاد کے بیان کے مطابق اس موخر الذکر قصیدے کے ساتھ ساتھ ذوق نے موقع کی مناسبت سے ایک تہنیتی مثنوی بھی کہی تھی جس کی بحر مثنوی کی مقرر کردہ بحروں سے علیحدہ تھی، اس مثنوی کا لوگوں میں خاص طور پر چرچا ہوا اور اس بدعت کو ناجائز قرار دیا گیا۔ غالباً لوگوں کے اعتراض کے سبب ذوق نے اسے ضائع کر دیا، مولانا آزاد نے آب حیات میں اس کے دو شعر نقل کئے ہیں جن میں ساچق کی رسم کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ دونوں شعر ذیل میں درج کئے جاتے ہیں ؎

ٹھلیاں تو نہ تھیں وہ مٹے عشرت کے سبو تھے ۔۔۔ یا قلزم ہستی کے حباب لب جو تھے

لازم تھا کہ لکھ باندھتے یہ اُن کے گلو میں — ہے بند کیا عیش کے دریا کو سبو میں[۵]

ذوق اور شاہ نصیر کے تعلقات کی ابتدا ۱۲۱۸ھ کے قریب ہوتی ہے، اس سے پہلے وہ حافظ شوق سے اصلاح لیتے تھے، غالباً شاہ نصیر سے اصلاحِ سخن کا سلسلہ بہت مختصر عرصے جاری رہا، وہ اپنی خداداد ذہانت اور تیزیٔ طبع کی بدولت بہت جلد اس سے بے نیاز ہو گئے، شاہ نصیر کے متعلق کہا جاتا ہے وہ ۱۲۱۹ھ میں پہلی بار دکن گئے - یہ اعظم الامراء ارسطو جاہ کی عمل داری کا آخری زمانہ تھا تھوڑے ہی دنوں بعد ان کی وفات ہو گئی اور راجہ چندو لال کا عہدِ وزارت شروع ہوا اس وقت تک ذوق کی عمر سولہ سترہ سال سے زیادہ نہیں تھی، غالباً شاہ صاحب کے دکن چلے جانے کے دو سال بعد اپنے استاد بھائی میر کاظم حسین کے توسط سے ذوق ولی عہد بہادر کے متوسلین میں شامل ہوئے - اردو اخبار ۱۸ر نومبر ۱۸۵۴ء مطابق ۲۷ر صفر ۱۲۷۱ھ ذوق کی وفات کے موقع پر اس واقعے کی صراحت کرتے ہوئے لکھتا ہے -

" ۱۹ برس کی عمر تھی کہ عالمِ ولی عہدیٔ حضور میں باریابِ دربارِ ولی عہدی ہوئے "

ولی عہد خود شاہ نصیر کے شاگرد تھے، شاہ نصیر کے دکن چلے جانے کے بعد میر کاظم حسین ان کی غزل بنانے لگے اور جب وہ بھی جان الفنسٹن کے میر منشی ہو کر باہر چلے گئے تو یہ عہدہ ذوق کے سپرد ہوا یہ واقعہ ۱۲۲۳ھ کا ہے اور اس وقت ذوق کی عمر لگ بھگ ۲۲ برس کی تھی، اس وقت تک ان کی ادبی حیثیت متعین نہیں ہوئی تھی لیکن ان کے کلام کا چرچا جا بجا ہونے لگا تھا - اس بنا پر ولی عہد ان سے گاہ گاہ مشورۂ سخن کرتے تھے لیکن استادانہ درجہ ہرگز نہ دیتے تھے - اس چیز کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ جب چند برس بعد شاہ نصیر دکن سے لوٹے اور ایک مشاعرہ میں ۹ شعر کی ایک غزل جس کی ردیف " آتش و آب و باد و خاک " تھی سنائی اور کہا اس طرح میں جو غزل کہے اسے استاد مانتا ہوں تو ذوق نے جن کی مشق بقول مولانا آزاد ان دنوں زوروں پر تھی، ایک قصیدہ اسی طرح میں بادشاہ کی مدح میں کہا اور اسے مولوی شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی خدمت میں لے گئے کہ اس کی صحت و سقم سے آگاہ فرمائیں - انھوں نے سن کر پڑھنے کی اجازت دے دی، لیکن ولی عہد نے اس کو اپنے شقہ کے ساتھ پھر شاہ صاحب کے پاس بھیج دیا، شاہ صاحب نے جواب میں اس شعر کے ساتھ واپس کر دیا ؎

---

[۵] آبِ حیات ص ۴۶۹

بود بگفتۂ من حربِ اعتراض چناں   کسے بدیدۂ بینا فرد برد انگشت

یہ قصیدہ دربارِ شاہی میں سنایا گیا اور اس کے بعد مشاعرے میں پڑھا گیا، اس قصیدے کا مطلع تھا ؎

کوہ اور آندھی میں ہوں گر آتش و آب دباد و خاک   آج نہ چل سکیں گے پر آتش و آب دباد و خاک

شاہ نصیر کے ایک شاگرد نے اعتراض کیا کہ سنگ میں آتش کے چلنے کا ثبوت چاہیئے۔ اس کا جواب دیا گیا۔ دوسرا اعتراض ہوا کہ سنگ میں آتش کا ثبوت چاہیئے اور شعری سند کے طور پر۔ اس پر ذوق نے حسن تاثیر کا یہ شعر پڑھ دیا ؎

پیش از ظہور جلوہ جانانہ سو ختیم   آتش بہ سنگ بود کہ ما خانہ سو ختیم

اسی طرح سوال و جواب ہوتے رہے اور درمیان میں شاہ نصیر بھی دخل دیتے رہے آخر میں ذوق نے شاہ نصیر سے مخاطب ہو کر کہا " آپ نے نو شعر کی غزل پڑھ کر فرمایا تھا کہ اس طرح میں کوئی غزل کہے تو ہم اُسے استاد جانیں میں نے تو ایک غزل اور تین قصیدے لکھے اب بھی استاد نہ ہوا "

بادشاہ کا مذکورہ قصیدے کو اپنے شقہ کے ساتھ شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں بھیجنا اس درخواست کے ساتھ اس کی صحت و سقم سے آگاہ فرمائیں، نیز خود ذوق کا برسر مشاعرہ شاہ نصیر سے یہ کہنا کہ " اب بھی میں استاد نہ ہوا" اس حقیقت کا اظہار ہے کہ کملائے دہلی اس وقت تک انھیں استاد تسلیم نہیں کرتے تھے۔ شاہ نصیر اور ذوق کی معرکہ آرائیوں کے باب میں مولانا آزاد نے تفصیل سے لکھا ہے" حیات ذوق " کے مصنف احمد حسین لاہوری نے بھی اس پر بہت کچھ روشنی ڈالی ہے لیکن ہم یہ تفصیلات یہاں غیر ضروری سمجھتے ہوئے قلم زد کرتے ہیں البتہ اتنا عرض کر دیا جائے تو نامناسب نہ ہو گا کہ ۱۲۳۳ھ تک ذوق کے شاہ نصیر سے تعلقات بالکل منقطع ہو گئے اور اب وہ زمانہ آگیا تھا کہ ذوق اپنی صلاحیت شعر گوئی اور کثرت مشق سخن کی بدولت اساتذۂ دہلی میں شمار ہونے لگے تھے۔ تذکرۂ صدرالدین آزردہ جس کا روٹوگراف ڈاکٹر مختار الدین آرزو علی گڑھ کی تحویل میں بتایا جاتا ہے اور جس کے متعلق یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ وہ مفتی صاحب کی خانہ نشینی (۱۲۲۷ھ - ۱۲۳۳ھ) کے درمیان ترتیب دیا گیا اس میں ذوق کے متعلق کہا گیا ہے:۔

" وز بدایت حال اشعار خود بہ نظر محمد نصیر الدین متخلص بہ نصیر
کہ از مشاہیر شعرائے ریختہ گویان دہلی است آوردہ ، آخر
با کثرتِ مشق دریں فن بجائے رسیدہ کہ امروز در قوۃ سخن گوئی

در اقران و امثال خود ممتاز ہست" [۵]

۱۲۲۳ھ سے ۱۲۵۳ھ کے درمیانی وقفے میں ذوق کا ملکۂ شعرگوئی اپنے شباب پر پہنچ چکا تھا اس دوران میں ذوق نے زیادہ تر قصائد اکبر شاہ کی مدح میں کہے صرف ایک قصیدہ " واہ وا کیا معتدل ہے باغ عالم کی ہوا " بہادر شاہ کی مدح میں ملتا ہے جو عالم ولی عہدی میں ان کے کسی غسل صحت کے موقع پر پیش کیا گیا، بقیہ قصائد جو اکبر شاہ کی مدح میں ہیں مطلعی اشعار کے اعتبار سے ان کی ترتیب درج ذیل ہے۔

۱۔ قلم جو صفحۂ کاغذ پہ ہو وے نکتہ نگار تو اپنے نقش مٹا دیں جہاں کے جادو نگار

۲۔ صبح سعادت، نور ارادت، تن بہ ریاضت دل بہ تمنا
حلوۂ قدرت، عالم وحدت، چشم بصیرت، محو تماشا

۳۔ سحر جو گھر میں، بشکل آئینہ تھا میں بیٹھا، نظارہ حیراں
تو اک پری چہرہ، حور طلعت، بشکل بلقیس و ماہ کنعاں

۴۔ صبح دم فکر جو تھی سیر فلک کی مشتاق عرش پر اڑ گئی اک آن میں مانند براق

۵۔ تا زباں زد دہر میں ہو فلسفی کا یہ کلام ہے پئے افلاک لازم نفی خرق و التیام

۶۔ گردش میں چشم مست کی ہو دل مرا گرہ اور کھولے ہائے دالے کی یوں آسیا گرہ

۷۔ خضر نصیب کی گر دنیا میں رہبری ہو اور شاہ راہ دل پر چشم ہنر دری ہو

۸۔ دل کہ اس دہر میں ہے گرسنۂ ناز بتاں نم تیغ اس کو غنیمت ہے کہ دیکھا لب ناں

۹۔ ساون میں دیا پھر مہ شوال دکھائی برسات میں عید آئی قدح کش کی بن آئی

۱۰۔ شاہا جمال حسن کا تیرے کھوں میں وصف کیا ظاہر میں تو ظل خدا باطن میں تو نور خدا (مخمس)

۱۱۔ افق دل پہ مرے عیش و طرب دونوں بہم آج یوں آئے سحر جیسے دو پیکر توام

۱۲۔ خسروا جلوہ ترا دہ طرب افزائے جہاں کہ جسے دیکھ کے ہو عید بھی قرباں قرباں

" خاقانی ہند " کا خطاب ذوق کو اکبر شاہ کی سرکار سے ملا، اس باب میں دہلی اردو اخبار ۱۸ نومبر ۱۸۵۴ء مطابق ۲۷ صفر المظفر ۱۲۷۱ھ رقم طراز ہے :-

" علاوہ قصائد سابقہ کے ایک قصیدہ مدح اعلیٰ حضرت

۵- تذکرۂ صدر الدین ص ۲۲۰

میں کہہ کر پڑھا، جس میں صنائع بدائع متکاثرہ استعمال
کی گئی تھیں، علاوہ بریں ایک عجیب و غریب صنعت
اس میں یہ تھی کہ اٹھارہ شعر اٹھارہ زبانوں میں تھے، ہر
ایک شعر ہر ایک بولی میں علیحدہ تھا، مثلاً فارسی، عربی،
ترکی، حبشی، پشتو، پنجابی، بھاشا، شاستری، مارواڑی،
بنگالی، میسور، جھنگ، سیالہ، انگریزی، جرمنی، لاطینی،
فرانسیسی وغیرہ کہ انشاء اللہ تعالیٰ واسطے ملاحظہ ناظرین کے
درج اخبار کیا جائے گا، جس پر خطاب خاقانیٔ ہند ملا،
علاوہ بر آں انعاماتِ معمولی و مکارم سابقہ بارگاہ اعلیٰ حضرت
سے مرحمت ہوا۔"

دہلی اخبار نے واضح طور پر اس قصیدے کی نشاندہی نہیں کی اور نہ ہی اس ضمن میں سن و تاریخ کا تعین کیا البتہ مولانا آزاد نے کسی قدر صراحت فرمادی ہے، ان کا بیان ہے:-

"انھوں نے ایک قصیدہ اکبر شاہ کے دربار میں کہہ کر سنایا
جس کے مختلف شعروں میں انواع و اقسام کے صنائع بدائع
صرف کئے گئے تھے، اس کے علاوہ ایک ایک زبان میں جو
ایک ایک شعر تھا ان کی تعداد اٹھارہ تھی مطلع اس کا
یہ ہے:-

جب کہ سرطان و اسد مہر کا ٹھیرا مسکن آب و ایلولہ ہوئے نشو و نمائے گلشن

اس پر بادشاہ نے "خاقانیٔ ہند" کا خطاب عطا فرمایا، اس وقت شیخ مرحوم کی عمر انیس برس کی تھی۔

مولانا نے جس قصیدے کا حوالہ دیا ہے وہ بدقسمتی سے ذوق کے مطبوعہ قصائد میں ہماری نظر سے نہیں گزرا، مزید برآں مولانا کا یہ بیان بھی محل نظر ہے کہ جس وقت ذوق کو یہ خطاب عطا ہوا اس وقت ان کی عمر انیس برس کی تھی۔ ذوق کا سن پیدائش ۱۲۰۳ھ بتایا جاتا ہے، اس اعتبار سے مولانا آزاد کے بیان کے مطابق یہ خطاب ۱۲۲۲ھ تک مل جانا چاہیئے، لیکن حقائق اس بات کی تائید نہیں کرتے اس لئے کہ ۱۲۲۲ھ تک تو ذوق صرف ولی عہد کی سرکار سے متعلق تھے اور اس وقت تک

ہ کا ادبی مرتبہ بھی متعین نہیں ہوا تھا، نیز ۱۲۲۶ھ سے ۱۲۴۲ھ تک کی درمیانی مدت میں جتنے تذکرے
ہے گئے ان میں ذوق کے نام کے ساتھ یہ خطاب درج نہیں ہے، تذکرۂ صدرالدین آزردہ کا ذکر
ہکا ہے" اور اہم تذکرے یعنی تذکرۂ سرور اور تذکرۂ عیارالشعرا، جو اس درمیانی مدت کی تصنیفات
ہے ہیں ان میں سے کسی میں ذوق کے نام کے ساتھ اس خطاب کا التزام نہیں کیا گیا ہے تذکرۂ عیارالشعرا
ن ترقی اردو پاکستان کراچی میں موجود ہے، راقم الحروف نے حضرت رمزا مرد ہوی کی وساطت سے
ں امر کی تصدیق کرائی ہے، ذوق کے نام کے ساتھ "خاقانیٔ ہند" کے خطاب کا التزام پہلی بار گلشن
ار" شیفتہ ۱۲۴۹ھ میں ملتا ہے اس اعتبار سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ذوق کو یہ خطاب ۱۲۴۲ھ
ر ۱۲۴۹ھ کے درمیان عطا کیا گیا اور اس وقت تک ذوق کو چالیس پینتالیس کے پیٹے میں ہونا چاہیئے
ں واقعے کے چند سال بعد ۱۲۵۳ھ مطابق ۲۸ اکتوبر ۱۸۳۷ء کو اکبر شاہ ثانی کا انتقال ہو گیا، ولی عہد
ا ابوظفر نے تخت شاہی پر جلوس کیا اور ابوالمظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ لقب اختیار کیا، اس
قع پر ذوق نے ایک قطعۂ تہنیت پیش کیا۔

خسروا تو ہے سراج دیں سراج سلطنت

، رجنوری کو جشن تاج پوشی منایا گیا، اس مبارک تقریب پر ذوق نے ایک زوردار قصیدہ
ش کیا، جس کا مطلع ہے ؎

ہے آج جو یوں خوشنما نور سحر رنگِ شفق   پرتو ہے کس خورشید کا نورِ سحر رنگِ شفق

کہ بھی موزوں کیا گیا ؎

بسیم و زر زدہ شد سکۂ بفضل اِلٰہ   سراجِ دین نبی بوظفر بہادر شاہ

کہا جاتا ہے کہ محولۂ بالا قصیدے پر ذوق کو ملک الشعرا کا خطاب عطا ہوا، لیکن مولانا آزاد
"آبِ حیات" میں اس بارۂ خاص میں کچھ نہیں فرمایا۔

بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی کے بعد ذوق نے مختلف تقاریب پر جو قصائد پیش کئے ان کی
صیل درج ذیل ہے۔

ہیں مری آنکھوں میں اشکوں کے تماشا گوہر   اک گہر دیکھو تو ہوں کتنے ہی پیدا گوہر
- ہے وہ جاں دارو ئے نافع اعضا و حواس   کہ دل مردہ ہو زندہ تن بے حس حساس
- ایک خورشید لقا طرفہ جوانِ ارشق   تاب رخسار فلق، شوخیٔ رخسار شفق
- مرحبا ساقیٔ فرخ رخ و خورشید جمال   مرحبا مطرب با دست حق و زہرہ خصال

۵۔ لاتا ہے رنگ نئے رنگ سے ہے چرخ حیل — واہ بگڑا ہے کچھ اس خم میں عجب رنگ سے نیل

۶۔ پائے نہ ایسا ایک بھی دن خوشتر آسماں — کھائے اگر ہزار برس چکر آسماں

۷۔ ساون میں دیا پھر مہ شوال دکھائی — برسات میں عید آئی قدح کش کی بن آئی

مندرجہ بالا قصائد میں سے پہلا قصیدہ کسی جشن سالگرہ پر نذر گزرانا، چھٹا قصیدہ شہزادہ جواں بخت کی شادی کی تقریب ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۲ء پر پیش کیا، بقیہ تمام دیگر قصائد عید سعید کی تقریبات کی یادگار ہیں۔

۱۲۶۸ھ میں مرزا محمد سلطان عرف مرزا فخرو کو کورٹ آف ڈائرکٹرس کی جانب سے ولی عہد مقرر کیا گیا اتفاق سے اسی زمانے میں بہادر شاہ ظفر سخت بیمار ہوئے۔ بیماری نے طول کھینچ کر تشویشناک صورت اختیار کر لی لیکن حکیم خصوصی احسن اللہ خاں کی تشخیص و علاج سے صحت ہو گئی، حکیم موصوف کو افلاطون دوراں کا خطاب عطا ہوا اور دیگر عطیات شاہی سے نوازے گئے، اس موقع پر مختلف شعراء نے بطور تہنیت غسل وصحت قصائد و قطعات پیش کئے، جن میں خود بادشاہ کی چہیتی ملکہ زینت محل بھی شامل ہیں، غالب کی یہ مشہور غزل ؎

پھر اس انداز سے بہار آئی — کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

اسی موقع کی یادگار ہے، جس کے مقطع میں غالب نے حقیقت حال کی صراحت ان الفاظ میں کی ہے ؎

کیوں نہ عالم کو ہو خوشی غالب — شاہ دیندار نے شفا پائی

ذوق نے اس موقع پر ایک معرکۃ الآرا قصیدہ " زہے نشاط اگر کیجئے اسے تحریر " پیش کیا جس کے صلے میں ایک زنجیر فیل، ایک انگوٹھی اور خدمت کے لئے چار سپاہی مقرر ہوئے، اس قصیدے کی پیش کش کے کچھ عرصے بعد ذوق نے ایک بہت ہی زوردار قصیدہ " شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت " خدمت عالی میں پیش کیا اس پر ایک گاؤں جاگیر میں دیا گیا، یہ قصیدہ ذوق کا آخری قصیدہ بتایا جاتا ہے اس کے بعد وہ مرض الموت میں گرفتار ہوئے اور ۲۳ رشب ماہ صفر ۱۲۷۱ھ شب آخر چہارشنبہ کو انتقال کر گئے اور قدم شریف میں دفن کئے گئے۔

(باقی آئندہ)

—— ⁕ ——

ڈاکٹر عبدالعلیم نامی

۱۸۵۷ء سے پہلے کی تھیٹریکل کمپنیاں

اردو ادب کی سب سے پہلی صنف جس کو غیر ملکیوں کی سرپرستی حاصل ہوئی اور جس نے مغربی اصول پر ترقی کے منازل بہت تمام طے کئے وہ اردو ڈراما ہے جس کے خالق پرتگال کے باشندے تھے جو ۱۴۹۸ء میں بغرض تجارت ہندوستان آئے اور یورپین خاص کر فرانسیسی اصول ناٹک پر حضرت عیسیٰ علیہ الصلاۃ و السلام کی زندگی کے حالات بصورت ڈراما اسٹیج پر پیش کئے۔

اگرچہ اردو ڈرامے کی صحیح تاریخ گوشہ گمنامی میں پڑی ہوئی ہے پھر بھی پرتگیز اور اطالین فادرز نے جو ریکارڈ چھوڑے ہیں اور ـــ ان کی خط و کتابت سے جو حوالے ملتے ہیں ان سے اس کی ابتدا ۱۵۴۰ء بھی جاتی ہے لیکن بعض مبلغین تثلیث کا خیال ہے کہ اردو ڈرامے کی ابتدا اس سے بہت پہلے ہو چکی تھی اور پرتگیز فادرز خود اس میں کام کرتے اور فارسی کا میز ٹوٹی پھوٹی اردو میں تماشے دکھلاتے تھے۔

چونکہ یہ تماشے حضرت عیسیٰؑ کی زندگی سے متعلق ہوتے تھے اس لئے ان کی ادائیگی میں ہر درجہ احتیاط برتی جاتی تھی اور ہر ممکن اصلاح جو یورپ میں رائج ہوتی تھی ہندوستانی اسٹیج پر دکھلائی جاتی تھی۔ چونکہ یورپین مبلغین تثلیث کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہتا تھا اس لئے مفکرین اور محققین اسٹیج کو یورپین اور اردو اسٹیج کی ٹکنیکل ضروریات میں بہت معمولی فرق نظر آتا ہے۔ اس معمولی فرق پر بھی مبلغین تثلیث مختلف الرائے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ اردو اسٹیج یورپین اسٹیج سے کہیں بہتر تھا کیونکہ :-

(الف) ہندوستان میں یورپین اسٹیج کے رواج سے بہت پہلے یہ ملک فن ڈراما اور اسٹیج سے واقف تھا۔ اسٹیج کی اداکاری ان کے لئے کوئی نئی بات نہ تھی۔ رامائن اور مہابھارت کے قصے ملک کے طول و عرض میں عام طور پر دکھلائے جاتے تھے۔

(ب) ہندوستان خاص کر دکن کی مالی حالت یورپ سے کہیں بہتر تھی اس لئے یہاں اسٹیج کی تیاری پر اوسطاً زیادہ روپیہ خرچ کیا جاتا تھا۔ ہندوستانی رئیس ـــ نواب ـ راجا اور سلاطین چونکہ طمطراق کی زندگی کے عادی تھے

اس لئے وہ کرسچین اسٹیج کو رام لیلا قسم کی ایک چیز سمجھ کر ان کی امداد کرتے تھے۔

(ج) پرتگیز نے دوران فتوحات دکن یہ سمجھ لیا تھا کہ اگر بیجاپور، احمد نگر، گولکنڈا، برار، بدار وغیرہ سے سادیاد تعلقات رکھنا ہیں تو ان کو اپنا معیار بلند کرنا اور انہیں کے معیار پر رہنا ہوگا چنانچہ وہ بھی سلاطین دکن کی طرح شان وشوکت کی زندگی بسر کرنے لگے تھے۔

(د) مبلغین یورپ خاص کر اہل پرتگال کی زندگی کا مقصد ہی تبلیغ تھا اس لئے وہ پورے جوش وخروش اور عقیدت کے ساتھ حضرت یسوع مسیح کے قدموں میں اپنے عقیدت کے پھول نچھاور کرتے تھے۔

جب عیسائی مبلغین کی سرگرمیاں بارآور ہوئیں اور کافی تعداد میں ہندوستانی تثلیث کے علمبردار بن گئے تو دکنی مشن کی طرف سے یہ "نئے عیسائی" دور دراز مرکزوں میں بھیجے گئے جہاں وہ اردو ڈرامے بھی تبلیغی حربے کے طور پر اپنے ساتھ لے گئے اس وقت اردو زبان تبلیغی زبان بن چکی تھی۔

ابتدائے اردو پر تحقیق کرنے والے نے اب تک یہ معلوم کرنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی ہے کہ پرتگیز نے اردو زبان کی کیا خدمت انجام دی ہے۔ انہوں نے کس قدر مدارس قائم کئے۔ ان کا نصاب کیا تھا۔ درسی کتب کس نے لکھیں اور کب لکھی گئیں۔ آیا وہ مابعد زمانے میں شائع ہوئیں یا نہیں۔ تبلیغی مدارس کے مدرسین اور منتظمین پرتگیز تھے یا دوسرے لوگ۔ اردو اور فارسی کے علاوہ اور کون کون سی مقامی اور غیر مقامی زبانیں پڑھائی جاتی تھیں۔

اگر ہم کو ان سوالات کا جواب مل جاتا ہے تو ہمیں نہ صرف ابتدائی ڈراموں کی تفصیلات معلوم ہو جائیں گی بلکہ تاریخ ادب اردو کے ابتدائی دور کی ترتیب وتدوین میں جو دشواریاں پیش آرہی ہیں وہ بھی دور ہو جائیں گی۔

یہ پرتگالیوں کی انتہائی خوش بختی تھی کہ ان کے عروج کے ساتھ ساتھ دولت مغلیہ کا آفتاب عالمتاب بھی طلوع ہوا اور اکبر نے چشم زدن میں ملک کا ایک بڑا حصہ سرنگوں کر لیا۔ دکن کے ایک حصے نے بھی اس کے حضور میں ہتھیار ڈال دیے۔

مغلیہ فتوحات کا اثر مبلغین تثلیث پر پڑا اور انہوں نے احمد نگر سے اکبر آباد تک تبلیغی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ شہنشاہ اکبر اور شہنشاہ جہانگیر کی سرپرستی اور ارکین دولت مغلیہ کی ہمت افزائی نے عیسائی مبلغین کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا اور وہ پنجاب اور کشمیر پار کرتے ہوئے تبت تک پہنچ گئے۔

مبلغین تثلیث کو دولت خداداد حکومت مغلیہ کی داد و دہشت سے کچھ فائدہ پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ اردو تبت میں بھی بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ پرتگیز کی سرگرمیاں کم وبیش ایک صدی تک جاری رہیں پھر ایسا انقلاب آیا کہ ان کو بیک بینی و دو گوش اس ملک سے رخصت ہونا پڑا۔ ان کی جگہ پہلے ڈچ۔ پھر فرنچ اور آخر میں انگریزوں نے لے لی۔

ہم ابھی تک یہ بتلانے سے معذور ہیں کہ ڈچ اور فرانسیسیوں نے اردو زبان و ادب اور خاص کر اردو اسٹیج کی کیا خدمت انجام دی ہے اس لئے ہم اس عبوری دور سے گزرتے ہوئے ۱۸۵۳ء تک پہنچتے ہیں جب بمبئی میں ایک عام اسٹیج قائم ہوا۔ اس اسٹیج کے

متعلق ہماری معلومات بہت ہی محدود ہیں لیکن سنہ ۱۸۰۰ء میں جب وہ از سرنو تعمیر ہوا تو اس کا نام "بمبے تھیٹر" تھا۔ یہ تھیٹر "بمبے گرین" میں واقع تھا جو "الفنسٹن سرکل" کے بعد اب "ہارنی مین سرکل" بن چکا ہے۔

یہ اسٹیج سنہ ۱۸۳۰ء تک قائم رہا۔ بعد کو قرض خواہوں کی نذر ہو گیا۔ دس سال کی کوشش اور جدوجہد کے بعد "بمبی تھیٹر" نے دوسرا جنم لیا لیکن اس بار اس کی ولادت گرانٹ روڈ پر ہوئی جہاں اب ڈاکٹر پٹیل کا دواخانہ ہے۔ اسی تھیٹر میں اردو اسٹیج نے جنم لیا اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے متعلق سطحی معلومات یہاں پیش کی جائیں۔

"بمبے کوارر" بمبے کا ایک اعلانیہ مورخہ ۲۳ اپریل سنہ ۱۸۳۶ء مظہر ہے کہ شیرف آف بمبے مسٹر ڈبلیو۔ سی۔ بروس نے باشندگان شہر کی درخواست پر اہل شہر کا ایک جلسہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی بمبے برانچ میں بتاریخ ۲۹ اپریل بوقت بارہ بجے طلب کیا تاکہ ایک نئے تھیٹر کی تعمیر کے سوال پر غور کیا جائے چنانچہ چھیالیس سرکاری عہدہ داروں اور تین پارسیوں کے دستخط سے شیرف آف بمبی کی خدمت میں ایک عریضہ گزرانا گیا تاکہ بمبی تھیٹر کی فروخت سے جو روپیہ حاصل ہوا ہے اور بعد منہائی قرض خزانہ عالیہ میں محفوظ ہے اس سے بمبی میں ایک نئے تھیٹر بنوانے کی اجازت طلب کی جائے۔

زبانی گفت و شنید اور بحث و مباحث کا یہ سلسلہ پانچ سال تک جاری رہا۔ ۲۶ نومبر سنہ ۱۸۴۱ء کو بمبے کوریر نے اہل شہر سے یہ اپیل کی کہ وہ اپنے روپے کو جو بمبے گورنمنٹ کے خزانہ میں بیکار پڑا ہے ضائع نہ ہونے دیں۔ اخبار مذکور نے اس بات پر بھی زور دیا کہ ہماری ذرا سی توجہ سے یہ رقم ڈیڑھ لاکھ بن سکتی ہے اور اس سے بہت ہی کم رقم سے ایک فرسٹ کلاس تھیٹر تعمیر ہو سکتا ہے یا ایک عمارت خرید کر اسے تھیٹر کی صورت میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ تھیٹر کی تعمیر کے بعد جو رقم بچے وہ گورنمنٹ سکورٹیز اور گارنٹیڈ فنڈز میں لگائی جا سکتی ہے۔

بمبے کوریر نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ اگر مطلوبہ رقم ایک لاکھ سے تجاوز نہ کرے تب بھی اس سے کئی مفید کام لئے جا سکتے ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ ڈھائی ڈھائی سو کے شیئرز جوائنٹ اسٹاک کی صورت میں جاری کئے جائیں۔ صاحب عزت اور صاحب ثروت لوگ اس کے ٹرسٹی اور منتظم قرار پائیں۔ جو حضرات اس میں اپنا روپیہ لگائیں ان کو تین تین سال کے لئے فی شیئر ایک ایک فری ٹکٹ دیا جائے۔ اگر منافع زیادہ ہو تو ٹکٹ کی میعاد بڑھا دی جائے۔

اسی جدوجہد اور بحث و مباحثہ میں ڈائرکٹران ایسٹ انڈیا کمپنی کا اجازت نامہ آگیا کہ "تھیٹر چونکہ ایک ہی جگہ پر پچاس سال سے واقع ہے اس لئے زمین کا قبضہ قبول کیا جاتا ہے اور بعد ادائیگی قرضہ جو روپیہ بچا ہے اس کے خرچ کا مجاز بھی دیا جاتا ہے کمپنی اپنی طرف سے کوئی مالی امداد نہیں دیگی۔ بمبئی کے کسی اور ادارے کو اس رقم کے استعمال کا حق نہ ہوگا۔"

چنانچہ ۱۶ جنوری سنہ ۱۸۴۳ء کو ٹاؤن ہال کے بریک فاسٹ روم میں ایک جلسہ طلب ہوا اور اس میں ڈائرکٹران ایسٹ انڈیا کمپنی کا شکریہ ادا کیا گیا اور ان سے درخواست کی گئی کہ بقیہ رقم تھیٹر کمیٹی کے سپرد کر دی جائے چنانچہ حکومت بمبئی نے چونتیس ہزار چھ سو اکیاون روپے گیارہ آنے ایک ہائی کمیٹی کے سپرد کر دیئے۔

جگنا ناتھ شنکر سیٹھ نے اپنی طرف سے زمین دی جس پر دیکھتے ہی دیکھتے ایک عالیشان تھیٹر تعمیر ہو گیا جو بعد میں تھیٹر قدیم کے نام پر بعد میں تھیٹر جدید کہلایا اور عوام میں مختلف ناموں سے مشہور رہا۔ چونکہ زمین جگنا ناتھ شنکر سیٹھ نے دی تھی اس لئے وہ جگنا ناتھ شنکر سیٹھ کا تھیٹر کہلایا ہے چونکہ وہ گرانٹ روڈ پر واقع تھا اس لئے گرانٹ روڈ تھیٹر کے نام سے موسوم ہوا۔ چونکہ اس پر ملکہ وکٹوریا کا مجسمہ نصب تھا اس لئے "رانی کا تھیٹر" کہلایا۔ چونکہ اس پر برٹش فلیگ لہراتا تھا اس لئے "باوٹے والا تھیٹر" کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔

اس تھیٹر میں ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۳ء تک انگریزی تماشے دکھلائے جاتے رہے۔ چونکہ جگنا ناتھ شنکر سیٹھ اب اس کی مجلس منتظمہ کے ایک اہم رکن تھے اس لئے ان کو مقامی زبانوں میں ڈرامے دکھلانے کی اجازت مل گئی۔
۱۸۵۳ء مرہٹی۔ گجراتی اور اردو میں ڈرامے دکھلائے گئے۔ چونکہ ہمارا تعلق صرف اردو تھیٹر سے ہے اس لئے ہم صرف اردو ڈراموں کی طرف اپنی توجہ مبذول کریں گے۔

اردو ڈرامے ۱۸۵۳ء - ۱۸۵۴ء اور ۱۸۵۵ء میں دکھلائے گئے۔ ۱۸۵۶ء اور ۱۸۵۷ء میں بھی تھیٹر بند رہا۔ ۱۸۵۸ء سے ۱۸۶۰ء تک صرف دو کمپنیوں نے اردو ڈرامے دکھلائے۔ ایک ہندو ڈرامیٹک کور اور دوسری پارسی ڈرامیٹک کور۔
اب ہم پہلے ہندو ڈرامیٹک کور کے پیش کردہ اردو ڈراموں کی تفصیلات درج کریں گے اس کے بعد پارسی کور کی طرف اپنی توجہ مبذول کریں گے۔

ہندو ڈرامیٹک کور۔ بمبئی ۱۸۵۳ء

اس تھیٹریکل کمپنی کے متعلق صرف اسی قدر معلوم ہو سکا ہے کہ وہ سانگلی۔ دکن سے آئی تھی اور اس نے گرانڈ روڈ تھیٹر۔ بمبئی میں چہار شنبہ مورخہ ۹ مارچ کو رامائن کے ماخذات مرہٹی زبان میں دکھلائے تھے۔ تماشا آٹھ بجے رات کو شروع ہوا تھا۔ تماش بینوں کی تعداد کم تھی (ملاحظہ ہو ٹیلیگراف اینڈ کوریئر مورخہ ۹ مارچ ۱۸۵۳ء - جلد ۵ - نمبر ۸۵ - صفحہ ۸۵۷)

اخبار مذکور نے ۱۲ مارچ کو ان الفاظ سے اس پر تبصرہ کیا:۔

" ہندوؤں کی تعداد کم تھی اور یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ لوگ اپنے تو ہی تھیٹر کی طرف بہت کم توجہ دیتے ہیں۔ یورپین تماش بین موجود تھے۔ خواتین کی تعداد صفر تھی۔ تماشا قابل اطمینان تھا لیکن زبان سے بیگانگی کے باعث ہم اس سے بخوبی لطف اندوز نہ ہو سکے۔

" سب ایکٹر ہندو تھے۔ جن لوگوں نے کورس میں کام کیا وہ سب برہمن تھے دیوی۔ دیوتا اور راون کے سپاہی سب کھتری تھے۔ مسخرہ کا پارٹ شروع سے آخر تک خوب رہا۔ جب رام چندرجی اور اندراجیت جی باتیں کرتے تو وہ سر کے بل کھڑا ہو جاتا۔ دیوی اور دیوتا کرسیوں اور صوفوں پر اس طرح آرام سے بیٹھتے گویا وہ اس کے استعمال کے عادی ہوں۔ جب لکشمن اور اندراجیت ایک دوسرے پر حملہ کرتے تو معلوم ہوتا گویا وہ کسی انگریزی رہائش گاہ میں رقص کر رہے ہیں۔

"حاشا وکلا اس سے ہمارا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہم ڈرامے کی عظمت کو کسی طرح کم کریں۔ مصنف کا کام اتنا عمدہ تھا کہ زبان نہ جاننے کے باوجود لوگ اس سے محظوظ ہو رہے تھے۔"

ہندو ڈرامیٹک کور نے مرہٹی زبان میں کئی ڈرامے دکھلائے۔ ان کا دوسرا ڈراما ۱۵ر مارچ کو۔ تیسرا ۱۹ر مارچ کو۔ چوتھا ۲۰ر مارچ کو۔ پانچواں ۲ر اپریل کو۔ چھٹا ۱۹ر اپریل کو اور ساتواں ۱۹ر نومبر کو دکھلایا گیا لیکن یہ ڈرامے مالی اعتبار سے ناکامیاب ثابت ہوئے۔

باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ سانگلی۔ دکن۔ سے جو ناٹک منڈلی آئی تھی وہ سرراہے گاہے ہندوؤں کے مندروں اور دولتمندوں کی حویلیوں کی چہار دیواریوں میں تماشے دکھلاتی تھیں۔ جگناتھ شنکر سیٹھ نے اس دکنی کمپنی کو از سرنو قائم کیا۔ اس میں نوجوان تعلیم یافتہ مرہٹے داخل کئے اور انگریزی اداکاروں کے ذریعے ان کو تعلیم دلوائی۔ اس درس وتدریس اور ریہرسلوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ مرہٹی ڈرامے مغربی اصول پر دکھلائے جانے لگے لیکن دو چیزوں سے وہ عہدہ برآ نہ ہو سکے۔ ایک اقتدار کی جنگ۔ دوسرا صوبائی تعصب۔ وہ آپس میں لڑتے جھگڑتے اور ایک دوسرے کو تماشے کی ناکامیابی کا ذمہ دار ٹھہراتے رہے۔ مرہٹی چونکہ صوبائی اور بہت ہی غریب طبقے کی زبان تھی اس لئے تماشائی بہت کم آتے۔ چونکہ نقصان کا بار صرف جگناتھ شنکر سیٹھ کو برداشت کرنا پڑتا اس لئے مرہٹی اسٹیج کا مسئلہ ان کے لئے ایک دردِ سر بن گیا اور ان کو بہت سنجیدگی سے یہ سوچنا پڑا کہ ہندو ڈرامیٹک کور جاری رکھی جائے یا بند کر دی جائے۔

جگناتھ شنکر سیٹھ کے لئے یہ بات ناممکن تھی کہ بیک گردش قلم وہ اپنی قوم کو تعلیم یافتہ بنا دیں یا ان کے لئے ایسے وسائل پیدا کر دیں کہ وہ مالا مال ہو جائیں۔ مرہٹے اس زمانے میں "گھاٹی" کہلاتے تھے۔

ہندو ڈرامیٹک کور نے بمشکل چھ تماشے دکھلائے ہوں گے کہ حالات نے ناگوار صورت اختیار کر لی۔ اداکار آپس میں لڑ بیٹھے۔ جگناتھ شنکر سیٹھ نے مالی امداد دینے سے انکار کر دیا اور بمشکل تمام جب راضی ہوئے تو اس شرط پر کہ کور ہندوستانی (اردو) زبان میں تماشے دکھلائے۔

مرہٹوں کے لئے اردو پڑھنا اور بولنا ایک امر دشوار تھا لیکن چونکہ یہ کور کی زندگی اور موت کا مسئلہ تھا اس لئے انہیں طوعاً و کرہاً منظور کرنا پڑا۔ انہوں نے اردو سیکھی اور ۲۶ر نومبر اور ۳ر دسمبر کو ہندوستانی زبان میں تماشے دکھلائے۔ کور کا آٹھواں تماشا ہندوستانی زبان میں دکھلایا گیا۔ اس کا اعلان ۲۰ر نومبر کو ان الفاظ میں شائع ہوا۔

ہندو تھیٹر

ہندو ڈرامیٹک کور باشندگان بمبئی۔ اہل شہر و یورپین حضرات کی خدمت بابرکت میں

عرض پرداز ہے کہ بروز شنبہ ۲۰ر نومبر وہ اپنا دلچسپ تماشا "راجا گوپی چند" اور

جلندہرؔ بزبان ہندوستانی ۔ گرانٹ روڈ تھیٹر میں پیش کرے گی ۔
فیس داخلہ حسب ذیل ہوگی ۔

ڈریس سرکل	۳ — ۰ — ۰
اسٹال	۲ — ۰ — ۰
گیلری	۱ — ۸ — ۰
پٹ	۱ — ۰ — ۰

ٹکٹ تھیٹر ہال پر دستیاب ہوں گے ۔
تماشا ٹھیک آٹھ بجے شروع ہوگا ۔

مندرجہ بالا اعلان ٹیلیگراف اینڈ کوریر بمبی کی اشاعتہائے ۲۵ ر اور ۲۷ ر نومبر کو بھی شائع ہوا ۔ تماشے کے بعد انٹرٹینمنٹ جی کا کومک بھی دکھلایا گیا ۔ ایک کاشمیری نے ہندوستانی اور فرانسیسی زبان میں گانے گائے ۔

پنجشنبہ یکم دسمبر کو مذکورہ بالا ڈراما کا دوبارہ اعلان ہوا اور ۳ ر دسمبر کو تماشا دکھلایا گیا ۔ یہ تماشا راجا گوپی چند اور جلندہر کا دوسرا حصہ تھا اور اس میں یہ بتلایا گیا تھا کہ راجا اپنی منسوبہ کنفا کو رخصت کرانے کے لئے جاتا ہے جلندہر بھی ہوتا ہے ۔ راجا کی ماں منونتی اس کے غیض وغضب کی آگ کو ٹھنڈا کرتی ہے ۔

راجا گوبر کے ڈھیر سے جلندھر کو نکالنے کی فکر کرتا ہے جو اس میں دفن کر دیا گیا تھا ۔ اسی وقت مچھندر آتا ہے ۔ راجا اس کے سامنے ایک تجویز پیش کرتا ہے مچھندر غصہ ہوکر کہتا ہے کہ اسی کی لاپروائی کے باعث جلندہر کو یہ دن دیکھنا نصیب ہوا ہے اور حکم دیتا ہے کہ وہ اپنی چار مورتیاں دھات کی بنوائے چنانچہ مورتیاں بنوائی جاتی ہیں ۔ جلندہر غلاظت سے باہر نکلتا ہے اس کو دوائیں دی جاتی ہیں ۔ (وقفہ)

راجا بلند آواز سے جلندہر کو مخاطب کرتا اور ہر بار جب وہ اپنی مورتی مچھندر کے سامنے رکھتا ہے تو وہ جل کر خاکستر ہو جاتی ہے ۔ مچھندر راجا کو مشورہ دیتا ہے کہ وہ مورتی کی جگہ خود بیٹھے چنانچہ وہ بیٹھتا ہے ۔ جلندہر کا غصہ اس کو دیکھ کر فرو ہوجاتا ہے ۔ راجا گوپی چند — جلندہر کے چرن چھوتا ہے اور اپنے عقیدت کے پھول ان پر نچھاور کرتا ہے ۔ جلندہر اس کو دعائیں دیتا ہے راجا دنیاوی عیش وعشرت پہ لات مار کر فقیری لے لیتا ہے اور اسی حالت میں اپنی بہن کے یہاں جاتا ہے ۔ اس کے بعد مقامات مقدسہ کی زیارت کرتا ہوا واپس ہوتا ہے ۔ واپسی پر وہ جلندہر سے ملتا ہے جو اس کی تبدیلی ہیئت، مزاج ودماغ سے اس قدر خوش ہوتا ہے کہ اس کو سریر آرائے سلطنت ہونے کی اجازت دیتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ وہ اپنے خدا اور اس کے بندوں کی خوشنودی حاصل کرے ۔

۱۸۵۴ء سال مذکور میں چھ اردو ڈرامے اسٹیج ہوئے ۔ پہلا ڈراما ۸ ر جنوری کو اسٹیج ہوا ۔ دوسرا ۱۷ ر مئی کو ۔ تیسرا ۲۰ ر مئی کو ۔

چوتھا ۳ر جون کو اور پانچواں ۱۷ر ستمبر کو۔ ان ڈراموں کی تفصیلات مختلف کمپنیوں کے تحت علیحدہ علیحدہ درج کی گئی ہیں۔

دی بمبئی ٹائمس اینڈ جنرل آف کامرس۔ بمبئی۔ مورخہ ۳ر جنوری رقمطراز ہے کہ ہندو ڈرامیٹک کور نے بمبئی سے باہر جانے سے پہلے یہ اعلان کیا کہ راجا گوپی چند اور جلندھر کا تماشا جو اس سے قبل دو قسطوں میں دکھلایا گیا تھا۔ ۷ر جنوری کو بیک وقت دکھلایا جائے گا۔ ٹکٹ کی قیمتوں میں تخفیف کردی گئی ہے۔ اعلان مندرجہ ذیل تھا۔

دی ہندو تھیٹر

دی ہندو ڈرامیٹک کور باشندگان شہر کی خدمت میں عرض پرداز ہے کہ وہ راجا گوپی چند اور جلندھر کا مکمل ڈراما بزبان ہندوستانی بروز شنبہ ۷ر جنوری گرانٹ روڈ تھیٹر میں پیش کرے گی یہ تماشا ایک بار پھر دکھلایا جائے گا۔

داخلے کی قیمت حسب ذیل ہوگی۔

باکس	۲-۰-۰
اسٹال	۱-۸-۰
گیلری	۱-۰-۰
پٹ	۰-۱۲-۰

"بمبئی ٹائمس" مورخہ ۷ر جنوری (ص ۴۵- کالم ۲) تماشے کا خلاصہ ان الفاظ میں پیش کرتا ہے۔

"یہاں ہندو تماشے کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے جو آج شب کمپنی مذکورہ گرانٹ روڈ تھیٹر میں بزبان ہندوستانی پیش کرے گی۔"

"تماشے کا افتتاح حسب معمول ہوگا۔"

"اس تماشے میں انسانی عظمت اور دنیاوی مسرت کے بے مائیگی دکھلائی جائے گی۔ تماشے کا مرکز بنگال کا سابق دارالخلافہ گور ہوگا۔"

"راجا ترلوک چند اپنی محبوبہ دلنواز کے ساتھ دادِ عیش دے رہا ہے۔"

"ایک دن جبکہ رانی اپنی کنیزوں اور شہزادہ ماول کے ساتھ بالاخانہ پر محو نظارہ تھی کہ اس کی نظر ایک ایسے شخص پر پڑتی ہے جو سر پر لکڑیوں کا گٹھا لئے جا رہا تھا لیکن یہ گٹھا سر سے بلند تھا۔"

رانی مینا وتی کو خیال گزرا کہ یقیناً اس شخص میں کوئی غیر معمولی بات ہے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ اس سے ملنے کے لئے دوڑی لیکن وہ جاچکا تھا پھر بھی اس نے اسے ڈھونڈھ نکالا اور اس کی کٹی پر جا پہنچی اور — جلندھر — سے ملکر بہت خوش ہوئی۔

اس سے درخواست کی کہ وہ اُسے اپنے حلقہ مریدین میں لے لے لیکن اس نے انکار کر دیا لیکن یہ انکار رانی کی ہٹ کے سامنے رثابت ہوا اور جلندر کو اُسے اپنے حلقے میں لینا پڑا۔

" یہ واقعات شدہ شدہ عوام تک پہنچے ۔ راجا ترلوک چند اور ولی عہد سلطنت راج کنور گوپی چند کو بھی اس کا پتا چلا۔ بڑھی ۔ اس میں کلی پھوٹنے لگے اور ایک رانی نے اسے اس رنگ میں پیش کیا کہ راج کنور کی ہمدردیاں اس سے جاتی رہیں۔ خاطر خواہ نکلا اور گوپی چند اپنی ماں پر شک کرنے لگا "

" راج کنور نے اپنے دوستوں سے مشورہ کیا کہ کس طرح جلندہر کو راستے سے ہٹایا جائے ۔ چنانچہ دعوت میں اس کو ب آور دوا دی گئی اور بحالت بیہوشی اُسے گوبر کے نیچے دفن کر دیا گیا ۔ (وقفہ)

" ایک دن جبکہ گوپی چند غسل کر رہا تھا اس کی ماں نے اسے دیکھا ۔ راج کنور کا خوبصورت جسم لاغر ہو رہا تھا ۔ ماں ل کو صدمہ پہنچا اور وہ اسی فکر میں رہنے لگی کہ کس طرح دوبارہ وہ صحت حاصل کرتا ہے ۔ راجا نے رانی سے فکرمندی کا سبب فت کیا ۔ رانی نے بیان کر دیا ۔

" کینفا جو جلندہر کی تلاش میں تھا گورک سے ملا ۔ وہ بھی اپنے گرو مچھندر کے لئے سرگرداں تھا ۔ ہر دو کی تلاش اور ثابت ہوئی ۔ ہر دو گرو مل گئے " (وقفہ)

" راجا گوپی چند کنیفا سے ملنے کے لئے گیا ۔ کنیفا اندر ہی اندر پیچ وتاب کھا رہا تھا ۔ وہ گوپی چند اور اس کی ں کے شریفانہ برتاؤ سے خاموش رہا بالآخر سب نے مشورہ کیا کہ کس طرح جلندہر کو غلاظت سے باہر نکالا جائے اور پ کے غصے کا سدباب کیا جائے ۔ اسی درمیان میں مچھندر بھی آجاتا ہے اور اس کے سامنے جلندہر کی رہائی کا مسئلہ ں کیا جاتا ہے ۔ مچھندر راجا سے بازپرس کرتا اور اس کو اپنی چار مورتیاں بنانے کا حکم دیتا ہے "

" راجا گوپی چند اپنی مورتیاں مچھندر کے سامنے رکھ کر جلندہر کو آواز دیتا ہے لیکن اس کی آواز صدا بصحرا بت ہوتی ہے اور ہر بار اس کی مورتی جل کر خاکستر ہو جاتی ہے ۔ مچھندر اس کو مشورہ دیتا ہے کہ مورتی کی جگہ وہ خود ڑا ہو کر جلندہر کو آواز دے ۔ جلندہر کا غصہ اس کو دیکھ کر فرو ہو جاتا ہے۔

" راجا گوپی چند اس کا چیلا بن جاتا ہے اور جوگی کا روپ دھارن کرکے پہلے اپنے محل میں اور پھر اپنی بہن یہاں جاتا ہے ۔ وہ مقامات مقدسہ کی زیارت کرنے کے بعد وطن واپس لوٹتا اور جلندہر سے ملتا ہے جو اپنی خوشنودی اج کا اظہار کرتا ہوا اس کو اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ وہ تخت حکومت پر بیٹھے اور ایک اچھے اور نیک دل کمران کی حیثیت سے رعایا کی خبرگیری کرے گا "

" دی ٹیلیگراف اینڈ گوائیڈ مورخہ ۹ جنوری ۱۸۷۳ء ڈراما مذکور پر تبصرہ کرتا ہوا رقمطراز ہے۔

" ہندو ڈرامیٹک کور کا یہ تماشا بروز شنبہ بڑی کامیابی کے ساتھ گرانٹ روڈ تھیٹر میں دکھلایا گیا ۔ تماشے

میں کافی آدمی تھے - ہندو اور پارسیوں کے علاوہ یورپین بھی ادھر ادھر نظر آرہے تھے؟
افتتاحی تعارف کے بعد جلندھر لکڑیاں فروخت کرتا ہوا نظر آتا ہے جس اداکار نے جلندھر کا پارٹ کیا حق یہ ہے کہ اس نے حق محنت ادا کر دیا - اس میں صرف ایک ہی نکتہ قابل گرفت نظر آتا ہے یعنی اس کے قدم فوجیوں کے انداز میں پڑتے تھے - مسخرے کا پارٹ بھی خوب رہا اور اس نے دل کھول کر تماش بینوں کو ہنسایا - اس کے لطیفا اور گورک پر جو پھبتیاں کسیں اس سے تماش بین بے حد محظوظ ہوئے - ایک موقع پر وہ کہتا ہے کہ لوگ پوتر گنگا میں اشنان کر کے اور ساری دنیا کے چکر کاٹتے ہیں لیکن دکتل باڑی میں جانا اور کادس جی پٹیل تالاب میں نہانا نہیں بھولتے -
زنانہ کردار خصوصاً مونا ونتی اور اس کی سہیلیوں کے پارٹ جن لڑکوں نے کئے وہ بھی بہت خوب رہے - ان کے علاوہ گوپی چند کا پارٹ بھی بڑی خوبی سے ادا کیا گیا -
وہ منظر انتہائی دلسوز اور دردناک تھا جب گوپی چند فقیر کے لباس میں اپنی بیویوں سے ملنے کے لئے جاتا ہے - اور رانیوں کی فطری پریشانیاں جو اپنے مالک کی عجیب و غریب تبدیلی پر حیران و پریشان تھیں اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر اور پاؤں پکڑ پکڑ کر اس سے کہتی تھیں کہ وہ ان مضحکہ خیز حرکتوں سے باز آئے اور ان کو تن تنہا چھوڑ کر چلا نہ جائے -
گوپی چند بارہ سال کی جبریہ فقیری کے بعد وطن واپس آتا ہے - محل میں خوشیاں منائی جاتی ہیں -
تماشے میں بد اخلاقی کا شائبہ تک نظر نہیں آتا - ایک مقامی معاصر کا یہ کہنا کہ اداکار بد اخلاقی کے مجرم ہیں نہ صرف غلط اور گمراہ کن ہے بلکہ تبصرہ نگار کی بیوقوفی اور بدنیتی پر دلالت کرتا ہے -
" تماشا آٹھ بجے شروع ہوا - بارہ بجے کے بعد ختم ہوا "
اس کے بعد ہندو ڈرامیٹک کور بڑودہ چلی گئی اور کم و بیش سال بھر تک واپس نہیں آئی -

۱۸۵۵ء

بڑودے سے واپسی پر ہندو ڈرامیٹک کور نے پہلے مرہٹی میں ڈرامے دکھلائے پھر اردو میں - بروز پنجشنبہ یکم فروری کو کور کی طرف سے مندرجہ ذیل اعلان ٹیلیگراف اینڈ کوریر میں شائع ہوا -
" ہندو ڈرامیٹک کور ساکن سانگلی (دکن) — دی رائٹ آنریبل دی گورنر (آف بمبئی) کی سرپرستی میں بروز شنبہ ۳ فروری کو راجا گوپی چند اور جلندھر کا تماشا بزبان ہندوستانی بمقام گرانٹ روڈ تھیٹر، باشندگان شہر کی خدمت میں پیش کرے گی - اس تماشے کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ بنانے کی کوشش کی گئی ہے "
" فیس داخلہ حسب ذیل ہوگی "
باکس ۰ — ۰ — ۲

اسٹال	۰-۸-۱
گیلری	۰-۰-۱
پٹ	۰-۱۲-۰

• تھیٹر ہال ساڑھے سات بجے کھل جائے گا اور تماشا ٹھیک آٹھ بجے شروع ہوگا۔ تھیٹر ہال کے علاوہ ٹکٹ بمبے سماچار کے دفتر سے بھی مل سکیں گے۔"

مندرجہ بالا اعلان ٹیلیگراف اینڈ کوایر کی اشاعتہائے ۳ر و ۶ر فروری میں بھی دہرائے گئے۔ ان کے علاوہ "بمبے ٹائمس" اور "بمبے گزٹ" کی اشاعتہائے ۳ر ۵ر اور ۶ر فروری میں بھی شائع ہوئے۔

ان ڈراموں کی کامیابی کے بعد ہندو ڈرامیٹک کور پھر مرہٹی ڈراموں کی طرف متوجہ ہوگئی اور اس نے مسلسل تیرہ ڈرامے مرہٹی زبان میں دکھلائے۔ پھر اپنا سولہواں ڈراما ہندوستانی زبان میں اسٹیج کیا جس کی خبر ۲ر نومبر کے ٹیلیگراف اینڈ کوریر میں شائع ہوئی۔ ۳ر نومبر کو مندرجہ ذیل اعلان شائع ہوا۔

بمبے تھیٹر

"دی ہندو ڈرامیٹک کور ساکن سانگلی باشندگان بمبے کی خدمت میں ملتمس ہے کہ بروز شنبہ مورخہ ۳ر نومبر گرانٹ روڈ تھیٹر میں راجا گوپی چند اور جلندہر کا تماشا بزبان ہندوستانی دکھلایا جائے گا۔

داخلہ فیس حسب ذیل ہوگی۔

باکس	۰-۰-۲
اسٹال	۰-۸-۱
گیلری	۰-۰-۱
پٹ	۰-۱۲-۰

تھیٹر ہال ساڑھے سات بجے کھلے گا۔ تماشا آٹھ بجے شروع ہوگا۔ ٹکٹ تھیٹر ہال پر ملیں گے اور ہندو ہار بنجر کے دفتر سے بھی دستیاب ہوسکیں گے۔ ڈرامے کو کامیاب بنانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی گئی ہے۔ ٹکٹ صرف نقد قیمت پر دستیاب ہوں گے۔ سگریٹ پینے کی اجازت نہ ہوگی۔

اس ڈرامے کی کامیابی کے بعد اگلا ڈراما بھی ہندوستانی زبان میں دکھلایا گیا۔ یہ ڈراما سیتا کی شادی کے متعلق تھا۔ ٹیلیگراف اینڈ کوریر کی اشاعتہائے ۱۰ر و ۱۲ر نومبر کو اس کا اعلان مندرجہ ذیل الفاظ میں شائع ہوا۔

بمبے تھیٹر

دی ہندو ڈرامیٹک کور ساکن سانگلی باشندگان بمبے کی خدمت میں عرض پرداز ہے کہ بروز شنبہ مورخہ ۱۲ نومبر گرانٹ روڈ تھیٹر میں ایک دلچسپ تماشا بزبان ہندوستانی پیش کیا جائے گا۔ ڈرامے کا نام ہے "سیتا کی شادی اور راس"

"داخلہ فیس حسب ذیل ہوگی"

باکس	۲—۰—۰
اسٹال	۱—۸—۰
گیلری	۱—۰—۰
پٹ	۰—۱۲—۰

تھیٹر ہال ساڑھے سات بجے کھلے گا۔ تماشا آٹھ بجے شروع ہوگا۔ ٹکٹ تھیٹر ہال میں ملیں گے۔ اس کے علاوہ ہندو پارینجر کے دفتر سے بھی دستیاب ہوسکیں گے۔ ڈراما دلچسپ بنانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے۔ ٹکٹ نقد قیمت پر فروخت ہوں گے۔ سگریٹ پینے کی ممانعت ہے۔

اب میں آپ کی توجہ ایک دوسری تھیٹریکل کمپنی کی طرف جس کا نام پارسی ڈرامیٹک کور ہے مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

پارسی ڈرامیٹک کور۔ بمبئی ۱۸۵۳ء انگریزی کمپنیوں کے ڈرامے اور اٹالین ٹروپس اوپرا دیکھتے دیکھتے پارسیوں کو خیال گزرا کہ وہ بھی اپنی مادری زبان میں ڈرامے دکھلائیں چنانچہ جگناتھ شنکر سیٹھ نے جونہی مرہٹی میں ڈرامے دکھلانے کا انتظام کیا پارسی نوجوانوں نے بھی اپنی قوم کے ذمہ دار حضرات کی ایک کمیٹی بنا کر گجراتی ڈرامے پیش کرنے کا اعلان کردیا۔

بمبے گزٹ ۔ بمبے ۔ بروز شنبہ ۔ بتاریخ یکم اکتوبر کو مندرجہ ذیل اعلان شائع ہوا ۔

"ہم کو یہ جان کر خوشی ہوئی کہ جزیرہ کے ہونہار پارسی نوجوانوں نے ایک تھیٹریکل کمپنی قائم کی ہے اور طے کیا ہے کہ وہ گرانٹ روڈ اسٹیج پر وسط نومبر میں تماشے دکھلائیں گے۔ امید واثق ہے کہ اس تحریک سے پارسی اسٹیج کا آغاز ہوگا۔ اور وہ پھلے پھولیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ابتدا میں پارسی نوجوانوں کو ڈرامے لکھنے اور پیش کرنے میں کافی دشواریاں پیش آئیں گی لیکن ہمیں امید ہے کہ وہ بخوشی یہ تکلیف گوارا کریں گے۔ ہم کو یہ بھی امید ہے کہ بمبے کے

سرمایہ داران کے لئے اپنی تجوریوں کے منہ کھول دیں گے تاکہ ان کی اجتماعی کوششیں پروان چڑھیں۔ ان کے ڈرامائی ادب میں خاطر خواہ اضافہ ہو اور عزیزوں کی ناخوشگوار زندگی میں انقلاب آئے۔ رشتہ میں تنوع اور روابط میں وسعت پیدا ہو۔ ماں کی عزت بڑھے۔ پڑھے لکھے اور جاہل اپنے خالق کے حضور میں سربسجود ہوں۔ ہم پارسی نوجوانوں کے بہی خواہ ہیں اور ان کی کامیابی کے لئے دست دعا دراز کرتے اور ان کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اپنی پوری کوشش اس فرض کی ادائیگی میں صرف کر دیں اور اپنی امید کی عمارت سنگین زمین اور خوشگوار حالات میں تعمیر کریں۔

اس اطلاع کے چھپتے ہی پارسی قوم میں چہ می گوئیاں شروع ہو گئیں۔ تھیٹر کے منتظمین اور نوجوان اداکاروں کا دل کھول کر مذاق اڑایا گیا۔

پارسیوں کی حالیہ خوشحالی۔ ان کی عزت و عظمت۔ کثیر دولت اور اعلیٰ معیار زندگی نے بہت کم لوگوں کو یہ سوچنے کا موقع دیا ہے کہ ڈیڑھ سو سال پہلے وہ بھی ان کی طرح مفلس و لاچار تھے۔ کاشت اور مزدوری ان کے پیشے تھے۔ ان کے اندر بھی وہ تمام عیوب موجود تھے جو بدحال اور مفلس قوم کے لئے باعث زوال بنتے ہیں۔ عام جہالت۔ قمار بازی۔ شراب نوشی۔ رقص و سرود سے ذوق۔ سربازار لڑنا جھگڑنا اور گالی گلوچ کرنا۔ عورتوں کو مارنا پیٹنا اور عزیزوں کے آگے دست طلب دراز کرنا غرضیکہ کوئی ایسا فعل بد نہ تھا جس کے وہ مشکار نہ ہوں لیکن مسلسل محنت اور مستقل مزاجی۔ ہر کام کو دل لگا کر کرنا اور اسے اپنے لئے باعث افتخار سمجھنا۔ بڑوں کا ادب اور چھوٹوں سے محبت سے ان کو ایک قابل فخر قوم بنا دیا۔

ان کے قومی پریس۔ ان کے صاحب ثروت حضرات اور ان کے سرمایہ داروں نے اپنے نوجوانوں کی ہمت افزائی کی۔ فرنگیوں کی جی حضوری اور اعلیٰ عہدیداروں کی دربارداری نے ان پر طلسمی قلعوں کے دروازے کھول دیئے اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے چین سے لندن تک کے تاجر بن گئے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدہ دار جو عام طور پر نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے ہمیشہ ایسے لوگوں کی ٹوہ میں لگے رہتے تھے جو بآسانی خط غلامی لکھ سکیں اور ذاتی جاہ و حشم کے لئے اپنے اہل وطن سے غداری کر سکیں۔ چنانچہ پارسیوں میں ان کو بکثرت ایسے لوگ مل گئے جو برطانوی تاج کے سائے میں پھلنا پھولنا پسند کرتے ہوں۔

چنانچہ انگریزوں نے ان کو اپنے اصول پر تعلیم دلوائی۔ ان کو صنعت و حرفت کے راستے دکھلائے۔ ان کو اپنی تجارت میں شریک کیا اور ان کے نام پر اپنے جہاز بحر ہند سے بحر چین تک دوڑائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہندو اور مسلمانوں سے ہر میدان میں سبقت لے گئے۔

لیکن علم و دولت اور سیاحی نے بہت جلد ان کی آنکھیں کھول دیں اور وہ سچے محب وطن بن گئے۔ پارسی نوجوانوں نے اپنے وعدے کے مطابق ڈرامیٹک کور قائم کی اور ۲۵ اکتوبر کو اعلان کر دیا کہ پارسی ڈرامیٹک کور کا پہلا

تماشا "رستم زبولی اور سہراب" بزبان گجراتی بمقام گرانٹ روڈ تھیٹر بتاریخ ۱۹ر اکتوبر بوقت آٹھ بجے دکھلایا جائیگا چنانچہ وقت مقررہ پر تماشا دکھلایا گیا اور خاصا کامیاب رہا - پارسی کور کا دوسرا تماشا ۵ر نومبر اور تیسرا ۱۹ر فروری ۱۸۵۳ء کو پیش کیا گیا -

اگرچہ پارسی جوان اپنی کامیابی پر بحید مسرور تھے لیکن مالی اعتبار سے انہوں نے جو امیدیں قائم کی تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں اس لئے انہوں نے اپنی پوری توجہ اردو ڈراموں کی طرف مبذول کردی اور اردو اسٹیج کا جو چراغ آج سے ایک سو بارہ سال پہلے انہوں نے روشن کیا تھا اسے دم آخر تک بجھنے نہیں دیا -

۱۸۵۴ء

بروز سہ شنبہ بتاریخ ۱۰ر مئی بمبے ٹائمس میں مندرجہ ذیل اعلان شائع ہوا -

دی پارسی تھیٹر

بروز شنبہ ۱۴ر مئی کو مندرجہ ذیل تماشے

شیاوکس کی پیدائش

اور

ایک مذاحیہ ڈراما بنام تیکھے خاں

بزبان ہندوستانی

دکھلائے جائیں گے

فیس داخلہ حسب ذیل ہوگی -

باکس	۲ — ۸ — ۰
اسٹال	۲ — ۰ — ۰
گیلری	۱ — ۸ — ۰
پٹ	۱ — ۰ — ۰

ٹکٹ تھیٹر ہال میں دستیاب ہوں گے - ہال ساڑھے سات بجے کھلے گا اور تماشا ٹھیک آٹھ بجے شروع ہو جائے گا -

مندرجہ بالا اعلان شنبہ ۱۵ر مئی کو بمبے گزٹ بمبے میں بھی شائع ہوا - اخبار مذکور اپنی اشاعت مورخہ ۱۵ر مئی میں تماشائے مذکور پر تبصرہ کرتا ہوا رقمطراز ہے -

"پارسی ڈرامیٹک کور کا چوتھا تماشا گزشتہ سنیچر کو گرانٹ روڈ تھیٹر میں دکھلایا گیا۔ تماشے کا نام شیاوکس (شیوکس) تھا۔ مذاحیہ ڈرامے کا نام "تیکھے خاں شمشیر بہادر" تھا۔

"اداکاروں کی پوشاکیں کافی قیمتی تھیں۔ نوجوان پارسیوں کی کوششیں قابل تعریف ہیں اور اُن سے ہندوستانی ڈرامے کی ترقی اور خوش آیند مستقبل پر روشنی پڑتی ہے۔

"پہلا تماشا بہت خوبی کے ساتھ انجام پزیر ہوا۔ تماش بین مذاقیہ ڈرامے سے بہت محظوظ ہوئے۔ اس ڈرامے میں نوابوں کی زندگی کا خاکہ اڑایا گیا تھا۔ یہ تماشا ہندوستانی زبان میں تھا اور تماشائی اس سے بیحد لطف اندوز ہوئے۔

"جمال اور تیکھے خاں کا قصہ ایسا نہیں ہے کہ بہ آسانی فراموش ہوسکے۔" دھنجی غرق ہ کے بعد اس کی ہی مقبولیت کا نمبر آتا ہے۔ جمال کا کیریکٹر اس طرح پیش کیا گیا کہ اس سے اہل مشرق کی ہوشیاری۔ بیوفائی اور دھوکے بازی ثابت ہو۔ اس مذاحیہ تماشے میں یہ بھی دکھلایا گیا کہ ہندوستانی اپنے مالک کا کس قدر وفادار ہوتا ہے۔ وہ دنیا میں سب کو دھوکا دے سکتا ہے لیکن اپنے مالک کو نہیں۔ وہ فطرتاً خاموش اور کم سخن ہوتا ہے وہ کافی غور و خوض کے بعد زندگی کے نقشے بناتا ہے۔ وہ نواب کی ناگفتہ بہ حالت پر کبھی افسوس کرتا ہے اور کبھی اس کی بدعقلی اور عشرت پرستی پر خوش ہوتا ہے۔ جمال کا کردار اداکار نے بڑی خوبی سے ادا کیا۔"

"افسوس صرف اس قدر ہے کہ تماشائی بہت کم تھے لیکن امید ہے کہ تھیٹریکل کور کی شہرت میں جس قدر اضافہ ہوگا اسی قدر اس کے کارناموں کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوگا۔"

بمبے ٹائمس مورخہ ۱۸ رمئی میں اعلان ہوا کہ پارسی ڈرامیٹک کور کا ایک اور ڈراما بروز شنبہ مورخہ ۲۰ رمئی بوقت آٹھ بجے شب گرانٹ روڈ تھیٹر میں دکھلایا جائے گا۔ تماشے کا نام "شیاوکس (شیوکس) حصہ دوم ہوگا۔ تماشے کے ساتھ "حاجی میاں اور ان کے ملازمین ـــ نفنل اور تیکھے خاں" بھی پیش کیا جائے گا۔ یہ مذاحیہ ڈراما بے حد کامیاب رہا۔ بمبے ٹائمس اپنی اشاعت مورخہ ۲۳ رمئی میں نقل مذکورہ پر تبصرہ کرتا ہوا لکھتا ہے۔

"پارسی امیچور کا دوسرا تماشا گرانٹ روڈ تھیٹر میں بروز سنیچر دکھلایا گیا۔ ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ حاضرین کی تعداد کافی تھی۔ تماشائی ہر دو نقلوں سے جو ڈرامے کے بعد دکھلائی گئیں بہت محظوظ ہوئے۔ حاجی میاں کی نقل مسٹر جوائس کی ایک تصنیف سے ماخوذ معلوم ہوتی ہے[۱]

مذاحیہ ڈرامے کا پلاٹ حسب ذیل ہے۔

۱۔ JOYCE: HAUNTS OF VICE AND DENS OF INFAMY

"چند پارسی گرگام[1] کے ایک مکان میں داخل ہوتے ہیں - ملازم اُن کو شراب پلاکر بیہوش کرتا اور اُن کی جیبیں خالی کرکے ایک بگھی میں ڈالتا اور گاڑی بان سے کہتا ہے کہ وہ اُسے اسپلینڈ میدان میں پھینک کر اپنا راستہ لے - دونوں پارسی رات بھر اُسی میدان میں پڑے رہتے ہیں - وہ علی الصباح اٹھتے اور اپنی جیبیں خالی پاکر ایک دوسرے کو چوری کا ملزم قرار دیتے ہیں - پہلا دوسرے پر الزام لگاتا ہے کہ اُس نے اُس کی جیب سے روپے نکال لئے - دوسرا اس پر یہ الزام لگاتا ہے کہ اُس نے اُس کی جیب سے گھڑی نکال لی - پہلا شخص یہ الزام سن کر گھبرا جاتا اور دوسرے کو تین سو روپے کا تمسک لکھ دیتا ہے -

"ہمیں یہ سن کر افسوس ہوا کہ منتظمین کور مقروض ہو گئے ہیں - انہیں ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ صبر کریں اور اچھے وقت کے منتظر رہیں - یقینی طور پر ان کی محنت کا صلہ اُن کو ملے گا - ہمیں معلوم ہوا ہے کہ کور کی مجلس منتظمہ نے ہز لارڈشپ سے "سرپرستی" کی درخواست کی ہے - امید ہے کہ ہز لارڈشپ درخواست مذکورہ کو شرف قبولیت بخشیں گے"

تاریخ مذکورہ (سہ شنبہ - ۲۳ مئی ۱۸۵۳ء) میں بمبے گزٹ اسی پر تبصرہ کرتا ہوا لکھتا ہے -

"گزشتہ شب (بروز شنبہ) پارسی ڈرامیٹک کور کا پانچواں تماشا گرانٹ روڈ تھیٹر میں اسٹیج ہوا - تماشبینوں کی تعداد اگرچہ قابل اطمینان نہیں تھی پھر بھی پہلے سے بہتر تھی - تماشے کا نام شیاوکس تھا جو شروع سے آخر تک بڑی خوبی سے دکھلایا گیا - اس میں جو مناظر پیش کئے گئے وہ بڑی حد تک تاریخی تھے - بعد میں دو مذاحیہ ڈرامے دکھلائے گئے - جن کا تعلق مقامی واقعات سے تھا -

یہاں یہ بیان کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انسان اُن امثال سے زیادہ متاثر ہوتا ہے جو حقیقت سے قریب ہوں - امثال خواہ زندہ انسانوں سے تعلق رکھتے ہوں یا تاریخی کرداروں سے - دنیا میں شاذونادر ہی انسان غیر فطری چیزوں سے اظہار ہمدردی کرتا ہے مثلاً ایک ہاتھ سے البرز (پہاڑ) کو حرکت دینا یا برش کی بجائے کھجور کے تنے سے دانت صاف کرنا وغیرہ وغیرہ - ہم غیر فطری باتوں سے اس وقت تک متاثر نہیں ہو سکتے جب تک کہ مافوق الفطرت باتیں بیک قلم رد نہ کردی جائیں - شیکسپیر ٹھیک ہی کہتا ہے -

"فطرت سے مناسبت ہر شے کو انسان کے قریب کردیتی ہے"

اصل تماشے کے بعد "حاجی میاں" اور "فددی فضل" کی نقلیں دکھلائی گئیں اور سچ یہ ہے کہ بہت خوبی سے پیش کی گئیں - ان کا خلاصہ اس طرح سے بیان کیا گیا ہے -

---

[1] بمبئی کا ایک محلہ جس میں اب مرہٹے آباد ہیں -

"ایک ضعیف العمر تاجر — حاجی میاں نام — جو تمباکو اور افیون کا رسیا ہے اور ہمیشہ روپیہ کمانے کی تجویزوں پر غور کرتا رہتا ہے ایک دن وہ اپنے ملازم فضل سے مشورہ کرتا ہے کہ وہ کوئی ایسی ترکیب بتائے کہ ایک روپے سے دس روپے بن جائیں۔ فضل کی عقل اس قسم کی تجویز سوچنے سے معذور رہتی ہے۔ یہاں یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ حاجی میاں نے کچھ عرصے قبل ہی تین خوبصورت لڑکے خریدے تھے۔

"حاجی میاں ان لڑکوں سے مشورہ کرتا ہے۔ لڑکے متعدد تجویزیں پیش کرتے ہیں۔ ایک تجویز مناسب معلوم ہوتی ہے اور اس کو بروئے کار لانے کا پروگرام مرتب کیا جاتا ہے۔ ایک دوکان کرائے پر لی جاتی ہے۔ اس کا افتتاح ہوتا ہے۔ فضل اس کا نگراں مقرر کیا جاتا ہے۔

"ایک دن دو پارسی لڑکے دوکان میں داخل ہوتے ہیں۔ ملازم ان کو شراب میں دارو ئے بیہوشی ملا کر پلاتا ہے۔ اُن کی جیبیں خالی کی جاتی ہیں ان کو ایک بگھی میں بٹھلا کر اسپلینڈ میدان میں ڈلوا دیا جاتا ہے۔

"پھر ایک کانسٹبل ملاح کے لباس میں داخل ہوتا اور شراب پئے بغیر ہی بیہوش ہو جاتا ہے۔ ملازمین اس کی تلاشی لینے کے بعد اس کو حسب معمول گڑھے میں پھکوا دیتے ہیں ایک پولیس مین یہ دیکھ کر غل مچانا چاہتا ہے کہ فضل اسے لے دے کے راضی کر لیتا ہے۔ ملاح اپنے اصلی لباس میں ظاہر ہوتا اور پولیس مین کو سچ بولنے پر مجبور کرتا ہے۔ فوری فضل عدالت میں طلب کیا جاتا ہے جہاں وہ اپنے گناہ کا اقرار کرتا ہے۔ وہ توبہ کرتا۔ معافی مانگتا اور دوکان بند کر دیتا ہے۔"

"حاجی میاں اور فضل کا پارٹ کرنیو اسے ادا کار قابل ستائش ہیں دونوں بڑی روانی کے ساتھ ہندوستانی بولتے ہیں ملاح کا پارٹ بڑی خوبی اور محنت سے کیا گیا۔ پارسی نوجوان شیوا شا اور فیروز شاہ نے حاجی میاں کے خوبصورت ملازمین کے پارٹ بڑی خوبی سے ادا کئے۔

"اس کے بعد تیکھے خاں کی نقل دکھلائی گئی۔ اس تماشے کے متعلق ہماری رائے پہلے ہی درج کی جا چکی ہے۔ ہمیں یہ سن کر خوشی ہوئی کہ نگراں حضرات کی سرپرستی میں ایک اور کامیاب تماشا جلد ہی پیش کیا جائے گا۔

پارسی تھیٹریکل کمپنی نے موسم سرما کے آخری تماشے کا اعلان ۳ر جون کو کیا۔

"پارسی تھیٹریکل کمپنی کا قطعی آخری تماشا بروز شنبہ ۳ر جون کو گرانٹ روڈ تھیٹر میں دکھلایا جائے گا۔"

کمپنی نے یہ بھی اعلان کیا کہ اس کھیل کے سلسلے میں ایک مشہور پروشین پروفیسر کی خدمات بھی حاصل کر لی گئی ہیں جو اپنے عجیب و غریب کرتبوں سے آپ کو محظوظ کریں گے۔

پروگرام حسب ذیل ہوگا۔

(۱) پروشین پروفیسر کے کمالات۔

(۲) "حاجی میاں" اور "فضل" کی نقلیں بزبان ہندوستانی۔

(۳) پروشیں پروفیسر کے کمالات ۔

(۴) "کلال خانہ" کی نقل بزبان ہندوستانی ۔

نقلیں اگرچہ پہلے بھی اسٹیج کی جا چکی تھیں لیکن اس موقع پر انہوں نے دو آتشہ کا کام کیا ۔

ان تماشوں اور نقلوں کے بعد تھیٹر تین مہینے بند رہا ۔ جب ستمبر میں دوبارہ کھلا تو مندرجہ ذیل اعلان اخبارات میں نظر سے گزرا ۔

پارسی تھیٹر

موسم سرما کا افتتاحی کھیل ۔

پہلی اور خاص شب

پارسی تھیٹریکل کمپنی کا نیا تماشا شنبہ ۱۷ ستمبر کو بزبان ہندوستانی گرانٹ روڈ تھیٹر میں دکھلایا جائے گا ۔

پٹھان سرفراز اور گلو

پندرہ منٹ کی ایک مذاحیہ تمثیل بنام "الہ دین اور بانو زلیخا"

بھی دکھلائی جائے گی ۔

امید ہے کہ پبلک ان تماشوں کو پسند کریگی اور جوق در جوق دیکھنے کے لئے آئے گی ۔ اس کے باوجود کہ تماشے پر بے دریغ روپیا صرف کیا گیا ہے لیکن داخلہ فیس بہت کم رکھی گئی ہے ۔

باکس	۲ — ۸ — ۰
اسٹال	۱ — ۸ — ۰
گیلری	۱ — ۴ — ۰
پٹ	۱ — ۰ — ۰

جس دن یہ تماشا پیش کیا جانے والا تھا اسی دن بمبی گزٹ نے مندرجہ ذیل نوٹ اپنے اخبار میں شائع کیا ۔

"پارسی ڈرامیٹک کور نے اپنا سرمائی پروگرام شروع کر دیا ہے کمپنی کا پہلا تماشا آج شب کو گرانٹ روڈ تھیٹر میں دکھلایا جائے گا ۔ وہ نوجوان جو اس ڈرامے میں پیش پیش ہیں اور اپنی کوششوں کو قابل، عتنا سمجھتے ہیں ۔ ملتجی ہیں کہ پبلک ان سے اشتراک کرے ۔ آج شب جو نقلیں ہندوستانی زبان میں دکھلائی جائیں گی وہ قابل تعریف ۔ دلچسپ اور نصیحت آموز ہیں ۔

محمد مصطفیٰ

ڈاکٹر اقبال اور سیموئیل راجرس

شاعر مشرق جناب اقبال کی نظم " ایک آرزو " لڑکپن میں میں نے پڑھی تھی اور جوانی میں پڑھائی تھی آج جو ایک انگریز شاعر سیموئیل کی نظم " A Wish " کسی کتاب سے اپنی بیاض میں لکھی ہوئی نظر آئی تو شوق کا تقاضا ہوا کہ باوجود کوتاہ نظری کے دونوں کو آمنے سامنے رکھ کر ان کے خدوخال کا موازنہ کروں ۔

دونوں نظموں کو پڑھ کر بعض مستشرقین کہیں گے کہ " الفضل للمتقدم " اقبال نے سیموئیل سے " ایک آرزو " حاصل کی ، لیکن انصاف کا فتویٰ ہے کہ اگر حاصل کی توجیہ بھی لی ، کیونکہ " کم ترک الاول للآخر " کے قاعدے کے مطابق فضل وکمال کا طرۂ امتیاز اقبال ہی کے سر رہتا ہے جیسا کہ ادنیٰ تامل سے عیاں ہے ۔

Mine be a cot beside the hill (سیموئیل)

۱؎ دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب — کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو (اقبال)

۲؎ شورش سے ہوں گریزاں، دل ڈھونڈتا ہے میرا — ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو

۳؎ مرتا ہو خامشی پر، یہ آرزو ہے میری — دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو

سیموئیل پہاڑ کے پہلو میں ایک چھوٹا جھونپڑا چاہتا ہے ، کیوں ؟ کیا وحشت ہے ، مالیخولیا ہے، راہبانہ زندگی مرغوب ہے ، آخر اس کی وجہ ؟ " المعنی فی بطن الشاعر " لیکن ہمارے اقبال ان تمام باتوں کو حکیمانہ اور عارفانہ انداز سے بیان کرتے ہیں ، پریشان ہیں اور پریشانی دور کرنے والے خدا کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اس کو پکار اٹھتے ہیں کہ " یارب " یعنی بار الٰہا آپ ہی میرے مربی ہیں ، نعمت وجود کے بعد نعمت بقا و نعمت استمرار حیات ، اور نعمت علم آپ ہی کا عطیہ ہے ، آپ میری مدد فرمایئے اور ایسی تربیت وتادیب کیجئے کہ اس قحط الرجال میں اپنے ابنائے جنس کی خدمت کر سکوں ، ان بھولے بھٹکوں کو شمع نبوت کی روشنی میں اعلاء کلمۃ اللہ کا سبق پڑھاؤں ۔

اقبال پر اس طلب صادق کے غلبے میں ایک وحشت طاری ہے، وہ وحشت جو خفقان اور جنون کے مترادف نہیں بلکہ وہ جو "سیر الی اللہ" والوں پر گاہ گاہ مسلط کر دی جاتی ہے تاکہ، منازل سلوک طے کرنے پر "دعوت الی الحق" کا کام ان سے لیا جائے۔

اقبال بھی اسی کی بدولت ہنگامۂ عالم سے گریزاں ہیں "فَفِرُّوا الی اللہ" اور ایسے سکوت کے طالب ہیں جو تقریر سے بھی زیادہ بامعنی اور وعظ و خطابت سے بھی زیادہ پُرمغز ہو، کیوں کہ صفات باری تعالیٰ شانہٗ میں تفکر کرنے کے لئے (تفکروا فی آلائہ۔ الحدیث) قلت کلام اور قلت اختلاط (مع الانام) دونوں لازم ہیں۔

A bee hive's hum shall soothe my ear,
A willowy brook, that turns a mill,
With many a fall, shall linger near.

؎ لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں　چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو (اقبال)

سیموئیل کو شہد کی مکھی کی بھن بھن پسند ہے، اقبال کو چڑیوں کے چہچہے لذیذ ہیں، یہ اپنا اپنا مذاق مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں، ہاں دیکھنا یہ ہے کہ اقبال نے دوسرے مصرع کے سات لفظوں میں جو کچھ کہہ دیا اس کو سیموئیل تیرہ لفظوں کے دو مصرعوں میں بھی بیان نہ کر سکے، "باجا سا" ان کے یہاں بجا ہی نہیں، مزید برآں اقبال کا جملہ مفرد ہے (*Simple*) اور ترتیب و نشست الفاظ بالکل سادہ، اور سیموئیل کا جملہ موصولہ ہے (*Complex*) اور فقرہ در فقرہ

The swallow oft, beneath my thatch, (سیموئیل)
Shall twitter near her clay built nest.

؎ مانوس اس قدر ہو صورت سے میری بلبل　ننھے سے دل میں اس کے کھٹکا نہ کچھ مرا ہو (اقبال)

سیموئیل کی جائے قیام کے نیچے ابابیل بولتی ہے، وہاں اس کا آشیانہ ہے، اس میں کچھ اغراب نہیں البتہ بلبل اقبال کو اپنا ہی سمجھتی ہے اور اس ننھی منی گائن کو ان پر پورا اعتبار اور کامل وثوق ہے۔

اس وقت شیخ ابن فارض مصری رحمۃ اللہ علیہ کا قصیدۂ تائیہ والا مصرع یاد آتا ہے کہ ع

دبا لوحش اُنسی اذ من الانس وحشتی

یعنی انسان سے مجھے وحشت ہے اور وحشی جانوروں سے اُنس ہے، اقبال یہ نہیں کہتے کہ مجھے، بلبل سے اُنس ہے بلکہ بلبل مجھ [illegible]

لحاظ رکھیے)

یہاں بلبل کا انتخاب اس لئے بھی ہوا ہے کہ شاعر کامل بھی چمنستان قوم میں بمنزلۂ بلبل ہے۔ ؎

اس چمن میں ہوں گے پیدا بلبل شیراز بھی

(سیموئیل) Oft shall the pilgrim lift the latch,
And share my meal, a welcome guest

؎ راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم　　(اقبال)

امید اُن کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو

؎ بجلی چمک کے اُن کو کٹیا مری دکھا دے

جب آسماں پہ ہر سو بادل گھرا ہوا ہو

سیموئیل کی مہماں نوازی اور میزبانی قابل داد ہے کہ تھکے ماندے زائرین کو اپنے دسترخوان پر نوازتا ہے، سیموئیل کے مہمان تو کسی نہ کسی طرح اُس تک پہنچ ہی گئے اور انہوں نے کھانے پر بھی ہاتھ صاف کر دیا۔

اقبال ان لوگوں کا ذکر کر رہے ہیں جو "تاریکستان" میں سفر کر رہے ہیں اور جن کے پاؤں چلتے چلتے شل ہو گئے ہیں چاروں طرف اندھیرا ہے اور اندھیرے آسمان پر گھنگھور گھٹا چھا رہی ہے، گاہے گاہے بجلی چمکتی ہے تو ان خستہ حال لوگوں کو شاعر کا ٹوٹا ہوا دیا (یعنی مفلس کا چراغ) نظر آجاتا ہے، بس اُن کے دل میں حصول مقصود کی لگن از سرِ نو تازہ ہو جاتی ہے اور منزل مقصود تک پہنچنے کے ولولے میں وہ پھر گامزن ہو جاتے ہیں۔

سیموئیل نے اپنے مہمانوں کو جسمانی غذا دی، ان کا خیر مقدم کیا، اقبال کے ٹوٹے ہوئے دیئے یعنی (مٹی کے چراغ) نے رہروان راہِ رخصت کو اولوالعزمی کی روشنی دکھائی، اخلاقی اور روحانی غذا سے اُن کی پژمردہ قوتوں کی آب یاری فرمائی۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

ہاں! استعارے کی زبان میں ہر سو بادل کا گھرا ہوا ہونا اور اندھیرا ہی اندھیرا ہونا، عبارت ہے جہل، ظلم، فساد اور غم و اندوہ سے اور بجلی سے مراد ہیں وہ تخویفات اور ایقاظات جو باری تعالیٰ کی جانب سے اپنے بندوں کے لئے ہوتی ہیں، پس معنی یہ ہوئے کہ ایسے نازک وقت میں ارباب بست وکشاد کو ایک مرد فقیر، ایک مرد خدا سے ہمت و نصرت حاصل ہوتی ہے۔

(سیموئیل) Around my ivyd porch shall spring
Each fragrant flower that drink the dew.

ؔ گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا ساغر ذرا سا مجھ کو گویا جہاں نما ہو (اقبال)

سیموئیل عشق پیچہ (یا عشق پیچاں) کی بیل اور خوشبودار شبنم آلود پھولوں سے دل بہلاتا ہے، لیکن اقبال کے اس ذرا سے ساغر کے سامنے سیموئیل تو درکنار شیخ شیراز کی بیت بھی ؎

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

جذب اور والہیت سے زیادہ بھرپور نظر نہیں آتی، اور سچ تو یہ ہے کہ شیکسپیر کا یہ مقولہ

We find tongues in trees, books in the running
brooks, sermons in stones and good in everything.

مقابلۃً کچھ زیادہ بلاغت اور جامعیت نہیں رکھتا۔

کلی جب چٹکتی ہے تو آواز ہوتی ہے خواہ وہ کتنی ہی پست و خفی کیوں نہ ہو، اور پیغام کے لئے بھی آواز لازم، "کسی" کنایہ ہے محبوب حقیقی سے، گل باعتبار رنگ کے شراب سے مشابہ ہے اور باعتبار شکل کے "پیالے" سے، چونکہ طالب صادق کو اس کے مشاہدے سے کیف و سرور حاصل ہوتا ہے، اور مئے محبت ملتی ہے، اس لئے مجموعی طور پر "گل" ذرا سا ساغر ہوا، اور خدا کی شان کے قربان کہ یہی ذرا سا ساغر عارف کامل کے لئے جام جہاں نما بن جاتا ہے، کہ دنیا کی حقیقت کا انکشاف اسے کیفیات و واردات عشقیہ کی وجہ سے ہو جاتا ہے۔

اس "پیغام دے کسی کا" میں جو بے خودی ہے، جو شکر و مستی ہے، وہ دفتر معرفت کردگار کے مطالعے سے بے نیاز ہے، جذبۃ من جذبات الحق توازی عمل الثقلین

ما بداں منزلِ عالی نتوانیم رسید ہاں مگر لطف شما پیش نہد گامے چند

اس کے بعد چونکہ سیموئیل دنیوی محبت کا دلدادہ ہے، اس لئے کہتا ہے۔

(سیموئیل) And Lucy, at her wheel, shall sing,
In russet gown and apron blue.
The village church, among the trees.
Where first our marriage vows were given,
With merry peals shall swell the breeze.

And point with taper spire to Heaven.

اس معاشقے اور ازدواجی محبت پر نہ مجھے اعتراض ہے اور نہ احتراز، یہ سب باتیں اوسط طبقہ والوں کو بھی حاصل ہیں البتہ اقبال جس کیمیا اثر محبت کا بیان کرتے ہیں اس کے سامنے سیموئیل کی یہ محبت فی صدی دو نمبر پانے کی بھی مستحق نہیں، سنیئے، ارشاد ہے۔

۹ پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے　　رونا مرا وضو ہو، نالہ مری دعا ہو (اقبال)

غایت اس کوہ نشینی کی اس شعر سے مترشح ہے، صبح کے وقت پھول شبنم سے تر ہو جاتے ہیں، شاعر کہتا ہے کہ شبنم حسینان چمن کو نماز صبح کے لئے وضو کرانے آئی ہے (حسینوں کی قدر سب ہی کرتے ہیں) شاعر کی آرزو ہے کہ اس وقت مجھ پر گریہ کی عاشقانہ کیفیت طاری ہو جائے جس سے میری روحانی کثافتیں دھل جائیں اور جناب باری میں ایسی نالہ و زاری کروں، جو میرے لئے دعا و نماز کی قائم مقام ہو، مولانا فرماتے ہیں۔

تا نگرید طفل کے جوشد لبن　　تا نہ گرید ابر، کے خندد چمن

چوں خدا خواہد کہ ماں یاری کند　　میل مارا جانب زاری کند

شعر میں اشارہ ہے اس مسئلے کی طرف کہ رکعتان فی العشق لا یصح وضوء ھما الا بالدم عشق کی دوگانہ نماز کے لئے خون (یعنی جاں نثاری) ہی کا وضو شرط ہے :- یہ نماز بغیر اس وضو کے ادا ہی نہیں ہوتی، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ صبح کا وقت ورود تجلیات کا ہوتا ہے، کلام الٰہی میں ہے " ان قرآن الفجر کان مشھودا "

دعائے صبح و آہ شب کلید گنج مقصود است　　بایں راہ و روش می رو کہ با دلدار پیوندی (حافظ)

اور جب انسان کو یہ قرب الٰہی حاصل ہوتا ہے تو وہ بنی نوع انسان کی ہدایت و ارشاد فرماتا ہے بارگاہ الٰہی میں اس کے کلمات طیبات مقبول ہوتے ہیں آسمان پر بھی اس کا بول بالا ہوتا ہے۔

۱۰ اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے　　تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو

اور زمین والوں پر بھی وہ نالہ اپنا کارگر وار کئے بغیر نہیں رہتا، دردمند رونے لگتے ہیں، نیم ہوش ہوش میں آجاتے ہیں اور بعضے بیہوش اور مدہوش بھی جاگ اٹھتے ہیں، یعنی وہ مضامین عارفانہ نامردوں کو مرد، مردوں کو شیر مرد اور شیر مردوں کو عین درد بنا دیتے ہیں، البتہ جو محروم ازلی ہیں ان کی ہدایت کسی کے بس میں نہیں اس لئے فرماتے ہیں۔

۱۱ ہر دردمند دل کو رونا مرا رلا دے　　بیہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگا دے

پہلے مصرع میں جو قضیہ موجبہ کلیہ ہے اور دوسرے میں جو جزئیہ مہملہ ہے وہ اسی مضمون کا آئینہ دار ہے۔

ابو سلمان شاہجہانپوری

نئے خزانے

یہ اشاریہ مندرجہ عنوانات کے تحت ترتیب دیا گیا ہے

اس اشاریہ کی ترتیب میں مارچ ۱۹۶۶ء اور دیگر مہینوں کے درج ذیل رسائل واخبارات سے مدد لی گئی ہے

ماہنامہ ادب لطیف لاہور مارچ ۶۶ء
سہ ماہی اردو ادب علی گڑھ ۶۵ء نمبر ۲
ماہنامہ اردو ڈائجسٹ لاہور مارچ ۶۶ء
" اردو زبان سرگودھا "
" اردو نامہ کراچی "
ماہنامہ الرحیم حیدرآباد "
" الشجاع کراچی "
" انوار الاسلام رام نگر بنارس فروری
" اورینٹل کالج میگزین لاہور "
" برہان دہلی ستمبر تا مارچ
" بہائی میگزین لاہور مارچ اپریل
" پیام عمل " مارچ
" تحریک دہلی جنوری تا مارچ
" ترجمان القرآن لاہور مارچ
" تہذیب الاخلاق " فروری مارچ
" جامعہ دہلی مارچ
" جام نو کراچی "
" چراغ راہ "
" خاتون پاکستان کراچی مجلہ حج ۶۶ء
" خاتون دکن حیدرآباد نومبر دسمبر ۶۵ء

ماہنامہ خالد ربوہ مارچ ۶۶ء
" زندگی رام پور اکتوبر ۶۵ء تا مارچ ۶۶ء
" ساقی کراچی مارچ ۶۶ء
" سب رس حیدرآباد دکن ستمبر تا دسمبر ۶۵ء و مارچ ۶۶ء
" سیارہ لاہور مارچ ۶۶ء
" سیارہ ڈائجسٹ لاہور مارچ ۶۶ء
" شاعر بمبئی نومبر دسمبر ۶۵ء
" شاہکار الہ آباد نمبر ۲۵
" صبح امید بمبئی مارچ ۶۶ء
" طلوع اسلام لاہور "
" عارف " "
" عصمت کراچی "
" فاران " "
" ناقوس چاٹگام دسمبر ۶۵ء
" فروغ اردو لکھنؤ مارچ ۶۶ء
" فکر و خیال کراچی جنوری فروری
" فکر و نظر " فروری مارچ
" قومی زبان " مارچ
" کتاب لکھنؤ "
" کتابی دنیا کراچی "

ماہنامہ گل خنداں لاہور فروری مارچ ۶۶ء
سہ ماہی مجلہ ادارہ تحقیقات پاکستان لاہور جولائی اکتوبر ۶۵ء
ماہنامہ معارف اعظم گڑھ مارچ ۶۶ء
" منشور کراچی "
" مولوی دہلی "
" نقش کراچی فروری
" نگار پاکستان " "
" نوائے ادب بمبئی اکتوبر ۶۵ء
" نیرنگ خیال لاہور مارچ ۶۶ء
" ہندوستانی ادب حیدرآباد دکن جنوری مارچ

ہفت روزہ رسائل

آئین (لاہور) المنبر لائل پور، چٹان، خدام الدین، شہاب (لاہور) صدق جدید (لکھنؤ) ۳ ستمبر ۶۵ء تا ۲۵ فروری ۶۶ء و مارچ ۶۶ء قندیل (لاہور) ہماری زبان علی گڑھ

روزنامے

انجام، جنگ، حریت (کراچی - اشاعت ہائے جمعہ و اتوار)

ادب و تحقیق

آغا حشر کاشمیری	ٹھنڈی سڑک	انجام، ص ۷، ۱۴ر مارچ
ابو اللیث، ڈاکٹر	غنائیہ شاعری	خاتون دکن، ص ۲۲ تا ۲۳، نومبر دسمبر
، ،	سخن فہمی اور سخن شناسی	ہندستانی ادب، ص ۹۰ تا ۹۲، جنوری تا مارچ
احتشام احمد ندوی، سید	عبد القاہر جرجانی کا تنقیدی نظریہ	برہان، ص ۱۹۷ تا ۲۰۲، اکتوبر
، ، ،	ابوحیان توحیدی کے تنقیدی افکار کتاب المقاسیات کی روشنی میں	برہان ص ۳۶۰ تا ۳۶۴، دسمبر
احمد، محی الدین	قاضی عبد الودود سے تحقیق کے متعلق چند سوالات	شاعر، ص ۱۶ تا ۱۸، دسمبر
احمد عروج قادری، سید	حافظ شیرازی کی غزلیں	چراغ راہ، ص ۱۳ تا ۲۲، مارچ
احمر لاری	حسرت کی سیاسی شاعری	سب رس، ص ۳ تا ۱۰، ،
اختر، پروفیسر بشیر محمود	نذیر احمد کا ناول "ایامی"	ساقی، ص ۴۹ تا ۵۳، ،
اختر، محمد خالد	کیانی کے پریشان افکار	فنون، ص ۹۴ تا ۱۰۲، فروری مارچ
ارشد، ڈاکٹر اے ڈی	دیوان فیضی	مجلہ ادارۂ تحقیقات پاکستان، ص ۲۳ تا ۵۸، جولائی
اسمٰعیل پانی پتی، شیخ محمد	سرسید کی ادبی حیثیت (۶)	تہذیب الاخلاق، ص ۳۱ تا ۴۵، فروری
اعجاز احمد، چودھری	اردو ادب پر سرسید کا اثر	، ، ، ۵ تا ۱۱، مارچ
اعجاز حسین، ڈاکٹر	غزل (مضمون)	خاتون دکن، ص ۱۰ تا ۱۲، نومبر دسمبر
اقتدار عالم خاں	جنگ اور ادب	کتاب، ص ۱۶ تا ۱۸، مارچ
اکرام چغتائی، محمد	ولی گجراتی اور شاہ سعد اللہ گلشن	اردو نامہ، ص ۹ تا ۱۱، ،
امید، علی عباس عابدی	جدید شاعری میں ہیئت کا مسئلہ	شاعر، ص ۹ تا ۱۱، دسمبر
امین چند شرما، پروفیسر	مومن کی عشقیہ رباعیات[1]	نوائے ادب، ص ۶۵ تا ۷۴، اکتوبر

[1] یہ مضمون ہندستانی ادب، حیدر آباد دکن کے شمارہ جنوری تا مارچ ۶۲ء میں بھی نقل کیا گیا ہے

امیر حسن، ڈاکٹر سید	دیوان راقم	معارف، ص ۲۰۱ تا ۲۱۷، مارچ
انتظار حسین	ادب جنگ کے بعد	فنون، ص ۹۲ تا ۹۳، فروری مارچ
انعام ادیب	پاکستانی ادب	گل خنداں، ص ۱۰ تا ۱۲، "
بشیر حسین، ڈاکٹر محمد	مکتوبات سعد اللہ (تعارف)	مجلہ ادارہ تحقیقات پاکستان، ص ۱۰۸ تا ۱۱۰، جولائی اکتوبر
پروین عالم	ادب اور جمالیات	شاعر، ص ۱۲ تا ۱۵، دسمبر
"	ادب اور افادیت	تحریک، ص ۱۷ تا ۲۱، فروری
تبسم کاشمیری	سرشار — تحقیقی جائزہ	اردو زبان، ص ۱۶ تا ۲۱، مارچ
جلیل قدوائی	انشائے ہاشمی فرید آبادی	قومی زبان، ص ۴۱ تا ۴۹، "
خلیل الرحمان اعظمی	اختر الایمان — ایک متحرک شاعر	شاہکار، ص ۱۱۳ تا ۱۲۸،
خیال بخاری	زبان ترقی کا زینہ	اردو نامہ، ص ۱۶ تا ۲۶، مارچ
رفیقہ سلطانہ، ڈاکٹر	حیدرآباد میں افسانہ کی تدریج و ترقی	سب رس، ص ۲۸ تا ۳۲، اکتوبر
ریاض احمد	آج کے عہد میں ادب کا مفہوم	ادب لطیف، ص ۸۳ تا ۸۸، فروری مارچ
سبط حسن، سید	طوفان سے پہلے (۲)	فنون، ص ۱۱۱ تا ۱۲۰، فروری مارچ
سرفراز فاروقی	کرشن چندر اور رومانیت	ادب لطیف، ص ۸۹ تا ۹۵، " "
سلامت اللہ خاں	سودا بحیثیت طنز نگار	نگار پاکستان، ص ۴۳ تا ۵۲، فروری
سیدہ جعفر، ڈاکٹر	مخدوم کی نظم نگاری	کتاب، ص ۶۹ تا ۷۴، مارچ
شماتوت، آزاد نصیر الدین	سب رس مصنفہ ملا وجہی میں عربی اور فارسی الفاظ	سب رس، ص ۳ تا ۲۰، ستمبر
شمیم اختر	سرسید سے مولوی عبدالحق تک	انجام، ص ۷، ۱۴، مارچ
عابد حسین، ڈاکٹر سید	غزل کا مستقبل	خاتون دکن، ص ۱۷ تا ۱۹، نومبر دسمبر
عبدالحلیم چشتی، مولانا	سید احمد شہید کی تحریک کا اثر اردو ادب پر	الرحیم، ص ۵۰ تا ۷۰، مارچ
عبدالواحد، پروفیسر ابوظفر	نگار خانہ نیر	سب رس، ص ۷ تا ۹، نومبر
عبداللہ، ڈاکٹر سید	اردو شاعری پر ایک اور نظر	فنون، ص ۵۰ تا ۶۶، فروری مارچ
عضد الدین خاں، محمد	شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی محفل	
	شعر و ادب	برہان، ص ۱۴۸ تا ۱۵۸، ستمبر

نام	عنوان	رسالہ
علی جواد زیدی	لکھنؤ کے پرانے چراغ	فروغ اردو، ص ۱۴ تا ۱۷، مارچ
علی عباس جلالپوری، سید	روحِ عصر (۳)	فنون، ص ۷۲ تا ۷۶، فروری مارچ
غلام رسول، مولوی	اردو زبان کی داستان	سب رس، ص ۲۵ تا ۲۸، دسمبر
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر	جگر کے شاعرانہ مرتبے کا تعین	نگار پاکستان، ص ۴۳ تا ۴۶، فروری
فضل الرحمان صوائی، مولانا حکیم	دوستانِ امیر خسروؒ	برہان، ص ۳۰۰ تا ۳۱۴، دسمبر
فہمیدہ ریاض (مترجم)	کچھ مفہوم کی وضاحت کے بارے میں	فنون، ص ۱۰۷ تا ۱۱۰، فروری مارچ
کرمانی، امان اللہ	ملک العزیز درجینیا	نیرنگ خیال، ص ۱۱ تا ۱۴، مارچ
کریم فاطمہ	امجد کی رباعیات	سب رس، ص ۱۴ تا ۱۸، نومبر
محمد باقر	مقدمہ قصر عارفاں	اورینٹل کالج میگزین، ص الف تا ز، فروری
محمد عمر، ڈاکٹر	میر کا سیاسی اور سماجی ماحول	برہان، ص ۱۷۷ تا ۱۸۷، ستمبر
"	" "	" ، ص ۲۴۹ تا ۲۵۳، اکتوبر
مظہر العلیم، پروفیسر	ہم اور اردو ادب کا مستقبل	فانوس، ص ۱۵ تا ۱۷، دسمبر
ملا واحدی دہلوی	اہلِ قلم کا مقدر	ساقی، ص ۱۱ تا ۱۳، مارچ
منیر احمد شیخ	نیئں ریساں شہر لہور دیاں	فنون، ص ۱۰۳ تا ۱۰۶، فروری مارچ
مین را	دیوندر ستیارتھی کے ساتھ ایک دن	تحریک، ص ۹ تا ۱۶، مارچ
میمونہ انصاری	آگ کا دریا	ادب لطیف، ص ۶۶ تا ۸۰، فروری مارچ
نسیم، سلطان جمیل	التماس پر ایک تحقیقی نظر	نیرنگ، ص ۳۶ تا ۴۸، مارچ
نظیر صدیقی، پروفیسر	نئی نظم اور پورا آدمی	ساقی، ص ۲۹ تا ۳۲، "
نیاز فتح پوری	سٹیج اور تمثیل کا آغاز	نیرنگ خیال، ص ۳۹ تا ۴۰، مارچ
نیر اقبال	گیلکرسٹ اور اس کی ہندستانی زبان کی قواعد	ہماری زبان، ص ۳ تا ۴، ۶۶-۸۰، جلد مارچ
وحید اشرف، سید	تاریخ پیدائش و وفات سید اشرف جہانگیر سمنانی	معارف، ص ۲۱۸ تا ۲۲۴، مارچ
وحید قریشی	ہمارے ادب کا نیا دور	فنون، ص ۸۸ تا ۹۱، فروری مارچ
وزیر آغا	ڈاکٹر سید عبداللہ کا ایک مضمون	اردو زبان، ص ۳ تا ۱۳، مارچ
وقار احمد رضوی	ادب کیا ہے؟	ہندستانی ادب، ص ۳۹ تا ۴۳، جنوری تا مارچ

دلی الحق انصاری ڈاکٹر محمد	کلیات عرفی شیرازی پر ایک تحقیقی نظر[1]	برہان، ص ۱۲ تا ۳۲، جنوری
" " "	" " " "	" " ۹۷ تا ۱۰۶، فروری
یوسف حسن، حکیم	آغا حشر کا صید ہوس	نیرنگ خیال ص ۵۷ تا ۶۸، مارچ
———	توازن — زندگی اور ادب میں	فروغ اردو، ص ۹ تا ۱۳، مارچ
———	محمد عبد اللہ قریشی سے ایک ملاقات	سیارہ، ص ۲۸، مارچ

دیگر زبانوں کا ادب

اختر رضوی	سندھی، پاکستان کی قدیم ترین علاقائی زبان	انجام، ص ۶، ۷، مارچ
تحسین سروری	تلگو زبان پر فارسی کا اثر	اردو نامہ، ص ۳۳ تا ۳۹، مارچ
جعفر رضا، زیدی	ہندی شاعری کا تاریخی جائزہ	معارف، ص ۱۹۷ تا ۲۰۹، "
ناصر اصلاحی، عبد الرحمان	فارسی زبان کا ارتقا	برہان، ص ۳۶۴ تا ۳۶۹، دسمبر
نیاز فتح پوری	فارسی طنز نگاری کا لطیف پہلو	نگار پاکستان، ص ۲۷ تا ۳۰، فروری

اردو زبان اور اس کے مسائل

ابن منور وزیری	اردو اور ۱۹۷۲ء	قومی زبان، ص ۶۰ تا ۶۲، مارچ
تاج، ریاست علی صدیقی	دکن میں آندھرا اور تلگو	سب رس، ص ۱۰ تا ۱۳، نومبر
عبد اللطیف	قومی زبان، گاندھی اور جامعہ	جامعہ، ص ۱۴۸ تا ۱۵۳، مارچ
کرشنا مورتی، پروفیسر	اردو میں تلگو کے الفاظ	سب رس، ص ۱۱ تا ۱۲، ستمبر

تاریخ

آفتاب حسن، میجر	قائد اعظم کے ساتھ چند گھنٹے	حریت، ص ۶، ۲۴، مارچ
الطاف حسن قریشی	معرکۂ باٹا پور	اردو ڈائجسٹ، ص ۱۵ تا ۲۶، "
امام الدین رام نگری، ابو محمد	معیاری اسلامی حکومت — خلافت راشدہ (قسط ۱۳)	انوار الاسلام، ص ۸۵ تا ۹۲، فروری

---

[1] یہ مضمون ماہنامہ کتاب لکھنؤ کے شمارہ مارچ ۱۹۷۲ء میں بھی نقل کیا گیا ہے۔

انعام درانی	۲۳ مارچ — ایک تاریخ ساز تاریخ	جنگ، ص ۵، ۲۳ مارچ
حزین، صلاح الدین	قرآن حکیم، مسلمان سپاہی اور انگریز افسر	نقش، ص ۱۱۳ تا ۱۲۴،
حسین امام، سید	تاریخ پاکستان کا ایک بڑا دن	حریت، ص ۵، ۲۴ مارچ
ذوالفقار حسین بخاری، سید	سید سلیمان ندوی — بحیثیت ایک مورخ	برہان، ص ۲۹۵ تا ۳۰۹، نومبر
رضوان احمد	قرارداد پاکستان کا پس منظر	حریت، ص ۷، ۲۴ مارچ
رئیس احمد جعفری	تاریخ پاکستان کی جھلکیاں نمبر ۲ تا ۵	انجام، ص ۵، ۱۸، ۱۹، ۲۲ مارچ
زبیر خاں آفندی، راجہ محمد	قرارداد پاکستان کا پس منظر و پیش نظر	" " " ۲۴ "
شبیر احمد خاں غوری	موسیو سدیو کی تاریخ عرب پر ایک نظر	برہان، ص ۴۳ تا ۵۳، جنوری
شریف کیانی، محمد	بارودی سرنگیں	اردو ڈائجسٹ، ص ۶۲ تا ۶۸ + ۱۹۱، مارچ
ضیاء الحسن فاروقی	علامہ شبلی — مورخ کی حیثیت سے (۱)	جامعہ، ص ۱۲۲ تا ۱۴۱، مارچ
عبداللہ قریشی، محمد	لاہور کی کہانی	مجلہ ادارہ تحقیقات پاکستان، ص ۱ تا ۲۲، جولائی اکتوبر
عبیداللہ سندھی، مولانا	جدوجہد آزادی کا ایک ورق — سندھ ساگر پارٹی کا دستور العمل	جنگ، ص ۲، ۲۴ مارچ
عروج، عبدالرؤف	بنگال کا پہلا مسلمان فاتح — ملک بختیار الدین خلجی	انجام، ص ۱۳، ۲۴ مارچ
عزیز الرحمان، محمد	پاکستان کے دستور کا بنیادی تصور	" " ۶، ۲۴ "
عقیل دانش	پاکستان کا سنگ بنیاد سرسید نے رکھا تھا	" " ۵، ۲۸ "
علی صابری، سردار	۲۳ مارچ ایک یادگار دن	" " ۵، ۲۴ "
فاتح قائم آبادی	جدوجہد آزادی کے تین دور	قندیل، ص ۷ تا ۸، ۲۰ "
مائل، محمد زکریا	اہل چین ابن بطوطہ کی نظر میں	فاران، ص ۲۹ تا ۳۰، "
محمد اسلام، حافظ	تصور پاکستان کا ارتقاء	جنگ، ص ۴ + ۱۸، ۲۴ "
محمود ربانی، خالد	نظریہ پاکستان کی تشکیل	قندیل، ص ۶، ۲۰ "
مظہر انصاری	نائجیریا کی بغاوت	سیارہ ڈائجسٹ، ص ۳۳ تا ۳۸، مارچ
ناز، ایم ایس	آزادی کا قافلہ منزل بہ منزل	قندیل، ص ۹ تا ۱۱ + ۱۸، ۲۰ "

محمد مجیب، پروفیسر	ہماری تاریخ [1]	
مترجم :- نذیر الدین مینائی		جامعہ، ص ۱۱۵ تا ۱۲۱، مارچ
یامین خاں، نواب سر محمد	پانی پت کی تیسری لڑائی	عصمت، ص ۴۳ تا ۱، ؍

تعلیمات اور تعلیمی و تحقیقی ادارے

اشتیاق حسین قریشی	سائنس کی تدریس [2]	قومی زبان، ص ۱۳ تا ۱۸، مارچ
اختر بھٹی، نعمت علی	اردو میں سائنسی تعلیم کا مستقبل	انجام، ص ۵، ۷ر مارچ
بشارت علی قریشی، ڈاکٹر محمد	ہمارے تعلیمی نظام کی کوتاہیاں	تہذیب الاخلاق، ص ۳۷ تا ۴۳، مارچ
خدا بخش بچا، ملک	خطبہ تقسیم اسناد [3]	قومی زبان، ص ۳ تا ۱۳، مارچ
رشید احمد صدیقی	سر سید اور علی گڑھ	انجام، ص ۲، ۲۸ر مارچ
عبدالغفور، خواجہ	نئی تعلیم	جنگ، ص ۹، ۲۸ر ؍
قریشی، اے ڈی	اصلاح معاشرہ و تعلیم بالغان	فکر و خیال، ص ۱۲ تا ۱۸، جنوری فروری
محمد باقر	خطبہ بتقریب یوم تاسیس	اورینٹل کالج میگزین، ص ۱ تا ۹، فروری
محمد عثمان، پروفیسر	ہمارا نظام تعلیم	چٹان، ص ۱۵، ۷ر ۱۴ر ۲۱ر مارچ
نجید، حمید اصغر	پاکستان کے دینی مدارس	؍ ؍ ۱۰ تا ۱۱، ۱۴ر ؍
نذیر احمد کاشمیری، صوفی	ہندستان کے اسلامی اداروں کا مستقبل	صدق جدید، ص ۸، ۱۰ر ۲۴ر ستمبر

تہذیب و تمدن

عبدالماجد دریابادی، مولانا	ایک مٹائی ہوئی تہذیب (لکھنؤ کی قدیم تہذیب)	صدق جدید، ص ۵ تا ۶، ۳ر ستمبر
محمد اسلم، پروفیسر خواجہ	اسلامی تہذیب اور اس کے عناصر ترکیبی	شہاب، ص ۸ تا ۱۰، ۱۳ر مارچ
ناز، ایم ایس	میلے - علاقی تہذیب کا عکس	قندیل، ص ۱۰ تا ۱۱، ۲۷ر ؍

---

[1] جامعہ کالج کے زیر اہتمام تاریخی سیمنار کا خطبہ افتتاح

[2] یہ مضمون ہفت روزہ لاہور کے ۲۰ر مارچ ۱۹۷۷ء کے شمارے میں بھی نقل ہوا ہے۔

[3] مغربی پاکستان زرعی یونیورسٹی کے پہلے جلسۂ تقسیم اسناد میں پڑھا گیا۔

ناصر زیدی	موت کی رسمیں	سیارہ ڈائجسٹ، ص ۱۸ تا ۲۸، مارچ

خودنوشت سوانح

بخاری، سید ذوالفقار علی	بخاری کی سرگزشت نمبر ۱، ۲	حریت، ص ۴، ۲۱ و ۲۹ ر مارچ
خورشید احمد	میرا مطالعہ	سیارہ، ص ۳۴ تا ۴۰، "
سہروردی، حسن شہید	سہروردی کی کہانی سہروردی کی زبانی	جنگ، ص ۲، ۷، ۱۳، ۲۱ر "
عبدالماجد دریابادی، مولانا	ایک چالیس سالہ دورِ خدمت	صدق جدید، ص ۱، ۱۰ر ستمبر

سائنس

غازی عبدالحمید	چاند کا سفر	لاہور، ص ۳ تا ۷، ۱۰، ۱۴ر مارچ
مجاہد، رحمت علی	ایٹمی توانائی — تابکاری	سیارہ ڈائجسٹ، ص ۵۵ تا ۶۲، "

سیاسیات ومعاشیات

احسن علی خاں	جنوب مشرقی ایشیا کی سیاست کا تجزیہ	منشور، ص ۴۲ تا ۴۵، مارچ
راشدی، پیر علی محمد	مشرق ومغرب	جنگ، ص ۱۲، ۵ر ۱۲ر ۲۸ر "
عارف دہلوی	پارلیمانی نظام — ناکام یا کامیاب	آئین، ص ۷، ۱۰، ۹ر مارچ
عبدالقیوم کانپوری، مولانا	قضیہ کشمیر — اعلان تاشقند کے پس منظر میں	انجام، ص ۵، ۷ر مارچ
عبدالماجد دریابادی، مولانا	وطن دوستی اور اس کا درجہ	صدق جدید، ص ۵ تا ۶، ۲۹ر اکتوبر
عظمت اللہ خاں	معاشیات — آئیڈیولوجی اور اخلاق	چراغ راہ، ص ۳۲ تا ۳۴، مارچ
نذیر احمد کاشمیری، صوفی	ہندو پاک کی تمام مشکلات کا حل	صدق جدید، ص ۷ تا ۸، ۲۵ر اکتوبر
مترجم:- اب العدن	پاکستان اور امریکی امداد کا بوجھ	منشور، ص ۱۳، مارچ

سیر وسیاحت

ٹموتھی سیورن مترجم:- س۔م۔حسین	مارکو پولو کے نقش قدم پر	اردو ڈائجسٹ، ص ۵۹ تا ۹۰، مارچ

مصنف	عنوان	ماخذ
سعید احمد اکبرآبادی	دیارِ غرب کے مشاہدات و تاثرات	برہان، ص ۱۷۰ تا ۱۸۰، مارچ
محمد شریف، مولانا	دیارِ حبیب صلعم کی باتیں	المنبر، ص ۵ تا ۶، ۴ مارچ
نوروَلی، عبدالرحمان	مشاہدات سفر (ریاض)	صدق جدید، ص ۶ تا ۷، ۱۰ ، ۲۴ ستمبر
وجاہت علی، سید	۷ روپے میں سیرِ جہاں (۳۵)	انجام، ص ۲، ۱۲ مارچ

شخصیات

آزاد، مولانا ابوالکلام

مصنف	عنوان	ماخذ
ابوسلمان شاہجہانپوری	مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبیداللہ سندھی افکار و شخصیات کا تقابلی مطالعہ - چند اشارات	برہان، ص ۲۳۰ تا ۲۴۳، اکتوبر
ابوسلمان الہندی	مولانا آزاد اور ان کا فلسفۂ تعلیم	ہندستانی ادب، ص ۵۹ تا ۶۲، جنوری مارچ
سعید احمد اکبرآبادی، مولانا	ترجمان القرآن - جلد اول - مولانا ابوالکلام آزادؒ	برہان، ص ۳۱۷ تا ۳۱۸، نومبر

اقبال، علامہ

مصنف	عنوان	ماخذ
اقبال، شاعر مشرق علامہ	منزل کی طرف[1]	جنگ، ص ۴ ، ۲۲ مارچ
انیس احمد اعظمی	عصرِ حاضر - کلام اقبال کے آئینے میں	نگار پاکستان، ص ۱ تا ۲۲، فروری
رئیس الحسن	اقبال اور ان کی شاعری	فانوس، ص ۱۰۵ تا ۱۱۲، دسمبر
شورش کاشمیری	سید عبدالواحد ایم اے - مدرسہ اقبال کے ایک اسکالر	چٹان، ص ۴ ، ۲۸ مارچ
صابری، مصطفیٰ خورشیدی	اقبال بارگاہ خداوندی میں	فانوس، ص ۷۳ تا ۸۱ ، دسمبر

غالب

مصنف	عنوان	ماخذ
اختر، قاضی احمد میاں	نثرِ اردو کا مجدد غالب	عارف، ص ۵۳ تا ۶۴، مارچ

---

[1] وہ خطبہ جو مسلم لیگ کے اجلاس الہ آباد میں ۱۹۳۰ء میں دیا گیا۔

ادیب، احمد علی خاں	خطوط غالب	سب رس، ص ۱۹ تا ۲۲، مارچ
تحسین سروری	غالب ـ شخصیت اور شاعری کے آئینے میں	جنگ، ص ۸، ۷ر مارچ
حنیف فوق	غالب اردو کا سب سے بڑا شاعر	سیارہ، ص ۹۱ تا ۹۷، "
سرور، آل احمد	غالب کی شخصیت	الشجاع، ص ۴۱ تا ۴۴، "
طالب کشمیری، پروفیسران - ایل کے	سرمایۂ کلام غالب	نوائے ادب، ص ۹۳ تا ۵۵، اکتوبر
عبد الودود، قاضی	آغا احمد علی اور غالب	تحریک، ص جنوری
کمال کبریا	غالب اور غزل	کتابی دنیا، ص ۵ تا ۸، مارچ

دیگر شخصیات

آفتاب اختر	کلیم ابو القاسم فردوسی طوسی	برہان، ص ۲۰۳ تا ۲۱۱، اکتوبر
ابو بکر شبلی	شیخ محی الدین ابن عربی	الرحیم، ص ۱۲۱ تا ۱۳۷، مارچ
ابو سعید عبد العزیز	مولانا احمد علیؒ	خدام الدین، ص ۵۵ ۱۵ / ۲۵ر مارچ
اختر رضوی	تیتو میر شہید	انجام، ص ۱۳، ۲۴ر مارچ
اکبر الدین صدیقی	مہاراجہ سرکشن پرشاد	ہندستانی ادب، ص ۸۷ تا ۹۱، جنوری مارچ
" "	سیٹھے بچن سناؤں[1]	سب رس، ص ۷ تا ۲۴، ستمبر تا دسمبر
انور حسین	شفاء الملک حبیب الرحمان خاں	انجام، ص ۲، ۲۹ر مارچ
اوصاف علی، سید	مولانا ناصر جلالی	ساقی، ص ۳۴ تا ۳۴، "
بشیر حسین، ڈاکٹر محمد	احوال و آثار حکیم ابو الفتح گیلانی	مجلۂ ادارۂ تحقیقات پاکستان، ص ۵۸ تا ۱۰۷، جولائی اکتوبر
تحسین سروری	سید جمال الدین افغانی	جنگ، ص ۹، ۲۴ر مارچ
جاوید اختر	اصغر گونڈوی	تہذیب الاخلاق، ص ۵۸ تا ۶۱، فروری
جعفر رضا، زیدی	ملا کاشفی بدخشانی اور سید احمد کاشفی	برہان، ص ۱۰۳ تا ۲۱۳، نومبر

---

[1] اس عنوان کے تحت ستمبر میں فراق بیجا پوری، اکتوبر میں ثانی شیرازی اور رسالک یزدی، نومبر میں قدیمی، بریدی اور دلاوری خاں آزاد اور دسمبر ۱۹۶۸ء میں سید شاہ دادل اور سید علی کی شخصیات کا تذکرہ کیا ہے

جمال کڑپوی	شری مان پٹا پرتی نارائن جارلو (تلنگو ادیب)	سب رس، ص ۳ تا ۹، دسمبر
خلیق احمد نظامی	داستان امیر خسروؒ[1] — ایڈیٹر برہان کے نام ایک خط	برہان، ص ۱۱۳ تا ۱۲۰، فروری
دلبر حسن، مولانا	سید عطاء اللہ شاہ بخاری	انجام، ص ۲، ۵ مارچ
ذکاء الرحمان	رشید اختر ندوی	ادب لطیف، ص ۹ تا ۱۲، فروری مارچ
ذکاء الرحمان و اختر، سید جاوید	جان سیپان[2]	" " " ۱۷ تا ۲۰، " "
زینت ساجدہ	فیض الحسن خیال	خاتون دکن، ص ۹ تا ۱۳، نومبر دسمبر
سعید الرحمان	حضرت مولانا عبد الرحمان	خدام الدین، ص ۱۰، ۱۱ مارچ
شاہد احمد دہلوی	آغا شاعر قزلباش	اردو زبان، ص ۴۰ تا ۵۴، "
شمیم احمد	شاہد احمد دہلوی	قومی زبان، ص ۳۳ تا ۳۷، "
شورش کاشمیری	مولانا عبد الہادی دین پوری	خدام الدین، ص ۹ + ۱۸، ۱۱ "
ظہیر احسن، ڈاکٹر سید	فورٹ ولیم کالج کی عظیم ادبی شخصیت میر مظہر علی خاں ولا	نوائے ادب، ص ۵ تا ۳۸، اکتوبر
عابد نظامی	مولانا حسرت موہانی	نیرنگ خیال، ص ۴۹ تا ۵۱، مارچ
عبد المجید سندھی، میمن	عبد الحکیم عطا	اردو نامہ، ص ۱۲ تا ۱۵، "
عبد الواحد، پروفیسر ابوظفر	نئی شاعری کا نقیب — حالی	خاتون دکن، ص ۷ تا ۱۱، نومبر دسمبر
عزمی کراروی، سید نذر عسکری	ملا سید شاہ محمد طاہر	پیام عمل، ص ۲ تا ۲۰، مارچ
عنبر چغتائی	سہا مجددی	حاکم نو، ص ۵ تا ۱۸، "
غلام عمر خاں، ڈاکٹر	ڈاکٹر زور مرحوم	سب رس، ص ۴۳ تا ۵۳، ستمبر
فراق گورکھپوری	اکبر الہ آبادی	فروغ اردو، ص ۴ تا ۸، مارچ
کلکرنی ایس ۔ آر	ڈاکٹر زور مرحوم	سب رس، ص ۳۳ + ۳۵، ستمبر

---

[1] اسی عنوان سے دسمبر ۱۹۵۸ء کے شمارے میں مطبوعہ مضمون میں بعض فرو گزاشتوں کی نشان دہی اور ان کی تصحیح ۔

[2] ادیبوں کے قلمی چہرے ۔ اس شمارے میں مندرجہ ذیل ادیبوں کے چہرے تحریر کیے گئے ہیں ۔ نصیر انور، بانو قدسیہ، رفیق خاور جسکانی، ساغر صدیقی، الطاف مشہدی، محمود شام، لطیف کاشمیری، ناصر زیدی اور راؤ مختار احمد

شورش کاشمیری	قلمی چہرے[1]	چٹان، ص ۸، ۷، ۱۴ مارچ
محمد تقی، سید	شبلی ایک مفکر کی حیثیت سے	جنگ، ص ۷، ۱۴ مارچ
محمد ظفر خاں، ڈاکٹر	شیخ یعقوب صوفی کشمیری	ساقی، ص ۳۳ تا ۴۴، "
معین الرحمان، سید	ذکر عبدالحق	نگار پاکستان، ص ۵۳ تا ۶۲، فروری
مقبول احمد سیوہاروی	بزرگوں کے تذکرے[2]	برہان، ص ۱۰۷ تا ۱۱۲، "
میمن، غلام نبی	ہمارا صدر	جنگ، ص ۶، ۲۴ مارچ
نازلی، روبینا	ان کا گھرانا علمی و ادبی گھرانا ہے[3]	حریت، ص ۶، ۳ مارچ
ناصر، نصر اللہ خاں	حضرت حسان بن ثابت رض	خالد، ص ۷۳ تا ۱۴، "
نجید، حمید اصغر	مولانا احمد علی لاہوری	خدام الدین، ص ۷ تا ۸، ۱۲، ۱۷ مارچ
نذیر حسین	استاد احمد لطفی	برہان، ص ۲۴۴ تا ۲۴۸، اکتوبر
نصرت نوشاہی	تذکرہ بزرگان اسلام	عارف، ص ۱۱ تا ۱۶، مارچ
وفا راشدی	بنگال کے تین بزرگ[4]	الرحیم، ص ۲۳۷ تا ۲۴۳، ۷، "
یکتا جودھپوری	بیدل بدایونی	اردو نامہ، ص ۲۷ تا ۳۲، "
یوسف حسین خاں، حکیم	سرسید اور اکبر الہ آبادی	سب رس، ص ۱۰ تا ۱۶، دسمبر
————	ہمارے شاعر[5]	فنون، ص فروری مارچ
————	سر شاہ سلیمان	جنگ، ص ۸، ۱۳ مارچ
————	چودھری رحمت علی	" " ۷، ۲۴ "

---

[1] اس عنوان کے تحت ۷ مارچ کے شمارے خان عبدالوحید خاں، ڈاکٹر محمد باقر اور شیخ فضل کریم اور ۱۳ مارچ کے شمارے میں آغا بیدار بخت اور پروفیسر حمید احمد خاں کے قلمی چہرے لکھے ہیں۔

[2] زیر ترتیب کتاب خاصان خدا میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے حالات کا ایک حصہ

[3] ڈاکٹر اسلم فرخی کے متعلق — مسز تاج اسلم فرخی سے انٹرویو۔

[4] شیخ جلال الدین تبریزی سہروردی، شاہ جلال یمنی سلہٹی اور شاہ جلال دکنی

[5] اس عنوان کے تحت ادا جعفری، محسن احسان، کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض کی شخصیت و کلام کا تعارف کرایا گیا ہے۔ لکھنے والے ہیں قاضی عبدالغفار مرحوم، انور خواجہ، شہزاد احمد اور محمد خالد اختر۔

صحافت

فیضان دانش	سرسید کے بعد کی اردو صحافت	تہذیب الاخلاق، ص ۲۳ تا ۲۴، فروری
منیر عبدالستار دلوی، ڈاکٹر	بمبئی کی اردو صحافت ۔ ایک جائزہ[۱]	صبح امید، ص ۲۱ تا ۲۰۲، ۲۲، مارچ

فنون لطیفہ

بابر آغا	منزل ہے کہاں تیری	فنون، ص ۲۶۱ تا ۲۶۴، فروری مارچ
پرسی براؤن		
مترجم :۔ سید مبارز الدین رفعت	ہندوستانی مصوری کا مسالہ اور تکنیک	سب رس، ص ۱۷ تا ۲۴، دسمبر
رشید ملک	راگوں کے نام	فنون، ص ۲۵۵ تا ۲۶۰، فروری مارچ
گوہر، جیون لال	ہندستان کا فن مصوری	شاعر، ص ۱۹ تا ۲۴، نومبر

کتابیات

ابو سلمان شاہجہانپوری	نئے خزانے (رسائل کا ماہوار اشاریہ)	قومی زبان، ص ۶۶ تا ۸۷، مارچ
افسر امروہوی	گنج ہائے گراں مایہ[۲]	" " " ۲۵ تا ۳۲، "
برنی، ضیاء الدین احمد	رسالوں پر طائرانہ نظر	کتابی دنیا، ص ۲۵ تا ۲۸، "
خالدی، ابو النصر	گلستر نامہ از اسمٰعیل	سب رس، ص ۳۶ تا ۴۰، اکتوبر
رسکن، جان		
مترجم :۔ احمد جمال پاشا	کچھ کتابوں کے بارے میں	اردو ادب، ص ۱۳۹ تا ۱۴۴،
ساحل، عبدالحلیم و دیگر حضرات	مقالہ نما	نوائے ادب، ص ۱ تا ۱۵، اکتوبر
سعید انصاری	خالق باری کے انداز پر تصنیفات	سب رس، ص ۳ تا ۱۲، "
فضل الرحمان، مولانا	بوم ۔ باورک اور اس کی کتاب ۔ ایک تعارف	برہان، ص ۲۸۵ تا ۲۹۶، نومبر

---

[۱] منقول از نوائے ادب بمبئی۔

[۲] مخطوطات انجمن ترقی اردو کی وضاحتی فہرست

مصنف	عنوان	ماخذ
نثار احمد، سندی	ایک نادر علمی تحفہ ـ تحفۃ الاشراف بمعرفۃ الاطراف شیخ ابوالحجاج المزی	برہان، ص ۲۱۲ تا ۲۲۰، اکتوبر
منظور حسین عباسی، قاضی	برصغیر پاک و ہند کی فارسی کتب کا تقابلی جغرافیہ اشاریہ ـ عہد قبل سلاطین مغلیہ (حصہ اول)	مجلۂ ادارۂ تحقیقات پاکستان، ص ۱ تا ۱۱، جولائی اکتوبر

لسانیات

مصنف	عنوان	ماخذ
شوکت سبزواری، ڈاکٹر	اشتقاقیات	اردو نامہ، ص ۴۴ تا ۴۷، مارچ
بالی، کنول کرشن	آریائی زبان و سامی عروض	کتاب، ص ۹۰ تا ۹۳، "
ہیشوری نیوگ، ڈاکٹر	آسامی بنگالی رسم الخط	سب رس، ص ۳ تا ۶، نومبر
وحید قریشی، ڈاکٹر (مرتب)	فرہنگ شیرانی (آخری قسط)	فنون، ص ۱۰۳ تا ۱۳۱، فروری مارچ
ـــــــ	اردو لغت ـ مجمل ایڈیشن (قسط نمبر ۱۷)	اردو نامہ، ص ۱۹ تا ۳۸، "

مذہبیات

اسلام اور سیاسیات و معاشیات

مصنف	عنوان	ماخذ
اسحاق، سندیلوی	شریعت میں ۔۔۔۔۔ مال یا جان کا بیمہ کرانے کی گنجائش موجود ہے[1]	شہاب، ص ۸ تا ۹، ۲۰ مارچ
بوم ـ باورک مترجم: مولانا فضل الرحمان	سود کے نظریات کی تنقیدی تاریخ[2]	برہان، ص ۳۴۱ تا ۳۵۰، دسمبر
عبدالماجد دریا بادی، مولانا	سیکولرازم اور اسلام	صدق جدید، ص ۶، ۲۲ نومبر
معین الدین قادری، سید	سرمایہ کاری کی معاشی حقیقت اور اسلامی نقطۂ نظر سے اس کے معاوضے کی وجہ جواز نمبر ۱/۲	برہان، ص ۱۵۹ تا ۱۶۶، ستمبر اکتوبر

---

[1] مجلس تحقیقات شرعیہ ہند کا متفقہ فتویٰ اور روداد مجلس

[2] یہ مضمون فروری ۱۹۷۳ء میں ص ۵۳ تا ۵۸ اور مارچ ۱۹۷۳ء ص ۱۸۱ تا ۱۹۲ پر آیا ہے

محمد عثمان، پروفیسر شیخ	قرآن حکیم اور نظام حکومت	فکر و نظر، ص ۵۲۹ تا ۵۴۰، فروری مارچ
مودودی، مولانا سید ابوالاعلیٰ	اسلامی نظم معیشت کے اصول و مقاصد	ترجمان القرآن، ص ۳۰ تا ۴۶، مارچ

اسلام اور قانون

ابو شہاب	اسلامی قانون کی تشکیل جدید	طلوع اسلام، ص ۱۳ تا ۱۸، مارچ
اسحاق، خالد محمد	الاحکام السلطانیہ	فکر و نظر، ص ۵۷۱ تا ۵۸۳، فروری مارچ
امینی، مولانا محمد تقی	احکام شرعیہ میں حالات و زمانے کی رعایت[1]	برہان، ص ۳۲۵ تا ۳۴۰، دسمبر
طفیل احمد قریشی	اسلامی قانون کی تدوین	الرحیم، ص ۶۶۹ تا ۶۸۰، مارچ
فارق، ڈاکٹر خورشید احمد	خلفائے راشدین اور اجتہاد و تشریع	برہان، ص ۲۷۲ تا ۲۸۴، نومبر
فضل الرحمان	اسلامی قانون میں حد کا تصور	فکر و نظر، ص ۵۴۱ تا ۵۴۳، فروری مارچ
مظہر الدین صدیقی	عہد جدید میں اسلامی قانون سازی	" " ۵۴۴ تا ۵۷۰، " "

تفسیر قرآن مجید

حبیب الرحمان، مولانا	تاج التراجم فی تفسیر القرآن	صدق جدید، ص ۶ تا ۷، ۳۰ ستمبر
زاہد الحسینی، مولانا قاضی	درس قرآن (سورہ بقرہ آیت ۲۴۶ تا ۲۵۲)	خدام الدین، ص ۱۱ تا ۱۳، ۲۵ مارچ
سالم قدوائی، محمد	سید محمد گیسو دراز اور ان کی تفسیر ملتقط	برہان، ص ۱۰۶ تا ۱۲۷، "
عبدالرحمان لودھیانوی، ایم	حروف مقطعات قرآنی	خدام الدین، ص ۱۱ تا ۱۲، ۴ "
علی نقی النقوی، سید	تفسیر القرآن	پیام عمل، ص ۹ تا ۱۰، مارچ
مبارک علی خاں، چودھری	حروف مقطعات (۱)[2]	صدق جدید، ص ۶ تا ۷، یکم اکتوبر
محمد شفیع، مفتی	معارف القرآن (سورہ ہود آیت ۱۱۱ تا ۱۲۳)	شہاب، ص ۷ و ۱۱، ۱۰ مارچ
ملا واحدی	ایک آیت قرآن کا مفہوم	فاران، ص ۸ تا ۹، مارچ

---

[1] یہ سلسلہ مضمون مارچ ۱۹۶۱ء تک مسلسل ہے

[2] یہ مضمون دسمبر ۱۹۶۰ء میں بھی ص ۳۵۱ تا ص ۳۵۹ پر آیا ہے

[3] یہ سلسلہ مضمون ۱۵ اکتوبر اور ۲۲ اکتوبر ۱۹۶۰ء کے شمارے تک جاری رہا

مودودی، مولانا سید ابوالاعلیٰ	الفتح (۳)	ترجمان القرآن، ص ۱۷ تا ۲۹، مارچ

مسائل ومباحث

ابوطاہر فارانی	ہمارا آقا صلی اللہ علیہ وسلم	لاہور، ص ۵، ۱۴ر مارچ
ابوالجلال ندوی، مولانا	آیات حج	خاتون پاکستان، ص ۵۵ تا ۷۰،
احمد مینائی، حسن	رویت ہلال	ترجمان القرآن، ص ۱۶ تا ۲۸، مارچ
امن گیسو دراز، محمد مرزا منور علی بیگ	حضرت ہاجرہ کی معاشی قربانی	خاتون پاکستان، ص ۱۰ تا ۱۱،
انور، مولانا عبید اللہ	اطاعت رسول اور ایمان کی تکمیل	خدام الدین، ص ۵ تا ۶، ۱۱ر مارچ
بیگم صوفی	اسلام اور طرز معاشرت	عصمت، ص ۱۲۱ تا ۱۲۲، مارچ
پرویز	کمیونزم اور اسلام	طلوع اسلام، ص ۹ تا ۱۴، ”
تقی الدین ندوی مظاہری	امام نسائی اور ان کی سنن کی خصوصیات	برہان، ص ۱۳۳ تا ۱۴۷، ستمبر
” ” ”	موطا امام مالک اور اس کی خصوصیات	” ” ۲۶۱ تا ۲۷۷، نومبر
” ” ”	امام طحاوی اور ان کی شرح معانی الآثار	” ” ۱۳۳ تا ۱۴۳، مارچ
صباح الدین عبدالرحمان، سید	سولہویں اور سترہویں صدی میں شمالی ہند میں مسلمان مجددوں کی تحریکیں	معارف، ص ۱۶۵ تا ۱۹۶، مارچ
طارق، رحمت اللہ	تصویر اور اسلام	نگار پاکستان، ص ۵ تا ۱۶، فروری
ظفر احمد عثمانی، مولانا	جہاد اسلامی ۔ حکومت کی حفاظت کے لیے یا دین کی اشاعت کے لیے ؟	شہاب، ص ۱۰ تا ۱۳، ۶ر مارچ
عبدالحمید صدیقی	مذہب اور تجدید مذہب	ترجمان القرآن، ص ۴۷ تا ۶۰، ”
عبدالقدوس ہاشمی	حج بیت الحرام	خاتون، ص ۱ تا ۹۶،
عبدالماجد دریابادی	دہریت کی منطق	صدق جدید، ص ۵ تا ۶، ۱۸ر مارچ
عمادالدین، ڈاکٹر محمد	سرسید کی دینی خدمات	انجام، ص ۲، ۲۸ر مارچ
گنگا پرشاد اپادھیائے	مصابیح الاسلام	معارف، ص ۲۲۷ تا ۲۳۸، مارچ
محمد یوسف اصلاحی، مولانا	تبلیغ دین (آخری قسط)	زندگی، ص ۹ تا ۱۸، مارچ
مہر، مولانا غلام رسول	رسول اکرم کا آخری حج	خاتون پاکستان، ص ۸ تا ۲۴،

دیگر مذاہب

سلطان مبین	بودھ مذہب میں جنت و جہنم کی تفصیل	زندگی، ص ۲۰ تا ۲۷، اکتوبر
محمد اسماعیل ندوی، شیخ	عہد عتیق و عہد جدید پر ایک سرسری نظر	صدق جدید، ص ۳، ۱۱ر فروری
نذیر احمد کاشمیری، صوفی	وشو ہندو دھرم سمیلن اور اس کے بعد	" " ۳ تا ۲۵ ر مارچ

مکاتیب

دیریندر پرشاد سکسینہ بدایونی	مشاہیر کے چند غیر مطبوعہ خطوط[1]	اردو ادب، ص ۱۳۵ تا ۱۵۵،
شاد عارفی	شاد عارفی کا ایک اہم خط	" " ۱۵۶ تا ۱۵۹،

وفیات

احمد قادری، سید	احمد بن بیلو کی شہادت	زندگی، ص ۴۹ تا ۵۲، مارچ
شریف رزمی	محمد انوار الحق خیری	جام نو، ص ۷، مارچ
عبداللطیف اعظمی	خواجہ حافظ نبی احمد	جامعہ، ص ۱۵۴ تا ۱۶۰، مارچ
عبدالماجد دریا بادی، مولانا	بدر عالم میرٹھی ثم مدنی	صدق جدید، ص ۳+۷، ۱۲ر نومبر
گوپال متل	سیڈو میرمزوڈک (یوگوسلاوی ادیب و شاعر)	تحریک، ص ۳، مارچ
———	فخر ماتری انتقال کر گئے[2]	حریت، ص ۲، ۷ر "
———	ذوالنورین کا انتقال	ہماری زبان، ص ۲، ۱۵ر مارچ

---

[1] جلیل مانکپوری، ڈاکٹر سعید احمد سعید بریلوی، تمکین کاظمی، منشی دیا نرائن نگم، فانی بدایونی، اصغر گونڈوی، منشی احمد علی شوق، احسن مارہروی، دل شاہجہانپوری، عزیز لکھنوی اور مرزا یاس عظیم آبادی کے ایک ایک دو دو خطوط پیش کیے ہیں۔

[2] پاکستان کے تمام اخبارات میں مرحوم کے انتقال کی خبریں شائع ہوئیں اور اخبارات نے اداریے لکھے، ۸ر مارچ کے اخبارات میں ان پر بہت سے مضامین شائع ہوئے اور ۹ر مارچ کو اخبارات ان کے سوگ میں بند رہے۔

مطبوعات جدیدہ (نئی کتابوں اور رسالوں پر تبصرے)

نام	مصنف	تبصرہ نگار	حوالہ
آثار الصنادید	سرسید احمد خاں	ــ	صدق جدید، ص ۵ ، ۲۵ر مارچ
ابراہیم جلیس کی تین کتابیں	ــ	ارشاد احمد خاں	انجام، ص ۷ ، ۱۴ر مارچ
ابن ماجہ اور علم حدیث	مولانا محمد منظور نعمانی	مرزا شکور بیگ	سب رس، ص ۴۲ تا ۴۷، اکتوبر
اخلاق محسنی مترجم	مترجم: قاضی سجاد حسین	س	برہان، ص ۳۲۰ ، نومبر
اردو مرثیہ (تاریخ)	سفارش حسین رضوی	احتشام حسین	شاہکار، ص ۱۳۹ تا ۱۴۰
ارمغان لطیف	شاہ عبد اللطیف بھٹائی		
	مترجم و مولف: رشید احمد لاشاری	ــ	فاران، ص ۵۱ تا ۵۲، مارچ
اسلام کا تہذیبی نظام	یحییٰ ندوی	ــ	ترجمان القرآن، ص ۶۲، "
اسلامی تقاریب	غلام دستگیر رشید	ــ	چراغ راہ، ص ۵۰ ، "
اسلامی حکومت کے نقش و نگار	مولانا ظفر الدین مفتاحی	س	برہان، ص ۱۲۶، فروری
اقبال کا تصور عشق	ڈاکٹر غلام عمر خاں	حکیم یوسف حسین خاں	سب رس، ص ۴۴ تا ۴۵، ستمبر
اوراق لاہور (ماہنامہ)	ــ	ا ۔ م	نیرنگ، ص ۵۶، مارچ
بلوچی کے لوک گیت	ــ	ــ	سیارہ ڈائجسٹ، ص ۱۲۰، "
بنیادی اردو	ابو اللیث صدیقی	شان الحق	اردو نامہ، ص ۶۰ تا ۶۵، "
بوہرہ قوم کی تاریخ اور عقائد	ایم عباس اورنگ آبادی	ــ	فاران، ص ۵۳ تا ۵۴، "
بہادر شاہ ظفر فن اور شخصیت	خواجہ منظور حسین	م ۔ خ	کتابی دنیا، ص ۲۲، "
بہار سخن	یکتا جودھپوری	ــ	فاران، ص ۵۲ تا ۵۳، "
پاکستان کے عوامی گیت	مرتب: رفیق خاور	خاطر غزنوی	فنون، ص ۲۲۰ تا ۲۲۳، فروری، مارچ
پروفیسر پریکٹیکل کیمیا	ایم شفیع ایف دہلوی	م ۔ ع ۔ ر	انجام، ص ۷ ، ۱۴ر مارچ

لہ "ہنسے اور پھنسے" "نیکی کر بھلائے جا" اور "اوپر شیروانی اندر پریشانی"

نام	مصنف	تبصرہ نگار	حوالہ
تاریخ اکبری	محمد عارف قندہاری مرتبہ: معین الدین ندوی و سید اظہر علی	سعید احمد اکبر آبادی	برہان، ص ۱۹۲، مارچ
تذکرہ صوفیائے بنگال	اعجاز الحق قدوسی	محمد سرور	فکر و نظر، ص ۱۰۹ تا ۱۱۴، فروری مارچ
ترکوں کا انتخاب	محمد علی جوہر مرتب: حکیم حبیب احمد ندوی	-	فاران، ص ۱۸ تا ۲۲، مارچ
تعارف مدنیت	محمد امین جاوید	ممتاز احمد	چراغ راہ، ص ۴۹ تا ۵۰، ،
تفسیر القرآن الکریم	ابو عبداللہ سفیان الثوری مرتب: مولانا امتیاز علی خاں عرشی	سعید احمد اکبر آبادی	برہان، ص ۱۸۹ تا ۱۹۱، مارچ
تفضیح الغافلین (وقائع زمان نواب آصف الدولہ)	مرتبہ: ڈاکٹر عابد رضا بیدار	-	برہان، ص ۳۸۲ تا ۳۸۴، دسمبر
تنقیدی نقوش	ڈاکٹر عبد القیوم	خاطر غزنوی	فنون، ص ۳۱۷ تا ۳۱۹، فروری مارچ
جمع و تدوین قرآن	سید صدیق حسن مرحوم	-	برہان، ص ۳۱۹، نومبر
جہاں گرد کی واپسی	ہومر مترجم: محمد سلیم الرحمن	وحید قریشی	اردو ڈائجسٹ، ص ۱۷۵، مارچ
درس زندگی	احمد شاہ بخاری پطرس و ایڈورڈ مرو مترجم: عبد المجید سالک و شفیق الرحمان	وحید قریشی	اردو ڈائجسٹ، ص ۱۷۲ تا ۱۷۴، مارچ
درس زندگی		ش - ا - ب	کتابی دنیا، ص ۲۳ تا ۲۴، مارچ
دستک نہ دو	الطاف فاطمہ	محمد خالد اختر	فنون، ص ۳۱۳ تا ۳۱۷، فروری مارچ
دشت امکاں	عزیز حامد مدنی	خاطر غزنوی	، ، ۳۲۲ تا ۳۲۳، ، ،
دیدۂ بیدار	قابل اجمیری	فرمان فتحپوری	نگار پاکستان، ص ۲۲ تا ۲۹، فروری

دید و دریافت	نثار احمد فاروقی	س	برہان/ص ۳۸۰ تا ۳۸۱/ دسمبر
دیوان فائز (فارسی)	شاہ نذیر الحق فائز پھلواری مرتب: خواجہ افضل امام	وحید قریشی	اردو ڈائجسٹ، ص ۱۴۴ تا ۱۴۵/ مارچ
ڈاکٹر وحید قریشی کے تحقیقی مقالے	وحید قریشی	ناصر زیدی	ادب لطیف/ص ۱۳۳/ فروری مارچ
رباعیات امجد		ن ۔ ن	انجام/ص ۷/ ۱۴ر مارچ
رضا لائبریری رام پور میں عربی مخطوطات کی نثری فہرست (انگریزی)	امتیاز علی خاں عرشی	سعید احمد اکبر آبادی	برہان/ص ۱۹۱ تا ۱۹۲/ مارچ
روح اسلام اقبال کی نظر میں	ڈاکٹر غلام عمر خاں	س	" " ۲۵۶/ اکتوبر
روضات	شیخ عبدالحق محدث دہلوی مترجم: ثناء اللہ ندوی	محمد سرور	الرحیم/ص ۷۳۹ تا ۷۴۳/ مارچ
زخم گل	سرشار صدیقی	ض ۔ ا ۔ ب	کتابی دنیا/ص ۲۹/ "
سائنس نامہ	محشر بدایونی	شان الحق حقی	اردو نامہ/ص ۶۶ تا ۶۹/ "
سفر	ایس اے رحمان	خاطر غزنوی	فنون/ص ۲۹۹ تا ۳۰۲/ فروری مارچ
سفرنامہ مصر و حجاز	مولانا سید منت اللہ رحمانی	س	برہان/ص ۲۲۵ تا ۲۲۶/ "
سفینہ	شاد عارفی مرتبہ سلطان اشرف	احتشام حسین	شاہکار/ص ۹۳
سیر افلاک	حکیم احمد	س	برہان/ص ۲۵۰/ اکتوبر
شاعری اور شاعری کی تنقید	عبادت بریلوی	سید وقار عظیم	فنون/ص ۳۱۱ تا ۳۱۲/ فروری مارچ
شاہ محمد غوث گوالیاری	مسعود احمد، پروفیسر محمد	س	برہان/ص ۱۲۵/ فروری
صحابہ کرام کا عہد زریں ۔ ازالۃ الخفا کا ترجمہ	شاہ ولی اللہ مترجم: مولانا محمد میاں	س	" " ۲۱۹ تا ۲۲۰/ دسمبر
صحیفہ خوش نویسیاں	احترام الدین احمد شاغل	"	" " ۲۵۵/ اکتوبر

نام	مصنف	تبصرہ نگار	حوالہ
شاہکار کا فراق نمبر	مرتب: محمود احمد ہنر	ا۔ س	سب رس، ص ۸۳ تا ۹۱، دسمبر
ضرب قلم[1]	سہیل اقبال	شاعر لکھنوی	جام نو، ص ۴۳ تا ۴۴، مارچ
عقلیات ابن تیمیہ	مولانا محمد حنیف ندوی	-	المنبر، ص ۴۰۹، ۱۱ر "
علم عمرانی کی قرآنی بنیادیں	سید معین الدین قادری	محمد افتخار الدین	سب رس، ص ۴۴ تا ۴۶، اکتوبر
قاسم کی مہندی	سید قاسم محمود	-	سیارہ ڈائجسٹ، ص ۱۵۹، مارچ
قاموس الاصطلاحات	شیخ منہاج الدین (مرحوم)	وحید قریشی	اردو ڈائجسٹ، ص ۱۷۱ تا ۱۷۲، "
قصاص سیدنا عثمان	محمد سلطان نظامی	محمد سرور	الرحیم، ص ۴۴، ۷، "
کتاب الآثار (عربی)	امام محمد بن حسن	-	صدق جدید، ص ۵، ۲۵ر "
کچھ اقبال اور اس کے فکر کے بارے میں (انگریزی)	ایم ایم شریف	ش۔ ن۔ عثمانی	زندگی، ص ۵۹ تا ۶۱، اکتوبر
کربل کتھا	فضل علی فضلی	س	برہان، ص ۱۸۳ تا ۱۹۱، نومبر
کشت زار غزل	عزیز حاصل پوری	-	سیارہ ڈائجسٹ، ص ۱۶۰، مارچ
کشمیر، ادب و ثقافت	سلیم خاں گمی		" " " ۱۶۰، "
کلیات شاہی	پروفیسر زینت ساجدہ	-	نوائے ادب، ص ۷۵، اکتوبر
کلیات غالب فارسی	-	ناصر زیدی	ادب لطیف، ص ۱۲۵، فروری مارچ
متاع شوق (مجموعہ کلام)	شاغل قادری	س	برہان، ص ۱۲۷ تا ۱۲۸، "
مجلات و رسائل کے خاص نمبر[2]	-	س	" " ۱۶۱ تا ۱۶۴، جنوری
مشارق الانوار	عبدالحلیم چشتی، مولانا	-	ترجمان القرآن، ص ۶۹ تا ۷۰، مارچ

---

[1] سیارہ لاہور ۴۵ اور سیارہ ڈائجسٹ لاہور ۱۵۹ کے مارچ ۶۳ء کے شماروں میں اس کتاب پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

[2] اس کے ذیل میں ان رسائل پر تبصرہ کیا گیا ہے دلی کالج میگزین میر نمبر۔ نعبائر کراچی ٹیپو سلطان شہید نمبر ماہنامہ کچھر لاہور تاجور نمبر، سب رس حیدرآباد زور نمبر۔ صبح نو علی عباس حسینی نمبر، اردو ادب جواہر لال نہرو نمبر، الفرقان مولانا محمد یوسف نمبر۔

نام	مصنف	تبصرہ نگار	حوالہ
مجموعہ تفاسیر ابومسلم اصفہانی	مرتبین: سید نصیر شاہ و رفیع اللہ	س	برہان، ص ۲۳۲، نومبر
مجموعۂ قوانین اسلام (جلد اول)	تنزیل الرحمان	-	فاران، ص ۴۱ تا ۴۶، مارچ
مضامین رشید	پروفیسر رشید احمد صدیقی	س	برہان، ص ۲۵۴، اکتوبر
معاشرتی و علمی تاریخ	معین الحق		فاران، ص ۴۶ تا ۴۷، مارچ
مفتاح الحکمت	نصیر الدین نصیر	م-ع-ر	انجام، ص ۷، ۱۴ر مارچ
مقالات شریعت وحکمت	حکیم محمد زماں الحسینی	س	برہان، ص ۱۲۶ تا ۱۲۷، فروری
مکتوبات سعیدیہ	شیخ محمد سعید الدین ابن امام ربانی شیخ احمد	افتخار احمد ندوی	مجلۂ ادارۂ تحقیقات پاکستان، ص ۱۱۱ تا ۱۱۲، جولائی اکتوبر
مولانا ابو الکلام آزاد کی تقریریں	-	ناصر زیدی	ادب لطیف، ص ۱۲۷، فروری مارچ
مومن - حیات وشاعری	-	ا-ص	سب رس، ص ۳۸، دسمبر
میر اور سودا کا دور	نثار الحق	ممتاز احمد	چراغ راہ، ص ۴۸ تا ۴۹، مارچ
میرے گزشتہ شب وروز (آپ بیتی)	جگن ناتھ آزاد	ا-ص	سب رس، ص ۳۵ تا ۳۶، نومبر
نقطۂ نظر	عبد المغنی	ع-ق	زندگی، ص ۵۰ تا ۵۹، اکتوبر
نوائے پریشان	جگن ناتھ آزاد	-	فاران، ص ۵۰ تا ۵۹، مارچ
نور فردا (مجموعہ کلام)	خلیق احمد عتیق	س	برہان، ص ۱۲۷، فروری
واقعہ کربلا در نظر اقبال	سید جلیل حیدر	-	پیام عمل، ص ۲۷، مارچ
ولی - تحقیقی وتنقیدی مطالعہ	محمد خاں اشرف	وحید قریشی	اردو ڈائجسٹ، ص ۱۷۴ تا ۱۷۵، مارچ
ہدیہ محمدیہ ترجمہ تحفہ اثنا عشریہ	شاہ عبد العزیز دہلویؒ مترجم: مولوی عبد المجید خاں	-	صدق جدید، ص ۵ / ۸ر اکتوبر
ہماری پہیلیاں	سید یوسف بخاری	شان الحق حقی	اردو نامہ، ص ۶۵ تا ۶۷، مارچ
ہندستانی مسلمان آئینہ ایام میں	سید عابد حسین	ابو نصر محمد خالدی	سب رس، ص ۳۹ تا ۴۳، "
یادگار مومن	منظور احمد	وقار خلیل	" ص ۳۸ تا ۳۹، نومبر

انجمن ترقی اردو پاکستان ماہوار ترجمان

قومی زبان

جلد ۲۹ شمارہ ۵

نومبر سنہ ۱۹۶۶ء

سالانہ قیمت
دس روپے

فی پرچہ
ایک روپیہ

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ
کراچی

فہرست مضامین

مجوّزہ اقامتی اردو کالج

جناب اختر حسین صدر انجمن ترقی اردو نے
۱۷ اکتوبر ۱۹۶۶ء کو ایک پریس کانفرنس میں حسب
ذیل بیان دیا۔

۱۶ اگست ۱۹۶۶ء کو بابائے اردو کی پانچویں برسی کے موقع پر انجمن ترقی اردو کے نئے اقامتی کالج کے تعمیری پروگرام کا تذکرہ کرتے ہوئے میں نے اپنی صدارتی تقریر میں عرض کیا تھا "انجمن کا اصل کام یہ ہے کہ اردو کو ہر سطح پر ذریعہ تعلیم بنایا جائے اس مقصد کے لئے آج سے سولہ برس پہلے اردو کالج قائم کیا گیا تھا جس میں نہایت کامیابی سے اردو کے ذریعے تمام علوم و فنون کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ اگرچہ بہت بڑی کامیابی ہے لیکن میں اس سے مطمئن نہیں کیونکہ موجودہ کالج بہرحال ایک محدود پیمانے پر یہ خدمت انجام دے رہا ہے اور اس سے صرف کراچی کے طالب علم ہی استفادہ کر سکتے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ یہ کالج حقیقی معنوں میں ایک قومی درس گاہ بن جائے جس سے پاکستان کے تمام علاقوں کے طالب علم فائدہ اٹھا سکیں۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کی صرف ایک ہی صورت ہو سکتی ہے کہ اس کالج کو ایک عظیم الشان اقامتی درس گاہ بنا دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے ہم نے کے۔ڈی۔اے سے (۱۰) بیس ایکڑ زمین حاصل کر لی ہے۔ دو سال قبل صدر مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے مجوزہ اقامتی کالج کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔ آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ ہم نے عملی اقدام بھی شروع کر دیا ہے اور کالج کی عمارت تعمیری مراحل میں داخل ہو گئی ہے۔

اس کالج کے لئے جو منصوبہ بنایا گیا ہے اس پر لاگت کا اندازہ تین کروڑ روپے ہے۔ ظاہر ہے اتنی بڑی رقم نہ تو حکومت دے سکتی ہے اور نہ انجمن ہی اپنے محدود مالی ذرائع سے فراہم کر سکتی ہے۔ ہم نے اگرچہ حکومت کو اس طرف توجہ

کیا ہے اور یہ بھی طے کیا ہے کہ انجمن کے اخراجات کم سے کم کر کے مصارف پورے کئے جائیں لیکن محض ان وسیلوں سے اتنا بڑا کام مکمل نہیں ہو سکتا ۔ اب اس کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ عوام سے مالی امداد کی درخواست کی جائے ۔

خدا کا شکر ہے کہ میری اس اپیل کا اثر ظاہر ہو رہا ہے اور عوام نے فراہمی اور عطائے رقم کے کام میں دلچسپی لینی شروع کر دی ہے ۔ نیز اساتذہ اردو کالج نے اپنی تنخواہ کا پانچ فی صد حصہ اس کار خیر کے لئے عطا کیا ہے ۔ مگر ہم اس کام کو بڑے پیمانے پر ایک مہم کے طور پر چلانا چاہتے ہیں اور اگرچہ ہمارے نمائندے فرداً فرداً مختلف علاقوں میں چندہ فراہم کرنے کی غرض سے گشت کریں گے ۔ مگر میں امید کرتا ہوں کہ اس مہم میں ہر چھوٹا بڑا شخص از خود بھی ہم سے تعاون کرے گا ۔ اس سلسلے میں ہم نے جو طریق کار طے کیا ہے اس کا بنیادی تصور یہ ہے کہ ہر شخص چھوٹی سے چھوٹی یا بڑی سے بڑی جو رقم آسانی سے پیش کر سکے ، اس کار خیر کے لئے عطا کر دے ۔ ویسے ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ یک مشت بڑی بڑی رقوم عطا کرنے والے اصحاب کے اسمائے گرامی بطور یادگار زیر تعمیر کالج کی عمارات پر کندہ کرائے جائیں یا پوری پوری عمارات مختلف ناموں سے مخصوص کر دی جائیں ۔

اس مقصد کے لئے ہم نے خاص طور پر ایک روپیہ اور پانچ روپے کی رسیدیں طبع کرائی ہیں جو ہر معطی کو اس کی عطا کردہ رقم کے مساوی وقت کے وقت پیش کر دی جائیں گی ۔ مخیر حضرات کی آسانی کے لئے یہ انتظام بھی کیا گیا ہے کہ وہ اپنی عطا کردہ یا جمع کی ہوئی رقوم نیشنل بینک آف پاکستان کی کسی بھی قریب ترین شاخ میں " حساب نمبری ۳۱۴ ۔ اے 'اقامتی اردو کالج فنڈ" میں جمع کرا دیں ۔ چنانچہ میں تمام حضرات سے جن میں مرد خواتین اور بچے سبھی شامل ہیں ۔ اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس نیک کام میں ہمارا ہاتھ بٹائیں اور اپنی ثقافت اور زبان سے گہری دلچسپی کا ثبوت دیتے ہوئے اردو کالج کی زیر تعمیر عمارات کی تکمیل میں ہماری مدد کریں ۔

اس موقع پر مجھے اردو ذریعہ تعلیم کے موضوع پر کچھ کہنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی ۔ یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ قومی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنائے بغیر ہم دنیا کے علوم و فنون کو اپنے ملک کے عام لوگوں تک کسی طرح نہیں پہنچا سکتے نہ اپنی تمام آبادی کو تعلیم یافتہ بنا سکتے ہیں کسی ملک نے بھی غیر ملکی زبان کے ذریعے تعلیم حاصل کر کے ترقی نہیں کی اور پاکستان اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا ۔ یہی وجہ ہے کہ بابائے اردو نے جن کی ساری زندگی اردو کی خاطر جہاد کرتے گزری تھی بڑی دور اندیشی سے کام لے کر چند در چند مشکلات کے باوجود ۱۹۵۰ء میں اردو کالج قائم کر دیا تھا ۔ جسے طلبہ میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور جو امتحانات کے نتائج کے اعتبار سے بھی نمایاں حیثیت حاصل کر چکا ہے ۔ اس کالج میں فنون ، سائنس ، قانون اور تجارت کے مضامین ڈگری امتحانات کی سطح تک اردو میں پڑھائے جاتے ہیں ۔ اس کے ساتھ انگریزی ادب کی معیاری تعلیم کا بھی انتظام موجود ہے ۔

اس وقت اردو کالج میں طلبہ کی جو تعداد ہے موجودہ عمارت میں اس سے زیادہ طالب علموں کا داخلہ ناممکن ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہر سال سینکڑوں کی تعداد میں کالج میں داخلہ لینے کے خواہش مند طلبہ مایوس ہو کر واپس جاتے ہیں ہماری برابر یہ خواہش رہی کہ اس کالج کو زیادہ سے زیادہ وسعت دی جائے۔ اور اقامتی بنیاد پر چلایا جائے تاکہ ملک کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے طلبہ یکجہتی اور دل جمعی سے، ایک ساتھ ایک قومیت کا تصور سامنے رکھ کر اردو میں تعلیم حاصل کر سکیں۔ مگر کالج کی موجودہ عمارت شہر کے ایک ایسے علاقے میں واقع ہوئی ہے جہاں اس میں توسیع کی گنجائش نہیں۔ اب تجویز کیا گیا ہے کہ نئی عمارت کی تکمیل کے بعد جو اقامتی بنیاد پر تیار کرائی جائیں گی کالج کو اس کے بیس ایکڑ وسیع کیمپس واقع یونیورسٹی روڈ میں منتقل کر دیا جائے۔

اردو کالج کے لئے یہ وسیع قطعہ زمین کمشنر کراچی و چیرمین کے ڈی اے جناب سید دربار علی شاہ نیز جناب مسعود نبی نور ڈائریکٹر جنرل کے ڈی اے کی توجہ سے کے ڈی اے کی اسکیم گلشن کے بہترین حصے میں ملا ہے۔ اس کے چاروں طرف پختہ سڑکیں اور کشادہ شاہراہیں ہیں جو اسے شہر کے تمام اہم علاقوں اور یونیورسٹی سے ملاتی ہیں۔ سامنے کراچی کا نیا شاندار ریلوے اسٹیشن تعمیر ہو رہا ہے جو طلبہ اور اساتذہ کی آمد و رفت میں سہولت پیدا کرے گا کالج کی عمارات سے ملحق مجوزہ خوبصورت عزیز بھٹی پارک کا علاقہ ہے اور اس سے ذرا ہی آگے وسیع و عریض پختہ تالاب واقع ہے اور ان دونوں تفریح گاہوں سے طلبہ پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں گے۔

بابائے اردو کی آرزو تھی کہ وہ ایک یونیورسٹی قائم کر جائیں اور انھوں نے اس مقصد کی خاطر بہت کچھ کام بھی کیا تھا۔ سچ پوچھئے تو ان کی یہ خواہش ایک عظیم عوامی مطالبے کے سبب پیدا ہوئی تھی مگر موت نے انھیں مہلت نہ دی کہ وہ اپنا مشن پورا کر سکیں۔ ہم ان کے مشن کو آگے بڑھانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں مگر اس امکان کو قریب تر لانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اردو ذریعہ تعلیم کے موجودہ تجربے کو وسیع کیا جائے۔ اور اس کی افادیت سے ہر طبقے کے طلبہ کو عملی طور پر روشناس کرایا جائے۔

اقامتی اردو کالج مستقبل کے لئے ایک تجربہ گاہ کے طور پر قائم کیا جا رہا ہے۔ یہاں نہ صرف بڑے پیمانے پر اردو میں ذریعہ تعلیم کا تجربہ ہوگا بلکہ جو نئے تدریسی مسائل پیدا ہوں گے ان کے حل بھی تلاش کئے جا سکیں گے۔ اس کالج کا ایک شعبہ ترجمہ تصنیف و تالیف اور اشاعت کا کام بھی کرے گا تاکہ اردو میں تدریس کے سلسلے میں جس جس میدان میں کمزوریاں محسوس ہوں بتدریج دور کر دی جائیں۔

اقامتی اردو کالج کے مجوزہ نئے کیمپس میں علمی اور انتظامی بلاک، ثقافتی ادارے، سائنس، فنون، تجارت اور قانون کے شعبے، عملے اور غیر ملکی مہمانوں کے لئے مکانات، بازار، طلبہ کے لئے یونین ہال، باغات، پارک اور دیگر ضروریات مثلاً سڑکیں وغیرہ تعمیر کی جائیں گی۔ ان عمارات کے علاوہ چار اقامت گاہیں ہوں گی جن میں سے ایک اقامت گاہ صرف طالبات کے لئے ہوگی۔ کھیلوں کے لئے علیحدہ علیحدہ میدان ہوں گے جن میں پویلین بھی تعمیر کئے جائیں گے۔ ایک وسیع کتاب خانہ اور سماعت گاہ کے علاوہ ایک شاندار مسجد بھی تعمیر کی جائے گی جو نہ صرف کالج بلکہ آس پاس کی آبادی کی ضروریات کے لئے بھی کافی ہوگی۔

اس انجمن گل میں

زیر تعمیر اردو کالج کے لئے عطیات

اس سلسلے میں اب تک کل مبلغ ۲۷۶۲۸.۰۰ (ستائیس ہزار چھ سو اٹھائیس) روپے جمع ہو چکے ہیں۔ جن حضرات نے ذاتی طور پر رقوم عنایت کی ہیں ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:-

۱۔ جناب نور حسین شاہ صاحب (ریڈیو اینڈ جنرل اپلائینس و پاکستان انڈسٹریز لمیٹڈ) لاہور — چھ ہزار روپے
۲۔ رفیق شاہ صاحب رئیس اعظم بہاول نگر — دو ہزار روپے
۳۔ چوہدری ظہور الٰہی صاحب گلبرگ۔ لاہور — دو ہزار روپے
۴۔ مسلم کمرشیل بنک لمیٹڈ — ایک ہزار روپے
۵۔ جعفر ابراہیم اینڈ کمپنی — دو سو پچاس روپے
۶۔ عبدالستار حاجی داؤد صاحب — دو سو پچاس روپے
۷۔ جناب حسن عادل صاحب پرنسپل نیشنل کالج کراچی — دو سو روپے

بقیہ رقم رسائد کے ذریعے وصول ہوئی ہے اس کی تفصیل آئندہ دی جائے گی۔

اردو کالج کی زیر تعمیر عمارت

فروری ۱۹۶۶ء میں تعمیراتی کمیٹی کا ایک اجلاس منعقد ہوا تھا جس پر طے پایا تھا کہ فی الحال تین لاکھ روپے کی لاگت تک کا تعمیراتی کام شروع کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے اخبارات کے ذریعے ٹنڈر طلب کرنے کے بعد گنن ڈنکرے اینڈ کو (پاکستان) لمیٹڈ کو ٹھیکہ دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ ۱۴ اپریل ۱۹۶۶ء کو اس ادارے نے تعمیراتی کام شروع کر دیا۔ اب تک مجوزہ عمارت کے شمال مشرقی حصے میں نوکروں کی چھت پڑ چکی ہے اور دروازے کے ہال کی تعمیر کرسی تک پہنچ چکی ہے۔ جن کمروں میں چھت پڑ چکی ہے وہاں پلاسٹر کا کام ہو رہا ہے۔

افسر امروہوی

خیّام الہند

۱۰ نومبر ۱۹۶۶ کو خیام الہند حضرت حیدر دہلوی کی آٹھویں برسی منائی جا رہی ہے۔ مرحوم کی یاد میں جناب انور دہلوی اور افسر امروہوی کے مضامین شائع کئے جا رہے ہیں۔

سمندر کی تہہ میں جتنے موتی ہوتے ہیں غوطہ زن کا ہاتھ سب کو سمیٹنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا وہ صرف اتنے ہی موتی باہر لاتا ہے جو اس کی گرفت میں آسکیں۔ ان میں معمولی سے معمولی قیمت والے موتی بھی ہوتے ہیں اور گراں بہا سے گراں بہا بھی۔ ممکن ہے کہ جن موتیوں تک غوطہ زن کا ہاتھ نہیں پہنچ سکا باہر نکلے ہوئے موتیوں سے بھی زیادہ قیمت رکھتے ہوں۔ لیکن جب تک وہ سمندر کی تہہ میں پڑے رہیں گے کسی بڑے سے بڑے جوہری کو بھی ان کی قیمت کا اندازہ تو کیا ان کے وجود کا علم بھی نہ ہو سکے گا۔

یہی حال اہلِ کمال کا ہے۔ کسی فن کسی میدان میں بھی اہلِ کمال کی کمی نہیں ہوتی لیکن بقول اکبر الہ آبادی ؎

نگاہیں کاملوں پر پڑ ہی جاتی ہیں زمانے کی — کہیں چھپتا ہے اکبر پھول پتوں میں نہاں ہو کر

اس کے لئے بھی نگاہِ شناسا کی ضرورت ہے اور نہ صرف نگاہِ شناسا کی ضرورت ہے بلکہ اس جذبے کی ضرورت بھی ہے جو کسی صاحبِ کمال کو روشناسِ عالم کرنے کے لئے ایک انصاف پسند طبیعت میں ہونا چاہیئے۔ "پیراں نمی پرند مریداں می پرانند" کا یہی مطلب ہے۔

اردو کی دنیائے شاعری میں دورِ اوّل سے اب تک ہزاروں شاعر پیدا ہوئے اور جب تک شعر و سخن کی گرم بازاری باقی رہے گی شاعروں کی پیداوار میں کمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن شہرتِ عام و بقائے دوام کی عزت حاصل کرنے والے پہلے بھی گنے چنے ہوئے اور آئندہ بھی ان کی تعداد انگلیوں پر گنے جانے تک محدود رہے گی۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان شعرا میں جو شہرت و قبولیت سے محروم رہے وہ جوہر نہیں تھے جو ان کو بامِ عروج تک پہنچاتے بلکہ اس کا سبب یہ تھا اور یہی رہے گا کہ ان خوابیدہ قسمت اربابِ کمال کو منظرِ عام پر لانے والے موجود نہیں تھے یا موجود نہیں ہیں۔

انھیں محرومِ شہرت اربابِ شعر و سخن میں جناب حیدر دہلوی بھی ہیں جو خیام الہند کہلاتے ہیں۔ میں حیدر صاحب

سے ذاتی طور پر واقف نہیں۔ جب میں کراچی میں تھا تو وہ دہلی کی مجالس شعر و سخن کی رونق افزائی میں مصروف تھے
قیام پاکستان کے بعد وہ کراچی آئے تو میں بعض نجی اسباب کی بنا پر حیدرآباد سندھ منتقل ہو چکا تھا۔ اور جب بار دگر
کراچی آیا تو وہ دنیا کو خیرباد کہہ کر شہر خموشاں میں پہنچ چکے تھے۔ اس لئے نہ مجھے ان کے اوصاف حمیدہ سے کوئی واقفیت
ہو سکی نہ ان کے خیالات عالیہ سننے کا شرف حاصل ہوا تعارف کی بنیاد دیہ چند منتخب اشعار ہیں جو اپنے ایک قدیم
رفیق جناب تبسم مدنی کی معرفت حاصل ہوئے اور انھیں کے سہارے میں یہ سطور لکھ رہا ہوں۔
مصحفی نے کہا ہے ع

شاعری یہ کچھ ہے لیکن قدرداں کوئی نہیں

معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ مقولہ سو فیصدی جناب حیدر صاحب کے حالات سے مطابقت رکھتا ہے
حیدر صاحب نے جابجا اپنے کلام میں اپنی شاعری کی بلند پائیگی اور ارباب زمانہ کی بے اعتنائی کا اظہار کیا ہے مثلاً:

حیدر ہماری فکر ہے تائید غیب کی	ہر شعر کو ہے حکم بقائے دوام کا

حیدر آغاز نگارش میرا	غالب و دبیر کے انجام سے ہے

لیکن خیال کی اس رفعت اور مضمون کی اس بلند پائیگی کے باوجود اہل وطن نے ان کے ساتھ جو سلوک کیا
وہ حد درجہ افسوسناک ہے

کیا کیا ستم ہیں مجھ پہ اہل وطن کے حیدر	پامال ہو رہا ہوں اپنی ہی رہگذر میں

جب مری کاوش کا حیدر ماحصل کچھ بھی نہیں	پھر پسند احباب کو میرا کلام آیا تو کیا

غالب کے بعد دلی کی حیدر سے لاج تھی	وہ بے نوا فقیر بھی گوشہ نشیں ہے آج

حیدر نہ ملی داد کسے علم و ہنر کی	ہر اہل وطن میرے لئے تنگ نظر ہے

وائے بے قدریٔ ہنر حیدر	کوئی معقول نکتہ چیں بھی نہیں

اس مقطع میں "معقول" اگرچہ "مفعول" کے وزن پر ہے لیکن حیدر صاحب نے اسے غلط العوام قرار دے کر
صاحب عقل کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

کسی ماہر تاریخ گو نے لکھنؤ اور کوفہ کے ہم عدد ہونے سے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ ان دونوں شہروں کے باشندوں کا خواص و عادات میں یکساں ہونا لازمی و بدیہی ہے۔ یہ خیال تو استقرائے صوری سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ حیدر صاحب نے ایک مقطع میں دہلی کو معناً کوفہ کا مماثل قرار دیا ہے۔ اس مقطع کی ساخت پر غور کیجئے کس قدر نکتہ سنجی سے کام لیا گیا ہے۔ تخلص کی مناسبت کا کیا کہنا۔ انگوٹھی میں نگینہ معلوم ہوتا ہے ؎

سرزمیں دہلی کی کوفہ ہے، یہاں جائز سمجھ / خونِ ناحق علم و فن کا، قتلِ حیدر، کُشتِ داد

دوسرے مصرع کے آغاز میں "خونِ ناحق علم و فن کا" کو "علم و فن کا خونِ ناحق" بھی لکھا جا سکتا تھا اور وزن اس کا متحمل تھا لیکن شاعر کا مقصودِ اصلی فوت ہو جاتا۔ "قتلِ حیدر، کشتِ داد" کے ساتھ ساتھ اہمیت و افضلیت "خونِ ناحق" کو تھی، علم و فن کا انتساب تو ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔

حیدر صاحب صرف اہلِ وطن ہی کے شاکی نہیں بلکہ لیسے اربابِ سخن کے بھی گلہ مند ہیں جن کی تربیت انھیں کے دامانِ کرم کی رہینِ منت تھی ؎

حیدر وہ معترض ہیں ہمارے اشعار پر / اولاد کی طرح جنھیں درسِ ادب دیا

شاید اسی بیگانگیٔ اربابِ وطن کا احساس تھا کہ حیدر صاحب نے بزمِ سخن کی شرکت ترک کر دی تھی ؎

حیدر مجھے یہ دعوتِ بزمِ سخن فضول / گوشہ نشیں فقیر ہوں، میرا کلام کیا

بزم آرائی سے بہتر ہے فقیری حیدر / تختِ شاہی ہے مرا گوشۂ عزلت مجھ کو

میں اپنے باغِ سخن کی خزاں ہوں خود حیدر / جو میرے بعد جئیں گے بہار دیکھیں گے

وہی چمن ہے وہی عہدِ گل وہی گلچیں / یہ اور بات ہے میں اپنے آشیاں میں نہیں

تخت شاہی سے نہیں کم گوشۂ عزلت مجھے / مست اپنے حال میں حیدر رہا کرتا ہوں میں

ننگِ جسد ہے خلعتِ شاہی مرے لئے / حیدر مجھے تو دلقِ فقیرانہ چاہیئے

گوشۂ عزلت کا ہے میرے بہت پایہ بلند / تختِ کیواں چاہیئے حیدر نہ دارائی مجھے

تغزل جیسا کہ اہلِ علم جانتے ہیں عشق و محبت اور اس کے لوازم کے لئے مخصوص ہے لیکن شعرا نے اس میں فلسفہ تصوف اور نہ معلوم کن کن موضوعات کو شامل کر لیا ہے ۔ یہ بڑی خوبی کی بات ہے کہ حیدر صاحب نے غزل کو غزل ہی کے درجے میں رکھا ہے ۔ اسے شیخ سعدی کا کریما یا فریدالدین عطّار کا پندنامہ نہیں بنایا ۔ جس شعر کو دیکھئے اس کے تیور بتاتے ہیں کہ صرف جذباتِ حسن و عشق کا مصور ہے ۔ اگرچہ شاذ و نادر کہیں ہلکا سا تصوف کا رنگ بھی آگیا ہے لیکن ایسے اشعار تمام و کمال حدودِ تغزل سے نہیں نکلے ۔ بس اتنا فرق ہوا ہے کہ حسنِ فانی اور عشقِ مجازی کے مظاہر کی جگہ جمالِ حق اور محبتِ حقیقی نے لے لی ہے ۔

حسن کی مختلف کیفیات کا نقشہ حیدر صاحب نے جس دل نشیں انداز میں کھینچا ہے اور ان کے اظہار کے لئے جو سنجیدہ و بے ساختہ پیرایۂ بیان انتخاب کیا ہے وہ بجائے خود بے حد قابلِ ستائش ہے ۔ اس تصویر کا ایک رُخ تو یہ ہے جو حسن اور مظاہر حسن سے متعلق ہے ؎

وہ ڈھال کر شراب ذرا مسکرا دیئے ۔۔۔ لو اور بھی نکھار دیا رنگ جام کا

کس نے کہا تھا حسن کا تم سایہ ڈال دو ۔۔۔ پہنچا دیا فلک پہ دماغ آفتاب کا

لوحِ وجود پر تری تصویر کھینچ کر ۔۔۔ یہ حال ہے کہ وجد میں حسن آفریں ہے آج

انگڑائی نے تو شان بڑھائی شباب کی ۔۔۔ غصہ کرو تو حسن کا عالم عجیب ہو

ہر چند کہ آزارِ محبت نہیں اچھا ۔۔۔ جب تم ہو تصور میں تو آرام بہت ہے

اللہ رے یہ شباب اور اتنی بہار پر ۔۔۔ آج آفتابِ حسن ہے نصف النہار پر

تمہارے گرمیِ محفل کے رنگ نے اڑ کر ۔۔۔ کہیں پناہ نہ پائی تو آفتاب بنا

اب تک ازل سے عالمِ ہستی ہے رقص میں ۔۔۔ پہنچا گیا تیری آنکھ کی گردش کو جام کیا

موج ہے، محرابِ کعبہ، ماہِ نو، قوسِ قزح　　　سَو طرح سے یاد ہے اک تیری انگڑائی مجھے

وہ حسنِ شگفتہ ہے بہرحال شگفتہ　　　جب دیکھئے ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی سی

ان اشعار کے مطالعہ کے بعد کون صاحبِ دل ہوگا جو متاثر نہ ہوگا۔ آخری شعر کے دوسرے مصرع کی ترکیب پر نظر کیجئے۔ شگفتگیٔ دوام کے لئے "ہنسی آئی ہوئی سی" کا ٹکڑا کس قدر معنی خیز ہے۔ اس پر "جب دیکھئے" کا استمراری مفہوم سونے پر سہاگا۔

اب تغزل کا دوسرا رُخ دیکھئے۔ کس قدر عشق و محبت کے گوناگوں جذبات میں ڈوبے ہوئے شعر ہیں ؎

جب آپ کا مشکل تھا مرے سامنے آنا　　　اب آپ میں آنا مجھے مشکل نظر آیا

تجھے شوقِ خود آرائی، میں محوِ خود شناسائی　　　تغافل لافنا تیرا، محبت دیرپا میری

خاک ہی آپ کے قدموں کی میسر نہ ہوئی　　　ورنہ دیوانے کی مٹی میں بیاباں ہوتا

ذرے ذرے نے صدا دی کہ یہ دستور نہیں　　　میں نے جب راہِ طلب میں کہیں آرام لیا

میں نے تکمیل کو پہنچائے محبت کے اصول　　　میری ترمیم کا محتاج ہر افسانہ ملا

پرانا ہوا داغِ جرمِ محبت　　　کوئی تازہ الزام تصنیف فرما

ستم کو کر نہیں سکتے کرم کیا　　　بدل سکتے نہیں معنی بھی ہم کیا

اللہ رے یاد ایک سراپا جمال کی　　　صورت بھی اپنی بھول گیا ہوں میں نام کیا

بند آنکھیں ہیں، دل محو، فضا مست و منوّر　　　آغوش میں لے آئی انہیں آج نظر کیا

یہاں تک حیدر صاحب کے صرف تغزل کی چند مثالیں پیش کی گئیں ۔ اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ انھوں نے غزل گوئی کے سوا کسی اور طرف توجہ نہیں کی ۔ میرے سامنے ان کی رباعیات کا ایک مجموعہ بھی ہے ۔ اس مجموعے میں فقط ایک سو رباعیاں ہیں ۔ رباعی جس قدر مشکل صنف ہے اس کا اندازہ صرف اہل تفکر ہی کر سکتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے ۔اردو شاعروں نے اس طرف زیادہ توجہ نہیں کی ۔ چند گنے چنے شاعر ہیں جنھوں نے رباعیات کے مجموعے مرتب کئے ۔ حیدر صاحب کا شمار انھیں چند حضرات میں ہے ۔

لکھنؤ کے ایک شاعر پیارے صاحب رشید تھے ۔ رباعیات میں پیری کے مضامین کو مختلف اور نادر انداز میں پیش کرنے کے لئے ان کا نام مشہور ہے ۔ حیدر صاحب کی "پیری" کی رباعیوں میں پیارے صاحب کی رباعیوں کا رنگ جھلکتا ہے ۔ دو رباعیاں ملاحظہ فرمایئے ؎

پیری میں بھی اس طرح جیا کرتے ہیں　　اعزاز بزرگی کا کیا کرتے ہیں
خم ہوتی ہے گردن نہ کمر جھکتی ہے　　ہم اپنے قدم آپ لیا کرتے ہیں

پستی نہ بلندی کی خبر ہوتی ہے　　کیفیتِ ہستی ہی دگر ہوتی ہے
رہ جاتی ہیں محرومِ بصارت آنکھیں　　پیری میں اندھا دھند بسر ہوتی ہے

شاید خیال کیا جائے کہ میں نے حیدر صاحب کے چند منتخب اشعار سے ان کا مرتبۂ شاعری متعین کرنے کی کوشش کی ہے ۔ اس اعتراض سے بچنے کے لئے میں اپنے مضمون کو ختم کرنے سے پہلے ان کی ایک سالم غزل درج کئے دیتا ہوں ۔ یہ غزل زبان کی خوبی، بندش کی صفائی ، الفاظ کی برجستگی اور خیالات کی پاکیزگی کا نمونہ ہے ؎

ہم اب کعبے سے جن کے واسطے منہ موڑے جاتے ہیں　　وہی ہم کو دمِ آخر خدا پر چھوڑے جاتے ہیں
رہا ہو کر قفس سے گلستاں تک کس طرح پہنچوں　　نہ اب اڑنے کی طاقت ہے نہ کندے جوڑے جاتے ہیں
یہی ہوتا ہے، اشکِ خوں گرا کرتے ہیں آنکھوں سے　　شبِ غم اور کیا تارے فلک کے توڑے جاتے ہیں
گلے مل مل کے کیوں جانباز روتے ہیں سرِ مقتل　　یہاں دم توڑے جاتے ہیں کہ رشتے جوڑے جاتے ہیں
سرِ بالیں ترا انگڑائیاں لینا ہم اب سمجھے　　ہمارے مندمل زخموں کے ٹانکے توڑے جاتے ہیں
جنونِ عشق میں اس کے سوا اور کام ہی کیا ہے　　بیاباں ناپنا پڑتا ہے ، پتھر پھوڑے جاتے ہیں

حجابِ حسن ادھر اٹھنے نہیں پاتا ، ادھر حیدر
تماشائیوں پہ بھر دے بے خودی کے چھوڑے جاتے ہیں

انور دہلوی

حیدر دہلوی

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریزوں کے انتقامی جذبے نے قوم کو ذہنی طور پر مفلوج اور معاشرے کو تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ ان حادثات پر رونے والی آنکھوں سے آنسو خشک کرنے کے لئے ایسے ہی معیار کے ادب کی ضرورت تھی جو اُس زمانے میں تخلیق کیا گیا۔ چنانچہ غالب جیسے شاعر کی گھن گرج بھی مقتضائے زمانہ ادب کی ابھرتی ہوئی قدروں میں دب کر رہ گئی۔

اس میں کلام نہیں کہ داغ و امیر اور اُن کے معاصرین نے جو ادب قوم کو دیا وہ بڑی حد تک اُن زخموں پر مرہم ثابت ہوا جو انگریزوں نے قوم کو دیئے تھے۔ لیکن اس ادب میں زبان و بیان کی سادگی کے علاوہ کوئی خوبی ایسی نہ تھی جو بقائے دوام حاصل کر سکتی۔ اُس دور کے شعرا جرات کی معاملہ بندیوں کو قلعۂ معلیٰ کی کوثر سے دُھلی ہوئی زبان میں پیش کرنا قابلِ فخر کارنامہ سمجھتے تھے۔ خیالات میں پاکیزگی تقریباً عنقا تھی۔ چنانچہ ابتذال اور سوقیانہ اندازِ کلام کے زہریلے اثرات اعلیٰ ادب کے لئے گھن کا کام کرنے لگے۔ اور یہ انداز عوام و خواص میں اس قدر مقبول ہوا کہ امیر مینائی جیسے ثقہ شاعر بھی عام مشاعروں میں فخریہ اس قسم کے شعر پڑھتے ہوئے سنے جانے لگے ؎

آنکھیں دکھلاتے ہو جوبن تو دکھاؤ صاحب ۔۔۔ وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

داغ و امیر اس محفل کے چشم و چراغ تھے اور ہندوستان کے ہر گوشے میں ان کے سکۂ ادب کو مستند سکۂ رائج الوقت سمجھا جانے لگا۔

اساتذۂ وقت کی پیروی کرنے والوں نے اس سستے اور سوقیانہ ادب کو نقطۂ عروج تک پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا اور قوم کو اعلیٰ ادب کے احساس تک سے عاری کرنے میں نمایاں کامیابی حاصل کر لی۔ ان ادبی سانحات پر جانشینی کے سلسلے میں تلامذۂ داغ کی آویزشیں ایک افسوس ناک اضافہ ہیں۔

یہ ماحول تھا کہ ۱۹۰۷ء میں سید جلال الدین حیدر کی گلی شاہتارہ دہلی میں ولادت ہوئی۔ یہ عجیب بات ہے

ایسے ماحول کی آغوش میں پرورش پانے والے نے جب ہوش سنبھالا تو گردوپیش کا کوئی تاثر قبول نہ کیا - اور
سپھد یا بس ، رکاکت بیان ، اور ابتذال سے بچ کر اپنے لئے ایک نیا راستہ نکالا ؎

عثمانی اس قدر تقلید کے ہے میری خودداری قدم بچ بچ کے رکھتا ہوں میں نقشِ پائے رہبر سے

ہر ہے کہ مرحوم نے اساتذۂ متاخرین اور اساتذۂ حاضر کو رہبر تو تسلیم کیا لیکن اپنی ذہنی اُپج اور خودداری کے
سبب اس کا اہل نہ پایا کہ اُن کی تقلید کی جائے - اور یہی مرحوم کی خوددارانہ زندگی کا نقطۂ آغاز ہے۔

شعر و ادب کی پاکیزگی سے فطری لگاؤ کے سبب مرحوم نے جو اسلوب اختیار کیا وہ اُس دور کی مسموم ادبی
فضاؤں میں اجنبی سا محسوس کیا گیا - پاکیزگیٔ طبع کی اس سے زیادہ روشن دلیل اور کیا ہوسکتی ہے کہ مرحوم کے مجموعۂ
کلام "صبحِ الہام" میں ایک مصرعہ بھی ایسا نہیں پایا جاتا جو ہم اپنی ماں - بہن - بیٹی اور بہو کو بے حجاب و بے تکلف
سنا سکیں - یہ وہ خصوصیت ہے جو اردو ادب کی تاریخ میں آج تک کسی شاعر کے یہاں نہیں پائی جاتی - اس پاکیزگی کے
علاوہ ندرتِ تخیل - قدرتِ زبان و بیان - مضمون آرائی - جدت طرازی اور ماحول کی ترجمانی وغیرہ سے بھی مرحوم
کا کلام تہی دامن نہیں - آہنگ کے ساتھ ایک مخصوص لہجہ بھی حیدر دہلوی کے کلام کا ایک خاصہ ہے - اس نئی اور
انوکھی آواز نے رفتہ رفتہ ماحول کو متاثر کرنا شروع کیا لیکن اس تاثر پذیری کی رفتار اس قدر سست تھی کہ مرحوم
کو کہنا پڑا ؎

ابھی ماحول عرفانِ ہنر میں پست ہے حیدر یکایک ہر بلند آواز پہچانی نہیں جاتی

یہ پہلا ادبی تجربہ تھا جسے مرحوم نے پیش کیا - یہ تجربہ بھی تلخ تھا اور اس کا پس منظر بھی - ادب کی اس
اُجڑی ہوئی محفل کو آراستہ کرنے کی کوششیں اساتذۂ وقت کی حیدر صاحب سے ضد اور دشمنی پر منتج ہوئیں - مختلف
ادبی جماعتوں نے اساتذہ کی سرکردگی میں متحد ہوکر اس ابھرتے ہوئے شاعر کے خلاف ایک مستقل محاذ قائم کرلیا - ادب
کی اپنی اجارہ داریوں کو خطرے میں دیکھ کر "تسبیح کے دانوں پر" غلیظ اور فحش گالیاں عام طور پر بکی جانے لگیں -
مالی - جسمانی - اور ذہنی کوئی تکلیف ایسی نہ تھی جو مرحوم کو پہنچانے کی کوشش نہ کی گئی ہو -

ہاں - اس تکلیف دہ ماحول میں ایک مردِ حق پسند و حق آگاہ ایسا بھی تھا جس کی بوڑھی اور جہاندیدہ
آنکھوں نے مستقبل کے اس شاعر کو پہچانا اور محبت اور قدردانی کی نظر سے پہچانا - نواب سراج الدین احمد خاں
سائل مرحوم کو راقم الحروف نے ایک بار خود دیکھا ہے کہ رکشا پر بیٹھ کر جامع مسجد کے قرب میں اُس ہوٹل کے سامنے
رُکے ہیں جس میں استاد مرحوم کی مستقل نشست تھی - رکشا میں بیٹھے بیٹھے نواب صاحب نے ایک چائے کا آرڈر
دیا ہے اور حیدر دہلوی کو طلب کیا ہے - استاد رکشا کے قریب پہنچے ہیں اور سلام عرض کرنے کے بعد مزاج پرسی
کی ہے - جس کے جواب میں نواب صاحب مرحوم کے یہ الفاظ آج تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں - "میاں حیدر!

ہم تو اب قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ اب ہم کیا اور ہمارا مزاج کیا۔ ہمارے دم سے دلّی کی رونق ختم ہو رہی ہے اور تمھارا دور شروع ہو چکا ہے۔ اس آخری وقت میں حافظ (کے ہوٹل) کی چائے کی چاہ اور تمھارے تازہ کلام کا اشتیاق مجھے جامع مسجد تک کھینچ لاتا ہے۔ اس دور میں تمھارے سوا کوئی ایسا شاعر نظر نہیں آتا جو ہمارے بعد دلّی کی لاج رکھے گا"

بغداد سے ہجرت کر کے آنے والے خاندان کے اس جوہرِ قابل کے ساتھ بے ادبی سے پیش آنے والے مدعیانِ ادب نے اس امر کا بھی پاس نہ کیا کہ جس پر ہم یہ ظلم توڑ رہے ہیں آلِ رسول میں سے ہے اور جس چراغ کو ہم بجھانے پر تلے ہوئے ہیں وہ ہمارے وطن کو ادبی ضیائیں بخش رہا ہے۔ اپنے جھوٹے وقار کو بچانے کے لئے الزام تراشیاں کی گئیں۔ جاہل قرار دیا گیا۔ سارق ٹھہرایا گیا۔ جرائم پیشہ کا خطاب دیا گیا۔ ان تمام حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے یہ کہنا ایک سیدِ عالی ظرف ہی کے شایانِ شان ہے ؎

یہ بغض بھی یہ ظلم بھی ہنگامی ہے انجام اس آغاز کا ناکامی ہے
اس بغض سے اس ظلم سے کیا ہوتا ہے حیدرؔ کا رسول اور خدا حامی ہے

جب مغلوب الغضب دشمن اس پر بھی دلآزاری سے باز نہ آئے۔ تو یہ کہہ کر اپنی منزلت کا احساس دلانا چاہا ؎

مجھ سے ہے حسد رنج کمالات سے ہے ہر روز تو اِک نئی آفات سے ہے
دہلی ہے وطن میرا، مجھے ناز نہیں دہلی کو شرف آج مری ذات سے ہے

طرح طرح کی افسانہ طرازیوں، اور بے بنیاد الزامات کی فہرست کی گلی گلی کوچے کوچے تبلیغ ہوتے دیکھ کر دعوتِ عمل بھی دی کہ ؎

تسلیم کے قابل نہیں خالی باتیں دعویٰ ہے ہنر کا تو ہنر پیش کرو

لیکن مصائب و آلام میں کمی کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی اور مرحوم یہ کہنے پر مجبور ہو گئے ؎

حیدرؔ مرے وطن میں ہمیشہ سے ہے روا اہلِ ہنر کے باب میں تضحیک بالخصوص

کیا سوچ کر ہیں درپئے آزار ہم وطن حیدرؔ سے ان کو ضد ہے کہ علم و ادب سے ضد

حیدرؔ کے لئے تنگ بھی ہیں بند بھی ہیں دل اہلِ وطن کے درِ خیبر تو نہیں

دجّال کے بارے میں بھی اب شک ہے مجھے ممکن ہے کوئی اہلِ وطن ہو میرا

حیدر جنھیں یارانِ وطن کہتا ہوں دوزخ کے دہکتے ہوئے انگارے ہیں

دوزخ کے عذاب آج نظر آتے ہیں سرد وہ شیطنتِ اہلِ وطن دیکھی ہے

برتی گئی ہے مجھ سے وطن میں مغائرت اپنی ہی انجمن سے اٹھایا گیا ہوں میں

مخالفت؛ اور دشمنی کا یہ انداز ہو تو قدرِ ہنر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تاہم مرحوم کو اپنے کمال کی بے قدری کا احساس شدت سے تھا۔ اس بے قدری کا سبب بے سبب دشمنی بھی تھا اور حسد بھی۔ مندرجہ ذیل اشعار بے قدریٔ فن کے احساس کی مکمل آئینہ داری کرتے ہیں ؎

سخن شناس کی حیدر تلاش ہے بے سود تو اس کو ڈھونڈ رہا ہے جو اس جہاں میں نہیں

لوحِ ہنر ہے شرم سے اک نقطۂ خفی خطِ جلی میں لکھ کے مٹایا گیا ہوں میں

اس بُرے وقت میں مجھے حیدر حق نے کس جرم میں کمال دیا

سرزمیں دہلی کی کوفہ ہے یہاں جائز سمجھ خونِ ناحق علم و فن کا، قتلِ حیدر کشتِ داد

اہلِ کمال پر ہے یہاں لب کشائی کفر ذہنوں میں حاسدوں کے بسایا گیا ہوں میں

دشمنوں نے آخری حربہ جو استعمال کیا وہ یہ تھا کہ متعدد تلامذہ کو بہکایا اور استاد سے برگشتہ کر دیا اور ان بدنصیب شاگردوں نے استاد کے کردار و کلام پر جا و بے جا اعتراض کرنے شروع کر دیئے۔ ذیل کے اشعار اسی سلسلے کی طرف اشارہ کرتے ہیں ؎

اولاد کی طرح جنھیں درسِ ادب دیا حیدر وہ معترض ہیں ہمارے شعار پر

استاد پہ لازم ہے سعادتمندی کم ظرفیٔ شاگرد کوئی عیب نہیں

ہندوستان سے ہجرت کر کے قدر دانیٔ ہنر کی امیدیں لئے پاکستان آئے اور ڈھاکے میں قیام کیا۔ یہیں ایک مشاعرے میں شرکت کی اور اپنی روداد ان الفاظ میں بیان کی ؎

جو کچھ بھی میسّر تھا گنوا کے آئے　　ارباب سیاست پہ لُٹا کے آئے
اک قلعۂ اعزاز و طرب تھی دلّی　　اُس قلعے کو ہم توڑ کے ڈھاکے آئے

ابتدا میں مشرقی پاکستان کے علمبردارانِ ادبِ اردو نے اس عظیم شاعر کے وجود کو اپنے لئے خطرناک سمجھ کر ایذا رسانی کا سلسلہ شروع ہی کیا تھا کہ انھیں یہ سننا پڑا ؎

اے ابنِ ادب تنگ نگاہی سے نہ دیکھ　　اِس عہد کی تاریخ کا عنوان ہوں میں

کیوں اتنے پسِ ترکِ وطن شاق ہیں ہم　　اِس مملکت و ملک کے خلاق ہیں ہم
ماضی کی روایات ہیں زندہ ہم سے　　تاریخ کے بکھرے ہوئے اوراق ہیں ہم

چنانچہ اہل مشرقی پاکستان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور مرحوم کی خاطر خواہ قدر بھی کی - قیام و کاروبار کی تمام ممکن سہولتیں مہیا کی گئیں اور کئی سال تک یہ عظیم فن کار زندگی کے سکون سے ہمکنار رہا -

۱۹۵۴ء میں دوست نما دشمنوں کی ترغیب پر اس یقین دہانی پر کراچی آئے کہ ڈھاکے سے زیادہ قدردانِ فن کراچی میں ہیں اور جو سہولتیں ابھی تک ڈھاکے میں مہیا نہیں ہوئیں کراچی میں فراہم کی جائیں گی - لیکن کراچی پہنچنے پر یہ تمام باتیں فریب ثابت ہوئیں - کراچی میں قیام کی دعوت دینے والوں نے جو سلوک روا رکھا ناقابل بیان ہے - یہاں آ کر مرحوم پرسشِ احوال تک کو ترس گئے - ذریعہ معاش نہ ملا - اپنا اور اپنے متعلقین کا سر چھپانے کے لئے مکان بھی اپنی ذاتی کوششوں سے مہیا کرنا پڑا - دس بچوں اور دو بیویوں کی کفالت عذابِ جان معلوم ہونے لگی - زندگی ایک مرتبہ پھر کرب میں مبتلا ہوگئی احباب کترا کر چلنے لگے - صحت نے جواب دے دیا - ذیل کے اشعار اُن تاثرات کی نشاندہی کرتے ہیں جو مرحوم کی حساس طبیعت پر مرتب ہو رہے تھے ؎

وہ جنس ہوں کہ قبولِ دیارِ غیر نہیں　　وہ بوجھ ہوں کہ زمینِ وطن اٹھا نہ سکی
معالجوں نے یہاں کے وبا قرار دیا　　اجل گناہ سمجھ کر قریب آ نہ سکی

زندہ ہیں تو تصویرِ محن ہیں ہم لوگ　　مردہ ہیں تو بے گور و کفن ہیں ہم لوگ
جن کو نہ کرے دوزخِ غربت بھی قبول　　وہ راندۂ فردوسِ وطن ہیں ہم لوگ

اتنی صورت شناس بستی میں کیا کوئی درد آشنا بھی ہے ؟

انتہا یہ کہ قریب بیٹھ کر استفادہ کرنے والے بھی باتیں کرتے کرتے طنز کر جاتے۔ سرطان کے موذی مرض کی وجہ سے آواز بیٹھ گئی تو ظالموں نے بیٹھی ہوئی آواز پر بھی طنز کرنے سے گریز نہ کیا۔ چنانچہ مندرجہ ذیل رباعیات اسی قسم کی ایک طنز آمیز گفتگو کا نتیجہ ہیں ؎

بیٹھی ہوئی آواز کو میری ناگاہ سنتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ماشاء اللہ
اس حادثے پر خوش ہیں بزعمِ خود لوگ لا حول ولا قوۃ الا باللہ

افسوس زباں نطق سے محروم ہوئی بیگانۂ ہر معنی و مفہوم ہوئی
حسّاد کا پھٹتا تھا کلیجہ جس سے خوش ہیں کہ وہ آواز ہی معدوم ہوئی

جذباتِ ہنر پہ جو جوانی تھی، وہ ہے مرقوم جو اعجاز بیانی تھی، وہ ہے
اظہارِ کمالاتِ زبانی نہ سہی پہلے جو طبیعت میں روانی تھی، وہ ہے

جب مجمعِ احباب میں مل بیٹھا ہے حیدر نہ فسردہ نہ خجل بیٹھا ہے
مایوس نہیں ہے وہ گرفتہ آواز آواز ہی بیٹھی ہے کہ دل بیٹھا ہے

عمر بھر کے ناروا مظالم، ناقدریٔ فن اور مصائب سے متاثر ہو کر ایک قطعہ کہا کہ ؎

فقر و فاقہ، ذلت و بغض و حسد روح فرسا فکر و کاوش کا مآل
واہ یہ انسانیت دشمن سلوک آہ تُف بر علم، لعنت بر کمال

اور یہ مقطع کہہ کر ۱۰ نومبر ۱۹۵۸ء کی صبح کو ۶۷ سال کی عمر میں، سول اسپتال کراچی میں گلے کے سرطان کے آپریشن کے دوران ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔

انّا للہ وانّا الیہ راجعون

میں اپنے باغِ سخن کی خزاں ہوں خود حیدر
جو میرے بعد جئیں گے بہار دیکھیں گے

ڈاکٹر جسٹس ایس۔ اے رحمن
جج سپریم کورٹ

اردو انجمنوں کی مجلس مشاورت[1]

انجمن ترقی اردو لاہور یعنی ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے اردو انجمنوں کی مجلس مشاورت کا اہتمام کرکے، ایک اہم قدم
ٹھایا ہے۔ مختلف انجمنیں متعدد مقامات پر اپنی اپنی صوابدید کے مطابق اردو زبان و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں
یکن اگر ان انجمنوں کو مجموعی حیثیت سے ادبی پیکر سے تشبیہ دی جائے تو صورت یہ بنتی ہے کہ مثالی خیرات کی طرح، جو کچھ
ں کا دایاں ہاتھ کر رہا ہے اس کے بائیں ہاتھ کو اس کی خبر نہیں۔ ان تمام انجمنوں کی کارگزاریاں تسلیم۔ لیکن یہ نفسی نفسی کا
لم اپنے اندر گیسوئے اردو کو سنوارنے کی بجائے کسی قدر الجھانے کا میلان رکھتا ہے۔ نیت نیک بھی ہو تو ممکن ہے کہ
ب ہی میدان میں بڑھنے والے مخالف سمتوں میں چل رہے ہوں یا اگر میدان ہموار کرنے کے لئے کوئی ایک گوشے توجہ
ب ہوں تو سب کدالوں کا ہدف محض ایک ہی نقطہ ہو۔ یہ صورت اعلیٰ کارکردگی سے موافقت نہیں رکھتی۔ ان
نوں کی اہلیتوں اور صلاحیتوں سے مکمل استفادہ اسی طریقے سے ہوسکتا ہے کہ ان کے درمیان وقتاً فوقتاً تبادلۂ
ال و اطلاع ہو اور ان کے مابین عملی رابطہ تقسیم کار کے سنہری اصول پر مبنی ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر یہ مجلس مشاورت
انتشاری کیفیت کا ازالہ کرسکے تو اردو کی مہم تیزی کے ساتھ تسخیر منزل کرلے گی۔ اس ضمن میں میری تجویز ہے کہ پروفی
نیں لاہور میں مرکزی ادارے کو اپنی کارگزاریوں اور زیر کار منصوبوں سے آگاہ کرتی رہیں مرکزی ادارے کا یہ فرض ہوگا کہ وہ
سے زیادہ انجمنوں کو اردو کی نسبت ایک ہی نوعیت کا علمی کام کرنے سے روکے اور جس ادارے کو کسی کار خاص کے
موزوں سمجھے، اسے کام جاری رکھنے کا مشورہ دے کر دوسروں کی توجہ کسی اور شعبۂ عمل کی طرف　منعطف کرائے۔ اگر
لیفۂ تلفیق مرکزی اردو بورڈ لاہور کو تفویض کیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا کیونکہ یہ اس کے فرائض منصبی میں داخل ہے
بلکہ اس بارے میں کچھ سہولتیں میسر ہیں۔ بورڈ نے کچھ عرصہ ہوا مختلف سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کو مراسلے بھجوائے تھے

---

[1] نجمن ترقی اردو لاہور کے زیر اہتمام ۱۷ ار ۱۸ ار ستمبر ۶۶ء کو اردو انجمنوں کی مجلس مشاورت کے اجلاس منعقد ہوئے جناب جسٹس ایس اے رحمن نے صدارت کے
ض انجام دیئے۔ موصوف کا خطبۂ صدارت ان صفحات میں شائع کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

تاکہ ان کی علمی سرگرمیوں کی کیف وکم کی تفصیل مل سکے۔ لیکن اکثر اداروں سے اطلاعات بہم نہ پہنچیں اور یوں مجوزہ صوبہ گیر لائحہ عمل مرتب ہونے سے رہ گیا۔ مجھے یقین ہے کہ مختلف اداروں کے باہمی تعاون اور اشتراک سے ہی یہ گتھی سلجھ سکتی ہے۔ اگر دو کو اس کا جائز مقام بحیثیت مسلمہ سرکاری زبان کے کب ملتا ہے، اس کا انحصار زیادہ تر اس امر پر ہے کہ اردو کے خادم متذبذبین کو کب قائل کر سکیں گے کہ اردو کی مفروضہ تہی مائیگی کا حقیقت سے واسطہ نہیں۔ اس کے لئے عمومی پروپاگنڈے سے زیادہ علمی سطح پر مسلسل کام کرنے کی ضرورت ہے۔ آئیے ہم اس سلسلے میں اردو زبان کی فتوحات کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیں تاکہ جو کچھ ہو چکا یا جو کچھ ہونا ہے، اس کی نشاندہی ہو سکے۔

جہاں تک اردو کو عام بول چال کی زبان یا کاروباری زبان بنانے کا مسئلہ ہے، یہ ظاہر ہے کہ اردو مغربی پاکستان کے تمام خطوں میں بولی سمجھی اور لکھی جاتی ہے۔ بنگلہ کی تخصیص مشرقی پاکستان کے لئے اور اردو کی مغربی پاکستان کے لئے موجودہ سرکاری فیصلے کے مطابق بدیہی ہے۔ اگر قومی تہواروں کے موقع پر جلسوں میں "اردو لکھو، اردو پڑھو اور اردو بولو"، کی تحریک کے نام لیوا اصرار کریں کہ وہ اپنے زعما کے خیالات اردو میں سننا چاہتے ہیں تو یہ کوئی نامناسب بات نہ ہوگی۔ کاروباری حلقوں میں بھی، عوام سے رابطے کی ضرورت کا احساس دلاتے ہوئے اردو کی اہمیت کا شعور پیدا کیا جا سکتا ہے۔ یہ میدان پروپاگنڈے کا ہے اور تقریروں، اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے وسائل سے اس تحریک کو تقویت دی جا سکتی ہے۔ سندھی، پشتو، بلوچی اور پنجابی بولنے والے اصحاب بے شک اپنے گھروں میں اپنی مادری زبانیں استعمال کریں لیکن عمومی دائرۂ کار میں مشترک قومی اغراض کے لئے اردو کو اپنائیں تو وہ ایک قومی فریضہ سرانجام دیں گے۔ اب عاقبت بینی اور زمانہ شناسی کا تقاضا ہے کہ وہ اس بات کو اپنے ذاتی مفاد کی پیش رفت کا ذریعہ بھی سمجھیں کیونکہ ایک نہ ایک دن تو اردو کو مغربی پاکستان کی سرکاری زبان بننا ہے۔

اب دفتری زبان کے مسئلے پر نظر ڈالیے۔ جیسا کہ ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے اپنے خطبۂ صدارت میں صراحت فرمائی ہے اردو کی صلاحیتیں اس ضمن میں عملی طور پر ریاست حیدرآباد دکن میں آزمائی جا چکی ہیں۔ دور کیوں جائیے۔ مغربی پاکستان کے ایک اہم حصے میں بھی اس قسم کا انتظامی تجربہ ہو چکا ہے۔ میری مراد سابقہ ریاست بہاول پور سے ہے جہاں تمام انصرامی امور سے متعلق کارروائی آغاز سے انجام تک اردو میں ہوتی تھی۔ مجلس زبان دفتری لاہور نے تیس ہزار کے قریب دفتری اصطلاحات کا مستند اردو ترجمہ شائع کر دیا ہے۔ نیز اس مجلس نے بعض اہم دفتری ضابطوں کا اردو ترجمہ اور اردو میں سرکاری مراسلت کے نمونے بھی تیار کئے تھے۔ جب مرحوم سردار عبدالرب نشتر سابق پنجاب کے گورنر تھے تو انھوں نے ہدایات جاری کرائی تھیں کہ ضلع کے دفاتر کی تمام کارروائی اردو میں ہو اور قسمت کی سطح پر کمشنروں کو اختیار دیا جائے کہ وہ بعض مسئلوں میں انگریزی زبان سے کام لیں اور باقی میں اردو سے کام چلائیں۔ البتہ سکرٹریٹ کے ساتھ مراسلت میں انگریزی کا استعمال برقرار رکھا گیا۔ ان ہدایات پر نشتر صاحب کے زمانۂ گورنری میں جزوی طور پر

عمل ہوا لیکن ان کے بعد یہ دفتر " گاؤ خورد " ہو گیا ۔ اس کی وجہ زیادہ تر بعض افسروں میں خود اعتمادی کی کمی تھی ۔ بہرحال اب بھی سابق پنجاب کے علاقے میں محکمۂ مال کی تمام کارروائی ضلعی دفتر میں اردو میں انجام پاتی ہے ۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ کم از کم اس خطے میں اگر دوسرے شعبوں میں بھی اردو کو ذریعۂ اظہار بنایا جائے تو کوئی سنگین رکاوٹ راستے میں حائل نہ ہو گی ۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہائی کورٹ سے کمتر عدالتوں کی سرکاری زبان اس علاقے میں اردو ہی ہے گو عدالتیں کارروائی کا ریکارڈ انگریزی میں بھی رکھتی ہیں ۔ غالباً سابق سرحدی صوبہ ، بلوچستان اور قلات میں بھی ریکارڈ مال اردو یا فارسی میں موجود ہے ۔ بہاولپور کے خطے کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں ۔ صرف سابق سندھ کے علاقے میں اراضی سے متعلق ریکارڈ سندھی میں ہے اور ماتحت عمال اور عدالتیں اسی زبان میں کام کرنے کے عادی ہیں ۔ اس مشکل کا حل اردو کے اہل علم کو عموماً اور سندھ کے فضلا اور سرکاری عمال کو خصوصاً سوچنا چاہیئے ۔

اگر مغربی پاکستان کی مجلس واضع قوانین اس بات کا انتظام کرے کہ آئندہ قانون وضع کرتے وقت مسودہ قانون نہ صرف انگریزی میں پیش ہو بلکہ اس کا مستند متن اردو میں بھی منسلک ہو تو اردو میں دفتری معاملات کی انجام دہی میں سہولت پیدا ہو گی ۔ اس اقدام سے عوام بھی زیادہ آسانی سے قانون آشنا ہو جائیں گے ۔ نیز سرکاری گزٹ انگریزی کے علاوہ اردو میں بھی چھپنا چاہیئے ۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ غالباً ۱۹۲۰ء تک ہائی کورٹ کے فیصلوں کے ترجمے اردو میں باقاعدگی کے ساتھ ایک نجی ادارے کی کوشش سے شائع ہوا کرتے تھے ۔

اردو کی اہمیت اہل نظم و نسق کی نظروں میں بڑھ سکتی ہے اگر سرکاری ملازمت کے مقابلے کے امتحانوں میں اسے ایک لازمی مضمون کا درجہ دے دیا جائے ۔ اس سے یہ فائدہ ہو گا کہ سرکاری ملازموں کی نئی پود میں اردو کے خلاف بے جا تعصب راہ نہ پا سکے گا ۔ اور انصرامی معاملات میں اردو کی ترویج کے لیے زمین ہموار ہو گی ۔

اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا مسئلہ مدت سے زیر بحث ہے ۔ اردو کالج کراچی میں ذریعۂ تعلیم اردو ہے ۔ لاہور میں بھی اردو کالج کی تاسیس کا منصوبہ ہے ۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن میں اردو ہی کے ذریعے تمام مضامین پڑھائے جاتے تھے ، جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے تذکرہ فرمایا ہے ، کراچی یونیورسٹی میں چند اقدامات ہوئے ہیں جنھیں ذریعۂ تعلیم کے تبدیلی کا آغاز سمجھنا چاہیئے ۔ سائنسی علوم کی تعلیم کے لئے اردو میں کتابوں کی کمی پورا کرنے کے لئے مختلف ادارے برسرکار ہیں ۔ ان میں پنجاب یونیورسٹی ، کراچی یونیورسٹی ، اردو کالج کراچی ، اردو اکیڈمی اور مرکزی اردو بورڈ لاہور شامل ہیں ۔ موخر الذکر بورڈ نے بی ایس سی کی سطح پر نصابی کتب کی تیاری کا منصوبہ بنایا ہے ۔ اس کی کتابیں " مادے کے خواص " اور " حرارت " شائع ہو چکی ہیں ۔ اور " روشنی " بنیادی ، خرد حیاتیات " اور " بنیادی حشریات " زیر طباعت ہیں ۔ عثمانیہ یونیورسٹی اور انجمن ترقی اردو کی مطبوعات پہلے سے موجود ہیں جن سے فی الحال امداد لی جا سکتی ہے اسی طرح اردو اکیڈمی نے قانونی لغت اور قاموس الاصطلاحات شائع کر کے ایک کارنامہ انجام دیا ہے ۔ اصل میں زبان کو بانثر و

بنانے کا طریقہ یہی ہے کہ اسے اعلیٰ علوم کی تعلیم و تدریس کے لئے استعمال کیا جائے۔ شروع شروع میں دقتیں محسوس ہوں گی لیکن آہستہ آہستہ زبان کی کمی اساتذہ کی کوشش سے پوری ہوتی جائے گی۔ میں اس میں کوئی قباحت نہیں سمجھتا کہ آغاز کار کنگنا جمنی زبان سے ہو۔ البتہ میں یہ واضح کردینا چاہتا ہوں کہ ہم اعلیٰ علوم کی سطح پر انگریزی کی افادیت سے صرف نظر نہیں کر سکتے۔ اس سطح کے طلبہ کا انگریزی سے کماحقہٗ واقف ہونا ضروری ہے۔ بین الاقوامی مصطلحات ہمساوات اور علامات کا استعمال بھی سائنسی علوم کی اردو کتابوں میں ہمارے لئے ناگزیر ہوگا تاکہ طلبہ کا رشتہ علوم میں بین الاقوامی ترقیوں سے کٹ نہ جائے۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ اس قسم کے تالیف و ترجمہ کے کام کی رفتار اور تیز کردی جائے اور سائنس کے ان استادوں کو اردو کے حق میں ہموار کرنے کی کوشش کی جائے جو ابھی تک اردو کی ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے صلاحیت کے قائل نہیں ہوئے۔ اس میدان میں تمام اہل علم و نظر کو دعوت عمل ہے۔ اردو آن سے زبان حال سے یہی کہہ رہی ہے۔

یہ گھڑی محشر کی ہے، تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

مطبوعاتِ انجمن

داستانِ زبانِ اردو
ڈاکٹر شوکت سبزواری

ڈاکٹر شوکت سبزواری اردو کے لسانی مسائل پر کئی گراں قدر مقالے اور کتابیں لکھ چکے ہیں "داستان زبان اردو" ان کا تازہ ترین علمی کارنامہ ہے جس میں انہوں نے اردو زبان کے لسانی سرمائے، مختلف نظریوں، مولد و منشاء، صرفی نحوی نشوونما، مزاج و منہاج اور ارتقاء کے مدارج پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اردو زبان کے بارے میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ قیمت: پانچ روپے

سید احمد خاں۔ حالات و افکار
بابائے اردو

ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنی نشاۃ ثانیہ کے اولین معمار سید احمد خاں کی شخصیت اور علمی کارناموں کا جائزہ جس میں بابائے اردو نے سرسید کے حالات اور افکار کے بعض پہلوؤں پر نئے انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب کو مولانا حالی کی "حیات جاوید" کا ضمیمہ سمجھنا چاہیے۔ قیمت ۸ روپے

تلخیص الاردو

یہ انجمن کے مشہور علمی جریدے سہ ماہی "اردو" کے سی سالہ پرچوں کے بہترین مضامین کا انتخاب ہے۔ اس میں مشاہیر اہل قلم کے لکھے ہوئے گیارہ علمی و ادبی مقالات شامل ہیں

قیمت: پانچ روپے پچاس پیسے

انجمن ترقی اردو۔ بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱

ڈاکٹر سید عبداللہ

کچھ نظام تعلیم کے بارے میں

جناب پرنسپل صاحب!

میں آپ کے لطف و کرم کا بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس جلسۂ تقسیم اسناد میں شرکت اور عزیز طلبہ و طالبات سے خطاب کا موقع عطا کیا۔ اور اس طرح اساتذہ و طلبہ و معززین شہر سے ملنے کی مسرت اور اس اشرف البلاد کی زیارت کا شرف حاصل ہوا جسے جغرافیے والے "قصور" کہتے ہیں مگر میں اسے دارالاسلام کہتا ہوں — یہی وہ مقام ہے جہاں پھر ایک بار، اہل ایمان نے یہ ثابت کر دکھایا کہ باطل اپنی کثرت کے باوجود تار عنکبوت سے زیادہ ضعیف ہو سکتا ہے بشرطیکہ ایمان اور سچائی کا جذبۂ صادقہ دلوں میں، اور حمیت کا خون رگوں میں موجزن ہو — ! میرے لیے یہ شہر اس لیے بھی زیارت کدہ ہے کہ میرے دو بزرگ استاد — پروفیسر محمد اقبال اور پروفیسر محمد شفیع خاک پر نور قصور ہی سے اٹھے تھے۔ اور پھر یہی وہ شہر ہے جو پچھلی صدی میں اپنی سابقہ علمی روایات کے باعث، پنجاب میں علوم مشرق کا گھر اور قومی زبان اردو کا ایک مستقر بنا اور لاہور سے قدم ملانے کی کوشش کرتا رہا —!

جناب پرنسپل صاحب! مجھے یہ معلوم ہو کر بے حد مسرت ہوئی ہے کہ آپ کا کالج گزشتہ سال بھر، جنگ پاک و ہند کی پیدا کی ہوئی غیر معمولی فضا کے باوجود، نہ صرف اپنی معمول کی سرگرمیاں جاری رکھ سکا بلکہ علمی و تعلیمی شعبوں میں بہت اچھے نتائج بھی دکھا سکا۔ اس کامیابی کا باعث آپ کی ماہرانہ رہنمائی اور آپ کے رفقا کی محنت و جاں فشانی ہے۔ میں آپ کی اور آپ کے محترم رفیقوں کی خدمت میں مبارک باد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ آئندہ کالج کو شاندار تر ترقیات کا منہ دیکھنا نصیب ہو۔

لہ اسلامیہ ڈگری کالج قصور کے سالانہ جلسۂ تقسیم اسناد کا خطبۂ صدارت

آج کے جلسے میں کالج کے جو طالب علم سند یاب اور انعام یاب ہوئے ہیں میں انھیں بھی مبارک باد کہتا ہوں اور ان کی کامیابیوں پر دلی خوشی کا اظہار کرتا ہوں۔

رسم کے مطابق، اس موقعے پر کچھ نصیحت ہوتی ہے، اچھے اچھے حکیمانہ نکتے بیان کیے جاتے ہیں مگر میں نہ جگنو، نہ پروانہ، نہ صبح کا ستارہ، نہ قندیل! مجھے واعظ یا حکیم یا فلسفی ہونے کا دعویٰ نہیں میں تو خود اندھیرے میں روشنی تلاش کر رہا ہوں، اس لیے میں ناصح نہیں بن سکتا۔ اور یوں ناصحوں کی بات ہوتی بھی ناگوار ہے چنانچہ ایک عام سا مصرع ہے۔ ع

ناصحا آگ لگے اس ترے سمجھانے کو

تو ایسی صورت میں نصیحت کر کے، سمجھانے کو آگ لگوانے کی اور آپ کے دل کو ستانے اور جلانے کی مجھے کیا ضرورت ہے، اس لئے میں نصیحت کی بجائے اپنے ایک دو تجربے آپ کے سامنے رکھتا ہوں ممکن ہے ان میں سے کوئی بات آپ کے بھی کام آ جائے۔

میرے نزدیک زندگی ایک تجربہ گاہ ہے، اس میں ہر گام، اور ہر لحظہ کسی نئے جذباتی یا واقعاتی تجربے سے دوچار ہونا پڑتا ہے، اور ہمت، عقل اور ایمان کا امتحان ہوتا رہتا ہے۔ میری طرح آپ میں سے اکثر کو زندگی اور معاش کے ان امتحانوں سے گزرنا ہوگا، ان گزرگاہوں میں ہمواری، توازن اور مستقل مزاجی کی بے حد ضرورت ہوتی ہے۔ مگر یہ چیزیں بازار میں نہیں بکتیں۔ اس کے لیے توفیق ایزدی اور ذہنی و روحانی تربیت درکار ہے۔

یوں تو خدا تعالیٰ ہر شخص پر خود مہربان ہے لیکن اس جہان عمل میں جہاں غلہ حاصل کرنے کے لیے کاشت و نگہداشت ضروری ہے، عمل اور اس میں مستقل مزاجی لازم ہے اور اس استقلال کے لیے ارادے اور دعا کی سخت ضرورت ہے۔ دعا دراصل، خدا سے رابطے کی ایک لطیف صورت ہے اور تجربہ یہ کہتا ہے کہ دعا سے بعض اوقات پتھروں کے سینے بھی گداز ہو جاتے رہے اور وہ چیزیں بھی ظہور میں آ گئیں جن کو لوگ ناممکن سمجھتے ہیں۔

خدا سے اس رابطے کے بعد با اصول شریفانہ زندگی بھی لازم ہے۔ آج کل کی زندگی میں ہر شخص ایک کشمکش میں ہے۔ اور عام طور سے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ کامیابی کے لئے محض جد و جہد اور کوشش کافی ہے۔ اس میں با اصول و بے اصول کی کوئی قید نہیں۔ یہ (PRAGMATISM) فلسفہ نفع پرستی کی پھیلائی ہوئی وبا ہے، اس میں ہر چھوٹا بڑا مبتلا ہے اور با اصول شریفانہ زندگی کے حق میں کہنے والے کو یہ طعنہ سننا ہی پڑتا ہے کہ شرافت، حماقت اور کمزوری کا دوسرا نام ہے۔ مگر عزیزان من! اگر پچاس کروڑ آدمی مل کر بھی مجھ سے کہیں

کہ شرافت اور نیکی بیکار چیز اور نا کاموں کا فلسفہ ہے تو بھی میں یہ تسلیم نہیں کروں گا کہ نیکی کو چھوڑ دینا چاہیئے۔ اگرچہ میں یہ تسلیم کروں گا کہ موجودہ سوسائٹی میں چالاکی، عیاری اور بدی کو نیکی کے مقابلے میں زیادہ عزت و کامرانی حاصل ہے۔ پھر بھی بدی بدی ہے اور نیکی نیکی۔ کسی نہ کسی گوشے سے نیکی کے حق میں بھی تو صدا بلند ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نیکی کی اہمیت کو تسلیم کرلیں گے تو پھر آپ کو ان مشکلات کا مقابلہ کرنا ہوگا جو اس مسلک کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔ نیکی پر قائم رہنے کے لئے ہمت اور اعلیٰ کردار کی ضرورت ہے۔ اور یہ اعلیٰ کردار نفس کو مارنے یعنی خودغرضی اور حرص کو چھوڑنے اور دوسروں سے انصاف کرنے کی سپرٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی لیے آنحضرتؐ نے فرمایا کہ نفس کا یہ جہاد دوسرے جہاد سے سخت تر ہے اگرچہ دونوں اپنی جگہ ضروری ہیں۔

میں نے اپنے تجربات میں، اپنی بساط اور کمزوریوں کا لحاظ رکھتے ہوئے، معمولی نیکیوں سے ابتدا کو بہت مفید پایا ہے۔ آپ بھی ایسا ہی کیجئے۔ خدا اگر بڑے بڑے کاموں کی توفیق دے تو سبحان اللہ، ورنہ چھوٹی چھوٹی نیکیاں تو ہر شخص کے لیے موجود اور ممکن ہیں۔ قومی اور معاشرے زندگی کے وسیع رقبے میں بے غرض خدمت کے بے شمار موقعے ہیں۔ بے غرض خدمت سے میری مراد وہ خدمت ہے جس کے لئے آپ کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتے۔ آپ جو کچھ کرتے ہیں، قومی خدمت کے لیے یا دوسروں کو کسی قسم کی راحت پہنچانے کے لئے کرتے ہیں، اور اس کا صلہ نہیں مانگتے۔ اس خدمت کے قومی زندگی میں بے شمار مواقع ہیں۔ اگر آپ اپنی بساط کے مطابق بے غرض خدمت کی کوئی معمولی شق بھی لے لیں اور آپ میں سے ہر شخص کچھ نہ کچھ کرے تو حیات قومی کا چمن راحت کے پھولوں سے صحن فردوس بن جائے۔ اگر آپ ہر شام ایک گھنٹے کے لئے کم از کم یہی کرسکیں کہ اہل محلہ کو صفائی کی تلقین کر دیا کریں۔ یا ٹریفک والے سپاہی کی امداد کر دیا کریں یا بازار میں بے احتیاطی سے پھینکے ہوئے چھلکے ہی اٹھا دیا کریں تو اس سے بھی بڑے عمدہ نتائج نکل سکتے ہیں، قوم کو بے غرض کارکنوں کی ضرورت ہے۔ مگر آج کل بے معاوضہ خدمت کا تصور تک بھی ممکن نہیں۔ آپ سبقت کریں اور کارکن بن کر قومی زندگی کو مالا مال کر دیں۔

پرنسپل صاحب! آپ نے بالکل بجا فرمایا ہے ہم ایک آزاد اسلامی مملکت کے شہری ہیں اس لئے قدرتی طور پر ہمارے نظام تعلیم کو آزاد بھی ہونا چاہیئے اور اسلامی بھی۔ یقیناً ہماری تعلیم کی اساس یہی ہوسکتی ہے، میں آپ کے اس خیال کی تائید کرتا ہوں۔ مگر یہ ضرور عرض کروں گا کہ نظام تعلیم کے آزاد اور اسلامی ہونے کا معاملہ وضاحت طلب ہے۔ اس کی تشریح ہر شخص اپنے ذوق اور حالات کے مطابق کرتا ہے اس لیے اس کی چھان بین لازمی ہے۔

نظام تعلیم کے آزاد ہونے کا مطلب وہ بھی ہے جو آپ نے بیان کیا ہے یعنی ہم ذہنی غلامی اور مغرب کی مرعوبیت سے پوری طرح آزاد ہوں اور یہ بھی ہے کہ ہم ہر قسم کی ذہنی غلامی اور مرعوبیت سے آزاد ہوں مرعوبیت اپنی ہر صورت میں بری چیز ہے اور ذہنی غلامی کا ہر رنگ ناپسندیدہ ہے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہوگا کہ ہم اپنی تعلیم کو قدرتی اصولوں کے مطابق ڈھالیں۔ قدرتی اصولوں سے میری مراد یہ ہے کہ ہماری تعلیم، ہمارے قومی مزاج، ہمارے ملکی و سماجی حالات اور ہمارے قومی تقاضوں کے مطابق ہونی چاہئے۔ اور جس گھڑی، ہم تعلیم کے مسئلے کو اس اصول کی روشنی میں دیکھنے لگیں گے اسی وقت ایک ایسا نظام تعلیم خود بخود ہمارے سامنے آجائے گا جس میں مرعوبیت کا شائبہ اور ذہنی غلامی کی بو بھی نہ ہوگی۔

ذہنی غلامی تب پیدا ہوتی ہے جب ہم ملکی و قومی تقاضوں سے زیادہ، دوسروں کے بنائے ہوئے سانچوں پر انحصار کر لیتے ہیں محض اس وجہ سے کہ وہ نمونے دنیا کے بعض با اقتدار اور غالب اقوام سے منسوب ہیں۔ ہم انھیں یہ دیکھے بغیر اپنانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ ہمارے حالات اور مزاج کے لیے سازگار بھی ہیں یا نہیں۔ ذہنی غلامی یہی ہے ورنہ علمی و عملی استفادے کے معاملے میں مشرق و مغرب کی کوئی قید نہیں۔ آنحضرتؐ کے اس ارشاد مبارک میں کہ اطلبوا العلم ولوکان بالصین (علم کی طلب میں چین تک بھی جانا پڑے تو چلے جاؤ) ہمارے لیے ایک واضح سبق ہے: علم مشرق و مغرب کی قید سے آزاد ہے لیکن کسی علم کے حصول کے مقصد اور اس کے استعمال کے سلسلے میں، ہر ملک اور ہر قوم کے رویے اور نظریئے اپنے ہوتے ہیں اور ان میں فرق ہوتا ہے اور اسی فرق کو نہ جاننے کا یہ نتیجہ ہے کہ ہمارا نظام تعلیم ابھی تک کسی واضح اور قطعی فلسفے سے محروم ہے۔

قدرتی اصول کے تحت ہمارے تعلیمی فلسفے کی چند بنیادیں ہونی چاہئیں۔

(۱) نظام تعلیم کو قومی مزاج کے مطابق ہونا چاہیئے۔

(۲) نظام تعلیم کو ملکی وسائل کے مطابق ہونا چاہیئے۔

(۳) نظام تعلیم کو قوم کے عملی فوائد کے نقطہ نظر سے منظم کرنا چاہیئے۔

(۴) نظام تعلیم ایسا ہونا چاہیئے جو "برتر انسان" کا کردار پیدا کرے۔

قومی مزاج کے مطابق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ نصاب اور نظام کا مجموعی اثر قوم کی تہذیبی روایات اور قوم کی تہذیبی غایتوں کا ممد ہو۔ قومیت کے احساسات اور قوم کے اچھے اوصاف کا اثر لے کر ان کو مزید ترقی دے۔

نظام تعلیم کے قومی ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اعلیٰ انسانی شرافتوں اور غایتوں کو نظر انداز کر دے اقوام کی شرافت کا بڑا ثبوت ہی یہ ہے کہ وہ اپنے مخصوص قومی کردار کے ساتھ ساتھ، وسیع انسانیت کی بھی علم بردار ہوں۔

پاکستان کی تعلیم، پاکستانی معاشرے کی طرح ایک تصادم اور تضاد میں مبتلا ہے۔ یہ ذہنی تضاد تاریخی حالات کی پیداوار ہے۔ ہم ۱۸۵۷ء سے پہلے ایک سالم تہذیب کے علم بردار تھے جو اپنی کمزوریوں کے باوجود مرکزی فکر کے لحاظ سے خود آشنا تہذیب تھی۔ ہم اسلام کو دنیا کا غالب ترین مذہب اور اسلامی معاشرتی تصورات کو افضل و اعلیٰ اخلاق مانتے تھے۔ سیاسی مغلوبی کے ہزارہا برے نتائج میں ایک بات یہ بھی ہوئی کہ ہم دوسروں کے سیاسی مغلوب بھی ہوئے اور ذہناً اور عملاً ایک دوسری تہذیب کو (یا دوسری تہذیب کو بھی) اعلیٰ اور افضل ماننے لگے۔ پہلے ایک نیام میں دو تلواریں کبھی نہ سما سکتی تھیں اب مصالحت پسندوں نے کچھ ایسی کل چلائی ہے کہ ایک ہی نیام میں دو تلواریں رکھنے لگے ہیں۔ اور اس کا نام انھوں نے زمانے کے تقاضوں سے مطابقت رکھا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ یہ دو تلواریں، ایک دوسرے کو کاٹنے لگی ہیں اور نیام تو بالکل برباد ہو گیا ہے۔ نام تو ہم اب بھی اسلام کا لیتے ہیں لیکن ناطق فیصلہ یا تو نفع کے ہاتھ میں ہے یا تن کی لذتوں کے ہاتھ میں۔ تن پرستی اور نفع پرستی ہماری منافقانہ زندگی اور ریاکاریوں کے اندر روح کی طرح کام کر رہی ہے۔ اب اسلام محض نعرہ ہے اور اس وقت کام آتا ہے جب نفع پرستی کو اس کی ضرورت ہے ہے۔ ورنہ اس کا عمل دخل کچھ نہیں، غرض ہمارا معاشرہ تضاد میں مبتلا ہے مگر اہم سوال یہ ہے کہ آخر ہماری راہ عمل ہو کیا؟ ہم مغربی زندگی کے ساتھ نباہ کس طرح کریں؟ کیا ہم مغرب سے کٹ کٹا کر، دنیا سے بالکل علیحدگی اختیار کر لیں۔

اس سوال کے جواب میں بڑی بڑی مغالطہ انگیزیاں کی جاتی ہیں۔ جس سے اصل مسئلے کی صورت بگڑ جاتی ہے۔ سوال کا صحیح جواب یہ ہے کہ کسی سے بے تعلقی مت اختیار کرو۔ یہ بے تعلقی کا فلسفہ تو ہندوانہ ہے۔ محمود غزنوی کے زمانے سے لے کر سکندر لودھی بلکہ اکبر کے زمانے تک، ہنود، مسلمانوں سے بے تعلق رہنے پر مصر رہے؛ یہ ان کی کمزوری تھی۔ مگر مسلمان دنیا کے کسی معاملے میں بے تعلق نہیں رہ سکتا؛ اس کی توانائی اسی میں ہے کہ وہ زندگی کے ہر تجربے کو سمجھنے کی کوشش کرے اور اپنے مرکزی عقیدوں کی روشنی میں ان کو قبول یا رد کر دے۔ مگر مرکزی عقیدوں کی گرفت مضبوط ہونی چاہیئے۔

ہمارے مرکزی عقیدے کیا ہیں؟ توحید پر ایمان، رسالت پر ایمان، وحی پر ایمان، قیامت اور سزا و

جزا پر ایمان - توحید پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ ہم خدا کو ایک مانیں اور اپنے ہر معاملے میں اسی سے مدد مانگیں اور اسی کی طرف رجوع کریں - خدا کا یہ عقیدہ انسان کی سب سے بڑی قوت ہے، یہ ہماری ہی ذات کی توسیع ہے - رسالت پر ایمان سے مراد یہ ہے کہ دین و دنیا کے ہر مسئلے میں آنحضرتؐ کے اسوۂ حسنہ اقوال و ارشادات ہی کو حکم بنانا ہے - اور جب یہ معلوم ہو جائے کہ آنحضرتؐ کا ارشاد یہ ہے تو اس کے سامنے گردن جھکا دینا سب سے بڑا اسلام ہے۔

اگر ہم اسلام کے دعووں میں سچے ہیں تو مغربی تہذیب کے سلسلے میں بھی ہمیں یہی رویہ اختیار کرنا ہوگا۔ مگر پہلے مغربی تہذیب کو سمجھنا ضروری ہے۔

مغربی تہذیب کیا ہے؟ (۱) سائنسی ایجادات، (۲) سائنسی نقطۂ نظر اور (۳) رہنے سہنے کے مخصوص طریقے - ظاہر ہے کہ سائنسی علم اور سائنسی ایجادات کے استعمال کے بارے میں کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا، نہ ان وسائل زندگی کا کوئی منکر ہے جو ٹکنالوجی نے مہیا کیے ہیں - البتہ سائنسی نقطۂ نظر اور رہنے سہنے کے مخصوص طریقوں کے بارے میں چھان بین کی بیحد ضرورت ہے۔

سائنسی نقطۂ نظر بڑا پیارا لفظ یا عمدہ الفاظ کا مجموعہ ہے، مگر اس کے سب خط سیدھے نہیں بہت سے پہلو کج بھی ہیں - سائنسی نقطۂ نظر وحی و الہام جیسی چیزوں کا منکر ہے - سائنس خود بے تعلق سہی مگر سائنسی فلسفہ، نظریئے اور عقیدے بناتا ہے - سائنسی فلسفہ محض عقل و تجربے کو صحیح مانتا ہے اس کے علاوہ یہ سراپا مادی ہے اور اسی وجہ سے اس کی اخلاقیت لبادفات تن پرستی اور نفع پرستی کی نذر ہو جاتی ہے میں سائنس میں یقین رکھتا ہوں مگر سائنسی نقطۂ نظر کو ناقص سمجھتا ہوں - اور یہیں سے ہمارے اور مغرب والوں کے طرز فکر میں فرق شروع ہو جاتا ہے - دین کی عمارت الہام اور قرآن پر قائم ہے - اور سائنسی نقطۂ نظر میں الہام اور وحی ایک مجہول و مشکوک کیفیت ہے۔

اہل مغرب کے رہنے سہنے کے بہت سے رواج ایسے ہیں جو ہمارے مجلسی تصورات کے خلاف ہیں خصوصاً عورتوں اور مردوں کے اختلاط کے معاملے میں یورپ کے نظریئے، اسلامی روح کے لئے بے حد وحشت انگیز ہیں - یہ دلیل مضحکہ خیز ہے کہ اب چونکہ بہت سے لوگ ان طریقوں کو اپنا چکے ہیں لہٰذا انھیں اسلامی کہہ دیا جائے - اسلامی طریقے وہی ہیں جو اسلامی ہیں - لیکن یاد رہے کہ مغربی زندگی کی ہر بات بری نہیں، یقیناً بہت سی باتیں ایسی بھی ہیں جن کو اپنا لینے میں کوئی مضائقہ نہیں - کم سے کم یہ بات تو ہمیں سیکھ ہی لینی چاہیئے کہ اپنے غسل خانے صاف رکھنے چاہئیں اور جلسے میں وقت پر پہنچنا چاہیئے - باقاعدگی یورپ کا مخصوص اصول نہیں مگر بے قاعدگی اس وقت گویا ہمارا مخصوص طریق زندگی ہے، لہٰذا اس وقت

یہ اصول اگر اور کسی وجہ سے نہیں تو، مغرب کی تقلید کی خاطر ہی اپنا لینا چاہیئے ۔

مشرق سے اگر تجھے ہوئی ہے نفرت
للہ اکبر نماز مغرب تو نہ چھوڑ

یہ معلوم ہے کہ علامہ اقبال نے مغربی تہذیب کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے ۔ مگر اس سے زیادہ قابل غور خود مغربی مفکرین کا احتجاج ہے ۔ مغرب کی مشینی تہذیب کے مخالفوں میں شپنگلر، ولن وڈ ریڈ وغیرہ خاص شہرت رکھتے ہیں ۔ مغرب کے مخالفین مغرب کا احتجاج اس بنا پر ہے کہ یہ تہذیب اب انسان میں زیادہ اعتقاد نہیں رکھتی دولت، صنعت اور ایجاد ہر شے ترقی کر رہی ہے لیکن انسان اتنے ہی سکون سے محروم ہوتے جاتے ہیں ۔

پاکستان کے نظام تعلیم کو مغربی نمونوں کی تقلید کرتے وقت یہ خاص احتیاط کرنی ہوگی کہ سائنس کے سارے رازوں پر حاوی ہو جانے کے ساتھ ساتھ خدا کے گہرے عقیدے کو گزند نہ پہنچے، رسالت کا اسوۂ حسنہ ہر حال میں برتر ہو ۔ اور تاویل اور بہانہ سازی کئے بغیر، وہ عقیدے اور رد لے بلا تکلف رد کر دیئے جائیں جن کی وجہ سے مغرب والوں کے گھر برباد ہو چکے ہیں اور ہمارے ہونے والے ہیں ۔

پاکستان کے تعلیمی فلسفے کی دوسری اہم بنیاد یہ ہے کہ اس کی تشکیل کرتے وقت ملکی وسائل کا ضرور خیال رکھا جائے ۔ یعنی اس ملک کے عام باشندوں کی عام مالی حالت بھی مدنظر رہنی چاہیئے، تعلیم کو علی العموم ارزاں ہونا چاہیئے، اسی طرح یہ امر بھی مدنظر رہنا چاہیئے کہ تعلیم ایک بے مقصد مشغلہ نہ بن جائے جیسا کہ اس وقت ہے ۔ تعلیم کو ایک بامقصد قومی سرگرمی بنانے کے لئے ملکی ضرورتوں اور افراد کی قابلیتوں کا جائزہ لینا ہوگا تاکہ ملک کی ہر ضرورت کی تکمیل کے سامان مہیا ہوں اور قابلیت رکھنے والا کوئی فرد بھی اس لیے ضائع نہ ہو جائے کہ اس کو وسائل میسر نہ تھے ۔ اس کے لئے حکومت کی طرف سے تعلیمی منصوبہ بندی کی ضرورت ہے، جتنا زور حکومت خاندانی منصوبہ بندی پر صرف کر رہی ہے اس سے آدھی توجہ بھی تعلیمی منصوبہ بندی کے لیے مبذول ہو جائے تو بہت سے مسئلے حل ہو سکتے ہیں ۔

تعلیم کے ذریعے کردار کی تشکیل بھی اہمیت رکھتی ہے اور اس پر بہت اچھے اچھے مقالے لکھے جا رہے ہیں ۔ لیکن اصل سوال یہ ہے کہ یہ ہو کس طرح ؟ ظاہر ہے کہ صرف کہنے سے تو یہ کام ہو نہیں سکتا ۔ خصوصاً جب کہ بچوں پر اثر ڈالنے والی بہت سی باتیں ایسی بھی ہیں جو تعلیم کے ماحول سے باہر واقع ہیں اور ان میں پورا معاشرہ مبتلا ہے ۔ میں یہ سفارش تو نہیں کروں گا کہ جب تک پورا معاشرہ درست نہیں ہو جاتا اس وقت تک مدرسے اور کالج معطل رہیں ۔ کہنا صرف یہ ہے کہ مسئلہ نازک ہے، لہٰذا اس کی طرف

پیش قدمی کرتے ہوئے، احتیاط، صبر، رواداری اور تدریج سے کام لینا ہوگا، صورتیں دو ہیں۔ یا تو استاد اصلاحِ کردار کی تحریک کو پھیلا کر طلبہ کے ساتھ ساتھ پورے معاشرے کی اصلاح کا بیڑا بھی اٹھائیں اور جراتِ گفتار سے کام لیں۔ یا پھر معاشرہ استاد کی مجبوریوں کا لحاظ رکھتے ہوئے، خود کو بھی بدلے اور طلبہ کی حد تک، استاد کو تدریجی کارروائی کا موقع دے۔

میں ذاتی طور پر دوسری تجویز کو قابلِ عمل سمجھتا ہوں، یعنی یہ چاہتا ہوں کہ معاشرے کے تعاون و اشتراک سے، تشکیلِ کردار کا تدریجی پروگرام بنایا جائے۔ اس سلسلے میں، میں بار بار پیتا لوزی کا ذکر کر چکا ہوں جس کے نظامِ تعلیم میں "عملی نیکی" بھی اہم مضمون کا درجہ رکھتی تھی۔ عملی نیکی کا مضمون ہمارے نظامِ تعلیم میں بھی شامل کیا جا سکتا ہے، مگر یہ عملی نیکی بھی بے اثر رہے گی اگر سوسائٹی کا عام عمل نیکی سے زیادہ بدی کا طرف دار ہوگا۔ اس وقت سوسائٹی میں بدی کی بڑی قیمت ہے۔ بدی بڑے بڑے انعام پاتی ہے، بدی منظم ہے، بدی کی قوت کا مقابلہ کرنا سوسائٹی کے بس کی بات نہیں، سوسائٹی کی دو بیماریاں، طمع اور خوف بدی کو مزید تقویت دیتی ہیں۔ اس لئے سوسائٹی کا صحت مند حصہ بدی کے خلاف آواز بلند نہیں کر سکتا کیونکہ وہ بدی کے جتھوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ البتہ اگر نوجوانوں کا کوئی گروہ بدی اور بے ضمیری کو مکروہ شے سمجھ کر اس کے خلاف منظم کام کرے گا تو اصلاح ممکن ہے۔

عالی جناب مسٹر جسٹس حمود الرحمان کے کمیشن نے، تعلیم کے اسلامی ہونے کے بارے میں تشکیک کا اظہار کیا ہے، اور واقعی علوم کے سلسلے میں بظاہر یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ان کو اسلامی اور غیر اسلامی کہہ کر، علم کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ جن صاحبوں نے تعلیم کو اسلامی بنانے کا مشورہ دیا وہ کیا تھا لیکن ذاتی غور و فکر سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ تعلیم کو اسلامی بنانے کا مطلب یہ ہے کہ تعلیم کا ماحول اسلامی بنایا جائے۔ ماحول کے اسلامی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ (۱) نصابوں میں دینی علوم اور عربی فارسی کو ایک خاص حیثیت دی جائے۔ (۲) علوم کی کتابوں میں یہی بتایا جائے کہ کسی خاص علم میں مسلمانوں نے کیا کیا اضافے کئے اور (۳) مدرسوں اور کالجوں کے ماحول ہی سے یہ پتا چل سکے کہ یہ مدرسے مسلمانوں کے ہیں، ہندوؤں یا فرنگیوں کے نہیں۔

ظاہر ہے کہ ان تینوں مسئلوں کی بے شمار جزئیات ہیں، ان اصولوں کی روشنی میں اہلِ تعلیم ان کی تعیین کر سکتے ہیں۔

تعلیم کے ذریعے انسانیت کی تربیت بھی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ تربیت جذباتِ انسانی کی صحیح تنظیم اور ان کے متوازن اظہار پر منحصر ہے۔ اور یہ چیز بھی عقیدے سے زیادہ زندگی کے عمل سے تعلق رکھتی ہے۔ اس

(باقی صفحہ ۲۹)

مرتضیٰ حسین فاضل

دیوانِ غالب کی ایک نادر قلمی شرح

غالب کی نثر ادب کا سنگ میل اور غالب کی نظم اردو شاعری کا مینار عظمت ہے۔ ایک صدی سے غالب کی نظم و نثر کا مطالعہ کیا جا رہا ہے۔ صاحبان علم و فکر مدتوں سے دیوان غالب کو اردو شاعری کا مثالی دفتر مانتے چلے آئے ہیں اس مطالعے کا مقصد ذوق ادب کی تسکین بھی ہے اور غالب کی شخصیت کے پہلو معلوم کرنے کا ذریعہ بھی دیوان غالب اس بات کی دلیل ہے کہ شاعر کا ذہن آفاقی بھی ہو سکتا ہے۔ شاعر کی زبان انسانی شعور و لاشعور کی ترجمان ہوا کرتی ہے۔ اس کا دل عام انسانوں کی کیفیت رنج و الم کا آئینہ خانہ ہوتا ہے۔ غالب عظیم شاعر ہے اس میں اکثر معیاری خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ غالب کے اشعار کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ فن کار جزئیات سے کلیات کا استنباط کرنے میں کس حد تک ذہین ہے۔ حقائق کی پہچان میں کتنی گہری نظر کا مالک ہے افراد سے تشخصات اور افکار سے زمان و مکان کی قیدیں دور کر کے ہر بات کو ایسے تجریدی رنگ میں دیکھتا اور دکھاتا ہے کہ ہر ذہن بیداری اور ہر خیال نشاط محسوس کرتا ہے۔

تخیل کی لطافت بیان کی رمزیت سے مل کر بات گنجلک کر دیا کرتی ہے، مگر غالب کے اشعار میں یہ دونوں چیزیں مل کر پھول کی رنگینی اور مہک بن گئی ہیں۔ اشعار میں وہ شفافیت اور رنگینی ہے جیسے ہشت پہل بلوریا ہزار پہلو نگینہ۔ ایسا آئینہ خانہ جس کو ہیں نور و روشنی کے ساتھ جلوے ہی جلوے ہوں۔ حافظ شیراز اور مولانائے روم کے علاوہ اس انداز کا معنی ہزار رنگ کا دفتر کہاں ہے؟ نظیری اور بیدل بات سے بات پیدا کرتے ہیں مگر غالب کا ان کا مقابلہ ہی کیا۔

ہے بسکہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

ان شعروں کا مطالعہ کرتے وقت عموماً کرشمہ دامن دل کھینچتا ہے، ذوق قدم قدم پہ رُکتا ہے، خیال ہوتا ہے

کہ جو بات سمجھ میں آئی ہے ممکن ہے غالب نے اس سے زیادہ اچھا نکتہ بیان کیا ہو، کوئی نفسیاتی مسئلہ حل کیا ہو۔ شاید کسی جذبے کی تحلیل ہو۔ ایک مطلب نکلتا ہے۔ مگر شعر کی ترکیب، بناوٹ اور لفظوں کی بندش پر توجہ کی جائے تو کسی اور نکتے کے انکشاف کی توقع پیدا ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے شارحین میں اختلاف نظر آتا ہے۔ مرزا کا دیوان خود ان کی زندگی میں توجہ سے پڑھا جانے لگا تھا لوگ مشکلات پر غور کرتے تھے بعض حضرات نے غالب سے رجوع کیا شعروں کا مطلب پوچھا، مرزا غالب نے سائل کی ذہنی کیفیت کے مطابق جواب دیا اور شرح لکھی۔ یہی شرح عام شرح نگاروں کے لئے نمونہ قرار پائی۔ مولانا حالی نے یادگار غالب میں تھوڑے سے اشعار کی شرح قلمبند کی۔ یہ شرح بڑے اچھے اسلوب کی حامل ہے۔ مولانا حالی نے اگر پورے دیوان کی شرح لکھی ہوتی تو یقیناً شعر فہمی کے لئے بیحد مفید ہوتی۔ حالی کے بعد علی حیدر نظم طبا طبائی کی شخصیت اور ان کی شرح بہت اہم ثابت ہوئی۔ مولانا طبا طبائی نے دیوان غالب کا براہ راست مطالعہ کیا اور بڑی توجہ سے اسے حل کیا۔ مولانا کی ادبی شخصیت اور علمی مرتبہ بلند تھا کہ ہر طرف سے ان کی شرح کا خیر مقدم کیا گیا۔ حد یہ ہے کہ مولانا حسرت موہانی جو ان دنوں شرح دیوان غالب لکھ رہے تھے۔ نظم کی شرح دیکھ کر رکے اور سرسری کام کرکے رہ گئے۔ اتفاق کی بات، مولانا نظم نے اپنی شرح میں بڑی حد تک اختصار کا خیال رکھا، وہی غالب کا انداز، مختصر، جامع اور علمی اسلوب، حسرت موہانی کی شرح اس سے بھی زیادہ مختصر تھی۔ لیکن اب شرحوں کی تعداد ایک درجن کے قریب پہنچ گئی تھی اختلاف کی راہیں کھل گئی تھیں ادھر جناب عبدالباری آسی کی شرح چھپ کر آئی تو لوگ چونکے، بحثیں شروع ہوگئیں محمد احمد صاحب بیخود موہانی مرحوم نے اسی زمانے میں شرح لکھی۔ میں نے وہ شرح دیکھی تھی۔ اور خود جناب بیخود مرحوم سے اس کے مختلف حصے سنے واقعی وہ شرح نہ صرف عالمانہ و ادیبانہ تھی بلکہ شعر فہمی کے لئے بے حد اہم درجہ کی مالک تھی "گنجینۂ تحقیق" میں غالب کے اشعار پر جو مضامین ہیں انھیں دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ بیخود موہانی کی شرح کا انداز بحث کیا تھا۔ افسوس ہے کہ وہ شرح اب تک نہ چھپ سکی۔ اور ایک بیخود موہانی کیا، مجھے یقین ہے کہ اور بھی حضرات ہوں گے جن کی شرحیں گوشۂ گمنامی میں پڑی ہوں گی، انہی نامعلوم شرحوں میں ایک وہ شرح ہے جو مجھے محترمی جناب صادق علی صاحب دلاوری کی بدولت دیکھنے کو ملی۔

یہ شرح پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج لاہور کے نامور استاد جناب مولانا سید اولاد حسین صاحب شاداں بلگرامی مرحوم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ شاداں صاحب مرحوم برصغیر کے مشہور عالم اور فارسی کے مسلم الثبوت ماہر تھے موصوف نے فارسی کی مشکل ترین کتابوں کی شرحیں تحریر فرمائی ہیں۔ تاریخ وصاف، مقامات حمیدی، جہانکشای جوینی جیسی ادق کتابوں کی تصحیح و تشریح ان کی قابلیت پر دلیل قاطع ہے، غالب کی کتاب "نیمروز" بھی مرحوم کے حواشی اور تصحیحات کے ساتھ جناب شیخ مبارک علی صاحب نے بڑے اہتمام سے شائع کر چکے ہیں۔

اولاد حسین صاحب شاداں اعلیٰ اللہ مقامہ، شب جمعہ ۲۹ ربیع الثانی ۱۲۸۷ھ/۱۸۷۰ء کو آرہ ضلع شاہ آباد (بہار ہند) میں پیدا ہوئے ۔ ان کے والد منشی سید تفضل حسین صاحب مرحوم مظفر پور کی تحصیل میں قرق امین تھے اور ۱۲۹۱ھ میں رہگرائے آخرت ہوئے، چھ سالہ یتیم نے پرورش اور تعلیم کے مراحل اپنے دادا جناب مولوی فدا حسین صاحب مرحوم کے سایہ عطوفت میں حاصل کئے ۔ چودہ سال کی عمر تک فارسی ادب کا مطالعہ کرنے کے بعد لکھنؤ میں چرچ مشن ہائی اسکول اور حسین ٹیال ہائی اسکول، میں تعلیم پائی ۔ مڈل کے بعد عربی ادب و فلسفہ و منطق کے لئے جناب ڈاکٹر محمد ہادی رسوا، جناب مولانا علن صاحب قبلہ، جناب مولانا ظہور حسین صاحب قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہم کے سامنے زانوے ادب تہ کیا ۔ پھر پنجاب یونیورسٹی سے فارسی کی اعلیٰ سند حاصل کی ۔

نوجوانی ہی میں لکھنؤ کے بعض اسکولوں میں مدرس کے فرائض انجام دینا شروع کر دیئے تھے ۔ ۱۳۱۸ھ/۱۹۰۱ء میں مدرسہ عالیہ رامپور میں مدرس فارسی کی حیثیت سے ملازمت کر لی ۱۹۲۳ء میں اورینٹل کالج میں تقرر ہوا، ۱۹۳۵ء میں یہاں سے ریٹائر ہو کر پھر مدرسہ عالیہ رام پور چلے گئے اور وہاں ۱۹۴۸ء بعمد وفات پائی ۔

شاداں صاحب کے تلامذہ کہتے ہیں کہ موصوف جو کتاب پڑھاتے تھے پہلے اس کا مطالعہ کرتے اور بڑی محنت سے اس کے نوٹس تیار کرتے تھے، اس کے مباحث کو تفصیل سے دیکھتے اور سمجھتے تھے پھر جب پڑھانے بیٹھتے تھے تو ہر نکتہ یوں سمجھاتے تھے کہ دل میں بیٹھ جاتا اور طالب علم یہ سمجھتا تھا کہ اب میں یہ کتاب خود پڑھا سکتا ہوں، طلبہ اور معاصر اساتذہ میں ان کے تیار کردہ نوٹ شہرت حاصل کر لیتے تھے، اور مرحوم طلبہ کی فرمائش سے اپنی تیار کردہ کتاب جناب شیخ مبارک علی صاحب کو دیدیتے تھے ۔ شیخ صاحب کا ادارہ فارسی کلاسیکی کتابوں کی معیاری اشاعت میں مشہور تھا، ادبا و محققین ان کے مطبوعات کو سند جانتے تھے، ۱۹۲۱ء سے ۱۹۴۷ء تک شاداں صاحب مرحوم نے بائیس کتابیں لکھیں اور وہ سب کی سب کتابیں شیخ صاحب ہی نے شائع کیں ۔

۱۹۴۷ء تک جناب شیخ مبارک علی صاحب دیوان غالب کی دو شرحیں شائع کر چکے تھے، ایک تہا کی شرح دوسری جناب آغا محمد باقر صاحب کی شرح "بیان غالب" شاداں صاحب فارسی کے استاد تھے اس لئے دیوان اردو کی شرح کے لئے شاداں صاحب مرحوم سے زیادہ توقع نہ تھی ۔ اتفاق سے ۱۹۴۵/۴۶ء میں شیخ صاحب کے عزیز جناب عنایت حسین صاحب سہیل نے اپنے استاد شفیق سے شرح دیوان غالب کی فرمائش کی اور کچھ کتابیں بھی رام پور بھیج دیں، مولانا نے حسب عادت بڑی محنت سے ایک سال کے اندر اندر شرح مکمل کر کے عنایت حسین صاحب کو بھیج دی اور عنایت حسین صاحب نے اس کی اشاعت کا اہتمام شروع کر دیا، مگر بعض مشکلات کی بنا پر یہ کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا ۔

---

[1] زیر نظر شرح بھی جناب شیخ صاحب ہی شائع فرما رہے ہیں ۔

میرے سامنے اسی شرح کا اصل مسودہ خود مصنف کے قلم کا تحریر کیا ہوا موجود ہے یہ کتاب زرد اور سفید کاغذ پر بہت خوشخط لکھی گئی ہے، اشعار اور لغات کے لئے سرخ اور شرح کے لئے نیلی روشنائی استعمال ہوئی ہے تیئیس سطری مسطر پر تقریباً ساڑھے تین سو صفحات کی ضخامت رکھتی ہے۔ مسودے میں چھ جگہ تاریخیں درج ہیں۔

۱۔ صفحہ ۱۵ پہ — " ۵ رمئی ۱۹۴۶ء معادل ۳ رجمادی الثانی ۱۳۶۵ھ"

۲۔ صفحہ زک — " ۵ رمئی ۱۹۴۶ء معادل ۳ رجمادی الثانی ۱۳۶۵ھ"

۳۔ صفحہ ۹ط — " ۱۶ راپریل جمعہ"

۴۔ صفحہ ۲۵ — " المرقوم ۱۹ راپریل ۱۹۴۶ء"

۵۔ صفحہ ۹۵ — " بلغ ۳۰ راگست ۱۹۴۶ء"

۶۔ خاتمہ کتاب کا ترقیمہ — ۲۶ رمارچ ۴۶ء معادل ۲۲ ربیع الثانی ۱۳۶۵ھ یوم سہ شنبہ"

گویا ۲۶ رمارچ ۱۹۴۶ء کو شرح مکمل ہوئی، ۲۶ رمارچ سے ۱۹ راپریل چوبیس پچیس دن میں مقدمہ انجام کو پہنچا۔ ۳۰ راگست ۱۹۴۶ء کو غالباً ۹۵ صفحات تک نظر ثانی ہو چکی تھی۔ میرے خیال میں شرح دیوان غالب جیسے کام کے لئے یہ رفتار بہت تیز ہے، پھر خوشخط اور سلیقے سے لکھنے والے کے لئے اس سے بڑھ کر محنت کا کام ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ مولانا نے یہ دن صرف شرح دیوان ہی پر صرف کئے ہوں اور شب و روز مسلسل لکھتے رہے ہوں۔

مسودے کی ترتیب اور کتاب کا خاکہ یہ ہے:۔

ورق ۱ - سرخ روشنائی سے کاتب یا ناشر کے لئے مندرجہ ذیل ہدایات ہیں۔

ورق ۱ - ٹائٹیل

۲ - خالی

۳ - تہدیہ

۴ - فہرست

۵ - عرض ناشر

۶ - عرض ناشر یا خالی

۷ - دیباچہ — آخر میں ہے " روح المطالب فی شرح غالب"

اس کے بعد والے ورق کے الف رخ پر فہرست اور ب پر تہدیہ ہے، جس کی عبارت یہ ہے:۔

" میں چھیالیس سال سے، اگر پندرہ سال (گیپ) کے نکال ڈالے جائیں تو اکتیس سال سے اس ریاست سے وظیفۂ دعاگوئی پا رہا ہوں، ہمارے سرکار اعلیٰ حضرت ہز ہائنیس سید رضا علی خاں صاحب بہادر بالقابہ دام اقبالہم وملکہم

قدردان علم و ہنر سے زیادہ کوئی ذات میری نظر میں نہیں چنانچہ ہندو بنارس یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی امداد لاکھوں روپیوں سے فرماتے رہتے ہیں۔

رام پور میں بھی سررشتہ تعلیم پر اتنی رقم صرف فرماتے ہیں جس سے ایک یونیورسٹی قائم ہو سکتی ہے۔ کبھی کسی رئیس کے عہد میں اتنا روپیہ سررشتہ تعلیم پر صرف نہیں ہوا۔ پھر ان کی ذات کے علاوہ کون اس کا مستحق ہو سکتا ہے کہ جس سے میں اپنی اس ناچیز تصنیف کا انتساب کروں۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

نمک خوار قدیم
سید اولاد حسین شاداں بلگرامی

سرورق کی عبارت ہے:۔

اسنی المطالب یعنی شرح دیوان (اردوئے) غالب

مصنفہ

پروفیسر سید اولاد حسین، شاداں بلگرامی

مصنف شروح عدیدہ کتب درسیۂ فارسیہ

حسب فرمائش

شیخ عنایت حسین (آنرزان پرشین) مالک مطبع

کوہ نور گنپت روڈ۔ لاہور

سنہ ۱۹۳۷ء

مطبوعہ مطبع کوہ نور

بار اول ۱۰۰۰		قیمت فی نسخہ

ان اوراق کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے:۔

صفحہ ۱ پر انگریزی میں PREFACE لکھ کر کاٹ دیا گیا ہے اور اس کے بجائے " دیباچہ " لکھا ہے اور بتایا ہے کہ یہ کتاب جناب شیخ عنایت حسین صاحب کی فرمائش سے لکھی ہے اور " میری جو تالیف ہے کسی تاجر کتب کی فرمائش ہی سے ہے" ۔ ص۲ "کبھی ہوش بلگرامی نے بھی اس کی (شرح دیوان غالب) خواہش کی تھی" ص۳ " امر واقعی یہ ہے کہ اگر شرح دیوان غالب مصنفہ جناب مولوی سید علی حیدر صاحب نظم طبا طبائی اعلی اللہ مقامہ میرے پاس نہ ہوتی تو میں یہ شرح نہیں لکھ سکتا تھا۔ اگرچہ بکثرت اشعار کے معانی ان سے الگ لکھے ہیں مگر اس اختلاف کا سبب بھی انھیں کے معانی

ہیں اس لئے ان معانی کو بھی انھیں کے سمجھنا چاہیئے ۔ جہاں کہیں میں نے معانی میں اختلاف کیا ہے وہاں جناب نظم اور حسرت موہانی کے معانی بھی لکھ دیئے ہیں ۔ بعض مقامات ایسے بھی ہیں جہاں اپنے ہی معانی پر اکتفا کی ہے ۔“
۔۔ ” جب میں شرح دیوان غالب سے فراغت حاصل کرچکا اور شرح کو صاحب فرمائش کے پاس بھیج چکا تو بیکاری میں دیوان غالب کو از سر نو دیکھنا شروع کیا، چونکہ دیوان غالب کے اشعار اس قسم کے ہیں کہ ان پر جتنی مرتبہ غور کیا جائے تو نئی نئی باتوں اور تاویلوں کا انکشاف ہوتا ہے ۔ اس طرح بہت سے اشعار کے معانی کچھ اور بھی ذہن میں آئے مگر ان کے لکھنے کا موقع نہیں رہا“ ۵ ” میری شرح من جمیع الوجوہ کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتی ہے، مگر اس میں دو باتیں اور شروح سے زیادہ ہیں ۔ ایک تو تشریح الفاظ و محاورات بہت زیادہ ہے (اگر صحیح بھی ہو) دوسرے اشعار مشکلہ کے تحت میں جناب حسرت و نظم اور کہیں کہیں معانی جناب حالی اور ردیف واو سے معانی جناب آسی بھی نقل کرتا گیا ہوں ۔ لہٰذا میری شرح چار بزرگ ہستیوں کی شرح کا مجموعہ ہے ۔ ناظرین ان سب کو دیکھ کر ضرور معانی حقیقی اشعار کو معلوم کرسکیں گے “

ان باتوں سے معلوم ہوا کہ :

۱۔ شاداں صاحب نے یہ کتاب ذاتی جذبے کے بجائے عنایت حسین صاحب کی فرمائش سے متاثر ہوکر لکھی ہے ۔

۲۔ موصوف نے حسرت ، نظم اور آسی کو خضر راہ بنایا اور انہی کے بیانات کی روشنی میں اشعار حل کئے گئے ۔

۳۔ پورے دیوان کی شرح لکھنے کے بعد مولانا کو غالب کے اشعار میں کچھ نئے پہلو ملے ۔ درحقیقت شرح لکھنے کا یہی وقت تھا ۔ اصولاً انھیں پہلے دیوان کا مطالعہ کرنا چاہیئے تھا ، پھر مختلف شارحین کے خیالات سمجھنے کے لئے اگر شرحیں بھی دیکھ لی جاتیں تو نامناسب نہ ہوتا ۔ اب صورت حال یہ ہے کہ مولانا کا کام تقریباً ثانوی حیثیت رکھتا ہے ۔ براہ راست فکر اور شاداں صاحب کی آزاد رائے تلاش کرنے کی سعی بیکار ہے ۔ یہ ضرور ہے کہ مولانا ، داد اور صلے کی تمنا نہیں رکھتے ۔ انکساری اور اعترافات بھی بہت زیادہ ہیں ۔ اس کے باوجود کتاب پر اس قسم کے اثرات یقیناً پائے جاتے ہیں ۔

پورے دیباچے میں جن مسائل سے بحث کی گئی ہے اس کا خلاصہ بھی دیکھتے چلیے ۔

(الف) تعریف شعر ۔ حسن یعنی خوبی تالیف — تاثیر یا تاثر حسن / جسے خیال کہتے ہیں — اردو کی بے مائگی — عشق — غزل — غزل کے مضامین — شروح دیوان اردوئے غالب — وثوق صراحت / شوکت میرٹھی کی شرح — یادگار غالب کے تذکرے — شرح جناب حسرت — کے بارے میں یہ رائے بھی موجود ہے ”مشکل اشعار کے معانی جو جناب نظم سے الگ کہتے ہیں وہ ڈھنگ کے ہوتے ہیں“ — شرح آسی — حیات غالب،

از نظامی بدایونی — شرح بیخود موہانی کے بارے میں سرسری خیال — رموز غالب یعنی جناب احسان دانش صاحب کی شرح - ارمغان غالب — علی گڑھ کے ایک پروفیسر کی شرح — رام پور انٹر کالج کی کتاب "چیستان غالب" تنقیدات عبدالحق سے آسی کی شرح کا احتساب۔

(ب) تسامحات و زلات غالب — کے عنوان سے کچھ ایسے شعر زیر بحث آئے ہیں جن میں — الفاظ غیر ضروری — ترجمۂ محاورۂ فارسی جو اردو میں نہیں بولتے — خلاف اردو، خلاف قاعدہ مسلمہ، سہو یا غلطی — وزن عروضی کی غلطی — غریب وغیر مانوس الفاظ — تکرار مضامین — تتابع اضافات۔ اعلان نون درحالت مضاف الیہ — شتر گربہ — بدمذاق — لغت کی غلطی — تذکیر و تانیث۔ تعقید — واو معروف ومجہول — ایطاء — غلط استعمال — دو اردو جملوں میں واو عطف فارسی۔

(ج) انتخاب اشعار پسندیدہ کے نام سے سو اتین سو شعروں کا انتخاب کیا ہے۔ (۵ رمئی ۴۶ء)

(د) یادگار غالب سے سوانح غالب کا خلاصہ — (۱۶ را پریل ۴۶ء)

(ہ) حالات زندگی شادان از قلم مصنف (۱۹ را پریل ۴۶ء)

ان مباحث کے بعد — شرح دیوان اردوئے غالب — ردیف الف، کا آغاز ہے:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

لغات: نقش، بمعنی تصویر۔ معنی دومی دو یا زیادہ رنگوں سے زینت دینا
شوخی - طراری - بےباکی، بےشرمی، چنچل پنا۔
کاغذی پیرہن - یا، پیرہن کاغذی - کاغذین جامہ وجامۂ کاغذیں، جامۂ کاغذکہ فریادیان پوشندے درقدیم رسم بودہ (بہار عجم)

نوشیرواں عادل نے اپنی خوابگاہ سے باہر تک ایک زنجیر باندھ رکھی تھی جو خوابگاہ والے سرے پر ایک گھنٹی بندھی تھی ہر دادخواہ اس زنجیر کو آکر ہلاتا تھا اور وہ کاغذ کے کپڑے پہنے ہوتا تھا۔ نوشیرواں اسے اپنے پاس بلالیتا اور دادرسی کرتا تھا۔ سلسلہ جنبانی محاورہ اسی عمل سے بنا ہے جہانگیر نے بھی اس زنجیر کی نقل اتاری تھی اسے زنجیر داد کہتے تھے۔ نوشیرواں اس کا موجد ہے۔

مرزا رضا قلی ہدایت شیرازی اپنی فرہنگ انجمن آرای ناصری میں تحریر فرماتے ہیں کہ "وقتی درشہری مقرر کردہ بودند کہ بہر ظلمی کہ از حکام برسد جامہ از کاغذ پوشیدہ بپای علمی کہ از جانب بادشاہ درمیدان خاصہ نصب کردہ بودند و آنرا علم دادی نامیدہ بودند رفتہ بعد تحقیق حال رفع ظلم بشود۔ حافظ گفتہ اند"

کاغذیں جامہ بخونابہ بشویم کہ فلک　　رہنمو ئیم بپای علم داد نکرد

بابا فغانی ؎

زخوباں دادِ خود خواہم فغانی مہربانی کو　　کہ سازد کاغذیں پیراہن از طومارِ افسوں ہم

کمال اسماعیل ؎

کاغذیں جامہ بپوشید و بدرگاہ آمد　　زادۂ خاطرِ من تا بدہی داد مرا

کاغذ مرکب از کاغ و دال نسبت، کاغ بمعنی آواز زاغ - ہندی میں کاگا کوے کو کہتے ہیں چونکہ کاغذ کے ہلانے سے اس میں آواز کوے کی بولی سے مشابہ نکلتی ہے اس لئے قرطاس کا نام کاغذ ہوا - اس کا معرب کاغذ آخر بذال معجمہ ہے، کواغذ اس کی جمع لاتے ہیں - لیکن صاحب منجد نے آخر میں دال مہملہ ہی لکھا ہے - عربی میں قرطاس وطرس بکسر اول کہتے ہیں -

سب سے پہلے چین میں روئی سے سفید رنگ کا بنایا گیا، تیسویں ہجری میں سمرقند میں رائج ہوا - علی بن محمد فارسی صاحب تاریخ عرب لکھتے ہیں کہ پچاسی ہجری میں جب سمرقند فتح ہوا تو یوسف بن عمرو نے کاغذ بنانا سیکھا اور مکے آکر لوگوں کو اس کا بنانا سکھایا، لیکن میکائیل کشیری نے ۳۰۰ھ میں اس وقت کے لحاظ سے عمدہ بنانے کی تعلیم دی - کاغذہائے بالیغ (چینی) سمرقندی، شامی، مشرقی میں مشہور تھے -

مسعود سعد کے شعر سے معلوم ہوتا ہے ؎

آں زاغ نگر کہ بر ہوائی کاغذ　　یک نیمہ از مداد و نیمی کاغذ

کہ کاغیدن مصدر بھی تھا بمعنی آواز کردن زاغ، کیونکہ ہی کاغد، حال کا صیغہ کاغیدن سے ہے اور یہ شعر ابلق کوے کی تشبیہ میں ہے - کاغد سے مراد سفید کاغذ ہے -

اس طرح مطلع حمدیہ کے معنی حضرت غالب علیہ الرحمہ نے عود ہندی کے ایک جملے میں لکھے ہیں،

ہستی دنیاوی چونکہ مبدء حقیقی سے دور ہوجانے کا باعث ہوئی ہے لہٰذا تصویر (انسان) باوجودیکہ اس کی ہستی محض اعتباری ہے مگر وہ بھی مبدء سے جدا ہوکر رنج و ملال میں گرفتار رہے اور کاغذ کا لباس پہن کر فریاد کرتی ہے اور دادخواہ ہوتی ہے جبھی تو "الست بربکم" کے جواب میں "بلیٰ" کہا، مگر جسم قبول کرکے دنیا میں آنے کے بعد مکروہات دنیوی اور ضروریات جسمانی میں پھنس کر وہ حالت وکیفیت سابقہ باقی نہ رہی لہٰذا دنیوی ہستی سے نفرت اور ملال ہے اور وہی عالم ارواح کا شوق وذوق ہے اس لئے فریادیوں کا ایسا لباس پہن کر اپنے اوپر ظلم وستم ہونے کا دادخواہ ہے -

اگرچہ نقش کے لحاظ لفظ تحریر اور معشوق ہونے کی وجہ سے لفظ شوخی متناسب الفاظ ہیں مگر معنویت

دور ہوتی جاتی ہے جب تک کہ اس شعر میں کوئی لفظ اظہار شوق اور تقرب الٰہی کے لئے اور نفرت دنیا کے لئے نہ ہو۔ لفظ تحریر جو قافیہ میں آپڑا ہے سب سے زیادہ مخل معنی ہے۔

میں اطلس میں ٹاٹ کا پیوند لگاتا ہوں ارباب کمال اگر پسند کریں تو خیر، ورنہ مردود تو ہے ہی، میرا مطلب یہ نہیں کہ انھیں میں سے کوئی مصرع ہو بلکہ اس مفہوم کو ادا کرتا ہوا کوئی چست مصرع ہو۔

نقش فریادی ہے کس ہستی غم تاثیر کا
نقش فریادی ہے کس کی دوری دلگیر کا
نقش فریادی ہے کس کے ہجر دامن گیر کا

جناب غالب، مولانا روم کی مثنوی کے پہلے شعر ۔۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند　　وز جدائیہا شکایت می کند

کے مفہوم کو کہنا چاہتے ہیں۔

از نیستاں تا مرا ببریدہ اند　　از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

جناب سید علی حیدر صاحب نظم طبا طبائی اعلی اللہ مقامہ جو سب سے پہلے شارح دیوان غالب ہیں وہ اپنی شرح میں تحریر فرماتے ہیں کہ پیرہن میر ممنون اور مومن خاں کے کلام میں بھی پایا جاتا ہے۔

ہر شارح نے اس شعر کی شرح میں تازہ ذہن ہو کر کچھ نہ کچھ لکھا ہے، شاداں صاحب کی شرح دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ انھوں نے سب سے زیادہ وضاحت اور زیادہ خوش بیانی سے کام لیا ہے۔ حل لغات میں تلمیحات کی تفصیل ور الفاظ کے معنی بہت اچھے پیرائے میں بیان کئے ہیں۔ اسناد دی ہیں۔ پھر مختلف پہلو سمجھا کر شعر کا پس منظر تیار کیا۔ ن کے بعد شعر کا مطلب بیان کیا اور دوسروں کے خیالات سے بحث کی۔ جس میں نظم طباطبائی اور آسی خاص طور پر سامنے آئے۔ یہ بحث بڑے شستہ انداز میں ہے۔ ان دونوں کی بات کا جواب بڑے عالمانہ طریقے پر دیا ہے۔

یہ ضرور ہے کہ نظم طباطبائی کی طرح غالب کے مصرعوں میں ترمیم کی مختلف صورتیں پیش کی ہیں۔ فنی اور روضی نکتہ آفرینیاں کی ہیں۔ لغت اور استعمالات پر مفصل گفتگو کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی طویل باتیں اختلاف باعث ہوا کرتی ہیں۔ اور جس طرح شاداں بلگرامی نے نظم طباطبائی سے اختلاف کیا ہے۔ اسی طرح بلگرامی صاحب سے بھی اختلاف خیال ممکن ہے۔ مثلاً

شب خمار شوق ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیط بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

خمار: ایک خاص قسم کی سستی جو شراب کا نشہ ٹوٹتے وقت طاری ہوتی ہے۔ سر میں درد اور جسم میں ضعف سا

محسوس ہوتا ہے جماہیاں اور انگڑائیاں آتی ہیں۔

شوقِ ساقی : انتظار ساقی

رستخیز اندازہ : باندازِ قیامت

محیط : سمندر ، دائرہ ، محیط بادہ ، شراب کا پیالہ

صورت خانہ : تصویر خانہ ، نگار خانہ

خمیازہ : انگڑائی

شب کو انتظار ساقی کے خمار نے قیامت کا نقشہ کھینچ دکھایا ، پیالے منہ کھولے اور صراحیاں بے کیف پڑی تھیں پورا میخانہ سراپا انگڑائی کی تصویر تھا ، بے کیف و بے لطف جیسے میخوار کا وقت خمار ۔ ساقی کے دم سے ہر طرف مستی اور سرور کا عالم رہتا ہے ، صراحیوں کی قلقل پیالوں کی گردش سے شرابیں ابلتی اور انڈلتی ہیں ۔ لیکن رات کو ساقی کے نہ آنے سے عجیب قیامت کا منظر تھا ۔ سب کے چہرے اداس ، ہر طرف وحشت و بے رونقی ، پیالے جمائیاں لے رہے تھے ، صراحیاں پڑی کروٹیں بدل رہی تھیں ، نہ کیف نہ سرور ایک بے لطفی کا عالم تھا جو پورے میکدے پر چھایا ہوا تھا ۔

جناب شاداں صاحب مرحوم نے نظم طباطبائی اور حسرت موہانی کی عبارتوں پر زیادہ غور کیا ، اور ” دونوں بزرگوں کی تشریح اور مفہوم کو لیتے ہوئے یہ معنی لکھے ہیں “ ۔ انتظار آمد ساقی میں میخواروں کا شوق قیامت خیز تھا اور خطوط جام نہ تھے بلکہ خمار کی وجہ سے انگڑائیاں لینے میں طلب مے کے لئے پھیلے ہوئے ہاتھ ہیں ، باوجودیکہ خود کسی قسم کا احساس نہیں رکھتے “۔

خمار شوق ساقی کا قیامت خیز ہونا تو مصرع کی صحیح نثر ہے ۔ صورت خانہ خمیازہ ، اور تا محیط بادہ میں بھی دونوں ٹکڑے صحیح ترتیب سے موجود ہیں ۔ پھر یہ کہنا کہ ” انتظار آمد ساقی میں میخواروں کا شوق قیامت خیز تھا “ کہاں سے نکلا ، غالب خمار کو قیامت خیز بتاتا ہے اور شرح میں ”میخواروں کا شوق قیامت خیز “ ہے ۔ ؟ پھر محیط بادہ ، کو خطوط جام کہنا اور انھیں انگڑائیوں کی صورت میں دیکھنا اس کے بعد خطوط جام کی انگڑائیوں کو طلب مے کے لئے پھیلے ہوئے ہاتھ فرض کرنا ۔ ترکیب و ہیئت شعر سے دور کی نہیں تو کیا ہے ؟ مگر مولانا طبا طبائی اور حسرت جیسے صاحبان ذوق کی بات ہے ، ہم بھی مانے لیتے ہیں ۔

اس شرح میں بھی دوسری شرحوں کی طرح بہت سے مقامات اختلاف کے قابل ہیں مگر حل لغات اور ابلاغ و تفہیم کے نقطۂ نظر سے اس کا درجہ تمام شرحوں سے بلند ہے چونکہ شاداں صاحب فارسی کی دقیق سے دقیق تر کتابوں کے شارح ہیں اس لئے نکتہ رسی اور گہرائی تک پہنچنے کی بھی کوشش ہے ۔ بلاشبہ یہ شرح ادبی تبرک ، اور علمی تحفہ کی حیثیت رکھتی ہے اور دیوان غالب کی شرحوں میں قابل قدر اضافہ کرتی ہے ۔

ڈاکٹر لطیف حسین ادیب

قصیدہ خزینۃ البرکات

مولوی اکبر حسین صولت ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کا وطن بدایوں تھا اور بریلی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ آپ
وم شرقیہ کے زبردست عالم تھے۔ آپ اوجین میں ججی کے عہدۂ جلیلہ پر بمشاہرہ ۶ صد روپیہ ماہانہ فائز تھے اور فرائض منصبی کی
ائیگی میں کافی مشہور۔ آپ سلسلہ قادریہ میں بریلی کے ایک صوفی اور نعت گو سید فضل غوث ساقیؒ کے مرید تھے۔ آپ کو فن شاعری
ں حضرت دلدار حسین مذاقؒ بدایونی سے تلمذ حاصل تھا۔ آپ کی زندگی اعلیٰ کردار کی نمونہ تھی۔ آپ نہایت منکسر المزاج متقی
رغربا پرور انسان تھے۔ آپ کا انتقال ۲۰ ربیع الآخر ۱۳۳۱ھ (۲۹ مارچ ۱۹۱۳ء) کو اوجین میں ہوا اور اندرون درگاہ
ضرت شاہ مولانا مغیث الدینؒ لب دریا سپرا مدفون ہوئے۔ (آئینہ دلدار از محمد ابرار علی صدیقی۔ ص ۱۳۲ - مطبوعہ اردو
یڈمی سندھ کراچی)

اکبر حسین صولت نے اردو فارسی شاعری پر مشتمل ایک ضخیم دیوان یادگار چھوڑا تھا جس کو ان کے صاحبزادوں نے
ائع کر دیا۔ مجھے ان کی چند مطبوعہ غزلیں فراہم ہوئیں جو گلدستہ نہال سخن بریلی (۱۹۱۱ء) میں طبع ہوئی تھیں۔ ان غزلیات سے
ن کی زبان دانی کا اندازہ ہوتا ہے ان کی تین غیر مطبوعہ نعتیہ غزلیں اور ایک نعتیہ قصیدہ مفتی صادق حسین صادق بیرۂ مفتی
سلطان حسن احسن تلمیذ غالب نے عطا کئے۔ مفتی صادق صاحب اکبر حسین صولت سے نسبت فرزندی رکھتے ہیں۔ صولت صاحب
ا نعتیہ قصیدہ اردو زبان کی نعتیہ شاعری میں ایک اضافہ ہے۔ میں نے نعتیہ قصیدہ (اسم تاریخی خزینۃ البرکات ۱۳۲۶ھ) کو اس
یال سے مرتب کر دیا کہ وہ ضائع ہونے سے بچ جائے۔

قصیدے میں اشعار کی مجموعی تعداد ۱۰۵ تھی۔ صولت نے تین اشعار قلمزد کر دیئے اور ایک شعر "زیر غور" لکھا جسے
ہم نے شامل نہیں کیا۔ اس طرح ۱۰۱ اشعار باقی رہے جو ہدیۂ ناظرین ہیں۔ مخطوطہ کرم خوردہ تھا۔ دو مصرعے پڑھنے میں
ہیں آئے جن کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔

قصیدے میں تشبیب، گریز، مدح اور دعا واضح اور مربوط ہیں۔ تشبیب قصیدے کے حسب حال ہے۔ تین مطلع ہیں۔

صولت نے پہلے مطلع کو واضح کیا ہے حالانکہ دو مطلع گریز میں ہیں - مدح میں قرآن حکیم اور حدیث قدسی کے حوالجات ہیں جن سے اشعار میں وزن پیدا ہو گیا ہے - قصیدہ کی زمین نامانوس نہیں ہے - صولت نے اظہار علمیت کی خاطر کرخت و ناہموار زمین کا انتخاب نہیں کیا ہے - اس زمین میں محسن کاکوروی نے قصیدہ نظم دل افروز (۱۳۱۸ھ) لکھا تھا اور ممکن ہے کہ صولت نے اس سے متاثر ہو کر خزینۃ البرکات (۱۳۲۶ھ) تحریر کیا ہو -

قصیدے میں سب سے زیادہ زوردار اشعار مدح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہیں - یہ اصول قصیدہ نگاری کے عین مطابق ہے جن شعرا نے تشبیب وگریز میں زیادہ زور قلم صرف کیا اور مدح اس کے مقابلہ میں ماند ہو گئی وہ غلطی پر تھے - مدحیہ قصیدہ میں قصیدہ کے جملہ لوازمات صرف مدح کو چمکانے کے لئے ہوتے ہیں کیونکہ مدحیہ قصیدہ کی تخلیق کا سبب ممدوح کی توصیف بھی ہوتی ہے -

ہمارے قدما نے ان تمام شعرا کو مکمل شاعر مانا تھا جو قصیدہ نگار بھی تھے کیونکہ قصیدہ نگاری اظہار کمال کا بہترین نمونہ ہے - ہمارے خیال میں صولت کا قصیدہ ان کے مکمل شاعر ہونے کا ثبوت ہے - اس میں سے ان کے کمال کا اظہار ہے -

صولت بریلی میں قصیدہ نگار شعرا کی فہرست میں آخری شاعر تھے - خزینۃ البرکات کے بعد کوئی قصیدہ ضبط تحریر میں نہیں آیا -

دل الجھا کیوں کسی کے تار گیسوئے معنبر میں	اٹھا بیٹھے بٹھائے کس لئے سودا مرے سر میں
فلک گردش میں ہے گردش ہے یا میرے مقدر میں	ہے میرے پاؤں میں چکر کہ میرا سر ہے چکر میں
جو پونچھے میرے آنسو گل ہوئے دامانِ دلبر میں	کہ خون دل بھی شامل تھا سرشکِ دیدۂ تر میں
رواں ہے آبِ گوہر قلزمِ طبعِ سخنور میں	کہ لہریں لے رہے ہیں ہفت قلزم آب گوہر میں
دکھاتی ہیں تماشا انقلابِ دہر کا آنکھیں	ابھی کچھ تھیں ابھی کچھ ہیں پلٹ جاتی ہیں دم بھر میں
ہے کون اب ڈھونڈنے والا کسے ڈھونڈے کہاں ڈھونڈے	ہوئی آغوش خالی اب نہ دلبر ہے نہ دل بر میں
تصور نے کسی نوکِ مژہ کے بوئے ہیں کانٹے	خلش پاتا ہوں نوکِ خار کی ہر تار بستر میں
سرورِ وصل کا ارمان تک دل میں نہیں آتا	غم فرقت نے کیسا کر لیا ہے دخل اس گھر میں
جو دیکھا شمع کو کس ناز سے بولے کہ کیا ہوتا	جو ہوتی باز پرسِ سوزشِ پروانہ محشر میں
تقاضا شوق کا ہے اڑ کے چلئے یار کے در پر	کہاں ہے طاقتِ پرواز اس بے بال و بے پر میں
عبث ہے جستجو مجھ سے غریق لجۂ غم کی	لے گیا تہ میں لاشہ کہ ڈوبا ہوں سمندر میں
ستم ہے چینِ ابرو پر عرق آلودہ پیشانی	دیا ہے آج قاتل نے غضب زہر آب خنجر میں

میں خود ہی ڈوب مرتا سخت جانی سے جو شرماتا
نہ پایا چلو بھر پانی بھی قاتل تیرے خنجر میں

تمہارا رشتۂ الفت بنا تارِ نفس اپنا
یہی اِک دم کا دھاگہ رہ گیا ہے جسم لاغر میں

تب و تاب دلِ پرسوز کا احوال کیا لکھا
کہ تاب کرمکِ شب تاب ہے بال کبوتر میں

بتائے کوئی کیف بیخودی کس میں زیادہ ہے
مۓ گلگوں کے ساغر میں کہ چشم مست کافر میں

بنایا آئینہ دیوار و در کو اون کے جلوہ نے
کہ باہر سے نظر آتے ہیں وہ بیٹھے ہوئے گھر میں

جمالِ غیرتِ خورشید روشن اوسکو کہتے ہیں
کہ باہر سے نظر آتے ہیں وہ بیٹھے ہوئے گھر میں

ترا ایما تھا ورنہ کون مجھکو ذبح کرلیتا
نہ دم تلوار میں اتنا نہ اتنی جان خنجر میں

خدا کے سامنے غیروں کا میرا فیصلہ ہوگا
خدا جانے وہ بت دیگا گواہی کس کی محشر میں

لگائیں کس جبیں پر خاک کوئے یار کا صندل
وہ اب سر ہی نہیں رہتا تھا پہلے درد جس سر میں

شکایت کیا کروں غیروں کی ان کا پیٹھ پیچھا ہے
ترے منہ پر نہ کہدوں جو جگہ ہے قلب مضطر میں

ذرا آہستہ اے مشاطہ اون کے بال سلجھانا
کہیں اولجھے ہوئے کتنے دل بیتاب گھونگر میں

سمجھ لیں بوالہوس آغاز و انجام محبت کو
لگی ہے اس لئے تصویر مجنوں یار کے در میں

جوانانِ چمن کو قامت رعنا سے کیا مطلب
برنگ سبزہ ہے بیگانگی سرو و صنوبر میں

کلام نغز سے موتی ترے تشبیہ دوں کیونکر
نہ ایسی آب کوثر میں نہ رعنائی گل تر میں

مطلع

نہیں ہے کوئی ذرہ کوئی قطرہ خشک میں تر میں
مگر لکھا ہوا ہے سب خداوندی کے دفتر میں

خدا کو سونپ سارے کام چپکا بیٹھ رہ گھر میں
کدھر جاتا ہے او ناداں تلاش یار و یاور میں

وہ ہی ہے قلب اہل دل اوسی کو قلب کہتے ہیں
جو ہر دم منقلب ہوتا رہے پہلوئے مضطر میں

تعجب کی جگہ ہے خواب غفلت عمر کوتہ میں
کہ گنجائش نہیں ہے پاؤں پھیلانے کی چادر میں

درِ منعم سے اوٹھے کس طرح پروردۂ نعمت
کہ ہے الفت کا پھندا پائے مرغ دست پرور میں

ندامت کا ابھی آنکھوں سے قطرہ تک نہیں ٹپکا
عبث ڈوبا ہوں سرتاپا سرشک دیدۂ تر میں

اگر اخلاص دل پگھلا کے ٹپکائے کوئی آنسو
تفاوت ہو نمایاں آب چشم و آب گوہر میں

یہ پروازِ طبیعت نشۂ خونِ جگر کی ہے
کہاں یہ بال و پر ہیں مستئ خون کبوتر میں

مرے مینائے دل میں ہے جو مے فیضان ساقی سے
سبو میں ہے نہ خم میں ہے نہ شیشہ میں نہ ساغر میں

اسی سوز محبت سے مرے دل میں پڑی ٹھنڈک
کہ ہے معجز نما کیفیت کافور اخگر میں

ہوئے ایک حکم کی تعمیل میں بَردًا سَلٰامًا آتش ... کرشمہ دیکھئے گلزارِ ابراہیم آذر میں

پسند خاطر موزوں ہوا نیرنگ بیرنگی ... کہ اب ڈوبی ہوئی ہے طبع رنگیں رنگِ دیگر میں

وہی رنگ خدا محبوب کی مدحت سرائی کا ... مرادِ صبغۃ اللّٰہی کلام پاک داور میں

قدیم آیاتِ رحمانی کلام پاک سبحانی ... عجب متن متیں ہے شرح اخلاق پیمبر میں

مرے ہاتھ آئی دستاویز بخشائش کی وہ مطلع ... پڑھوں نعت شفیع المذنبیں محبوب داور میں

تعالی اللہ محبوب خدا کی شان محشر میں ... شفاعت تاج سر ہے خلعت لولاک ہے بر میں

ملی خیر کثیر اتنی مجھے نعت پیمبر میں ... دہن میں آب کوثر ہے زباں ہے حوض کوثر میں

بیاضِ صبح پر وصف رخ پرنور لکھنا ہے ... لگاتا ہے مجھے تار شعاع مہر مسطر میں

ملے ہے نقد و جان و گوہر دل سارے عالم کو ... ازل کے دن تری مسند نشینی کی نچھاور میں

کہیں کیونکر نہ لَا اُحصِی ثناءً عرشی و فرشی ... کہ قاصر ہے زبان جملہ عالم مدح سرور میں

ہزاروں گوہر مقصد بکف ایک ایک قطرہ ہے ... سحاب بخشش و بحر عطائے بندہ پرور میں

کیا رد التماس کوہ زر کو سرور دیں نے ... ابھی تک زردی خجلت ہے رنگ چہرۂ زر میں

شب معراج انہیں آنکھوں سے دیکھا آپ نے حق کو ... یہی آنکھیں جو ہوتی ہیں بشر کے کاسۂ سر میں

اوڑی خوشبو ہوا پر کس کے جعد سنبل تر کی ... کہ سارا × × × × × × مشک و عنبر میں

بنایا حضرت آدم کو حق نے کس کی صورت پر ... نبوت کا معاحل ہوا آخر موخر میں

نہ پایا قول شارح اوس کی حد تام و ناقص کا ... معرفت عاجز الادراک فہم عرض و جوہر میں

اوسی سے نامور دنیا اوسی سے مفتخر عقبیٰ ... وہ ہی ایک نور حق ہے رونق کاشانہ دوگھر میں

خدائے پاک نے مشکوٰۃ میں مصباح فرمایا ... چمک ہے یہ اوسی جلوہ کی جو ہے ذات اطہر میں

وہی ہے عالم انوار کا وہ کوکب دری ... ہے جس کا نور ہر اک صورت و معنی کے اختر میں

نہ وہ جزو ہے کسی کا اور نہ اوس کا جزو ہے کوئی ... بجز اس کے نہ کچھ جزوِ اقل میں ہے نہ اکثر میں

نکلکر کنت کنزاً سے جو آیا کن فیکان تک ... ہوا وہ جلوہ گر اوس پیکر پاکیزہ منظر میں

ہو الاول ہو الآخر ہو الباطن ہو الظاہر ... نہاں اضمارِ مضمر میں عیاں اظہار مظہر میں

اوسی سے سب ہیں سب میں وہ ہے اور سب سے جدا ہے وہ ... نہ اوس کا اسم جامد میں نہ مشتق میں نہ مصدر میں

دوبالا پایا ہوتا عالم بالا کا گر حضرت ... لگاتے چوب شاخ سدرہ و طوبیٰ کو منبر میں

سمجھتا کون اگر خیر البشر آکر نہ سمجھائے ... بھلائی خیر میں کیا ہے بری کیا بات ہے شر میں

ہے اونکی پادشاہی آسمانوں میں زمینوں میں — اونہیں کا نام ہے چودہ طبق میں ہفت کشور میں
چراغ گور کی حاجت نہو مجکو پس مردن — پڑھوں وہ مطلع پر نور صولت نعت سرور میں
خدا کے نور کا جلوہ ہے ہر روئے انور میں — اوسی کا پر تو ہے چہرہ خورشید خاور میں
شفاعت ہوتی ہے طالب گنہگاروں کی محشر میں — چھپا لیں اپنا نُبد خشک زاہد دامن تر میں
جو ڈھونڈا میں نے اپنا نام روز حشر دفتر میں — بحمد اللہ کہا رضواں نے ہے میرے رجسٹر میں
جو دولت ہے ترے ادنیٰ غلاموں کے مقدر میں — نہ تھی وہ بخت دارا میں نہ اقبال سکندر میں
مگر آیا کوئی فریاد رس روز مصیبت کا — جھکے جاتے ہیں سرکس نے قدم رکھا ہے محشر میں
نسیم صبح لائی ہے شمیم جانفزا کس کی — کہ نکہت ہوگئی غرق عرق برگ گل تر میں
لب لعل و دہان تنگ میں ہیں گوہر مکنوں — مگر ہیں دُرّ بیضا معدن یاقوت احمر میں
عجب کیا ہے ترے لب ہلتے ہی گر جی اوٹھیں مردے — کہ آب زندگی ہے تیرے لعل و روح پرور میں
تو وہ بندہ ہے کرتی ہے خدائی بندگی جس کی — خدا کے امر بالمعروف میں اور نہی منکر میں
بتائے لی مع اللہ نے × × × × سرور عالم — جو عالی منزلت ہے حضرت خلاق اکبر میں
بہت زائد ہے اوس کے آپ کی چشم عنایت میں — ودیعت ہے جو کچھ شیر کرم پستان مادر میں
سخن میں حشو کی صورت برائے بیت کوئی ہو — مگر واقع میں تو ہی تو ہے صاحب خانہ ہر گھر میں
مجھے یاد آگئی ہے ثم وجہ اللہ کی آیت — نظر آتا ہے تو ہی تو ہر ایک دیوار ہر در میں
جمال ظاہر و باطن جو سب پیغمبروں میں تھے — وہ سب اور سب سے زائد جمع تیری ذات اطہر میں
ہوئے مرفوع و منصوب آپکے اعلام فیروزی — ہے شور کسر و جر ایوان کسریٰ ملک قیصر میں
لوائے نصر پر انا فتحنا کا لگا پرچم — ہے فیروزی علم بردار بیٹھا پیش لشکر میں
مقابل ہیبت حق کے کوئی میداں میں کیا آئے — ظفر زور آزما ہے نعرۂ اللہ اکبر میں
توئی ہے مرتضیٰ و فاطمہ حسنین میں شامل — تو ہی . تو ہے ابوبکر و عمر عثمان و حیدر میں
ثنائے ثانی اثنین بس ہے ثانی اثنین — دوئی بھی عین یکتائی ہوئی صدیق اکبر میں
دہل بیٹھی ہوئی ہے عدل فاروقی کی عالم میں — قیامت تک رہیگا لرزہ ہر گور ستمگر میں
ہے وہ مجموع عثمانی کلام پاک سبحانی — جو لکھا تھا قلم نے لوح کے محفوظ دفتر میں
توان بازوئے پیغمبری شان ید اللہی — دکھائی دست و بازوئے علی نے فتح خیبر میں
منزہ ہوگئے تنزیہہ تشبیہ مشبہ سے — جگہ پاکر بتول پاک کے دامان اطہر میں

جمالِ صورت و معنی کمال ظاہر و باطن — وہ ہی ہے سبط اکبر میں وہ ہی ہے سبط اصغر میں
رکھا خُلقِ حسن نے مختفی سِرِّ شہادت کو — شہید خنجر الماس کے پاکیزہ جوہر میں
شہادت سرخ رو دم سے حسین ابن علی کے ہے — لگی ہے چشم قربانی بجائے مُہر محضر میں
خطابِ مستطابِ طیّبات اللہ نے بخشا — ہوئی تطہیر وارد شان ازواج مطہر میں
کمال صدق و اخلاص و یقیں تھا سب صحابہ میں — بلال و سعد میں طلحہ میں سلمان و ابوذر میں
الٰہی ذکر لب پر یاد تیری دل میں ہو ہر دم — ہمیشہ گیسوئے محبوب کا سودا رہے سر میں
عظیم القدر عبد القادرِ محبوب سبحانی — دیا ہے دست قدرت جس کو قدرت نے مقدر میں
بھلائی اور برائی سے نہوں خوش اور نہوں غمگیں — کہ شر ہے خیر میں پوشیدہ مخفی خیر ہے شر میں
ہمیشہ قبر پر کرتا رہے رضوان گل افشانی — میں روز حشر تک سوتا رہوں پھولوں کی چادر میں
نہ مجھ سا کوئی عاصی اور نہ تجھ سا بخشنے والا — گناہ و مغفرت کا سامنا ہونا ہے محشر میں
ہو ایسی خواب ناز آغوش مرقد میں مری جیسے — کرے آرام طفل ناز میں آغوش مادر میں
دہن شیریں زباں شیریں ہے لب شیریں سخن شیریں — رہے شیریں بیاں صولتؔ ترے ذکر مکرر میں
ہوے مداح مولٰنا مذاقؔ و حضرت محسنؔ — سوم مفتی امیرؔ اور میں ہوں صولتؔ چوتھے نمبر میں
نثار روضہ انور ہوں اتنے گوہر تسلیم — ہیں جتنے ثابت و سیارہ و انجم چرخ اخضر میں
فصلے اللہ صلوٰۃً ستمراً دائماً ابداً — کہ ناممکن ہو احصا اوس کا اعداد مقرر میں

○

من کہ در فکر من چہ چیز بود — کہ کنم نازِ شے بریں ابیات
ہاں مگر نعت حضرتِ نبویؐ است — اشرف الخلق فخر موجودات
ذکر او ہمچو ذکر رب جلیل — کامل الخیر جامع الحسنات
بو کہ بخشائے فرود آید — بر گروہِ عصاۃ درعرصات
برکت ہا چو یافتم زیں فکر — نام کردم خزینۃ البرکات
۱۳۲۶ھ

○

محمد اکبرالدین صدیقی

علم سلوک

(ایک قدیم مثنوی)

بہمنی دور میں بیدر کے علمائے کرام میں سید بدرالدین بدر عالم حبیب اللہ بہت بلند مقام کے حامل تھے۔ آپ کے تین لڑکے تھے۔ سید شاہ ابوالحسن قادری۔ سید شاہ مصطفیٰ قادری اور سید شاہ قاسم قادری۔ حضرت بدرعالم حبیب اللہ کے انتقال کے بعد اول الذکر دونوں بھائیوں نے بیدر سے بیجاپور پہنچ کر قیام کیا اور چھوٹے بھائی سید شاہ قاسم حرمین شریفین کی زیارت کے لئے گئے اور شمالی ہند سے ہوتے ہوئے بیدر واپس ہوئے۔ یہاں پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ بھائیوں نے بیجاپور ہی میں مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی ہے تو آپ بھی ابراہیم عادل شاہ ثانی جگت گرو (۹۸۸ھ/۱۵۷۹ء تا ۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷ء) کے عہد میں بیجاپور آگئے۔[۱]

بادشاہ ان سب بھائیوں کا معتقد تھا۔ سید شاہ قاسم قادری نے ۱۰۳۲ھ میں انتقال کیا اور دونوں بڑے بھائیوں نے محمد عادل شاہ کے عہد (۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷ء تا ۱۰۶۷ھ/۱۶۵۶ء) میں ایسی زندگی گزاری کہ بادشاہ اور امیر امرا ہمیشہ معتقد رہے حضرت سید شاہ ابوالحسن قادری نے ۱۰۴۵ھ میں وصال فرمایا اور سید شاہ مصطفیٰ قادری نے ان سے کچھ پہلے انتقال کیا۔ ان بزرگوں کے حالات ان کے پوتے ابوالحسن ثانی نے اپنی کتاب صحیفۃ الہدیٰ میں تفصیل سے لکھے ہیں۔ اس کتاب کا تکملہ بعد کو صحیفہ اہل مدنی کے نام سے سید محی الدین ابن سید محمود نبیرہ حضرت سید شمس الدین قادری نے کیا ہے۔ جس کا اردو ترجمہ راقم الحروف نے شائع کر دیا ہے۔ صحیفۃ الہدیٰ بیجاپور سے متعلق اکثر کتابوں مثلاً روضۃ الاولیائے بیجاپور اور تذکرۂ اولیائے دکن کا ماخذ رہی ہے اور یہ دونوں کتابیں بشیرالدین احمد کی "واقعات مملکت بیجاپور" اور نجم الغنی خاں رامپوری کی تاریخ دکن کے ماخذ رہی ہیں اس سے صحیفۃ الہدیٰ کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے سید مصطفیٰ قادری کے ایک لڑکے سید عبدالقادر تھے جو علم و فضل اور زہد و ورع میں اپنے بزرگوں کے صحیح جانشین تھے۔ سید شمس الدین قادری انھیں کے لڑکے ہیں۔ سید عبدالقادر نے انتقال کے

---

[۱] صحیفہ اہل ہدیٰ میں ایک مقام پر علی عادل شاہ کے دور میں آنا بتایا گیا ہے جو قرین قیاس نہیں۔ ملاحظہ ہو ص ۱۱۲ (مطبوعہ ترجمہ)

وقت اپنے بیٹے سید شمس الدین کو اپنے پاس بلایا - ان پر توجہ کی اور کہا کہ مجھے جو کچھ دینا تھا تجھے دے دیا اور خدا کو سونپا۔ اس وقت آپ کی عمر صرف نو سال تھی - آپ حصول تعلیم کے لئے علامہ شیخ ابو تراب مدار العلوم کے سپرد کئے گئے - وہ بیجا پور کے علما اور مشائخین میں ممتاز درجہ رکھتے تھے ان کے والد کا نام شیخ ابو المعالی تھا جو حضرت شیخ علم اللہ محدث کے صاحبزادے تھے شیخ علم اللہ محدث کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ابن حجر عسقلانی ۔صاحب " صواعق محرقہ" کے شاگرد تھے ۔علم اللہ محدث نے ۱۱ رذالحجہ ۱۰۲۲ھ کو وفات پائی اور شیخ ابو تراب نے پنجشنبہ ۲۰ رصفر ۱۰۸۶ھ کو انتقال کیا - آپ کا مزار بیجا پور کے حصار کے باہر اعلیٰ پور دروازے کی طرف باغ مراری سے متصل اپنے دادا کے مزار سے شرق کی طرف ہے شہنشاہ اورنگ زیب کے استاد ملا نظام، شیخ ابو تراب ہی کی درس گاہ کے فیض یافتہ تھے ۔ شہنشاہ نے ملا نظام سے بارہا ان کے استاد کی تعریف سنی تھی ۔تسخیر بیجا پور کے بعد جب استاد سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا تو معلوم ہوا کہ آپ کا وصال ہو چکا ہے ۔ اس لئے اپنے سپہ سالار سیادت خاں کو حکم دیا کہ شیخ ابو تراب کے ورثا کو پیش کرے ۔شیخ ابو تراب کی لڑکی بی بی فاطمہ سید شمس الدین سے بیاہی گئی تھیں اور لڑکے محمد افضل تھے جن کا علم و فضل زیادہ نہ تھا لیکن سید شمس الدین عالم متبحر اور زہد و ورع میں مشہور زمانہ ہو چکے تھے ۔شاہی طلبی ہوئی تو محمد افضل نے اپنی والدہ امتہ الوکیل کو آمادہ کیا کہ وہ سید شمس الدین کو ساتھ جانے کے لئے آمادہ کریں کہ یہ خاندان کی توقیر کا معاملہ ہے ۔ان کی والدہ نے اپنے داماد کو محمد افضل کے ساتھ شہنشاہ کے پاس بھیجا ۔ شہنشاہ اس وقت شیخ ابو تراب کے مزار پر فاتحہ کے لئے آئے تھے ۔ سیادت خاں نے ان ہر دو کو وہیں متعارف کرایا اور علمی بحث و مباحثے کے بعد شہنشاہ سید شمس الدین قادری کے علم و فضل اور زہد و تقویٰ سے متاثر ہوئے ۔ جب ان کی کچھ خدمت کرنی چاہی تو آپ نے فقر و غنا کو اپنا مسلک بتایا لیکن شہنشاہ نے تین تین سو ہون کی دو تھیلیاں نذر کرنے کا حکم دیا ۔ حضرت سید شمس الدین قادری نے اپنی تھیلی اپنی خوش دامن کی خدمت میں بھیج دی اس کے بعد شہنشاہ نے دوبارہ آپ سے ملنے کی خواہش کی مگر آپ نے قبول نہ کیا ۔

صحیفہ اہل ہدیٰ میں آپ کے کئی [illegible]ق و عادات کی تفصیل دی گئی ہے لیکن علمی و ادبی کارناموں کا کہیں ذکر نہیں اسی خاندان کی ایک بیاض سے ہمیں یہ مثنوی دستیاب ہوئی ہے جس سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ حضرت موصوف نہ صرف رشد و ہدایت کی مسند سنبھالے ہوئے تھے بلکہ شعر بھی کہتے اور اس میں تصوف کے اسرار و رموز سمجھاتے تاکہ عوام اور معتقدین ذہن نشین کر سکیں ۔

آپ نے آخر زمانے میں گومرسی پرگنہ سند صور سرکار مدگل (حال ضلع رائچور) میں اقامت اختیار کی اور پنجشنبہ ۲ رجمادی الثانی ۱۱۲۸ھ کو انتقال کیا ۔ گومرسی میں مزار مرجع خلائق ہے ۔ آپ کی وفات کا ایک قطعہ تاریخ یہاں پیش ہے ۔

شاہ شمس الدین رئیس الاصفیا   عارف باللہ ندیم کبریا
معدن اسرار قادر ذات او   مظہر نور نبی الانبیا

چوں شراب امر حق را نوش کرد — زیں جہاں شد مست دیدار لقا
در غم آن آفتاب پُر ضیا — تاج از سرہا فگندند اتقیا
از سنین رحلتش در گوش دل — گفت ہاتف " رفت شمس اولیا "
۱۲۲۸ھ

یہاں ہم ان کی یہ مثنوی " علم سلوک " پیش کر رہے ہیں جس کے دوسرے نسخے کا اب تک کوئی پتہ نہ چل سکا۔ مثنوی کے علاوہ حضرت سید شمس الدین قادری کے کسی دوسرے کلام تک بھی رسائی نہیں ہو سکی۔

علم سلوک

ذرا سن تو علم سلوک اختصار — اگر ہے تو اہل طریقت کا یار
تو چل راہ اے سالک حق پرست — اگر تجکو توفیق کا ہووے دست
تو ثابت قدم ہو شریعت میں توں — بزاں[۱] کرو عمل آ، طریقت میں توں
شریعت کے عملاں بجا لیا تمام — طریقت کے یو دیکھنا توں مقام
شریعت میں کامل ہوا ے نیک رائے — طریقت کے عملاں میں یو دل جلائے
کہ بولے اہیں یو[۲] پرکھ[۳] اہل ہوا — شریعت طریقت بی نئیں ہے جدا
شریعت سے خارج جنے ہوئیگا — تو ادراج[۴] مارگ کے تئیں کھوئیگا
شریعت کو توں راج مارگ پچھان — کہ جس راج مارگ میں امن و امان
نہ اس راج مارگ میں ہیں رہزناں — نہ جنگل درندیاں کا نئیں دشمناں
جو بولے اہیں دیک راہ صفا — شریعت مبارک کے تئیں مصطفےٰ
جن اس راہ کو چھوڑ کر جائیگا — تو لئی پرکھ[۵] ہلا[illegible] اونے پائیگا
پڑے جا ہلائی[۶] کے بھونریاں[۷] منیں — بھی غول بیاباں کے ہوڑیاں[۸] منیں
کھڈے[۹] کھو درے ہور کانٹیاں کے جھوپ[۱۰] — لھوے بیر کے او بلایاں کے مونپ[۱۱]
نہ کچھ اس کوں منزل کے جلنے کی آس — لیوے بیر کر اس بلا آس پاس
شریعت کی مارگ کو چھوڑیا جنے — تو راہ ہلاکت کوں لوڑیا اونے
تو اس راج مارگ سوں ناموں پھرا — پھرا دسے تو تجکوں نہ کیں انترا[۱۲]

---

۱ اس کے بعد ۲ یونہی ۳ شاہراہ ۴ بہت کچھ ۵ جہالت ۶ بھنور ۷ واڈیچ ۸ مکر و فریب ۹ گڑھے ۱۰ جھاڑی ۱۱ بکثرت ۱۲ مرکزی۔

اسی راج مارگ پو یک نیت[1] رک	انگے بڈ[2] کر چل جائے تو ں پچ کچ نہ شک
اگر سچ کوں اس کے مثالاں کہوں	اچھے راست کر سچ کوں فالاں کہوں
شریعت، طریقت، حقیقت کی بات	تجے کھول کوں[3] معرفت کے نکات
او کہنا نبی کا شریعت وہی	بھی کرنا نبی کا طریقت وہی
حقیقت وا احمد نبی کا ہے حال	جو اس حال کا کوئی نہ دیوے مثال
نبی کا سو اسرار ہے معرفت	سمج یو تو چاروں محل کے صفت
مثال اس کے محلاں کا بھی خوب سن	سمج اہل عرفان کا یو سخن
شریعت مثال ایک کشتی دِسے[4]	نبی کی پنہ کی ہے کشتی جسے
طریقت سو دریا ہے جیوں پا شرف	کہ جس پر سو جانا خدا کی طرف
حقیقت سو سیپی سرا پردہ راک	اسی بیچ ہے معرفت در پاک
مثال ایک دو سرا دکھاؤں تجے	سخن سالکاں کا سناؤں تجے
شریعت سو سننا صفت پاک کا	کہ جس لگ نہیں دوڑ ادراک کا
شریعت صفت اس طلب کر چلیا	چلیا سو طریقت میں جا کر ملیا
کہیں ہیں کہ سننا شریعت اچھے	بھی سن کر سو چلنا طریقت کہے
چلیا، طے کیا راہ، اس راہ کوں	سو دیکھیا او جا پاک درگاہ کوں
جو دیکھیاچ[6] سو او حقیقت ہے جان	دلے دیکھنا او جو ہوے بے گمان
بھی دیکھے پو ہووے پچھانت جسے	تو کہیں معرفت کا محل ہے اوسے
پچھانت سو ہے معرفت بے بدل	پچھانیا پچھے[7] ہووے وحدت میں چل
یو وحدت اچھے "یک پنا" بے خلاف	نکلتا وہاں سب دوئی کا غلاف
کہ جیوں ایک قطرہ دریا سوں نکل	جدا ہو کے پھر اس میں آ ملے چل
جب آ کر او دریا میں مل جائے گا	تو پھر ناؤں قطرہ کا کاں[8] پائے گا
دریا بیچ مل جل کے ہوتا ہے وحیت[9]	تو کرنا ہے دعویٰ وہ دریا کا نیت[10]
سو منصور حلاج کا حال تھا	دیک ان بیچ وحدت کا کیا قال تھا

---

۱ مسلک۔ ۲ تار۔
۳ آگے بڑھ کر ۴ کیوں ۵ نظر آئے ۶ جو کچھ بھی دیکھا ۷ جان لینے کے بعد ۸ کہاں ۹ مراد متحد ۱۰ صحیح درست

کرمل کرا دوحدت کی مجلس میں جم — بغیر از انا الحق اٹھائے نہ دم
جو یوں تخم اصلی کوں اکت یاد توں — کرے برگ فرعی کوں برباد توں
سو یو کچھ پچھانت کا ہے داد دیک — کہ وحدت میں کیوں اس کا اُس کا اودیک
مثالاں یو چارو محل کی شکل — سنیا سو کہا کھول تیرے اگل[1]
شریعت حقیقت طریقت کا بھید — کہوں معرفت ہور وحدت سمید[2]
کہ فرمائے ہیں یو پرکھ بندہ نواز — محمد حسینی او گیسو دراز
یو چارو محل کا مثال اس رویش — کہے میں سو کہتا ہوں میں تیرے پیش
شریعت سو یک جھاڑ کا پھول دیک — ثمر معرفت اس کا مقبول دیک
ثمر بیج کا ج وحدت پچھان — جو لیتے رہیں بیج تے چھاں چھان
یو وحدت سو ہے تخم اصلی ایکبیچ[3] — کہ کئی پھول پھل ہوپ دیک اس کے بیچ
شریعت کہیں جھاڑ سو اس بدل — اول جھاڑ لاکر لیویں پھول پھل
درخت شریعت لگا توں اول — ہزاں[4] جھاڑ پر چڑکے لے پھول پھل
یہی جھاڑنا[5] لائے کر گرہاں — دھنڈے شاخ ہور پھول ہور پھل کہاں
سند بسا لکاں کا تو اس[6] دھات ہے — بھی سن منزلاں کیا مقامات ہے
اول دیک منزل ہے ناسوت کا — بھی دسرا سو منزل ہے ملکوت کا
بھی جبروت اہے ایک تیسرا مقام — مقام چہارم سو لاہوت نام

دربیان مقام ناسوت وذکر آں

اتا سن توں اس منزلاں کا بچار — تجے کھول کوں[7] یو مقامات چار
مقام یو جو ناسوت کا ہے اول — ہے اس پچھ حیواں صفت ہے سکل[8]
یو حیواں صفت سو اہے بھوک پیاس — اچھے خواب شہوت سو اُس آس پاس
کہ حیواں بی کھا[9] پیک سوتا اہے — طلب اس بی شہوت کا ہوتا اہے

---

[1] سامنے [2] سمیت (ایک ساتھ) [3] ایک ہی [4] پھر۔ اس کے بعد [5] نہ لگاکر [6] اس طرح [7] کھول [8] تمام [9] کھاپی کر۔

جبنگ آدمی اس صفت پر اچھے / تلک اس کوں ناسوت کا گھر اچھے
اگر جس کوں ناسوت کا ہے مقام / تو ہے اس کوں ذکر جلی سوچ کام
جلی ذکر ظاہر کا اقرار ہے / زباں ہور بیاں کا پچ تکرار ہے
یو ذکر جلی حبیب کا بولنا / زباں نفی اثبات سوں کھولنا
جلی ذکر سو یو زباں کا پچ ہے / تعلق زباں ہور لباں کا پچ ہے
جلی ذکر اول ہے اے مرد نیک / محل جو شریعت اسی کو پچ دیک
تو ذکر جلی کر کر ناسوت سوں / نکل کر انگے چل توں ملکوت کوں

در بیان مقام ملکوت و ذکر آں

یو ملکوت سو ہے ملک کا مقام / ملایک صفاتاں ہے اس میں تمام
ملک کی صفت طاعت و بندگی / جو حق یاد میں ان کی ہے زندگی
مقام ملک بھوت پاکی کی ٹھار / کہ جس ٹھار حرص و ہوا نیں قرار
ہوا، حرص، کھانا و پینا سکل / جکچ نیند، شہوت ہے اس پر کبل
تب آسان ہوتی ہیں اس حال میں / جو مل کر ملے یک کیرتے حال میں
کہے کم طلب کھان پانی کا پھیر / نکج اس کوں شہوت کرے اس کوں زیر
تپ اس کی نظر کوں اچھے آب و تاب / فرشتیاں کو دیکھے اسنے بے حجاب
فلک کے ملک کشف ہوتے اگل / مقام ملک اس جدا دیک چل
یہاں بی تو کشف و کرامات ہے / دلے وصل نیں سو ندامت ہے
توں منزل میں ملکوت کے نا اٹک / طلب کر وہاں سوں بی چلنا جھٹک
یو امرا پنا سبحان پر سونپ توں / پکڑ دل میں پچنچ کا چونپ توں
توں چلنا کگر چونپ دل میں دھرے / بدل اس کے توں ذکر قلبی کرے
سچ ذکر قلبی سو دل کا پچ کام / نظر آے واں رخ کوں دل کا مقام

لہ جب تک ۲ہ اس وقت تک ۳ہ زبان ۴ہ بولنا ۵ہ کھولنا ۶ہ اسی کو ہی ۷ہ آگے ۸ہ مقام ۹ہ تمام ۱۰ہ سخت
۱۱ہ کے ۱۲ہ نہ ٹھہر، رک ۱۳ہ چلنے کا ہی ۱۴ہ خواہش ۱۵ہ کہہ کر

اگر ذکر قلبی سوں ثابت رہیں تو اس کوں محل طریقت کہیں
ٹھگاں یوں توں قلبیچ سوں طے کرے مشقت جو اس ٹھار اپڑے کرے

در بیاں منزل جبروت و ذکر آں

یو جبروت ہے دیک تیسرا مقام ملاقات ہے یو سو منزل تمام
ملاقات ہور وصل کا یو ٹھکان محل حقیقت اسی کا پرکھ جان
دہاں غیر کے سات گفتار نیں بجز یار واں کوئی اغیار نیں
دلے والی بی ہیں کچ بری سیرتاں پچھلنے تلک آئے واں غیرتاں
سبھی غیرتاں سوں باں پہ آئے وصل ہور فراقی کے ...... آئے
وصل ہووے پروا بڑا ہے فراق کہ جاں واصلا کین لنا لا یطاق
یو منزل ہے جبروت کی جان توں یہاں ذکر روحی سوں لا دھیان توں
مقام یو ہے جبروت کا خوب دیک محل حقیقت میں محبوب دیک
کہ حق کیاں تجلیاں نظر آئیں یاں نظر آ کے پردے میں چھپ جائیں یاں
یہاں عاشقاں بہوت حیراں ہوئیں بسیں ہور کبھی پھر کہ ویراں ہوئیں
خراباد بستی کے میانِ ہلک رہے ای واں پرکھ پچھانت جھلک
پچھانت وہاں آئے پر عیش ہوئے او بیگانہ تب آپنا خویش ہوئے

در بیاں مقامات لاہوت و ذکر آں

پچھانت ہے یو معرفت کا ٹھکان انند و خوشی، عیش کا ہے مکان
سبھی لامکاں معرفت کا محل نہ اس ٹھار ہے [illegible] چرا کوں دخل
یو منزل کبل معرفت کیچ ہے کہ وحدت کی منزل اسی بیچ ہے
سو اس ٹھار تو ذکر سری خفی وجود فنا اس کا ہووے نفی
بقا بیچ مل کر بقا ہوئے واں یو فانی وجود آپنا کھوئے واں
یو مارگ ہنا پیر کے چل بکو بنا راہبر فکر سوں گل نکو
اتا شمس الدیں جیب کو موندلے یو چار و محل دیک کوں سونار لے

یو فانی ہے جگ سیر محلاں کی کر
سبھی ذکراں ستی رکھ توں اس کی خبر

احمد رفاعی

ذوق کی قصیدہ نگاری

(۲)

جیسا کہ اس مضمون کے شروع میں صراحت کی جا چکی ہے، ذوق کی قصیدہ گوئی کے بارے میں صاحبانِ نقد و نظر کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ اردو میں سودا کے بعد اس مخصوص صنفِ سخن میں کوئی دوسرا شاعر ان کا مدِ مقابل نہیں ہے، یہی نہیں بلکہ بعض خصوصیات کے اعتبار سے وہ سودا سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ ذوق کے قصائد کا مطالعہ کرنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں قصیدے کی بنیادی اقدار کا بھرپور احساس موجود ہے ان کے قصائد میں تشبیب، تمہید، مدح، گریز اور خاتمہ دعا کے ضمن میں بعض نادر شہ پارے نظر سے گزرتے ہیں، ان کے ممدوحین باوجودیکہ اس سطوت و شان کے مالک نہ رہے تھے جو صدیوں تک خانوادۂ تیموری کی خانہ زاد رہی ہے تاہم وہ ان روایات کے امین ضرور تھے جنھیں اپنے دورِ جہاں بانی کے شباب میں اس خانوادے نے ہند و بیرونِ ہند کی مختلف قوموں کے لٹریری، سماجی اور ثقافتی سرچشموں کا آبِ حیات پلا کر پروان چڑھایا تھا اور یہ واقعہ ہے کہ یہ خانوادہ اپنی اس گئی گزری حالت میں بھی ان حلا کار روایات کو سینے سے لگائے ہوئے لوگوں کی امنگوں اور آرزوؤں کا محور و مرکز بنا ہوا تھا، ذوق لوگوں کی اس جذباتی تحریک میں دل و جان سے شریک تھے جس نے لال قلعے کے در و دیوار کے گرد عقیدت و احترام کا ایک نورانی ہالہ قائم کر رکھا تھا، اس عقیدت و احترام نے صحیح معنوں میں ذوق کی قصیدہ گوئی کی لاج رکھ لی، ان کے قصائد کا مطالعہ کرتے وقت کسی وقت بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ ان حکمرانوں کی مدح میں ہیں جن کی حکومت قلعۂ معلّٰی کی چہار دیواری تک ہی محدود تھی یا غالباً اس سے بھی کم۔

قصیدہ ہماری کلاسیکی شاعری کی ایک اہم اور منفرد صنفِ سخن ہے، اس کی کچھ فنی قیود ہیں جن کا احترام بہر طور لازمی ہے، اس کے ساتھ ہی کچھ معنوی تقاضے ہیں جو قصیدہ نگار کی فکرِ پیکر تراش کو ہمہ وقت متحرک و برسرِ کار رکھتے ہیں اور برابر نا آسودگیٔ شوق کا گلہ کرتے رہتے ہیں کسی دور راہے پر تھک کر بیٹھ جانے والی فکر کی یہاں گنجائش ہی نہیں ہے، ایسی نا کردہ کار فکر تکملہ ہائے شوق کے فریضے سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی، یہی سبب ہے کہ قصیدہ نگار کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ اس کا تخیل رسا ہونا چاہیئے، مبالغہ قصیدہ کا ایک بہت ہی اہم معنوی عنصر ہے، حسنِ تشبیہ اور لطفِ استعارہ

کے پہلو بہ پہلو فکر و خیال کی ہمہ سمت رعنائیوں سے اس کے دل میں کھب جانے والے حسن کو نکھارا اور ابھارا جاتا ہے، مبالغہ جان مبالغہ کہلانے کا مستحق صحیح معنوں میں اسی وقت ہوتا ہے جب اس کے بھرپور وار کے مقابلے میں حقیقت نگارانہ زاویۂ نظر کے تمام تنقیدی اسلحہ کند ہو کر رہ جائیں، اس کی محاکاتی شان معنی و مفہوم کی مجسمہ سازی میں اس بلند و برتر مقام پر نظر آئے کہ خوب سے خوب تر کی متلاشی نظر یکبارگی ٹھٹھک کر رہ جائے اور قلب و ذہن کے تخلیق کردہ تمام فنی معیار جن کے باوجود تقاضائے ایک حشر کی بے پناہ تشنگی کے سبب نا آسودگی شوق کے شکوہ سنج ہوں یکلخت آسودہ و سیراب ہوتے ہوئے محسوس ہونے لگیں۔ مشرق کی کلاسیکی شاعری کے ہر بڑے قصیدہ گو نے مبالغے کے مرصع کار ستونوں پر اپنے فن کے قصر ہائے فلک بوس کی تعمیر کی ہے، مبالغے کے بغیر قصیدے کا معنوی آہنگ ترتیب پا ہی نہیں سکتا کسی بھی قصیدہ نگار کے فن پر تنقید کرتے وقت یہ امر ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے، زمانے کے معیار و مذاق کے اعتبار سے حقیقت نگاری کے تصورات بھی مختلف ہوتے ہیں، پرانے دور کی گل کاری و طرح کار طبائع اس دور کی سیدھی اور سپاٹ سی فنی اقدار پر مطمئن ہونے سے قاصر تھیں، قصیدہ اپنے عہد کی اس مزاجی کیفیت سے ہٹ کر کسی دوسری راہ پر گامزن ہونے کا مجاز نہیں رکھتا تھا اور نہ ہی جاگیرداری قدغن اس کو ایسی کسی بے اعتدالی کی اجازت دینے کی روادار تھی۔ قصیدے میں شوکت و الفاظ کا عنصر جاگیرداری آن بان کی نمائندگی کرتا ہے، اس کے بغیر قصیدے کی معنوی ہیئت کو شاہانہ جاہ و جلال کا مظہر نہیں بنایا جا سکتا تھا، لفظوں کا طنطنہ و طمطراق ایک خاص قسم کے علامتی انداز میں سطوت شاہی سے ہم آہنگ ہے، دربار شاہی کوئی گزرگاہِ خاص و عام نہیں ہے، اس کے آستانے پر باریاب ہونے کے لئے خاص قسم کی ہنرورانہ صلاحیتیں درکار ہیں، ایک قصیدہ گو جس وقت دربارِ شاہی میں عرضِ ہنر کرتا ہے تو خود کو معنوی طور سے اس انجمن ہی کا ایک فرد سمجھتا ہے اور شعوری طور پر اس حقیقت کو ملحوظ رکھتا ہے کہ اس انجمن خاص کے کچھ خاص الخاص آداب ہیں جن کا احترام و لحاظ اس کے لئے قطعی طور پر لازم و لابد ہے۔ قصیدے کے اجزائے ترکیبی اور ان اجزا کا معنوی دروبست شاعر کے اس احساسِ احترام کی گرم نفسی ہی سے جلا پاتا ہے اور صحیح معنوں میں اس کے بعد ہی قصیدہ فن کے اعتبار سے اُس بلند و برتر مقام پر فائز ہوتا ہے کہ اس کو متاعِ شہدا کی فہرست میں شامل کیا جا سکے۔ ذوق کے قصائد کا مطالعہ کرتے وقت اس احساس کی کارفرمائی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ذوق کی تعلیمی سرگرمیوں کے بارے میں تفصیل سے کچھ پتہ نہیں چلتا، مولانا آزاد نے صرف اس قدر لکھا ہے:

"جب پڑھنے کے قابل ہوئے تو حافظ غلام رسول نامی ایک شخص بادشاہی حافظ ان کے گھر کے پاس رہتے تھے محلے کے اکثر لڑکے ان کے پاس پڑھنے آتے تھے، انھیں بھی وہیں جا بٹھایا۔"[1]

---

[1] آبِ حیات ص ۴۵۰

حافظ غلام رسول غالباً ان کی علمی تشنگی فرو کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے لہٰذا قیاس کیا جاتا ہے کہ حصولِ علم کے ذوق نے انھیں دوسرے سرچشمہ ہائے فیوض سے مستفیض ہونے کے لئے مدتوں سرگرداں رکھا ہوگا، ان کے قصائد کا مطالعہ اس امر کی تائید کرتا ہے کہ انھیں اس وقت کے مروجہ علوم میں خاصی دسترس تھی۔ خوش قسمتی سے دہلی اس وقت صاحبان کمال کا گہوارہ بنی ہوئی تھی، کوئی وجہ نہیں کہ ذوق نے اس اجتماع کمال سے اپنے فکر و فن کی بالیدگی میں رہنمائی حاصل نہ کی ہو، ذوق کے قصائد کا سب سے دل کش حصہ اُن کی تشابیب ہیں جن کی روشنی میں ذوق کے علم و فضل کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مدح کا نمبر اس کے بعد آتا ہے گریز کے معاملے میں ذوق نے کچھ زیادہ پُرکاری کا ثبوت نہیں دیا۔ بعض بعض گریز تو بالکل سیدھی سادی اور سپاٹ سی ہیں۔ بیشتر قصائد کا اختتام بھی کچھ زیادہ موثر نہیں، صرف دعائیہ کلمات پر قصیدہ ختم کر دیا گیا ہے، البتہ بعض دعائیہ کلمات تنوعِ فکر سے خالی نہیں۔

قصیدے کے اجزائے ترکیبی میں سب سے مقدم جزو مطلع ہے، گزشتہ سطور میں ذوق کے تمام مطبوعہ قصائد کے مطلعوں کا حوالہ دیا جا چکا ہے جن کی روشنی میں شاعر کی خلاّقی سخن کا اندازہ لگانا مشکل نہیں، ذوق کے مطلعوں میں تخیل کی اٹھان معانی و مفاہیم کی بے ساختگی و برجستگی، اسالیب بیان کی ندرت و پاکیزگی اور الفاظ و اصوات کی نغمہ ہنر و تازگی بھرپور انداز میں موجود ہے ان کو پڑھتے ہی ایک خاص قسم کی شعری کیفیت طاری ہوتی ہے جو فوراً ہی ان کے جدوالے تشبیبیہ اشعار کی چمن طراز معنویت سے مسحور ہو کر کچھ اور بالیدہ ہو جاتی ہے۔ اس باب میں سودا اور ذوق کے درمیان ایک فرقِ امتیازی ہے، سودا اپنی پرکاری کی بدولت ایک چونکا دینے والی فضا کی تعمیر کرتے ہیں اور اس کے برخلاف ذوق ایک سحرکار قسم کے پس منظر کی تخلیق کرتے ہیں جس میں کیف و نشاط کی عطر بیز تہہ داریاں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔

ذوق نے موقع و محل کی رعایت کو نظر انداز نہیں ہونے دیا، انھوں نے اپنی فکری کاوشوں کا رخ متعین کرنے میں اس نکتے کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے کہ ابلاغ معانی کا سررشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے، مثلاً بہادر شاہ ظفر کے دور ولی عہدی میں ایک بار اُن کے غسلِ صحت کی تقریب پر ایک قصیدہ نذر گزرانا تو اس کا مطلع اس انداز سے ترتیب دیا ؎

واہ واہ کیا معتدل ہے باغِ عالم کی ہوا مثلِ نبضِ صاحبِ صحت ہے ہر موجِ صبا

اور اس کے بعد آنے والے تشبیبیہ کے ستائیس اشعار میں ہوائے بہار کی مسیحا نفسی کی مختلف انداز سے توضیح و تعبیر کی گئی اور بعد ازاں گریز کی اہم کڑی پر پہنچ کر اس سلسلۂ خیال کی اس انداز سے گرہ بندی کی گئی ہے ؎

"واقعی کس طرح سے صحت نہ اک عالم کو ہو جبکہ ہو اس کی نویدِ غسلِ صحت جانفزا

ایسی ہی ایک تقریب ۱۸۵۲ء میں پیش آئی اس موقع پر بھی ذوق نے بہت ہی دھوم دھام سے ایک قصیدہ

پیش کیا جس کا مطلع ہے ؎

زہے نشاط اسے کیجئے اگر تحریر عیاں ہو خامے سے تحریر نغمہ جائے صریر

اس قصیدے کی شانِ نزول سے متعلق کچھ تفصیلات گزشتہ سطور میں قلم بند کی جاچکی ہیں جن کا اعادہ بے محل ہوگا اس قصیدے کی تشبیب بھی محولہ بالا قصیدے کی تشبیب کے مثل سرتاسر بہاریہ ہے، خوشی و سرخوشی کی موجیں ہیں کہ احساسات کی تہیں الٹتی چلی جاتی ہیں، کائنات کے ذرّے ذرّے سے نغمگی کی سوت پھوٹ نکلی ہے سانسوں کے زیر و بم سے نغمات کی تخلیق ہورہی ہے، بلبل تصویر کی چونچ اسی شوق نغمہ سرائی سے وا ہوگئی ہے اندیشہ ہے کہ مرغ ہائے چمن جو ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے کہیں انڈے کے اندر ہی سے نہ بولنے لگیں، چٹائی کے نشانات جو اس کے زمین پر بچھانے کے سبب اس مقام پر ثبت ہوگئے ہیں۔ ہوائے بہار کی پرلطف گدگدی کی وجہ سے سنبل کی طرح لہلہاتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں، پتھر سے جو شرر اڑتا ہے وہ فیض ہوا سے تازہ جو کے دانے کی طرح سبز رنگت اختیار کرجاتا ہے اور جو دھواں اٹھتا ہے وہ برسنے والا بادل ہوکر اٹھتا ہے غرض کہ اسی قسم کی محیرالعقول باتیں ظہور میں آرہی ہیں جن کی توجیہہ فرماتے ہوئے شاعر اس انداز سے گریز کرتا ہے ؎

دیا ہے رنج کو دھو تیرے غسلِ صحت نے ضمیر خلق سے اے بادشاہِ پاک ضمیر

ذوق نے زیادہ تر قصائد عید کی تقریبات پر کہے ہیں، عید کی تقریب چونکہ عبارت ہی عیش و نشاط سے ہے لہٰذا ایسے قصائد کی تشابیب کا جو رنگ ہونا چاہیئے وہ ظاہر ہے، ایسی ہی ایک تقریب پر بہادر شاہ ظفر کی خدمت میں ایک قصیدہ پیش کیا تو اس کے ابتدائی حصے کو شراب کی مدح کے لئے مخصوص کردیا، عیش و نشاط کے جملہ متعلقات میں شراب کے علاوہ اور کون سی شئے شراب سے زیادہ اس استحقاق کی حامل ہوسکتی ہے، مذکورہ قصیدے کے مطلع ہی میں ارشاد ہوتا ہے ؎

ہے وہ جاں دارو ئے نافع اعضاد حواس کہ دل مردہ سو زندہ تن بے حس حساس

قصیدے کے ابتدائی سولہ شعروں تک مدح و ستائش کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے کہ شاعر کو یکبارگی بادشاہ کی دینداری و پرہیزگاری کا خیال آتا ہے اور وہ بڑے ہی پُر کارانہ انداز میں سلسلۂ بیان کا پہلو بدل کر خود سے اس انداز میں مخاطب ہوتا ہے

میں یہ کہتا ہی تھا جو دل نے میرے مجھ سے کہا توبہ کر توبہ نہ کر اتنی زیادہ بکواس
ایسے مردار بدافعال کا تو نام نہ لے حامیٔ شرع ہے وہ بادشۂ پاک انفاس
شاہِ دیندار بہادر شہ غازی جس نے خانۂ توبہ و تقویٰ کو کیا محکم اساس

یہاں سے خیالات کا رُخ پلٹ جاتا ہے اور شراب کی ہجو شروع ہوجاتی ہے اور کچھ اس انداز سے کہ ساتھ ہی ساتھ بادشاہ کی مدح کا پہلو خود بخود نکلنا شروع ہوجاتا ہے، ذوق کے تمام قصائد میں غالباً اسی قصیدے کی گریز فن کے اعتبار سے

بہترین گریز کہی جانے کی مستحق ہے، اس سے قبل گریز کے جن اشعار کا حوالہ دیا گیا ہے ان میں یہ پرکاری نہیں ہے۔

ذوق کی تشابیب ٹکنیک کے اعتبار سے شعرائے متقدمین سے علیحدہ نہیں ہیں، موضوع اور مضامین کے لحاظ سے بھی انھیں کوئی خصوصیت حاصل نہیں، قدیم شعراء کا ایک انداز یہ بھی تھا کہ تمہیدیہ اشعار میں اپنی محروم القسمتی پر ماتم کناں نظر آتے تھے، انتہائی یاس و نامرادی کے اس عالم میں جب کوئی سبیل نظر نہیں آتی تو یکایک کسی محبوبۂ عشوۂ طراز کی آمد آمد ہوتی اور وہ شاعر کو اس ہجوم نامرادی سے نکلنے کی راہ سجھاتی، جس کا رخ بہرحال بارگاہِ سلطانی کے علاوہ کسی اور سمت ہو ہی نہیں سکتا۔

ذوق نے متعدد قصائد میں اس ٹکنیک کو برتا ہے، ایسے قصائد کے تشبیبیہ اشعار میں چونکہ اس آنے والی معشوقہ کے حسن و جمال کی مدح و ستائش لازمی سی ہوتی ہے لہٰذا شاعر کے حسن پرستانہ رجحان کی بھرپور انداز میں عکاسی ہوجاتی ہے، نیز اس موقع پر چونکہ حسن کی جزئیات کا احاطہ بھی شاعر کا مقصود ہوتا ہے لہٰذا اس نوع کی کم و بیش تمام تشابیب از خود سراپا نگاری کے دائرے میں آجاتی ہیں۔ لیکن مبالغہ اور خیال آرائی کی بہتات اس قسم کی تشابیب کو بسا اوقات خیالی بنا دیتی ہے غالباً اسی بنا پر مولانا امداد امام اثر کو کہنا پڑا ہے۔

> "ذوق کی خلاقیٔ سخن میں کلام نہیں، بلاشبہ اس شاعر گرامی کی فکر بہت عالی ہے، مضامین استادانہ ہیں اور روش ادائے مطلب کی خوب و مرغوب ہے، مگر وہ دلآویزی جو نیچرل کلام کی ہوا کرتی ہے، اس کا جلوہ قصیدہ میں نمایاں نہیں۔"[1]

نیچرل دلآویزی کا فقدان جس کی جانب اثر صاحب نے اشارہ کیا ہے صرف ذوق ہی سے مخصوص نہیں ہے سودا اور دوسرے قابل ذکر قصیدہ گو بھی اس الزام سے بری نہیں ہیں۔ اس بارے میں پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ ہر دور کی کچھ مروجہ اقدار ہوتی ہیں، فکر و فن کے باب میں ان قدروں کی دخل در اندازی کو ملحوظ رکھا جائے تو اس نوع کے اعتراضات کی اہمیت بڑی حد تک کم ہوجاتی ہے، بات ذوق کے پیش کردہ مثالی پیکروں سے متعلق تھی جن کی تصویر کشی فکر و خیال کے تصنع و تکلف سے بری نہیں، جدید تنقیدی نقطہ نظر کی رو سے انھیں " اَن نیچرل " کہا جا سکتا ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ باوجود اس حقیقت کا علم ہوتے ہوئے بھی ہم اس مثالی حسن سے متعلق ذوق کی قلم کارانہ نقش طرازیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایک قسم کی باطنی مسرت محسوس کرتے ہیں، بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ذہن و قلب کی کوئی انجانی سطح یکبارگی مطمئن و سرشار ہوگئی اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ذوق کا یہ تصنع بھی کتنا جاندار و سحر طراز ہے جس کی داد نہ دینا گویا

---

[1] کاشف الحقائق جلد دوم ص ۷۷۹

مریخ ظلم کے مصداق ہے - اس ضمن میں یہ چند اشعار ملاحظہ فرمایئے جو اس قصیدے سے متعلق ہیں جو کسی جشنِ عید قرباں کے موقع پر اکبر شاہ کی خدمت میں نذر گزرانا گیا ؎

سحر جو گھر میں بہ شکل آئینہ تھا میں بیٹھا نظارہ حیراں
تو اک پری چہرۂ مہ طلعت، بہ شکل بلقیس و ماہ کنعاں

پری کی صورت، چمن کی رنگت، اگر اس کا شیوہ تو اس کا جلوہ
زباں شیریں، بیان رنگیں، کلام رنداں، خرام مستاں

انیس خلوت، جلیس جلوت، حریف کار، ظریف صحبت
بہ بزم یاراں، بہ دل بہاراں، بہ اہل عزلت گلے بداماں

نگاہ ساغر کش تماشا، بیاض گردن صراحی آسا
وہ گول بازو، وہ گوری ساعد، وہ پنجہ رنگیں بخون مرجاں

وہ رانِ روشن، وہ ساقِ سیمیں، وہ پلے نازک حنائی رنگیں
وہ قد قیامت وہ فتنہ قامت، دلوں پہ شامت، جو ہو خراماں

اس کے بعد گریز کے اشعار ہیں جن میں ان مذکورہ بالا پر تکلف قسم کے تشبیہی اشعار کے برخلاف ایک طرح کی پرلطف بے تکلفی کا احساس ہوتا ہے ؎

جو نام پوچھا کہا خوشی ہوں، جو وصف پوچھا تو دلبری ہوں
سبب جو پوچھا تو ہنس کے بولا کہ ذوق تجھی عجب ہے ناداں

وہ شاہ جو ہے محمد اکبر، جہاں میں رشکِ جم و سکندر
جلوسِ جشن اس کا ہے فلک پر، اسی کے پرتو ہیں سب یہ ساماں

سراپا نگاری فنِ شیشہ گری سے کم نہیں یہاں خفیف سی بے اعتدالی کے سبب پوری فنی تعمیر کے چکنا چور ہو جانے کا اندیشہ ہے - ذوق نے بہت ہی حزم و احتیاط کے ساتھ اس حد درجہ نازک حدود میں قدم رکھا ہے اور کامیابی کے ساتھ اسے عبور کیا ہے، ان کے رچے ہوئے تہذیبی شعور نے جس پر ان کی ثقہ طبیعت نے کچھ اور آب و رنگ چڑھا دیا تھا ان کی متانت و وقار کو ٹھیس لگنے سے بہر حال محفوظ و مامون رکھا ہے -

یہاں تک ذوق کی بہاریہ اور حسن پرستانہ تشابیب سے بحث کی گئی ہے جن میں موضوع کے اعتبار سے ایک خاص قسم کی ترو تازگی و طرح کاری پائی جاتی ہے، جسے شاعر کے حسن کارانہ اسلوب نے کچھ اور امتیاز آگیں بنا دیا ہے - اس نوع کی تشابیب سے ہٹ کر کچھ خاص قسم کی تشابیب ہیں جن میں شاعر نے تخیل کی کارفرمائی اور اپنی

وہی قوت شعرگوئی کی بدولت ایجاد معانی کی نوکارکرشمہ کاریاں کی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنے علم وفضل اور وسیع معلومات کی داد دی ہے، تدقیق فکر و نظر کے لحاظ سے اس نوع کی تشابیب کی خاص اہمیت ہے، ذوق کے تبحر علمی کا اندازہ ایسی ہی تشابیب کی روشنی میں لگایا جاسکتا ہے، ذیل میں اس نوع کی کچھ تشابیب سے بحث کی جاتی ہے -

ماہ صیام کی مبارکباد کے سلسلے میں ذوق نے اکبر شاہ کے حضور میں ایک قصیدہ پیش کیا جس کا مطلع ہے ؎

تا زباں زد دہر میں ہو فلسفی کا یہ کلام ہے پئے افلاک لازم نفی خرق و التیام

اس قصیدے کی تشبیب میں آسمان و زمین و دیگر سیارہ جات کے بارے میں حکمائے عہد قدیم کے نظریات کا احاطہ کیا گیا ہے، علم معانی و بیان بدیع اور گرامر کی اصطلاحات سے بحث کی گئی ہے، فلسفہ، منطق، موسیقی اور طب کے بارے میں اپنی ہمہ دانی کا مظاہرہ کیا گیا ہے، علم نجوم و رمل سے اپنی یک گونہ وابستگی و واقفیت ظاہر کی گئی ہے، فرقۂ معتزلہ سے متعلق صرف اسی قصیدے میں اظہار خیال پایا جاتا ہے اور اس کے مسلک ردّ رویت کی اس طرح صراحت کی گئی ہے ؎

رد کریں تا دعوی رویت کو اہل اعتزال اور ملاحد وسوسوں سے دین نبی کو اتہام

فارسی، ترکی اور رومی زبان میں مختلف مہینوں کے ناموں کو اس طرح قلم بند کیا ہے اور اس طرح گویا مختلف زبانوں سے اپنی واقفیت کا اظہار کیا ہے ؎

تا کہ فروردیں، ارد آب، اپریل، اور دیکل ماہ شمسی ہو مطابق ہر ولایت میں مدام

علم رمل سے متعلق اس قصیدے میں یہ شعر نظر سے گزرتا ہے ؎

تا زحل کے ساتھ شکل عقلہ و انکیس کو زائچے میں دیتے ہوں صاحب رمل نسبت مدام

علم فلکیات پر ذیل کا شعر دیکھیے ؎

تا کہ بیت سعد اکبر ہوں فلک پر قوس و حوت تا کہ جوزا اور حمل میں شمس کو ہو احتشام

علم نجوم سے غالباً گہرا شغف ہے، تین شعر مسلسل اس موضوع سے متعلق ہیں ؎

سنبلہ کو تا منجم کہوے ہے شاید عقیم تا کہ ہو دست و بغل جوزا فلک پر شادکام

حکم ہو بر جیس و کیواں کا رواں بر چین و ہند تا کہ تیر و ماہ روم و بلخ پر رکھیں مقام

تا خراساں نہر کو، بہرام کو ہو ملک ترک ماوراء النہر پر ناہید کو تا ہو قیام

منطق کا فلسفے سے چولی دامن کا ساتھ ہے، ذیل کے شعروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ذوق کو اس علم میں بھی خاص درک حاصل ہے ؎

کلیاتِ خمسہ ہوں منطق میں ایسا غوجیا یعنی جنس و فصل و نوع وخاصہ اور عرضِ عام
مادّی و فاعلی علت کو تا صورت کے ساتھ علتِ غائی پہ دیویں اہلِ دانشِ انصرام

یہاں ان اشعار سے متعلق قدرے صراحت کردی جائے تو مناسب ہے ۔ ایسا غوجیا منطق کی کتاب کا نام ہے ، جنس ، فصل ، نوع اور عرضی نام یہ علم منطق کی اصطلاحیں ہیں ۔ دوسرے شعر میں مختلف علتوں کا ذکر ہے یہ بھی منطق کی اصطلاحیں ہیں ۔

ذیل کے شعروں میں علم طب میں اپنے درک و مہارت کی نشان دہی کی ہے ۔

تا اطبّائے زماں کو ہووے علم طب کے ساتھ غورِ نبض و فکر بحراں ، فکر الوان و قوام
تا خس و حکاک لازغ رحوہ و ثاقب ثقیل جب تلک امراض مہلک کا اطبّا میں ہو نام

ناخس ، حکاک ، لازغ ، رحوہ ، ثاقب اور ثقیل مختلف بیماریوں کے نام ہیں ۔

ہندی گانا سات سروں سے ترتیب پاتا ہے جن کے نام مدھم ، پنچم ، کھرج ، گندھار ، دھیوت اور نکھار وغیرہ ہیں ۔ ذیل کے شعر میں اس فنی نکتے کی صراحت کی گئی ہے ۔

مدھم و پنچم ، کھرج ، گندھار ، دھیوت اور نکھار
نغمۂ ہندی کا ہووے سات سُر سے انتظام

قواعد و گرامر کے باب میں یہ شعر دیکھئے ؎

تا ان و لَن کے اذن دیں فعل مستقبل کو نصب جازم فعل مضارع ان و لم لمّا و لام

ذوق نے مختلف علوم مثلاً نجوم ، فلسفہ ، تصوف ، موسیقی ، منطق اور طب کی اصطلاحیں اور ان علوم سے متعلق اپنی معلومات کی صراحت کم و بیش آٹھ قصائد کی تشابیب میں کی ہے جن میں سے چار اکبر شاہ کی مدح میں ہیں اور چار بہادر شاہ ظفر کی ۔ اکبر شاہ کی مدح میں ایک قصیدہ تو یہی ہے جس کے بارے میں سطور بالا میں بحث کی گئی ، دوسرا قصیدہ جو کسی جشنِ سالگرہ کے موقع پر پیش کیا گیا ، اس شعر سے شروع ہوتا ہے ؎

صبح سعادت ، نور ارادت ، تن بہ ریاضت ، دل بہ تمنّا
جلوۂ قدرت ، عالم وحدت ، چشم بصیرت ، محوِ تماشا

اس قصیدے میں نجوم ، فلسفہ اور منطق کے بارے میں اظہار خیال موجود ہے ، موسیقی اور طب سے متعلق کوئی شعر نہیں ۔

تیسرا قصیدہ جس کا مطلع شعر ہے ؎

صبحدم فکر جو تھی سیر فلک کی مشتاق عرش پر اڑ گئی اک آن میں مانند براق

کسی عید کی تقریب پر کہا گیا ، اس میں صرف فلسفہ اور موسیقی کے باب میں بحث کی گئی ہے ۔

چوتھا قصیدہ جو شہزادۂ سلیم کے جشن کتخدائی کے موقع پر نذر گزرانا اس میں منطق و طب اور موسیقی کے بارے میں مندرجہ ذیل اشعار نظر سے گزرتے ہیں ؎

دیتا شکلوں میں ہے پیوند بدیہہ الانتاج　　یہ قلم سمجھے نہ تہذیب نہ جانے سُلّم

یہ بدیہہ الانتاج منطق کی ایک شکل ہے جس کا نتیجہ فوراً نکل آتا ہے، تہذیب اور سُلّم دونوں علم منطق سے متعلق کتابوں کے نام ہیں۔

چارہ گر ہو جو ترا لطف تو پھر کیا ہے عجب　　مشکِ سودہ کرے ہر زخم پہ کارِ مرہم

مشکِ سودہ سے پسا ہوا خشک مشک مراد ہے جس کے ڈالنے سے زخم گہرا ہو جاتا ہے۔

علم موسیقی سے متعلق دو ایک سرسری سے اشعار ہیں، رسم شادی کی جزئیات بھی تفصیل سے بیان نہیں کی گئیں جو موقع و محل کا اقتضا رتھا۔

اس ضمن میں بہادر شاہ ظفر کی مدح میں جو قصائد پیش کئے گئے ان میں سے ایک تو وہی معرکۃ الآرا قصیدہ ہے ؎ "زہے نشاط اگر کیجئے اسے تحریر" جو بادشاہ کے غسل صحت کے موقع پر پیش کیا گیا، اس قصیدے میں صرف منطق و طب سے سروکار رکھا گیا ہے:

ہوا ہے مدرسہ یہ بزم گاہِ عیش و نشاط　　کہ شمس بازغہ کی جا پڑھے ہیں بدر منیر

شمس بازغہ عربی میں طب کی کتاب کا نام ہے اور بدر منیر سے اردو کی مشہور مثنوی سحر البیان مراد ہے،[1] بادشاہ کی علالت کی رعایت سے شمس بازغہ اور ازاں بعد اس علالت سے صحتیابی کی خوشی میں بدر منیر کی ورق گردانی کا التزام خاص لطف رکھتا ہے ؎

[1] [illegible]

دوسرا شعر ہے ؎

اگر پیالہ ہے صغریٰ تو ہے سبو کبریٰ　　نتیجہ یہ ہے کہ سرمست ہیں صغیر و کبیر

صغرا اور کبریٰ منطق کی دو اصطلاحیں ہیں۔

یہ قصیدہ دراصل ذوق کی صنعت کارانہ مشاقی کا شاہکار ہے، اس کی اہمیت شاعر کے اس طرح کار تخئیل کے سبب سے ہے جو بیشتر مقامات پر تشبیہات و استعارات کی پہلو تراش جواہر کاریوں کی جلا پاکر جھلک جھلک اٹھتا ہے۔ مذکورہ بالا اصطلاحات محض برسبیلِ تذکرہ قلم بند کر دی گئی ہیں۔

"شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت" ذوق کا سب سے مشہور قصیدہ ہے، یہ بھی کسی جشن عہد کی یادگار ہے۔ ایک سو ستر (۱۷۰) اشعار کے اس قصیدے میں ایک سو اٹھارہ (۱۱۸) اشعار تشبیب پر مشتمل ہیں تشبیب بجائے خود دو حصوں میں منقسم ہے، اس کے پہلے حصے میں جو ستر اشعار کو محیط ہے ذوق نے اپنے تبحر علمی کی جی کھول کر داد

دی ہے، تشبیب کا دوسرا حصہ سراپا نگاری کے دائرے میں آتا ہے، حسب معمول خوشی مجسّم ہو کر خواب میں آتی ہے اور ذوق اپنی تعلّی آمیز خود کاری کا رخ موڑ کر اس نو وارد حسین مہمان کے لب و رخسار کی ستائش گری پر مائل ہو جاتے ہیں تشبیب کے پہلے حصّے میں شاعر نے اس وقت کے تمام مروّجہ علوم کا تذکرہ کیا ہے اور ان تمام میں اپنی کامل دستگاہ کا اِدّعا کیا ہے۔ فلسفے کے باب میں ارشاد ہوتا ہے ؎

کبھی کرتا تھا میں اعراض میں جوہر قائم　　کبھی میں کرتا تھا معلول سے ثابت عِلّت

عرض اور جوہر فلسفے کی دو اصطلاحیں ہیں، عرض وہ چیز جو اپنی ذات پر قائم نہ ہو اور جوہر وہ جو قائم بالذات ہو۔

کبھی مشائیوں سے کرتا تھا میں پیشروی　　کبھی لیجاتا تھا اشراقیوں پر میں سبقت

مشائین اور اشراقین حکمار کے گروہ ہیں، اول الذکر چیزوں کی حقیقت دسیلوں اور علامتوں سے معلوم کرتے ہیں اور مؤخر الذکر صفائی باطن کے ذریعہ دعویٰ معرفت کے علم بردار ہیں ؎

ماہر موسیقی ایسا کہ ادا کرتا تھا　　کبھی میں بارہ مقام اور کبھی چاروں مت

سرود کے بارہ پردے ہیں اور گانے کے چار طریقے جو چار گوتیوں کے نام سے مشہور ہیں، اس شعر میں ذوق نے اسی حقیقت کی جانب اشارہ کیا ہے۔

ان علوم کے علاوہ کچھ دوسرے علوم اور زندگی کے کچھ دوسرے شعبوں سے متعلق بھی ذوق نے اپنے اس قصیدے میں اپنی واقفیت کا اظہار کیا ہے مثلاً ؎

کبھی کرتا تھا مجسطی پر حواشی تحریر　　کبھی کرتا تھا اشارات و شفا کی صحت

کبھی کرتا تھا میں قانون سے تشریح علاج　　کبھی کرتا تھا میں قاموس میں تصحیح لغت

مجسطی ریاضی کی کتاب کا نام ہے جس کا مصنف حکیم اقلیدس ہے، اشارات و شفا طب کی دو کتابیں ہیں جو بو علی سینا کی تصانیف ہیں، قانون بھی طب ہی کی ایک کتاب کا نام ہے، یہ کتاب بھی بو علی سینا ہی سے منسوب ہے، قاموس عربی لغت کی ایک کتاب کا نام ہے ؎

کبھی میں رہتا سرودی میں تھا ایسا مشغول　　کہ نہ تھی ایک نفس ضبطِ نفس سے فرصت

سرودی فقیروں کی ایک مشق ہے جس میں سانس کو بند کر لیتے ہیں ؎

سیمیا سے کبھی تصویر کشِ مو ہوتا ہے　　کیمیا سے کبھی میں زرکشِ گنجِ دولت

سیمیا ایک علم کا نام ہے اور کیمیا گھٹیا دھاتوں کو سونا بنانے کی روایتی صفت سے مراد ہے۔ انگریزی کا لفظ کیمسٹری اسی سے ماخوذ ہے۔

(باقی آئندہ)

تحسین سروری

اردو ادب کے غیر ادبی ماخذ

(۷)

(بوستان اودھ)

فارسی زبان میں ملکِ اودھ کی یہ ایک تاریخ ہے، جس کے مولف کنور درگا پرشاد بہادر آنریری مجسٹریٹ و رئیس اعظم سندیلہ (ضلع ہردوئی) ہیں۔ بڑی تقطیع کے (۷۸۴) صفحات پر مشتمل ہے، جسے احمد علی خاں نے اپنے مطبع دبدبۂ احمدی میں ۱۸۹۲ء میں چھاپ کر شائع کیا تھا۔

بوستان اودھ (۶) دفتر اور (۶۶) ذیلی عنوانات میں تقسیم کی گئی ہے اور ہر دفتر کے مطالب کو اس طرح ظاہر کیا گیا ہے۔

دفتر اول، ذکر بادشاہانِ ہنود
دفتر دوم، ذکر فرمارد ایانِ اودھ
دفتر سوم، بادشاہانِ اودھ
دفتر چہارم، ہنگامۂ غدر
دفتر پنجم، آغاز ذکر نیاکان
دفتر ششم، در ذکر سندیلہ

ہر دفتر یا باب کے تحت اہم تاریخی واقعات کے ساتھ ساتھ چند قابل ذکر شخصیات کے حالات بھی قلم بند کئے گئے ہیں۔ پانچویں باب میں مولف نے خود اپنے خاندانی حالات بیان کئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اجداد مسلمان فرماں رواؤں کے عہد میں مناصب و جاگیر سے سرفراز تھے۔ اس تاریخ میں چار جگہ "ذکر بعضے شعرائے نامی این عہد" کے عنوانات سے شعرا کا تذکرہ ملتا ہے، جس کے ساتھ اردو فارسی کلام کا انتخاب بھی ہے۔ آخری باب میں محمد واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ واجد علی شاہ کے حالات سے قبل سندیلہ کی مختصر تاریخ اور اس شہر کے چند مشاہیر کا تذکرہ ہے۔ اس میں مولف نے ذکر

خاندان راقم ایں شگرف نامہ" کے عنوان سے اپنے اور اپنے خاندانی حالات بیان کئے ہیں۔ آخر میں تمت (ص، تا ۲۷۸) کے بعد چھ صفحوں میں ایک منظوم تقریظ چھ قطعات تاریخ الطباع کتاب اور خاتمہ کتاب ہے۔ تقریظ تاریخی قطعات لکھنے والے یہ شاعر ہیں۔

۱۔ منشی کنور چندی سہائے متخلص بہ نہال شاگرد نواب عاشور علی خاں بہادر

۲۔ حکیم سید ضامن علی جلال لکھنوی

۳۔ حکیم سید محمد مہدی کمال خلف حضرت جلال لکھنوی

۴۔ منشی مہکو لال عشرت لکھنوی شاگرد خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی۔

بوستان اودھ میں جن شعرائے گرامی کے حالات درج ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۸- میر دوست علی المتخلص بہ خلیل شاگرد آتش ص ۱۹۲

۱۹- منشی دیاکرشن المتخلص بہ ریحان ص ۱۹۲

۲۰- میر وزیر علی المتخلص بہ صبا شاگرد آتش ص ۱۹۳

۲۱- مرزا سلامت علی دبیر شاگرد میر ضمیر ص ۱۹۳

۲۲- میر ببر علی انیس ص ۱۹۴

۲۳- منشی فضل رسول رئیس سندیلہ المتخلص بہ واسطی ص ۱۹۷

۲۴- عارف علی شاہ المتخلص بہ عارف (از ولایت خراسان) ص ۱۹۸

۲۵- منشی نظیر حسن المتخلص بہ اوج ص ۲۰۱

۲۶- حکیم عابد علی المتخلص بہ کوثر شاگرد اسیر ص ۲۰۱

۲۷- شیو پردھان مہاراجہ جے گوپال سنگھ بہادر المتخلص بہ ثاقب ص ۲۰۲

۲۸- راجہ جیالال بہادر المتخلص بہ گلشن ص ۲۰۲

۲۹- منشی گردھاری لال المتخلص بہ اسد ص ۲۰۳

۳۰- منشی ظہور حسن المتخلص بہ ظہور شاگرد اسیر ص ۲۰۴

۳۱- قہر (کنور درگا پرشاد مولف کتاب ہذا)

۳۲- کنور کامتا پرشاد المتخلص بہ نجم ص ۲۵۱

کتاب میں جگہ جگہ فرماں روایان اودھ کی قلمی تصویریں ہیں جو سنگی چھاپے کے ذریعے چھاپی گئی ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۳)

بنیاد اس عرفان پر ہے کہ انسان کا ایک بڑا فرض یہ بھی ہے کہ وہ اپنے دل میں دوسروں کے لیے درد پیدا کرے، اور دوسروں کو راحت پہنچانے کے لیے قربانی کرے۔ دردمندی کا یہ سبق، ان انسانوں کے لیے نامانوس ہے جن کا فلسفۂ حیات خودغرضی اور نفسانفسی ہے۔ تعلیم اگر اس نفسانفسی کو دور کر سکے تو اسے قومی زندگی کا سب سے بڑا انعام سمجھنا چاہیے۔

حضرات! ان گزارشات کے بعد، میں ایک بار پھر آپ سب صاحبوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور تمام وسندیاب حضرات کو دلی مبارک باد دیتا ہوں۔ والسلام

مراسلات

نقیب ہمدرد :- قومی زبان میں جو مضمون ہمدرد کے ابتدائی حالات پر ہے، اُس کے سلسلے میں یہ توضیح ضروری ہے کہ اس سے مراد اصل روزنامہ نہیں جو آٹھ صفحہ پر نکلنا شروع ہوا تھا بلکہ ایک دوسرا اور چھوٹا پرچہ مراد ہے جو بطور نمونہ کئی ہفتے یا شاید کئی مہینے نکلتا رہا تھا اور اس کا مستقل نام "نقیب ہمدرد" تھا

(مولانا) عبدالماجد (دریا بادی)

مدیر "صدق" لکھنو

"سیماب اور دبستانِ سیماب پر تحقیق" میں پونہ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کے لئے علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم پر مندرجہ بالا عنوان پر کام کر رہا ہوں اساتذۂ متاخرین میں علامہ مرحوم کے تلامذہ کی فہرست کافی طول طویل ہے جن میں عصر حاضر کے مشہور شعراء کے علاوہ ادیب اور صحافی بھی شامل ہیں میرا موضوع چونکہ بہت وسیع اور اہم ہے اسلئے اردو دوستوں اور علامہ مرحوم کے تلامذہ کی مدد کے بغیر یہ کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ میں ہندوستان اور پاکستان کے تلامذۂ سیماب اور ادب دوستوں سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ اس سلسلے میں حتی المقدور میری اعانت فرمائیں۔

۱- ہندوستان اور پاکستان کے موجودہ تلامذۂ سیماب اپنے مختصر حالاتِ زندگی (مع تاریخ تلمذ) ۵ غزلیں یا ۲۰ منتخب اشعار، دو بہترین نظمیں اپنی تصنیفات و تالیفات کی فہرست کے علاوہ اپنے ادبی مقام کے متعلق حوالوں اور دوسروں کی آراء سے مطلع فرمائیں۔

۲- اپنی دو تین غزلوں پر استاد کی اصلاح کا نمونہ (اپنی اصل غزل کے ہمراہ)

۳- مرحوم تلامذۂ سیماب کے متعلق جن حضرات کو علم ہو وہ ان کا تذکرہ اور کلام عنایت فرمائیں۔

۴- اپنی تازہ ترین تصویر اور مولانائے مرحوم سے متعلق چشم دید حالات وغیرہ بھی روانہ کریں۔

پروفیسر افتخار احمد فخر دھولیوی ایم۔اے

(شعبۂ اردو۔ فارسی) ایم۔جے کالج جلگاؤں مشرقی خاندیس

(مہاراشٹر) ۶ بھارت

نکرہ پر نُون :- غالبؔ کی ایک غزل کا مصرع ہے
ناف زمین ہے کہ یہ نافِ غزال ہے

نکرہ پر نون کا اعلان جائز نہیں ہے۔ غالبؔ کی تقلید میں بندہ نے بھی کہا ہے
بے دست و پا ہے ہجر کی ساکت لبی روش
مشکل ہے پردہ ڈالنا اشکِ رواں پر
اربابِ علم اس سلسلہ میں راہ نمائی فرمائیں۔

اظہار روش بدایونی
بزم فکرِ نو - کمرشل بی ون ایریا -
لیاقت آباد - کراچی ۱۹

مجلس غالب پاکستان :- غالبؔ ہمارے ادب کی ایک عظیم شخصیت ہے، اپنے انفرادی اسلوب اور رفعتِ تخیل کی وجہ سے پورے ادب پر غالب ہے۔ جدید ادب کی تشکیل میں غالبؔ کی ہستی ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ غالبؔ کی وفات ۲ ر ذیقعد ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۵ ر فروری ۱۸۶۹ء کو ہوئی تھی۔ بلحاظ تاریخ ہجری امسال ان کی وفات کو سو سال گذر گئے۔ عموماً ان کی برسی عیسوی تاریخ کے مطابق منائی جاتی رہی ہے مولانا مہرؔ نے ماہِ نو فروری ۶۶ء کے شمارے میں غالبؔ کی صد سالہ برسی منانے کے سلسلے میں کچھ امور کی طرف رہنمائی فرمائی ہے۔

فروری ۶۹ء تک تقریباً تین سال ہیں ان میں خاطر خواہ تیاری کر کے غالبؔ کی صد سالہ برسی شایان شان طور پر منا سکتے ہیں، اس سلسلے میں سب سے پہلا اور اہم کام یہ ہے کہ غالبؔ کے متعلق جو کام پاکستان و ہندوستان میں ہو رہا ہے اس میں باہمی ربط پیدا کیا جائے۔ مختلف افراد اور اداروں کو ایک دوسرے کے متعلق معلومات فراہم کی جائیں۔ اسی ضرورت کے پیشِ نظر "مجلس غالب پاکستان" کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ جس کی مجلس مشاورت کے اراکین کے نام یہ ہیں،

۱ - جناب مولانا غلام رسول مہر
۲ - جناب حمید احمد خاں — وائس چانسلر پنجاب یونی ورسٹی لاہور
۳ - جناب ڈاکٹر عندلیب شادانی — صدر شعبۂ اردو ڈھاکہ یونی ورسٹی ڈھاکہ
۴ - جناب شان الحق حقی — سکریٹری ترقیٔ اردو بورڈ کراچی
۵ - جناب رفیق خاور — ڈپٹی ڈائرکٹر ادارۂ مطبوعات پاکستان کراچی
۶ - جناب مرزا عابد عباس — سکریٹری ثانوی تعلیمی بورڈ حیدر آباد سندھ
۷ - جناب مسعود اشعر — اقامتی مدیر روزنامہ امروز ملتان

۸ - جناب محمد موسیٰ خاں کلیمؔ — پرنسپل گورنمنٹ کالج نوشہرہ
۹ - جناب ڈاکٹر وحید قریشی — اورینٹل کالج لاہور
۱۰ - جناب محمد حیات خاں سیال — پروفیسر گورنمنٹ کالج جھنگ
۱۱ - سید قدرت نقوی — معتمد مجلسِ غالب پاکستان

مجلس کے عزائم یہ ہیں:-

۱ - غالبؔ کی تصانیف کی وقیع انداز میں اشاعت۔
۲ - غالبؔ سے متعلق قدیم وکمیاب کتب کی دوبارہ طباعت۔
۳ - غالبؔ کی نادر ونایاب تحریروں کو جمع کرکے شاملِ تصانیف کرنا۔
۴ - غالبؔ کے فن اور زندگی پر جامع کتب کی تصنیف واشاعت۔
۵ - غالبؔ سے متعلق رسائل واخبارات میں شائع شدہ مضامین کی فراہمی واشاعت
۶ - غالبؔ پر کام کرنے والوں کے درمیان رابطہ قائم کرنا۔
۷ - غالبؔ پر تحقیقی کام کرنے والوں کی ہر امکانی مدد کرنا۔
۸ - ناشرین حضرات کو طباعت کے متعلق ہر امکانی مدد دینا۔
۹ - مناسب وموزوں مقامات پر "مجلسِ غالبؔ پاکستان" کی شاخیں قائم کرکے مختلف اوقات میں جلسے منعقد کرانا

مفوّضہ کاموں کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:-

۱ - کلیات نظم فارسی

مولانا غلام رسول مہرؔ کلیاتِ نظمِ فارسی کو تین حصّوں میں مرتب کریں گے اور حواشی ومقدمات تحریر فرمائیں گے۔

حصّہ اوّل :- غزلیات ورباعیات۔
حصّہ دوم :- قصائد وقطعات۔
حصّہ سوم :- مثنویات۔

۲ - محمد حیات خاں سیال "لطیفِ غالبؔ" کے نام سے نہایت وقیع مضامین کا ایک مجموعہ ترتیب دیں گے۔

۳ - "مجلسِ غالبؔ پاکستان" کے تعاون سے پروفیسر محمد حیات خاں سیال نے "بزمِ غالبؔ" کے نام سے ایک کتاب مرتب کی ہے اور جسے نذیر سنز پبلشرز سرکلر روڈ لاہور نے طبع کیا ہے۔ "بزمِ غالبؔ" غالب شناسی میں

ایک اہم کردار ادا کرے گی

۴۔ "مجلسِ غالبؔ پاکستان" کی طرف سے سید قدرت نقوی نے حسبِ ذیل کام تقریباً مکمل کر لیا ہے:

(ا) مکمل اردو دیوان مع مقدمہ (تاریخی ترتیب)

(ب) مکمل خطوطِ غالبؔ (مع مقدمہ و حواشی۔ درستیٔ متن و تاریخ)

۵۔ "مجلسِ غالبؔ پاکستان" کی طرف سے حسبِ ذیل کام سید قدرت نقوی کے زیرِ قلم ہے۔

(ا) درفشِ کاویانی مع مقدمہ و حواشی۔

(ب) ترجمہ درفشِ کاویانی مع مقدمہ و حواشی۔

(ج) غالبؔ کا تنقیدی شعور۔

(د) اردو دیوان کا انتخابِ جدید

...

اس سلسلے میں مجلس کو جملہ علم دوست حضرات کے تعاون کی ضرورت ہے:

۱۔ اگر آپ اہلِ قلم ہیں تو "مجلسِ غالبؔ" سے رابطہ قائم فرمائیے۔

(ا) آپ کے زیرِ قلم جو کام ہے اس سے مطلع فرمائیے۔

(ب) آپ کو اپنے موضوع کے مطابق مواد نہیں ملتا تو لکھیے تاکہ ہر امکانی مدد دی جائے

۲۔ اگر آپ مدیر ہیں تو اپنے رسالے یا روزنامہ کی وہ کاپیاں ارسال فرمائیے جن میں غالبؔ کے متعلق کوئی مضمون شائع ہوا ہو۔

۳۔ اگر آپ کے پاس رسائل میں شائع شدہ مضامین ہیں تو ان کی بالتفصیل فہرست ارسال فرمائیے۔

۴۔ اگر آپ کے پاس کتابیں ہیں تو ان کی بالتفصیل فہرست بھیجیے۔

(ا) غالبؔ کی تصانیف کے نام۔ مطبع۔ سنِ طباعت۔ مرتب۔

(ب) غالبؔ سے متعلق تصانیف کے نام۔ مصنف۔ مطبع۔ سنِ طباعت۔

۵۔ اگر آپ ناشر ہیں تو مجلسِ غالبؔ کی وساطت سے فائدہ اٹھائیے اور لکھیے۔

(ا) غالبؔ کی کون سی تصنیف شائع کرنے کا ارادہ ہے؟ صحت و حواشی، مقدمہ وغیرہ کس سے لکھوایا؟

(ب) غالبؔ سے متعلق کون سی تصنیف شائع کرنے کا ارادہ ہے؟ مصنف کون ہے؟ موضوع کیا ہے؟

(ج) مجلسِ غالبؔ پاکستان کی مرتبہ کتابوں کی طباعت و اشاعت میں کیا مدد فرما سکتے ہیں؟

(د) آپ کے پیشِ نظر تصانیف پر مقدمہ و حواشی و صحت کے سلسلے میں مجلسِ غالبؔ کی خدمات حاضر ہیں۔

آپ کے تعاون کے خواہاں: سید قدرت نقوی معتمد اعزازی مجلسِ غالبؔ پاکستان ۱۴۱ ہ گل گشت

گرد و پیش

اردو انجمنوں کی مجلسِ مشاورت :- انجمن ترقی اردو لاہور کے زیرِ اہتمام اردو انجمنوں کی ایک مجلس مشاورت نے صدر مملکت سے اپیل کی ہے کہ قومی زبان سے متعلق مغربی پاکستان اسمبلی کی سفارش کے مطابق آئین میں مناسب ترمیم کی جائے تاکہ ۱۹۷۲ء تک اردو دفتری زبان کی حیثیت سے اپنا مقام حاصل کرلے۔ مجلس مشاورت نے آٹھ قرار دادیں منظور کرکے یہ اُمید ظاہر کی ہے کہ صدر ایوب اس معاملے میں قومی احساسات کے ترجمان بن کر قومی زبان کو دفتری زبان بنا دینگے۔ اس مجلس میں اردو کی مختلف انجمنوں کے دو درجن سے زائد نمائندے شامل تھے جو مغربی پاکستان کے مختلف حصوں سے شرکت کرنے آئے تھے۔ دیگر قرار دادوں میں کہا گیا ہے کہ ذریعہ تعلیم کی فوری اور مکمل تبدیلی کا اعلان کیا جائے جو طلبہ اردو میں امتحان دینا چاہیں انھیں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ہر ممکن سہولت دی جائے۔ پیشہ ورانہ تعلیم کے اداروں میں اردو پڑھانے اور امتحان دینے کی اجازت دی جائے۔ مرکزی اور صوبائی سروس کمیشن کے امتحانات میں قومی زبانوں کو مساوی درجہ دیا جائے اور انٹرویو کی زبان اردو کو قرار دیا جائے۔ دفتری زبان کی بلا تاخیر تبدیلی کے انتظامات کئے جائیں کیونکہ اس سلسلے کی رکاوٹ دور ہو چکی ہے اور تمام دفتری اصطلاحات وضع ہو چکی ہیں۔ پبلک اسکولوں اور غیر ملکی اثرات کے حامل اداروں اور سکولوں کی تعداد گھٹا دی جائے کیونکہ پاکستان میں دوہرے معاشی اور تعلیمی نظام کے نقائص اسی وجہ سے پیدا ہو رہے ہیں۔ مجلس نے عوام سے بھی اپیل کی ہے کہ وہ نجی اور کاروباری دائرے میں انگریزی کا استعمال بالکل ترک کر دیں اور اس کی جگہ اردو کو اپنائیں۔

ڈویژنل کونسل کراچی کا اجلاس :- ڈویژنل کونسل کراچی کے دوسرے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے کمشنر کراچی دربار علی شاہ صاحب نے واضح طور پر یہ ہدایات جاری کی ہیں کہ بنیادی جمہوریتوں کی تمام کارروائی اردو میں ہو۔ انھوں نے کہا ہے کہ جو اراکین اردو نہیں بول سکتے وہ اجلاس سے قبل کونسل کو مطلع کر دیں تاکہ انھیں ترجمان مہیا کیا جاسکے۔ جناب دربار علی شاہ نے بعض تجاویز کو انگریزی میں پیش کئے جانے پر اعتراض کیا اور وضاحت سے ڈائرکٹر بنیادی جمہوریت کو اردو اختیار کرنے کے

سلسلے میں ہدایات دیں۔

طلبہ کا اعلامیہ :- انجمن اتحاد طلبہ ڈی۔ جے گورنمنٹ سائنس کالج نے ایک اعلامیے کے ذریعے عوام سے اور بالخصوص طلبہ سے درخواست کی ہے کہ وہ اُردو کی ترقی اور نشوونما کے لئے پوری تندہی اور خلوص سے کام لیں۔ تاکہ وہ مقررہ وقت سے پہلے ہی سرکاری زبان کی حیثیت سے مضبوط بنیادیں تلاش کر سکے۔ اعلامیے میں ایک ملک گیر مہم چلانے پر زور دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ جب تک دوکانوں، مکانوں، کاروں اور بسوں کے مالکان اپنا سارا کام، اور تختیاں اور بورڈ اردو میں تحریر نہیں کرائینگے، اردو سے اُن کا خلوص مشکوک رہیگا۔

کراچی میں اُردو جاپانی کمیٹی کا قیام :- ٹوکیو یونیورسٹی کے شعبۂ غیر ملکی لسانیات کے صدر پروفیسر آر۔ گامو اور ان کے شاگرد رشید مسٹر میاں موٹو چیرمین فجی من کمپنی سے تبادلۂ خیال کرنے کے بعد انجمن طلبۂ قدیم جامعہ عثمانیہ نے ایک اردو جاپانی کمیٹی بنائی ہے جس کے ارکان ریسرچ اسکالر مسلم ضیائی اردو جاپانی مترجم صمدانی نقوی اور چیرمین میاں موٹو ہوں گے۔ یہ کمیٹی ایسے الفاظ کی فہرست مرتب کریگی جو اُردو جاپانی میں مشترک ہیں یا ایک زبان کے الفاظ دوسری زبان میں مستعمل ہیں۔ یہ بھی تحقیق کی جائے گی کہ اُردو کے کن ادب پاروں کا جاپانی میں اور جاپانی کے شاہکاروں کا اردو میں ترجمہ کیا جا چکا ہے یا آئندہ کیا جا سکتا ہے۔ کام پایۂ تکمیل کو پہنچنے کے بعد انجمن طلبۂ قدیم جامعہ عثمانیہ "اردو جاپانی" کے عنوان سے ایک کتاب شائع کریگی جس میں اس کمیٹی کے تحقیقاتی کاموں کے نتائج درج ہوں گے۔ معتمد انجمن مرزا ظفر الحسن نے ادیبوں سے اپیل کی ہے کہ وہ اردو جاپانی کمیٹی سے اشتراک کریں۔ مفید معلومات یا تو براہ راست اراکین کو بہم پہنچائیں یا معتمد کے توسط سے حاصل کریں۔

علمی۔ تعلیمی اور تہذیبی خبریں

مقامات حریری جرمن زبان میں :- مقامات حریری کو نہ صرف ساری اسلامی دنیا بلکہ تمام یورپی مستشرقین بھی یکساں طور پر عربی زبان وادب کا سب سے بلند پایہ اور بہترین شاہکار مانتے چلے آئے ہیں۔ ۱۸۲۶ء میں جرمنی کے ایک ممتاز و باہنر شاعر فریڈرک ریوکرٹ نے جنھیں مشرقی ادب پاروں کا جرمن ترجمہ کرنے میں غیر معمولی دستگاہ حاصل تھی، مسجع و مقفیٰ عبارت میں اس کتاب کا ایک ایسا ترجمہ کیا جسے ارباب علم وادب آج تک جرمن نثر نگاری کا ایک یکتا اور بے مثل نمونہ اور اسلوب و بیان میں اصل کے ہم پلّا سمجھتے ہیں۔ یہ اہم کتاب ایک عرصے سے نایاب تھی۔ اب اقوام متحدہ کے تعلیمی، سائنسی، اور ثقافتی ادارے

کے تعاون سے اس کا ایک نیا ایڈیشن شائع کیا گیا ہے، جو دنیا کے بہترین جواہر پاروں کے سلسلے کی کڑی ہے۔

عالمی زبان کی مہم:- نومبر میں اقوام متحدہ کے سکریٹریٹ کے سامنے ایک تجویز پیش کی جائیگی کہ عالمی زبان کی حیثیت سے "اسپرانٹو" زبان کا انتخاب کرلیا جائے۔ اس تجویز پر دس لاکھ افراد کے دستخط ہیں اور تقریباً ۴ہزار اداروں نے اس کی حمایت کی ہے، جن کی رکنیت چھ کروڑ ۷۴ لاکھ ہے۔ یہ تجویز عالمی زبان کا مسئلہ حل کرنے کے لئے پیش کی گئی ہے۔ ادارہ اقوام متحدہ ابتک غیر سرکاری طور پر انگریزی کو استعمال کرتا رہا ہے۔

کتب خانوں کی کمی:- کراچی یونیورسٹی لائبریری سائنس ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام یکم اکتوبر کو ایک مجلس مذاکرہ منعقد ہوئی جس کا موضوع تھا۔ "کراچی میں لائبریریوں کی ضرورت" مذاکرے کی صدارت جناب عدنان احمد علی نے کی اور جن مقررین نے اس میں حصہ لیا ان میں ڈاکٹر امیر حسن صدیقی۔ ڈاکٹر اے موئد، ایس دی حسین اور سید ریاض احمد کے نام قابل ذکر ہیں۔ مذاکرہ میں تمام مقررین نے کراچی میں کتب خانوں کی شدید کمی پر افسوس کا اظہار کیا اور تجویز پیش کی کہ یہاں زیادہ سے زیادہ کتب خانے قایم کیئے جائیں۔ ایک تحریک میں کتب خانوں کی ترقی کے لئے ٹیکس لگانے کی تجویز بھی پیش کی گئی۔ یہ ٹیکس تفریحی ٹیکس کا جزو شمار کیا جائیگا۔

اخبار ناطق:- سوئیڈن کے تقریباً تین سو نابینا افراد کے لئے ایک بولنے والا اخبار شائع کرنے کا انتظام کیا گیا ہے۔ یہ اخبار دو گھنٹے تک خبریں سنا سکتا ہے۔ یہ دو گھنٹے کا اخبار دراصل ٹیپ ریکارڈ ہوگا۔ نابیناؤں کی سویڈش انجمن اس اخبار کی ایک ہزار کاپیاں "شائع" کریگی۔ یہ اخبار واپسی کی شرط پر دیئے جائینگے جس کو نابینا دو یا تین دن اپنے پاس رکھ سکیں گے۔

علاقائی کتابوں پر انعامات:- ادارۂ مصنفین پاکستان حلقہ مغربی پاکستان نے اعلان کیا ہے کہ ۶۶-۱۹۶۵ء کے دوران علاقائی زبانوں پنجابی، سندھی، اور پشتو میں شائع شدہ بہترین کتابوں پر چھ ہزار روپے کے انعامات دیئے جائینگے۔ اعلان میں کہا گیا ہے کہ تینوں علاقائی زبانوں کے حصہ نظم کے لیئے ایک ہزار روپیہ کے انعامات مخصوص کئے گئے ہیں۔ بشرطیکہ کتاب یکم جون ۱۹۶۴ء اور ۳۰ جون ۱۹۶۶ء کے درمیان چھپی ہو۔ مقابلے کی کتابیں سکریٹری گلڈ ۵۲ منٹگمری روڈ لاہور کے پتے پر روانہ کی جائیں۔

قرآن کریم کے مزید ترجمے:- ایک اطلاع کے مطابق تھائی زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ تکمیل پا چکا ہے اور اشاعت کے مراحل میں ہے۔ یہ ترجمہ جناب ابراہیم قریشی نے کیا ہے۔ موتمر عالم اسلامی کے ایک اعلان میں بتایا گیا ہے کہ جنوبی افریقہ میں بولی جانے والی دو زبانوں افریقان اور زولو میں بھی قرآن کے تراجم تکمیل پا چکے ہیں۔ یہ دونوں تراجم جنوبی افریقہ کی انجمن "عالمی تحریک صداقت" کے زیر اہتمام شائع کئے جائیں گے۔

آئینہ خانے میں

ڈاکٹر سید عبداللہ کو خراج تحسین - ڈاکٹر سید عبداللہ پروفیسر پنجاب یونیورسٹی۔ صدر شعبۂ اردو عربی۔ پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور چالیس سال ملازمت کرنے کے بعد ۳۰ ستمبر ۱۹۶۶ء کو ریٹائر ہو گئے۔ آپ نے ۱۹۲۶ء میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے علوم مشرقی کے مسودات کے کیٹلاگر کی حیثیت سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا تھا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے یونیورسٹی کی اس طویل ملازمت کے دوران نہ صرف قابلِ قدر علمی، تعلیمی اور تنظیمی خدمات انجام دیں بلکہ ایک ادیب اور نقاد کی حیثیت سے اعلیٰ مقام بھی حاصل کیا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کو ان کی قابل قدر علمی خدمات کے پیش نظر صدارتی تمغہ اور صدارتی ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ شاہ ایران نے ان کی فارسی زبان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر "نشان سپاس" بھی عطا کیا ہے۔ یونیورسٹی سنڈیکیٹ نے ڈاکٹر صاحب کو اُن کی بے لوث خدمات کے لئے شاندار خراج تحسین پیش کیا ہے۔

پروفیسر آر گاموکی آمد - ٹوکیو یونیورسٹی میں اُردو اور فارسی کے استاد اور مشہور جاپانی عالم آرگامو آجکل پاکستان کے دورے پر آئے ہوئے ہیں۔ آپ نے متعدد اداروں میں لیکچر دیئے ہیں اور کہا ہے کہ مسلمانوں نے نہ صرف مختلف قوموں کی قدیم تہذیب سے استفادہ کیا ہے بلکہ وہ جن ممالک میں گئے ان کی ثقافت کو اپنی اعلیٰ اخلاقی اقدار سے روشناس کرایا اور ان پر گہرے اثرات چھوڑے۔ پروفیسر آرگامو نے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ جاپانی باشندوں میں اُردو پڑھنے کا شوق برابر بڑھ رہا ہے۔ اور گزشتہ ۱۵ سال میں اردو سیکھنے والوں کی تعداد چھ گنا ہو گئی ہے۔ پروفیسر موصوف نے بتایا کہ ٹوکیو یونیورسٹی میں اردو کا شعبہ ۴۳ سال قبل قائم ہوا تھا۔

حلقہ ادب۔ لاڑکانہ - حلقہ ادب لاڑکانہ کا قیام مارچ ۱۹۶۶ء میں عمل میں آیا۔ مشاعروں اور مباحثوں کے علاوہ اس ادارے نے دو اہم اجتماعات منعقد کئے۔ ان میں سے یوم نیاز اور یوم کشمیر قابل ذکر ہیں۔ یوم نیاز کے اجتماع میں ڈاکٹر دلدار حسین فرمان فتح پوری نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ یوم کشمیر کی صدارت وادیٔ مہران کے نامور شاعر حسن حمیدی نے کی۔ اب یہ ادارہ عنقریب ایک کل پاکستان مشاعرہ منعقد کر رہا ہے جس کے انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔ یہ مشاعرہ عالمی شہرت یافتہ شاعر، ادیب اور صحافی جناب فیض احمد فیض کی صدارت میں منعقد ہوگا۔ ملک کے نامور شاعر اس مشاعرہ میں شرکت کر رہے ہیں۔

جی الآنا کا ایک اور اعزاز:- پاکستان کے مشہور انگریزی شاعر جناب جی۔ الآنا کو عالمی یوم شعر کا پاکستان کے لئے ڈائرکٹر مقرر کیا گیا ہے۔ عالمی یوم شعر کئی ملکوں میں منایا جا رہا ہے اور اس نام کے ادارہ کا مقصد شاعر اور شاعری کے ارتقا اور اس کے احترام کو بڑھانے میں مدد دینا ہے۔ جناب الآنا کو اس سے پہلے بھی یونائیٹڈ انٹرنیشنل نے پاکستان کے ملک الشعراء کا اعزاز دیا تھا۔

یادوں کے چراغ

یوم اکبر الہ آبادی:- بزم اکبر پاکستان کے زیر اہتمام ایک جلسہ لاہور میں منعقد ہوا جس میں تقریر کرتے ہوئے سابق مرکزی وزیر چودھری نذیر احمد خاں نے فرمایا کہ اکبر الہ آبادی نے اپنے اشعار کے پردے میں طنز و مزاح کے ذریعے انگریزوں کے خلاف جہاد کیا تھا اور آزادی وطن کی تحریک کو پر و بال عطا کئے تھے۔ انھوں نے ارشاد فرمایا کہ اکبر نے جو کچھ نصف صدی پہلے کہا تھا وہ آج ہمارے سامنے ہے۔ یہ جلسہ اکبر الہ آبادی کی ۵۴ ویں برسی کے موقعے پر منعقد ہوا تھا۔ جلسے سے جن مقررین نے خطاب کیا اُن میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ، ا۔د۔ا۔ظہر اور ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کے نام قابل ذکر ہیں۔

مجلس اقبال کا جلسہ:- لندن کے اسلامک کلچر سینٹر میں مجلس اقبال کے زیر اہتمام ایک جلسہ منعقد ہوا۔ جس کی صدارت برطانیہ میں پاکستان کے ہائی کمشنر جناب افضل اقبال نے فرمائی۔ مجلس اقبال کا یہ جلسہ یوم قائد اعظم پر منعقد ہوا تھا۔ جس میں سینکڑوں پاکستانیوں نے شرکت کی۔ جلسہ سے خطاب کرنے والوں میں جناب شریف بقا صاحب نے مجلس اقبال کی طرف سے قائد اعظمؒ کے حضور خراج عقیدت پیش کیا۔

عبدالماجد کی یاد میں:- ریڈیو پاکستان کے ممتاز فنکار اور ڈرامہ نگار عبدالماجد مرحوم کی پہلی برسی پر ایک جلسہ عام کراچی میں ہوا۔ جس کی صدارت جناب ذوالفقار علی بخاری صاحب نے فرمائی۔ اور کہا کہ عبدالماجد ریڈیو پاکستان کی جان تھے۔ جلسے سے مولانا احتشام الحق تھانوی صاحب نے بھی خطاب کیا اور کہا کہ ماجد شہید ہوئے ہیں کیونکہ انھوں نے ملک و قوم کی خدمات انجام دیتے ہوئے قابل افتخار یادیں چھوڑی ہیں۔ جلسے میں ایک قرارداد کے ذریعہ صدر پاکستان سے ماجد مرحوم کے پسماندگان کے لئے مستقل وظیفہ کی اپیل کی گئی ہے۔

ماتم میں ہم شریک

شاد امرتسری چل بسے :- ملک کے ادبی حلقوں میں یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سُنی گئی کہ مشہور خوشگو شاعر جناب شاد امرتسری کا انتقال اچانک اور بے وقت ہوگیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر صرف ۴۲ سال تھی۔ وہ ریڈیو پاکستان حیدرآباد میں اسسٹنٹ ٹیکنیکل ڈائرکٹر تھے۔ بیماری کی وجہ سے حیدرآباد سے لاہور آگئے تھے۔ شاد امرتسری اردو کے ذہین اور جدید شعراء میں ایک خاص اہمیت کے مالک تھے اور اپنی خوشگوئی اور شرافت کی وجہ سے ہر دل عزیز تھے۔ اُن کا مجموعۂ کلام ابھی کچھ عرصہ پہلے شائع ہوا تھا۔ ادارۂ قومی زبان شاد امرتسری کے پسماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔

سندھ کے مشہور ادیب کا انتقال :- سندھ کے مشہور ادیب اور شاعر رئیس ضیا الدین احمدؒ ۵ ستمبر کو انتقال فرما گئے۔ ضیاء الدین احمدؒ صاحب کو قانون میں بھی ایک ممتاز حیثیت حاصل تھی اور سندھی اور اردو دونوں زبانوں میں ایک خاص اور ممتاز لکھنے والے شمار ہوتے تھے۔ مرحوم نے علی گڑھ سے ایم۔ اے اور ایل ایل بی کیا تھا۔ اور دادو کالج میں وائس پرنسپل تھے۔۔۔۔ ضیاء الدین احمدؒ بہت مقبول شخصیت تھے اور دادو کی بزم شعراء کے نائب صدر اور بار ایسوسی ایشن کے صدر بھی تھے۔

رام سوامی آینگر کی وفات :- بھارت کے مشہور ادیب اور مدبّر راما سوامی آینگر لندن میں انتقال کر گئے۔ ان کی عمر ۸۶ سال تھی۔ رام سوامی آینگر بھارت کی ان ممتاز اور مشہور شخصیتوں میں شمار ہوتے تھے جن سے ساری دنیا واقف تھی۔ اور پاک و ہند کا ہر پڑھا لکھا آدمی اُن کے نام سے آشنا ہے اُنھوں نے ساری عمر اپنے نظریات اور تحریروں سے عوامی تحریکوں کو آگے بڑھانے میں مدد دی تھی۔

آئینۂ ھند

اُردو کی حمایت :- کانگریس کے مرد آہن اور بھارت کے ممتاز لیڈر جناب کامراج نے زور دیا ہے کہ یو۔ پی اور بہار میں اُردو کو سرکاری زبان کی حیثیت فوراً دیدی جائے۔ اس سلسلہ میں مسز اندرا گاندھی بھی کامراج سے اتفاق کر رہی ہیں۔ لیکن انتہا پسند جماعتیں اس کے خلاف شدت سے سرگرم عمل ہیں۔ اور اس کو کانگریس کا ایک انتخابی ہتھکنڈہ سمجھ رہی ہیں۔

مغربی بنگال میں اردو:- مغربی بنگال کے مسلمانوں نے صوبائی حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ تمام امتحانات میں اردو میں سوالات کے جواب دینے کی سہولتیں انھیں مہیا کی جائیں۔ ٹائمز آف انڈیا کی خبر کے مطابق یہ اپیل مسلم کانفرنس کے اختتام کے بعد کی گئی ہے اور اس سے مغربی بنگال میں اُردو کی غیر معمولی مقبولیت کا پتہ چلتا ہے۔

اردو صوبہ بنانے کا مطالبہ:- آل انڈیا تنظیم تحفظ اردو نے بھارت میں اردو صوبہ بنانے کے متعلق ایک یادداشت صدر کانگریس، وزیر اعظم ہند اور چیف کمشنر دہلی کو پیش کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ دلّی میں نہ صرف عوامی اکثریت اُردو بولتی ہے بلکہ وہاں سے شائع ہونے والے اخبارات بھی ۹۰ فی صد اردو میں شائع ہوتے ہیں۔ یادداشت میں کہا گیا ہے کہ اُردو دنیا کی پانچویں بڑی زبان ہے اور ہندوستان کے تمام حصّوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یادداشت میں اردو کو جلد از جلد دہلی کی سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر بارکر دہلی میں:- یکم ستمبر ۶۶ ۱۹ء کو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی درخواست پر میگل یونیورسٹی کینیڈا میں اردو کے معلم ڈاکٹر محمد عبدالرحمن بارکر پوسٹ گریجویٹ انسٹی ٹیوٹ کے شعبۂ اردو میں تشریف لائے اور انھوں نے میگل میں اردو زبان وادب کی تعلیم پر تقریر کی۔ جلسے کی صدارت جناب ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے کی۔ ابتدائی کلمات ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے کہے۔ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کا شمار اُردو کے چوٹی کے علماء میں ہوتا ہے۔ عابد صاحب نے ہندوستانی تہذیب، مسلمانوں کی تاریخ پر جو کام کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ عابد صاحب نہ صرف اعلیٰ پائے کے عالم ہیں بلکہ ایک مثالی انسان بھی ہیں۔ اس نمائشی دور میں ان کی ذات خاموش علمی خدمت کی بہترین مثال ہے۔

ڈاکٹر محمد عبدالرحمن بارکر کے بارے میں ڈاکٹر نارنگ نے کہا کہ میگل یونیورسٹی کے ادارۂ علوم اسلامیہ کی شہرت اپنے ٹھوس علمی کام کی وجہ سے نہ صرف پورے عالم اسلام میں بلکہ پوری دنیا میں ہے۔ بارکر صاحب اس ادارے میں اردو زبان اور ادب کی تعلیم دیتے ہیں۔ امریکہ اور کینیڈا میں اردو کا کام ابھی چند سال پہلے شروع ہوا ہے۔ اس لئے وہاں کے اسکالروں سے ابھی ہم کو زیادہ توقعات وابستہ نہیں کرنا چاہیئے۔ لیکن بارکر صاحب وہاں کے واحد اسکالر ہیں جو نہایت صحیح اردو اچھی خاصی روانی کے ساتھ بول لیتے ہیں۔ اُردو کی خدمت بارکر صاحب کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ بنیادی طور پر بارکر صاحب ماہر لسانیات ہیں۔ لیکن زبان کے ساتھ ساتھ وہ ادب میں بھی نہایت گہری دلچسپی لیتے ہیں۔ وہ پہلی بار ہندوستان میں ۱۹۵۰ء میں "فل برائٹ اسکالر" کی حیثیت سے آئے تھے۔

اسی زمانے میں انھوں نے اردو سیکھنی شروع کی۔ وہ مشرف بہ اسلام بھی ہو چکے ہیں اور ان کی اہلیہ محترمہ بھی ہندوستانی ہیں۔ ان کی کوششوں سے میگل اردو کا ایک اہم مرکز بنتا جا رہا ہے۔ جس میں اردو کی تقریباً دس ہزار کتابیں اور کئی نایاب نسخے جمع ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر بارکر نے اپنی تقریر میں بتایا کہ ادارہ علوم اسلامیہ میں جو زبانیں پڑھائی جاتی ہیں اردو ان میں ایک ہے۔ اور اسے کئی طلبا بڑی دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اردو کی کتابیں اور قلمی نسخے جمع کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ اور وہ چاہتے ہیں کہ میگل کو اردو تعلیم کا اہم ترین مرکز بنا دیں۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ غیر ملکیوں کو اردو پڑھانے کے لئے انگریزوں نے جو کتابیں لکھی تھیں ان کا طریقہ کار اس قدر پرانا ہے کہ وہ کتابیں نئی ضرورتوں کا ساتھ نہیں دے سکتیں۔ امریکہ میں نصابی کتابوں کے تیار کرنے کا کام شروع ہو چکا ہے لیکن ادارۂ علوم اسلامیہ میں وہ اپنا نصاب خود تیار کر رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اس سلسلے میں وہ تین کتابیں تیار کر رہے ہیں۔ پہلی اردو زبان کا ابتدائی بنیادی نصاب ہوگی جس کے ذریعے بول چال کی زبان اور اردو رسم الخط سکھایا جائے گا۔ شروع شروع میں رومن حروف استعمال کئے جائیں گے۔ بعد میں اردو حروف سکھائے جائیں گے۔ ڈاکٹر بارکر نے اردو کے لئے رومن حروف کی مثالیں بھی دیں۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی دوسری کتاب اردو کی اخباری ریڈر ہوگی۔ جس میں پاکستان کے اردو اخباروں کی زبان کے نمونے ہوں گے۔ اور جس سے سماجی علوم کے طلبا استفادہ کر سکیں گے۔ ان کے کام کی تیسری شق اردو کی صحافتی زبان کا WORDCOUNT ہے۔ جس میں انھوں نے ایک لاکھ تیس ہزار الفاظ کی فہرست بنا کے یہ تجربہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو میں کون سے الفاظ زیادہ استعمال ہوتے ہیں اور کون سے کم۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ امریکہ میں اردو کی جو نصابی کتابیں ملتی ہیں وہ یا تو بہت ابتدائی ہیں یا پھر ان کی زبان اچھی خاصی ادبی ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ونشر کا جو نئی ریڈر تیار کر رہے ہیں اس سے یہ کمی پوری ہو جائے گی۔ آخر میں ڈاکٹر بارکر نے بعض نایاب قلمی نسخوں کی رنگین سلائیڈز دکھائیں جو مانٹریال میں محفوظ ہیں۔ انھوں نے شعرائے اردو کے ایک تذکرے کا بھی پتہ ... دیا جو سورت میں لکھا گیا تھا اور جس کے مصنف کے شیفتہ سے تعلقات تھے۔ نیز انھوں نے ایک غیر مطبوعہ دکنی مثنوی کے بھی عکس پیش کئے جو پیغمبر اسلام کی شان میں ہے اور جو انھیں کینیڈا کے ایک کتب فروش سے ملی۔ اس کے علاوہ انھوں نے کلیات سودا، سحر البیان، باغ و بہار اور بعض دوسرے قدیم مخطوطات کی تصویریں دکھائیں اور مسلمانوں کی مصوری پر تبصرہ کیا۔ ڈاکٹر بارکر نے بعض وصلیاں بھی دکھائیں اور خطاطی کے نمونے بھی دکھائے۔ ڈاکٹر بارکر کی تقریر کے بعد جلسے کے صدر ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے ہندوستان میں اردو کے موقف پر بھی اپنے بیش قیمت خیالات پیش کئے اور بتایا کہ وہ اس کے مستقبل سے مایوس نہیں ہیں۔ آخر میں ڈاکٹر قمر رئیس صاحب نے صدر جلسہ اور مہمان محترم کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ بارکر صاحب کی زبان دانی لائق رشک ہے اور آج ان کی باتیں سن کر اپنی زبان کا احترام ہمارے دل میں کئی گنا بڑھ گیا۔ (مرسلہ : امیر اللہ شاہین۔ سیکریٹری بزم ادب)

ابو سلمان شاہجہانپوری

نئے خزانے

پیش نظر اشاریہ ماہ اپریل ۷۶ء اور بعض دیگر مہینوں کے رسائل اور اخبارات کی مدد سے مندرجہ ذیل موضوعات کے تحت ترتیب دیا گیا ہے

- اردو ادب وزبان ـ تحقیق وتنقید اور مسائل
- آپ بیتی
- تاریخ
- تعلیم وتدریس
- تہذیب وتمدن
- سیاست
- سیروسیاحت
- شخصیات
  - علامہ اقبال
  - دیگر شخصیات
- صحافت
- عالم اسلامی اور اس کے مسائل
- کتابیات
- مذہبیات
  - قرآنیات
  - سیرت
  - مسائل ومباحث
- وفیات
- مطبوعات جدیدہ (نئی کتابوں اور رسالوں پر تبصرے)

اس اشاریہ کی ترتیب میں مندرجہ ذیل رسائل و اخبارات سے مدد لی گئی ہے

	رسالہ	مقام	شمارہ		رسالہ	مقام	شمارہ
ماہنامہ	ادب لطیف	لاہور	اپریل ۷۳ء	ماہنامہ	فکر و خیال	کراچی	مارچ و اپریل ۷۳ء
"	اردو زبان	سرگودھا	" "	"	قومی زبان	"	اپریل "
"	ارژنگ	پشاور	مارچ اپریل "	"	کتابی دنیا (اقبال نمبر)	"	" "
"	البلاغ	بمبئی	" "	"	گل خنداں	لاہور	" "
"	الرحیم	حیدرآباد	اپریل "	"	ماہ نو	کراچی	" "
"	الشجاع	کراچی	" "	سہ ماہی	مجلہ الجامعہ	ربوہ	جنوری تا مارچ "
"	برہان	دہلی	" "	ماہنامہ	نگار	کراچی	مارچ اپریل "
"	پیام عمل	لاہور	" "	"	نیرنگ خیال	لاہور	اپریل "
"	تجلی	دیوبند	" "	ہفت روزہ	آئین	"	" "
"	تحریک	دہلی	" "	"	المنبر	لائل پور	" "
"	ترجمان القرآن	لاہور	" "	"	چٹان	لاہور	" "
"	تہذیب الاخلاق	"	" "	"	خدام الدین	"	" "
"	چراغ راہ	کراچی	" "	"	ساغر	کراچی	" "
"	جامعہ	دہلی	" "	"	شہاب	لاہور	" "
"	ساقی	کراچی	" "	"	صدق جدید	لکھنؤ	" "
"	سب رس	حیدرآباد دکن	فروری تا اپریل "	"	قندیل	لاہور	(بشمول اقبال نمبر) "
"	سیارہ	لاہور	اپریل "	"	لاہور	لاہور	اپریل "
"	سیارہ ڈائجسٹ	"	" "	روزنامہ	انجام	کراچی	(صرف جمعہ اور اتوار ایڈیشن)
"	شاعر	بمبئی	" "	"	جنگ	"	(بشمول اقبال نمبر)
"	صبح امید	"	" "	"	حریت	"	" "
"	صحیفہ	لاہور	" "	"	کوہستان	لاہور	(اقبال نمبر ۲۱ ر اپریل ۷۳ء)
"	عارف	"	" "	"	مشرق	"	" "
"	فروغ اردو	لکھنؤ	" "	"	نوائے وقت	"	" "

اردو ادب (تحقیق و تنقید)

ابن الحسن	قومی شعور اور ادب	قومی زبان، ص ۲۴ تا ۳۴، اپریل
احمد دین مرحوم، مولوی	ادبی نوادر (رازونیاز)[1]	" " ، ۵۵ تا ۶۰، "
اعجاز صدیقی	اردو ادب میں مشترکہ تہذیب و تمدن	شاعر، ص ۲۳ تا ۲۷، "
افتخار حسین، آغا	"کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ" پر ایک نظر	نگار پاکستان، ص ۶۹ تا ۷۳، مارچ اپریل
اکرام چغتائی، محمد	دکنی ادب	اردو زبان، ص ۷ تا ۱۵، اپریل
اوکاکورا کاکوزا		
صمدانی نقوی (مترجم)	فن سے لطف اندوزی	قومی زبان، ص ۳۵ تا ۴۱، اپریل
آصف، ظفر احسن	حسرت کی غزل گوئی	نگار پاکستان، ص ۶۰ تا ۶۷، مارچ اپریل
آغا بابر	آغا حشر کے زمانے کے تھیٹر	نیرنگ خیال، ص ۱۲ تا ۱۵، اپریل
پریم ناتھ، ڈاکٹر	عقلیت کا مفہوم	نگار پاکستان، ص ۷ تا ۱۱، مارچ اپریل
جاوید وششٹ، پروفیسر	محمد قلی قطب شاہ کا رنگ تغزل	سب رس، ص ۲۳ تا ۲۴، اپریل
جمال کرتپوری	قطب شاہی دور میں تلگو کی سرپرستی	" ، ۵۴ تا ۶۰، "
حبیب احمد صدیقی	اردو کی ایک عریاں مثنوی (خواب و خیال)	نگار پاکستان، ص ۸۲ تا ۹۵، مارچ اپریل
حسرت کاسگنجوی	اداس نسلیں (ایک ناول)	" " ، ۱۳ تا ۵۷، " "
خالدی، ابوالنصر محمد	چند دکنی مثنویاں	سب رس، ص ۱ تا ۱۰، جنوری فروری
دیوانہ، ڈاکٹر موہن سنگھ	شاہ حسین کے خیالات اور اس کا تصوف	قندیل، ص ۲، ۱۰، اپریل
راجا راؤ	کچھ افسانے کے بارے میں	ارژنگ، ص ۹۸ تا ۱۰۹، مارچ اپریل
رشید حسن خاں	امیر مینائی کے ادبی خطوط	صحیفہ، ص ۴۳ تا ۵۲، اپریل
زاہدہ ابوالحسن	محمد قلی کی شاعری — ایک ادبی جائزہ	سب رس، ص ۹ تا ۲۲، "
سہیل بخاری	اردو اور مسلمان	صحیفہ، ص ۱۲ تا ۳۳، "
شکیل احمد صدیقی، محمد	امیر خسرو کی شاعرانہ عظمت	فروغ اردو، ص ۱۲ تا ۲۵، "

---

[1] مولوی صاحب مرحوم کا ایک قدیم مضمون

شاہد۔ضیا۔شہزاد	اشارات، تاثرات، سخنہائے گفتنی [1]	ساقی، اپریل
شمس مرادآبادی، محمد عابد	جگر مرادآبادی کے عشق کا پہلا سفر	چٹان، ص ۵، ۱۱ر "
شمیم اختر	ادب وسائنس اور زندگی	انجام، ص ۲، ۱۸ر "
شمیم حنفی	فراق گورکھپوری سے ایک ملاقات	نگار پاکستان، ص ۴۴ تا ۵۱، مارچ اپریل
شوکت سبزواری، ڈاکٹر	عوامی ادب کی تخلیق	قومی زبان، ص ۱۳ تا ۳۴، اپریل
طیب انصاری، ملک زادہ	معانی — جدید رجحانات کی روشنی میں	سب رس، ص ۲۳ تا ۲۸، "
عبدالحلیم چشتی، محمد	سید احمد شہید کی تحریک کا اثر اردو ادب پر	الرحیم، ص ۸۰۹ تا ۸۱۲، "
عتیق احمد	رسم الخط اور زبان کا تعلق	نگار پاکستان، ص ۲۲ تا ۲۸، مارچ اپریل
عروج قادری	حافظ کی غزلیں	چراغ راہ، ص ۳۰ تا ۴۳، اپریل
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر	مغرب کی شاہکار نظموں میں افسانوی عناصر	نگار پاکستان، ص ۳۵ تا ۴۵، مارچ اپریل
قاسمی، احمد ندیم	ادب میں جدید وقدیم کی بحث	ارژنگ، ص ۳۷ تا ۴۸، " "
قیوم نظر	امانت لکھنوی کا نظریۂ شعر	صحیفہ، ص ۹ تا ۲۰، اپریل
مبشر علی، پروفیسر	ابلیس کا تصور	الشجاع، ص ۳۸ تا ۴۰، "
محمد افضل	زبان وخطاطی	اردو زبان، ص ۱۶ تا ۱۹، "
محمود ہاشمی	نئے ذہن کی جلاوطن آبادیاں	ادب لطیف، ص ۴۶ تا ۴۷، "
مفتون کوٹوی	شوکت تھانوی کی مزاح نگاری کے چند عوامل وعناصر	شاعر، ص ۲۲ تا ۲۵،
منظر اعظمی	اردو شاعری اور عصری تقاضے	جامعہ، ص ۱۹۲ تا ۲۰۶، اپریل
ندیم، صلاح الدین	ادب میں ابلاغ کا مسئلہ	اردو زبان، ص ۴ تا ۶، "
وحید قریشی، ڈاکٹر	مولانا محمد علی جوہر کی شاعری	قومی زبان، ص ۷ تا ۳۰، "
وفا راشدی	وحشت کی نثر	نیرنگ خیال، ص ۹ تا ۱۱، "
ہارون خاں شروانی، پروفیسر	حالی کی شاعری اور حب الوطنی	نگار پاکستان، ص ۵۶ تا ۶۷، مارچ اپریل
یوسف حسین، ڈاکٹر	خواجہ حسن نظامی بحیثیت انشاپرداز	حریت، ص ۵، ۱۰ر اپریل

---

[1] ساقی کا پیش نظر شمارہ سید فیضی کے منظوم رزم نامے پر مشتمل ہے۔ ان عنوانات کے تحت شاہد احمد دہلوی، ضیا جالندھری اور شہزاد احمد نے ان کے کلام اور شخصیت پر اظہار خیال کیا ہے۔

	آزاد کی تشبیہوں اور استعاروں کی فنی عظمت	سب رس، ص ۴ تا ۱۷، جنوری

آپ بیتی یا خود نوشت سوانح

بخاری	بخاری کی سرگزشت ۳ تا ۶	حریت، ص اپریل[1]
سوئیکارنو، صدر انڈونیشیا	سوئیکارنو کی کہانی خود ان کی زبانی	" " "[2]
مریم جمیلہ	میرا مطالعہ	سیارہ، ص ۵۷ تا ۶۲، "

تاریخ

اطہر مبارک پوری، قاضی	تاریخ قصبہ مبارک پور	البلاغ، ص ۴۹ تا ۵۸، مارچ اپریل
اکرام الحق، شیخ	قدیم ملتان کے آثار	جنگ، ص ۶، ۳۰ اپریل
جواد علی، ڈاکٹر		
نثار احمد فاروقی مترجم	تاریخ طبری کے ماخذ	برہان، ص ۲۲۴ تا ۲۳۲، اپریل
حفیظ الرحمٰن صدیقی	ارسطو کے نظریات پر خوردبین کی ضرب کاری	فکر و خیال، ص ۴۲ تا ۲۸، مارچ
رئیس احمد جعفری	تاریخ پاکستان کی جھلکیاں	انجام، ص اپریل[3]
سراج علی خاں، میر	قطب شاہی سلاطین کی رواداری	سب رس، ص ۱۹ تا ۲۲، اپریل
ظفر، مظفر احمد	بڈشاہ	سیارہ ڈائجسٹ، ص ۴۶ تا ۴۹، اپریل
عبدالرؤف رحمانی، مولانا	جب اسلام کارفرما تھا	تجلی، ص ۱۶ تا ۴۴، اپریل
عقیل دانش	علی گڑھ تحریک یا سرسید تحریک	فکر و خیال، ص ۲۹ تا ۳۳، مارچ
غریب	آج کا حجاز	صدق جدید، ص یکم و ۱۵ اپریل
غلام ربانی	قطب شاہی مقبرے	سب رس، ص ۸ تا ۱۱، اپریل
فدا، گلزار احمد	تحریک پاکستان اور تحریک کشمیر چھوڑ دو	جنگ، ص ۵، ۳۱ مارچ
فضل قریشی	سعودی عرب	" " ۲، ۲۰ اپریل

[1] ۳ اپریل، ۱۱ اپریل صک ۱۸ اپریل صٹ ۲۵ اپریل صٹ میں شائع ہوئی۔

[2] ۲۸ مارچ ۱۹۶۰ سے شروع ہوتی اور روزانہ شائع ہو رہی ہے۔ [3] ۲، ۹، ۱۶ اور ۲۳ اپریل کے نمبروں میں

مصنف	عنوان	ماخذ
محمد، سید نصیر شیخ	تاج محل کی تعمیر اور اس کے معمار	نگار پاکستان، ص ۲۵ تا ۲۹، مارچ اپریل
محی الدین احمد	قطب شاہی بادشاہوں کے رفاہی کام	سب رس، ص ۱۶ تا ۱۸، اپریل
نجید، حمید اصغر	۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء — جلیانوالہ باغ	چٹان، ص ۱۹، ۱۸ اپریل
نسیم اختر	ارسطو کے نظریات	عارف، ص ۲۳ تا ۲۵، ؍
	حکومت سعودیہ کا تاریخی پس منظر اور ہیئت ترکیبی	المنبر، ص ۵ تا ۱۰، ۲۲ اپریل

تعلیم وتدریس

مصنف	عنوان	ماخذ
اشتیاق حسین قریشی	جامعہ کراچی کا سالانہ جلسہ تقسیم اسناد کا خطبہ	انجام، ص ۳، ۱۸ اپریل
آربتھر، ڈاکٹر ڈبلیو	مطالعہ کے بنیادی اصول	فکر و خیال، ص ۵۶ تا ۶۸، اپریل
رشید احمد بٹ	چین کا جدید طرز تعلیم	جنگ، ص ۱۱، ۱۳ مارچ
عبدالغفور چودھری	سماج اور استاد	تہذیب الاخلاق، ص ۵۰ تا ۶۱، اپریل
عشرت حسین عثمانی، ڈاکٹر	پاکستان میں سائنس کی تعلیم	حریت، ص ۶، ۱۳ اپریل

تہذیب وتمدن

مصنف	عنوان	ماخذ
راماکرشنا، ڈاکٹر لاجونتی	جشن شاہ حسین	جنگ، ص ۲، ۱۱ اپریل
محمد ظہیر	سندھ کی قدیم اقوام کی رسمیں	عصمت، ص ۲۰۵ تا ۲۰۸، اپریل

سیاست

مصنف	عنوان	ماخذ
راشدی، پیر علی محمد	مشرق و مغرب	جنگ، اپریل[1]
رافعہ حسن، سیدہ	مصر میں یہ کیا ہو رہا ہے؟	المنبر، ص ۹، ۱۵ اپریل
عبدالحمید غازی	برطانوی انتخابات	لاہور، ص ۷ تا ۱۲، ۱۸ ؍
مودودی، مولانا سید ابوالاعلیٰ	کشمیر - ایک المیہ - ایک سوال - ایک آتش فشاں	آئین، ص ۹ تا ۱۹، ۲۲ اپریل

---

[1] ۲، ۹، ۱۶، ۲۳ و ۳۰ اپریل ۷۰ء

سیر و سیاحت

ابراہیم جلیس	کراچی سے بیروت تک	انجام، ص ۵، ۱۱ راپریل[1]
محمد سعید، حکیم	میں نے چین کا سفر کیوں کیا؟	حریت، ص ۵، یکم "
وجاہت علی، سید	۷۰ روپے میں سیر جہاں	انجام، ص ۳ "

شخصیات

علامہ اقبال

ابراہیم جلیس	اقبال کا پیغام (اداریہ)	انجام، ص ۵، ۲۲ راپریل
ابو سلمان شاہجہانپوری	کراچی میں پہلا یوم اقبال ۔ ۱۹۳۸ء کا ایک یادگار اجلاس	جنگ، ص ۲۲ راپریل
اجمل نیازی	اقبال اور عشق رسول	مشرق، ص ۷، ۲۱ "
احمد میاں، احمداد	صرف اسلام نے آڑے وقتوں میں مسلمانوں کو زندہ رکھا	کوہستان، ص ۹، ۲۱ راپریل
اختر امرتسری، عبدالرؤف	عطیہ بیگم ۔ علامہ اقبال کی دعوت	انجام، ص ۲۲ راپریل
اختر جمال	عطیہ اور اقبال	جنگ، ص ۲، ۲۲ "
اختر جمال خانم	نوائے وقت	قندیل، ص ۱۲، ۲۲ "
اختر، شیر محمد	تعلیمات اقبال	" " ۲۳، ۲۳ "
اختر وارثی	آغا حشر کاشمیری اور ان کی نظم شکریہ یورپ	کتابی دنیا، ص ۸ تا ۹، "
اختر وسیم قریشی	اقبال ۔ ترجمان حقیقت	حریت، ص ۳، ۲۲ "
اقبال	قومیں شاعروں کے دلوں میں جنم لیتی ہیں ۔ حضرت علامہ کی ذاتی ڈائری سے چند اقتباسات	کوہستان، ص ۱۰، ۲۱ راپریل
اقبال	سودیشی تحریک اور رہبران اسلام ۔ ایک نایاب تحریر	جنگ، ص ۲، ۲۲ "

---

[1] " ۱۸، ۲۵ و ۳۰ راپریل

اشتیاق حسین قریشی، ڈاکٹر	یادگار اقبال کا سالانہ خطبہ[1] (۱)	شہاب، ص ۸ تا ۹، ۲ر اپریل
	اقبال کے دو غیر مطبوعہ خطوط بنام مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی	ماہ نو، ص ۲۰، اپریل
انعام درانی	تلخ و شیریں	جنگ، ص ۳، ۲۲ر "
برنی، ضیاء الدین احمد	بیاد مجلس اقبال	کتابی دنیا، ص ۱ تا ۲، اپریل
شبیر احمد، میاں	اقبال اور اہل پاکستان	نوائے وقت، ص ۷، ۱۳ر "
بقا، پروفیسر محمد شریف	عورت اقبال کی نظر میں	قندیل، ص ۱۵، ۲۲ر "
تحسین سروری	حیدرآباد اور اقبال — دو یادگار جلسوں کی روداد	جنگ، ص ۱۳، ۲۲ر "
جلیل قدوائی	یاد اقبال	قومی زبان، ص ۵ تا ۱۰، "
حاتم علوی	اقبال پر کی اشتراکیت آمیز تقریریں	ساغر، ص ۵، ۲۱ر "
حامد مجید	غیر فانی شاعر	قندیل، ص ۶، ۱۷، ۲۲ر "
حسن عسکری فاطمی	علی بخش سے ایک ملاقات	حریت، ص ۵، ۲۲ر "
حسن عطا، شاہ	اقبال اور بیداری ایشیا	کتابی دنیا، ص ۳ تا ۵، "
حسنین کاظمی	اقبال اور مردان خدا کا آستانہ	انجام، ص ۵، ۲۲ر "
خلیق قریشی	اقبال	نوائے وقت، ص ۸، ۲۱ر "
خورشید، ڈاکٹر عبدالسلام	خطبہ الٰہ آباد اور اس کا پس منظر	مشرق، ص ۷، ۲۱ر "
"	اقبال اور ملت اسلامیہ کا نصب العین	جنگ، ص ۳، ۲۲ر "
درویش	سرآمد روزگار	نوائے وقت، ص ۵، ۲۱ر "
ڈار، بشیر احمد	حلاج — رومی اور اقبال	حریت، ص ۴، ۲۲ر "
"	اقبال فکر اور اقبال اکیڈمی	جنگ، ص ۲۲ر "
راحت حسین، خواجہ	علامہ اقبال اور اجماع	ساغر، ص ۷، ۲۱ر "
رحمت فرخ آبادی	اقبال اور عورت	نگار پاکستان، ص ۱۰، مارچ اپریل
رئیس امروہوی	نذر اقبال (نظم)	جنگ، ص ۲، ۲۲ر اپریل
زینب النساء بیگم	کلام اقبال کی آفاقیت	قندیل، ص ۱۰، ۲۲ر "

[1] پنجاب یونیورسٹی کی ایک مجلس میں پڑھا گیا

ساقی، ف۔م	اقبال اور بہار اکردار	ساغر، ص ۳تا ۴، ۲۱؍اپریل
سرور آل احمد	اقبال کا پیغام	فروغ اردو، ص ۴تا ۱۱، "
سلیم احمد	ضرورت ہے ایک اقبال کی	چراغ راہ، ص ۶تا ۱۲، "
سلیمان ندوی، علامہ سید	باپ کی محنت کا معاوضہ ادا کر دیا — اقبال کی زندگی کے دو اہم واقعات	کوہستان، ص ۱۰، ۲۱؍اپریل
سلیمہ سلطانہ بیگم، پروفیسر	شاہیں صفت ہیں تیرے نوجواں	ساغر، ص ۱۰تا ۱۱، ۲۱ر "
شاہد حسین درانی	اقبال اور اسلامی تصورات	حریت، ص ۶تا ۷، ۲۲ر "
شفا، حکیم محمد یحییٰ خاں	اقبال فہمی	نیرنگ خیال، ص ۹تا ۴۴، "
شمیم اختر	اقبال کا تصور مملکت — اور قومی زبان	انجام، ص ۲۲؍اپریل
ضمیر بخاری، سید	اقبال کا فلسفۂ غم (نظم)	" ۲۲ر "
طاہر جمیل نقوی	علامہ اقبال کا پیغام — نوجوانوں کے نام	جنگ، ص ۷، ۲۳ر "
عاشق حسین بٹالوی، ڈاکٹر	اقبال کے استاد — سر ٹامس آرنلڈ	قندیل، ص ۹، ۲۴ر "
عاصم، محمد سرور	معلم اقبال مولوی میر حسن	مشرق، ص ۱۱، ۲۱ر "
عبدالحق، بابائے اردو مولوی	بیاد مجلس اقبال[۱]	قومی زبان، ص ۳تا ۸، "
عبدالحق قریشی	علامہ اقبال — عظیم مفکر، ادیب اور شاعر	کوہستان، ص ۹، ۲۱ر "
عبدالحکیم مرحوم، خلیفہ	علامہ اقبال سے میری پہلی ملاقات	جنگ، ص ۴+۱۴، ۲۲ر "
عبدالحی قریشی	علامہ اقبال کی شاعرانہ عظمت	مشرق، ص " ، ۲۱ر "
عبداللہ، ڈاکٹر سید محمد	اقبال کے فوراً بعد	چٹان، ص ۶+۱۵، ۲۵ر "
عبداللہ، پروفیسر محمد	ٹیگور اور اقبال کی شاعری میں فلسفۂ موت	سیارہ، ص ۳۴تا ۴۳، "
عبدالواحد	اقبال اور کشمیر	ماہ نو، ص ۱۳تا ۱۶، "
عبدالواحد معینی	شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن — علامہ اقبال کا فلسفۂ شہادت	نوائے وقت، ص ۱، ۲۱؍اپریل
عشرت حسین زبیری مرحوم	اقبال اور مغربی مفکرین	ماہ نو، ص ۵تا ۱۱، اپریل

---

[۱] علامہ اقبال سے متعلق بابائے اردو کی چند مطبوعہ تحریریں یہ مغربی ہفت روزہ لاہور بابت ۲۰؍اپریل کو نقل کیا گیا ہے۔

عروج، عبدالرؤف	اسرارِ خودی کا ایک متنازعہ حصہ	انجام، ص ۲، ۲۲ اپریل
عشرت رحمان	لاہور ریڈیو سے علامہ اقبال کا تاریخی نشری پیغام	مشرق، ص ۱۱، ۲۱ر "
عشرت رحمانی	تعمیرِ ملت اور دانائے راز	کوہستان، ص ۶، ۲۱ر "
غلام سرور	عشقِ رسول اور اقبال	نوائے وقت، ص ۳، ۲۱ر "
فارسٹر		
فضل من اللہ (مترجم)	محمد اقبال	سیارہ، ص ۴۴ تا ۴۷، اپریل
فرحت شاہجہانپوری	اقبال اور اسلامی قومیت کا نظریہ	مشرق، ص ۶، ۲۱ر "
کلیم اختر	نسیمے از حجاز آید کہ ناید	قندیل، ص ۷، ۲۴ر "
گلچیں معانی، آقائے	حدیثِ جاودانی (افکارِ اقبال)	ماہِ نو، ص ۳۰ تا ۳۱، "
محبوب مرشد، سید	علامہ اقبال (یومِ اقبال کی تقریب کا خطبہ صدارت)	چٹان، ص ۴+۱۷، ۲۵ر "
محمد باقر، ڈاکٹر	کیا ہم نے اقبال کے تصورات کو برقرار رکھا ہے	مشرق، ص ۱۱، ۲۱ر "
محمد حسن قریشی، کلیم	اقبال کی بعض نظموں کا پس منظر	جنگ، ص ۱۴، ۲۲ر "
" " "	تحریکِ اتحادِ اسلامی کے فروغ میں اقبال کا حصہ	مشرق، ص ۶، ۲۱ر "
" " "	تذکرہ اقبال	انجام، ص ۲۲ر "
" " "	سلطان المشائخ اور علامہ اقبال	نوائے وقت، ص ۸، ۲۱ر "
" " "	اقبال اور محمد علی جوہر	کوہستان، ص ۹، ۲۱ر "
محمد شفیع، میاں	چودھری محمد حسین مرحوم و مغفور	نوائے وقت، ص ۴، ۲۱ر "
" "	اقبال کے آخری چوبیس گھنٹے	قندیل، ص ۵+۱۷، ۲۴ر "
محمد یحییٰ	اقبال نے اپنے استاد کو محقق بنا دیا	مشرق، ص ۲، ۲۱ر "
محمود الرحمٰن (د پرویز کاکوی)	اقبال بچوں کی بزم میں	جنگ، ص ۳، ۲۲ر "
مرغوب صدیقی	اقبال اور جمہوریت کی نوحہ گری	نوائے وقت، ص ۳، ۲۱ر "
" "	حکیم الامت کو اسلامی اقدار کی سربلندی عزیز تھی	مشرق، ص ۳، ۲۱ر "
" "	اقبال کے فلسفۂ خودی کا سیاسی مفہوم	کوہستان، ص ۵، ۲۱ر "
مسز کمیل میر لوپلے	اقبال برصغیر کا ابراہام لنکن	مشرق، ص ۷، ۲۱ر "
مشفق خواجہ	اقبال پرستی سے اقبال شناسی تک	جنگ، ص ۲۲ر "

مصلح، مولانا ابو محمد	علامہ اقبال سے دو ملاقاتیں	قومی زبان، ص ۹ تا ۱۴، ۱ اپریل
منظور احمد قریشی	اقبال کا بچپن	قندیل، ص ۱۳ تا ۱۴، ۲۴ر "
مہر سلطانہ	یوم اقبال پر ہم کیا کرتے ہیں، کیا کرنا چاہیئے	انجام، ص ۷، ۲۲ر "
ناز، ایس ایم	اقبال کا مثالی معاشرہ — جاوید اقبال سے ایک ملاقات	قندیل، ص ۱۰ تا ۱۲، ۲۴ر اپریل
نذیر بخاری، سید	اقبال کے تصور پاکستان کا مقصد	انجام، ص ۵، ۲۲ر "
نظر، غلام محی الدین	ڈاکٹر سر محمد اقبال	قندیل، ص ۱۴، ۲۴ر "
وارث میر	فلسفہ اقبال کا ایک اہم اور بنیادی پہلو	مشرق، ص ۹، ۲۱ر "
" "	خودی قانون الٰہی کی پابند ہو تو مسلمان ہو جاتی ہے	کوہستانی، ص ۵، ۲۱ر "
واسطی، سید محبوب حسن	اقبال، نئی نسل — مغربیت اور دہریت	انجام، ص ، ۲۲ر اپریل
وحیدہ نسیم	روح اقبال	" " ۳، ۲۲ر "
وسیم احمد بخاری	اقبال روایات کا باغی	گل خنداں، ص ۱۰ تا ۱۲، "
———	اقبال شناسی[1]	قومی زبان، ص ۱۲ تا ۱۴، "
———	جب علامہ اقبال علی گڑھ گئے	جنگ، ص ۴، ۲۲ر "
———	یوم اقبال (اداریہ)	" " ۳، ۲۲ر "
———	علامہ اقبال کے دو غیر مطبوعہ خط (ڈاکٹر مظفر الدین کے نام)	" " ، ۲۲ر "
———	شاعر مشرق کے گھر اور مکتب نے انھیں عظمت کی راہ پر گامزن کیا	کوہستان، ص ۲، ۲۱ر اپریل
———	اقبال اپنے مکتوبات کی روشنی میں	" " ۲، ۲۱ر "
———	اقبال کے فلسفہ کا محور اسلام ہے	مشرق، ص ۲، ۲۱ر "
———	اقبال — اسلام اور عالم اسلامی	نوائے وقت، ص ۳، ۲۱ر "
———	اقبال کی ایک علامت — شاہین	قندیل، ص ۸ + ۱۸، ۲۴ر "

[1] اقبال اکادمی کراچی کے علمی و تحقیقی کاموں اور منصوبوں کا تعارف

دیگر شخصیات

ابراہیم جلیس	اب فخر ماتری کبھی واپس نہیں آئیں گے	حریت، ص ۴تا ۵، ۱۵ر اپریل
ابن انشا	اس یوسف کی قمیص (فخر ماتری کے بارے میں)	" " ۸، ۱۵ر "
احتشام احمد ندوی، سید	ڈاکٹر احمد امین	جامعہ، ص ۶،۷تا ۱۷، ۱۲ر "
اسعد، افق، عثمان، گلزار	تعارف[1]	آئین، ص ۷تا ۹، ۹ر "
اشرف، حکیم عبدالرحیم	صدر عبدالسلام عارف مرحوم	المنبر، ص ۴، ۲۲ر "
اکرام الدین صدیقی، محمد	سٹھ بچن سناؤں (وجہی)	سب رس، ص ۱۳تا ۲۵، فروری
امداد نظامی	حضرت خواجہ غلام فرید	انجام، ص ۹ر اپریل
بیگم فخر ماتری	میرے شوہر	حریت، ص ۱۹، ۱۵ر "
تاثیر، عبدالحق	پہلا نقاد	ادب لطیف، ص ۵،۷تا ۸۱، اپریل
تحسین سروری	حضرت گنج شکرؒ	جنگ، ص ۲، ۲۵ر اپریل
جاوید اختر، سید	جان پہچان[2]	ادب لطیف، ص "
حسن عطا، شاہ	خورشید درخشید وہ..... (ابوطیب محمد مصطفیٰ مرحوم)	ماہ نو، ص ۴۳تا ۴۶، "
خالد، علاؤالدین	میرا دوست فخر ماتری	حریت، ص ۶، ۱۵ر اپریل
رخسانہ ماتری	میرے ڈیڈی فخر ماتری	" " ۹، ۱۵ر "
رفعت القاسمی	حکیم الشعراء حضرت امجد حیدرآبادی	انجام، ص ۱۲، ۱۱ر "
رئیس احمد جعفری	ابو نصر فارابی	تہذیب الاخلاق، ص ۳۶تا ۴۹، اپریل
شمیم احمد	شاہد احمد دہلوی[3]	نیرنگ خیال، ص ۳۳تا ۳۵، "

---

[1] حکیم عبدالرحمان ہاشمی، گوہر صدیقی، مولانا نیاز اللہ خاں، مولانا غلام محمد صاحب کا ان حضرات نے تعارف کرایا ہے اسعد گیلانی، عثمان غنی، افق، گلزار احمد۔

[2] اس عنوان کے تحت مندرجہ ذیل شعرا اور ادبا کا تعارف کرایا گیا ہے۔ احسان دانش، عبدالحمید عدم، احمد ندیم قاسمی، عبدالحمید ارشد، زہرہ جبیں مصطفوی، تبسم کاشمیری۔

[3] منقول از قومی زبان کراچی

سریواستوا، گوری سرن لال	بھگتی تحریک کے ممتاز شعرا	نگار پاکستان، ص ۹۲ تا ۹۴، مارچ اپریل
شمیم، مظفر حسین	فخر ماتری مرحوم	حریت، ص ۹ ، ۱۵ اپریل
شورش کاشمیری	خواجہ حسن نظامی	چٹان، ص ۴+۱۶، ۱۱ ر ،،
صباح الدین عبدالرحمان	عرشی صاحب	تحریک، ص ۵ تا ۱۰، ،،
ضیاء الحسن فاروقی	علامہ شبلی — مورخ کی حیثیت سے (۲)	جامعہ، ص ۱۷۱ تا ۱۹۱، ،،
عابد حسین، سید	عرشی صاحب	تحریک، ص ۳ تا ۴، ،،
عقیل دانش	مصور فطرت خواجہ حسن نظامی	انجام، ص ۱۲ ، ۱۱ ر ،،
کشفی، سید ابوالخیر	ماتری صاحب	حریت، ص ۱۰ ، ۱۵ ر ،،
محمود بریلوی	بن برکہ	الشجاع، ص ۱۴ تا ۱۶، ،،
مسیح الزماں، ڈاکٹر	ہاشم علی برہان پوری	سب رس، ص ۸ تا ۱۳، جنوری
منشور	اکبر الہ آبادی	نگار پاکستان، ص ۶۹ تا ۸۱، مارچ اپریل
میر مسعود، ڈاکٹر	حیات مرزا رجب علی بیگ سرور	سب رس، ص ۳ تا ۱۴، فروری
نسیم احمد فریدی امروہوی	حضرت شاہ عبدالرحیم فاروقی دہلوی	الرحیم، ص ۵۵۷ تا ۵۹۷، اپریل
نصراللہ خاں، محمد	مولانا رحمت علی سامی مرحوم	چراغ راہ، ص ۵ تا ۸، ،،
نورالحسن	حضرت امام غزالیؒ	جنگ، ص ۳ ، ۱۶ اپریل
وجاہت حسین سونی پتی	آغا شاعر قزلباش	ماہ نو، ص ۱۷ تا ۲۲ + ۴۸، ،،
	ہمارے قلمی رفیق — پروفیسر محمد عبداللہ و اسعد گیلانی	سیارہ، ص ۷۸ تا ۷۹، اپریل

صحافت

مذاق فاروقی	اودھ پنچ اور حیدرآباد	سب رس، ص ۵ تا ۱۰، فروری
ضیاء الحسن موسوی	سعودی عرب کی صحافت	جنگ، ص ۶ ، ۲۰ اپریل

عالم اسلامی اور اس کے مسائل

امتیاز الدین حسین	دنیائے اسلام میں اتحاد	عصمت، ص ۱۹۱ تا ۱۹۲، اپریل

خلیل احمد حامدی	رابطۂ عالم اسلامی	ترجمان القرآن، ص ۵۵ تا ۶۰، اپریل
خلیل الرحمان، میر	سعودی عرب اور پاکستان	جنگ، ص ۵، ۲۰ اپریل
فیصل شاہ	دعوت اتحاد اسلامی	" " ۳، ۲۰ "
کلیم اختر	شاہ فیصل اور تحریک رابطۂ عالم اسلامی	قندیل، ص ۶، ۱۷ "
مودودی، مولانا سید ابوالاعلیٰ	عالم اسلام کا اتحاد	آئین، ص ۲۰ تا ۲۱، ۲۲ "
نثار احمد زبیری	پاکستان اور عالم اسلام	" ۶ تا ۷، ۱۶ "

کتابیات

ابوسلمان شاہجہانپوری	نئے خزانے (اکتوبر کے رسائل کا اشاریہ)	قومی زبان، ص ۱۷ تا ۶۸، اپریل
برنی، ضیاء الدین احمد	رسالوں پر طائرانہ نظر (مضامین کا تعارف)	کتابی دنیا، ص ۶۲ تا ۶۹، "
بیدار، عابد رضا	علوم اسلامیہ کی ایک انسائیکلوپیڈیا (برہان کے مضامین کا اشاریہ)	برہان، ص ۲۴۱ تا ۲۵۶، اپریل
رفیعہ سلطانہ، ڈاکٹر	دکنی ادب کی چند غیر مطبوعہ لغات	سب رس، ص ۳ تا ۷، جنوری
غلام مصطفیٰ قاسمی	شاہ ولی اللہ کی تالیفات پر ایک نظر	الرحیم، ص ۷۶۶ تا ۷۷۴، اپریل
گوہر نوشاہی	گنج الاسرار ـــ اردو کی ایک قدیم مثنوی	صحیفہ، ص ۵۳ تا ۷۰، "
ـــــــ	انجمن کا کتب خانۂ عام[1]	قومی زبان، ص ۵۰ تا ۵۱، "

مذہبیات

قرانیات

بشارت علی صدیقی، محمد	قرآنی عمرانیات	تہذیب الاخلاق، ص ۵ تا ۲۲، اپریل
زاہد الحسینی، مولانا، ترتیب محمد عثمان غنی	درس قرآن (۳)	خدام الدین، یکم و ۲۹ اپریل
عبدالقادر، شیخ	قرآن حکیم پر مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات	مجلہ الجامعہ، ص ۹ تا ۲۴، جنوری تا مارچ
علی نقی النقوی، علامہ	تفسیر قرآن	پیام عمل، ص ۹ تا ۱۰، اپریل

[1] موضوع وار کتابوں کی تعداد

ودودی، مولانا سید ابوالاعلیٰ	سورۃ الحجرات	ترجمان القرآن، ص ۷ تا ۳۸، اپریل
ــــــ	کتاب اللہ کے اہم تراجم (دنیا کی زبانوں میں)	البلاغ، ص ۴۱ تا ۵۴، مارچ اپریل

سیرت

صم صہبائی	سرور عالم کے اسلحہ جنگ	سیارہ ڈائجسٹ، ص ۱۲۸، اپریل
رانی، ابوطاہر	ہمارا آقا صلی اللہ علیہ وسلم	لاہور، ص ۵+۱۱، ۱۸ر "
واحدی، ملا	ازواج مطہرات	" " ۶ تا ۷، ۱۱ر "

مسائل ومباحث

دسلمان شاہجہانپوری	حضرت ایوبؑ اور ان کا صحیفہ	الرحیم، ص ۷۴۹ تا ۷۶۶، اپریل
ینی، مولانا محمد تقی	احکام شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت	برہان، ص ۱۹۷ تا ۲۱۳، "
ور، مولانا عبیداللہ	نماز اور قربانی	خدام الدین، ص ۵ تا ۶، یکم "
" "	صحابہ کرامؓ کی مخالفت	" ۵ تا ۶+۱۰، ۸ر "
" "	عبادات کا مقصود	" ۴+۶، ۱۵ر "
ولک، بوم		
ضل الرحمان مترجم	سود کے نظریات کی تنقیدی تاریخ	برہان، ص ۲۱۴ تا ۲۳۱، اپریل
قب، محمد احمد	رویت ہلال — ایک جائزہ	مجلہ الجامعہ، ص ۳۷ تا ۵۸، جنوری تا مارچ
یل احمد میواتی، مولانا	تصوف کیا ہے؟	خدام الدین، ص ۱۱ تا ۱۲، ۱۰ تا ۱۲، ۱۵، ۹ اپریل
یل، مبارک احمد	حدیث کی روایت وکتابت میں احتیاط	مجلہ الجامعہ، ص ۲۰ تا ۳۶، جنوری مارچ
سن علی جامعی، ملک	اصحاب نبی پر تنقید[1]	چٹان، ص ۵ تا ۱۰، ۱۸ اپریل
عتیق احمد	داعیان حق کی اصل کامیابی	آئین، ص ۶۹، ۹ر "
باد اللہ، گیانی	گرو نانک جی اور اسلام	مجلہ الجامعہ، ص ۷۴ تا ۹۱، جنوری تا مارچ
بدالحمید صدیقی	مذہب اور تجدید مذہب (۳)	ترجمان القرآن، ص ۳۹ تا ۵۴، اپریل

[1] مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے ایک مضمون پر تنقید

عبادت لقوی امروہوی، سید محمد — عربی ہند سے[1] — برہان، ص ۲۳۳ تا ۲۴۰، اپریل

معصومی، ڈاکٹر محمد صغیر حسن — عمر خیام — الرحیم، ص ۵۷۷ تا ۵۸۷، "

مودودی، مولانا سید ابوالاعلیٰ — حج — انجام، ص ۳ راپریل

نذیر احمد کاشمیری، صوفی — اہل تبلیغ سے گزارش (۱) — صدق جدید، ص ۷، ۲۲ر "

وفیات

ظفر نیازی ایڈیٹر ماہنامہ نقاد کراچی کا انتقال — انجام، ص ۲، ۲ راپریل

صدر عارف[2] — حریت، ص ۱۲ر "

راجہ غلام حیدر (ممتاز کشمیری رہنما) — جنگ، ص ۵، ۱۳ر "

مطبوعات جدیدہ (نئی کتابوں پر تبصرے)

نام	مصنف	تبصرہ نگار	حوالہ
ادب اور تعصب	اکبر امامی	ناصر زیدی	ادب لطیف، ص ۱۱۳، اپریل
اردو شاعری کا مزاج[3]	وزیر آغا	اعجاز فاروقی	اردو زبان، ص ۵۲ تا ۵۴، "
اسلامی اصول کی فلاسفی	مرزا غلام احمد (قادیانی)		نگار پاکستان، ص ۱۱۱، مارچ اپریل
اصول قانون	احمد عبداللہ المسدوسی	ض۔ ا۔ ب	کتابی دنیا، ص ۲۴ تا ۲۵، اپریل
اقبال کا مرد مومن	کرم حیدری		ماہ نو، ص ۱۷ تا ۱۹، "
انشائیہ	ڈاکٹر آدم شیخ	غلام رسول	سب رس، ص ۳۹، جنوری

۱۔ ـــــ ایک مضمون "اسلامی علوم کے ہندی مصادر" مطبوعہ برہان بابت ماہ فروری ۱۹۶۹ء کے سلسلے میں

۲۔ ۱۰ راپریل کے تمام اخبارات میں حادثہ کی اطلاع و تفصیل آئی ہے

۳۔ نیز دیکھئے ہفت روزہ قندیل لاہور ۱۰ راپریل ۱۹۶۹ء صفحہ ۱۹

نام	مصنف	تبصرہ نگار	حوالہ
آہنگ (غالب نمبر) [۱]	صہبا لکھنوی (مدیر)	سید اشرف بخاری	ارژنگ، ص ۹۵، مارچ اپریل
انوار قدسیہ	امام عبدالوہاب شعرانی	ضیا	الرحیم، ص ۱۱۳ تا ۱۱۸، اپریل
برگ گل ــ مجاہد نمبر			چٹان، ص ۱۶، ۲۵ر "
بریشم عود	سید عابد علی عابد		ادب لطیف، ص ۱۱۵، "
۳۴ نظمیں	کلیم الدین احمد	ناصر زیدی	" " ۱۱۶، "
تقسیم ہند	حبیب اللہ خاں	" "	" " ۱۱۳ تا ۱۱۴، "
چاند تارا [۲]	غلام عباس		نگار پاکستان، ص ۱۱۱ تا ۱۱۲، مارچ اپریل
چاندنی کی پتیاں	ناصر شہزاد	ناصر زیدی	ادب لطیف، ص ۱۱۴، اپریل
داغ داغ اجالا (ناول)	لیلیٰ قزلباش	محمد عزیز الرحمان	انجام، ص ۳، ۱۸ر "
دشت شام وکف دریا	عبدالعزیز خالد	آذر	ارژنگ، ص ۹۳، مارچ اپریل
دیواریں [۳]	حمید کاشمیری	"	" " ۹۴، " "
رزم نامہ دبیر	سرفراز حسین خبیر لکھنوی	میر لٹیین علی خاں	سب رس، ص ۳۹، فروری
زخم گل (نظم)	سرشار صدیقی		نگار پاکستان، ص ۱۱۰، مارچ اپریل
زراعت اور ہماری معیشت	قمر الحسن صدیقی	ض-ا-ب	کتابی دنیا، ص ۲۳، اپریل
سائنس نامہ	محشر بدایونی		نگار پاکستان، ص ۱۱۰ تا ۱۱۱، مارچ اپریل
کربل کتھا [۴]	فضل علی فضلی	م-ا-ص	سب رس، ص ۳۴ تا ۳۵، فروری
شام وشفق (مجموعہ رباعیات)	ڈاکٹر سلام سندیلوی		شاعر، ص ۹۴ + ۹۶

[۱] نیز دیکھیے ن-ش کے قلم سے انجام کراچی ۳ر اپریل ۶۱ء

[۲] نیز دیکھیے روزنامہ انجام کراچی ۳ر اپریل ۶۱ء

[۳] نیز دیکھیے ماہ نو کراچی بابت ماہ اپریل ۶۱ء ص ۲۶ تا ۳۲۔ آفاق ہاشمی کے قلم سے

[۴] نیز دیکھیے روزنامہ انجام کراچی ۳ر اپریل ۶۱ء

[۵] نیز دیکھیے شاعر بمبئی جلد ۳۰ نمبر ۴ ص ۹۴

نام	مصنف	تبصرہ نگار	حوالہ
قاسم کی مہندی	سید قاسم محمود	فضل من اللہ	سیارہ، ص ۷۴ تا ۷۵، اپریل
قانون معاہدہ	کلیم الدین انصاری	ص - ا - ب	کتابی دنیا، ص ۲۵، ″
کتب خانوں کی تنظیم	صادق علی خاں		فکر و خیال، ص ۶۰، ″
کیف صہبا	ابوالخیر سید ابراہیم حسینی صہبا	ضیاء الدین احمد شکیب	سب رس، ص ۳۷ تا ۳۹، فروری
لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر	مولانا تقی الدین امینی	صغیر احمد	برہان، ص ۲۵۵ تا ۲۵۶، اپریل
لمحوں کے بھنور	آغا اشرف	رامش ممتاز	اردو زبان، ص ۴۷ تا ۵۰، ″
ماحول (ناول)	شیدا امام		انجام، ص ۳ر اپریل
مثنوی قبلہ نما	کاوش بدری	م - ا - ص	سب رس، ص ۳۷، جنوری
مجموعہ قوانین اسلام جلد اول	تنزیل الرحمان		الرحیم، ص ۱۲۸ تا ۱۳۸، اپریل
مجموعہ وصایا اربعہ	محمد ایوب قادری مرتب	ص - ا - ب	کتابی دنیا، ص ۳۳، ″
معیار الحق	مولانا سید نذر حسین محدث دہلوی مرحوم	-	چٹان، ص ۱۶، ۲۵ر اپریل
مکاتیب امیر مینائی	مولوی احسن اللہ خاں ثاقب مرتب	پرلیسین علی خاں	سب رس، ص ۳۹ تا ۴۴، فروری
میر انیس	محمد حسین حسان	م - ا - ص	″ ″ ۳۶، جنوری
ہماری مصوری	خواجہ منظور احمد	-	فکر و خیال، ص ۶۲، اپریل
کتاب کا رپلی کیشنز رامپور کی مطبوعات[1]	-	م - ا - ص	سب رس، ص ۳۶ تا ۳۷، فروری

[1] مندرجہ ذیل کتابوں پر تبصرہ ہے

(۱) پرلاغانہ از تحسین سروری

(۲) رسوم دہلی از سید احمد دہلوی

(۳) چاچکن از سید امتیاز علی تاج

(۴) انارکلی پر ایک نظر از آنسہ روح افزا رحمان

(۵) شیر کیا سوچتا ہے از سید رفیق حسن

سہ ماہی

اردو

اکتوبر ۶۶ء کا شمارہ شائع ہوگیا ہے

مندرجات

قیمت صرف تین روپے پچاس پیسے

سالانہ قیمت ۱۲ روپے

انجمن ترقی اردو - بابائے اردو روڈ کراچی

آکسفورڈ اسٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری

کے

خاص ایڈیشن

کی چند

خصوصیات

- یہ لغت ماہر علماء کی ایک جماعت کے تعاون سے تیار ہوئی۔ اس لئے اس کی جامعیت، افادیت اور صحت مطالعہ کو درجہٴ استناد حاصل ہے۔
- اس میں انگریزی زبان کے تمام مروجہ الفاظ کے معانی دیئے گئے ہیں۔
- انگریزی الفاظ کے صرف اردو مترادفات درج کرنے پر ہی اکتفا نہیں کی گئی بلکہ ضرورت کی جگہوں پر الفاظ کی تشریح بھی کی گئی ہے۔
- اس بات کا پورا اہتمام کیا گیا ہے کہ انگریزی محاورے یا روز مرہ کے لئے اردو محاورہ یا روزمرہ انگریزی مثل کے لئے اردو مثل اس طرح درج کی جائے کہ انگریزی کا صحیح مفہوم پوری طرح ادا ہو جائے۔
- انگریزی الفاظ کے معانی کے نازک فرق بھی اردو مترادف الفاظ سے ظاہر کئے گئے ہیں۔ جو الفاظ کے مختلف اور متعدد معنی ہیں وہاں معانی کا نمبر شمار دیا گیا ہے تاکہ معانی کا امتیاز صاف طور پر نظر آسکے۔ ہر معانی کا فرق مثالیں دیکر واضح کیا گیا ہے۔
- طباعتی حسن کے ساتھ صوری اعتبار سے بھی خاص ایڈیشن اپنی مثال آپ ہے۔ اسے اعلیٰ نوعیت کے بائبل پیپر پر چھاپا گیا ہے۔ یہ کاغذ خاص طور پر اسی ایڈیشن کے لئے درآمد کیا گیا ہے۔

یہ ایڈیشن

محدود تعداد میں شائع کیا گیا ہے اس لئے اپنا نسخہ جلد از جلد حاصل کر لیں

ایک ساتھ دو نسخے منگوانے پر محصول ڈاک معاف۔

انجمن ترقی اردو پاکستان کا ماہوار ترجمان

قومی زبان

جلد ۲۹ شمارہ ۶

دسمبر ۱۹۶۶ء

سالانہ قیمت
دس روپے

قیمت فی پرچہ
ایک روپیہ

انجمن ترقی اُردو پاکستان
بابائے اُردو روڈ
کراچی

فہرست

زیرِ تعمیر اردو کالج کے لئے عطیّات

صدر انجمن جناب اختر حسین نے زیر تعمیر اردو کالج کے لئے عطیات کی جو اپیل کی تھی اس کے خاطر خواہ نتائج سامنے آرہے ہیں۔ اس مقصد کے لئے ایک روپے اور پانچ روپے کی جو رسیدیں چھپوائی گئی تھیں وہ مختلف حضرات میں تقسیم کر دی گئی ہیں۔ اب تک اس مد میں۔ مبلغ پینتیس ہزار ایک سو بائیس روپے جمع ہو چکے ہیں۔ جن حضرات نے ذاتی طور پر عطیات عنایت کئے ہیں ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صدر مملکت پاکستان۔	دو ہزار روپے
جناب شریف الدین پیرزادہ صاحب وزیر خارجہ حکومت پاکستان۔	پانچ سو روپے
جناب اعجاز احمد صاحب نیشنل ٹائرز اینڈ ربر کمپنی۔ کراچی۔	دو ہزار روپے
میسرز ریاض فیشنز۔ کراچی	دو سو اکیاون روپے

جن حضرات کے ذریعے رسائد فروخت کی جا رہی ہیں اُن میں مندرجہ ذیل حضرات نے ایک ہزار روپیہ یا اس سے زاید کی رقم جمع کرائی ہے۔

۱ - ڈاکٹر فیروز عباسی صاحب۔ کراچی
۲ - خان بہادر رشید احمد صاحب۔ لاہور
۳ - کرنل عطاء الرحیم صاحب پرنسپل اردو کالج۔ کراچی
۴ - جناب یعقوب پٹیل صاحب کراچی

مندرجہ ذیل حضرات نے پانچ سو روپے یا اُس سے زاید کی رقم جمع کرائی ہے۔

۱ - جناب حامد حسین صاحب کراچی۔
۲ - جناب اشرف ریاض صاحب کراچی۔
۳ - پروفیسر خلیل اللہ صاحب کراچی

مندرجہ ذیل حضرات نے ڈھائی سو روپے یا اس سے زائد کی رقم جمع کرائی ہے

۱ - بیگم رضیہ غلام علی صاحبہ -	کراچی
۲ - کرنل ذوالفقار علی صاحب -	کراچی
۳ - جناب زاہد حسین صاحب -	کراچی
۴ - جناب ڈی قریشی صاحب	کراچی
۵ - جناب بیگم اکبر حسین	کراچی
۶ - جناب چودھری محمد حسین صاحب	ملتان

صدر مملکت کا عطیہ

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صدر مملکت پاکستان نے زیر تعمیر اردو کالج کے لئے دو ہزار روپے کا گراں قدر ذاتی عطیہ عنایت فرمایا ہے۔ صدر محترم ابتدا ہی سے اس قومی ادارے سے دلچسپی لے رہے ہیں اور اس کا سنگ بنیاد بھی اُنھوں نے رکھا تھا

جناب اختر حسین (ہلال پاکستان)

کتب خانوں کی اہمیت

محترم حاضرین[1]!

میں پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن کے اراکین کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھے قومی لائبریری ہفتہ کا افتتاح کرنے کی دعوت دی۔ میں نے اس دعوت کو اس لئے قبول کیا ہے کہ مجھے بھی لائبریریوں کے سلسلے میں کچھ باتیں عرض کرنی ہیں۔ اس موقع پر جب کہ یہاں ملک کے ممتاز لائبریرین اور اہل علم حضرات موجود ہیں، مجھے یقین ہے کہ میری گزارشات پر توجہ دی جائے گی۔

سب سے پہلے تو میں پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن کو یہ ہفتہ منانے پر مبارک باد دیتا ہوں۔ اس قسم کی سرگرمیاں ملک میں مفید علمی ماحول پیدا کر سکتی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ ایسوسی ایشن آیندہ بھی ایسے مفید کام کرتی رہے گی۔

محترم حاضرین! انسان کی زندگی میں کتاب کی جو اہمیت ہے وہ کسی دوسری چیز کو حاصل نہیں۔ یہ دراصل فکر انسانی کا ایک ایسا آئینہ ہے۔ جو کبھی دھندلا نہیں پڑتا اور یہی وہ واحد ذریعہ ہے جو ماضی، حال اور مستقبل کو ایک دوسرے سے ملاتا ہے۔ فکر انسانی نے مختلف ادوار میں جو مراحل طے کئے ہیں اُن کی روداد کتاب ہی کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہے، لہٰذا اگر ہم کتاب سے کنارہ کشی کر لیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم خود اپنے آپ کو اور اپنی حقیقت کو فراموش کر رہے ہیں۔

علوم و فنون کی اشاعت کے لئے کتب خانوں کی جو ضرورت ہے، اس کے بارے میں کچھ کہنا تحصیل

---

[1] ۲۷ر اکتوبر ۱۹۶۲ء کو کراچی میں قومی لائبریری ہفتہ کا آغاز ہوا جس کا افتتاح انجمن ترقی اردو کے صدر جناب اختر حسین صاحب نے فرمایا۔ موصوف کا خطبہ صدارت پیش کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

حاصل ہے۔ پاکستانی معاشرہ تعمیر نو کے جس مرحلے میں داخل ہو رہا ہے، اس کا تقاضا ہے کہ زیادہ سے زیادہ کتب خانے کھولے جائیں۔ موجودہ کتب خانے بالکل ناکافی ہیں، اگر سرکاری اور تعلیمی اداروں کے کتب خانوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو پاکستان میں ایسے کتب خانے جو صحیح معنوں میں عوامی ہوں، گنتی ہی کے نکلیں گے۔ کتب خانوں کی یہ کمی افسوس ناک ہے۔ حکومت کے ساتھ ساتھ ہمارے ملک کے اہلِ ثروت کو بھی اس طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ میری تجویز ہے کہ ہر شہر اور ہر گاؤں میں کتب خانے کھولنے چاہئیں، اور اس مقصد کے لئے بنیادی جمہوریتوں کی تنظیم کو بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ہر یونین کونسل کے ساتھ اگر ایک اچھا کتب خانہ بھی قائم کیا جائے تو اس طرح عوام کے علمی و تعلیمی ذوق کو بلند کیا جا سکتا ہے۔

کتب خانوں کی تعداد میں اضافہ ہونا تو بہت ضروری ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ دو اہم امور پر نظر رکھنا لازمی ہے اور وہ یہ ہیں کہ اول کتابوں کا انتخاب اور دوسرے مہتمم کتب خانہ یعنی لائبریرین کا انتخاب۔

ہمارے کتب خانوں میں جو کتابیں داخل ہوتی رہتی ہیں، وہ عام طور پر بغیر کسی منصوبہ بندی کے خریدی جاتی ہیں۔ جس کے نتیجے میں اچھی اور مفید کتابیں کتب خانوں میں بار پانے سے محروم رہتی ہیں اور اس کے برعکس سطحی اور ادنیٰ درجے کی کتابوں سے الماریاں بھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ کتابوں کا انتخاب کرنے والے عموماً کتب فروشوں ہی کی رائے پر انحصار کرتے ہیں۔ اور کتب فروش معیار سے گری ہوئی کتابوں کی اشاعت میں اس لئے حصہ لیتے ہیں کہ ان کی فروخت سے تاجرانہ فوائد زیادہ حاصل ہوتے ہیں۔ ان حالات میں کتب خانے بھرے ہوئے ہونے کے باوجود خالی نظر آتے ہیں اور ان کتب خانوں سے سنجیدہ قارئین کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ کتابوں کا انتخاب ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے، اسے محض کتب فروشوں کی پسند ناپسند تک محدود کر دینا بڑی غیر ذمہ دارانہ بات ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ایک ایسی مرکزی مجلس مشاورت بنائی جائے جو ملک کے تمام کتب خانوں کے لئے قابل خرید کتابوں کی سفارش کرے۔ اس مجلس مشاورت میں ملک کے ممتاز اہلِ قلم اور مختلف علوم و فنون کے ماہرین شامل ہوں اور ہر کتب خانے کو اس مجلس مشاورت کی سفارشات پر عمل کرنے کا پابند کیا جائے۔ اس طرح دو فائدے حاصل ہوں گے۔ ایک طرف تو کتب خانوں میں اچھی اور معیاری کتابیں جمع ہو جائیں گی اور دوسری طرف ان کتابوں کے شائع کرنے والوں کی ہمت افزائی بھی ہوگی۔ اور وہ مزید اعلےٰ درجے کی کتابیں شائع کرنے کے منصوبے بنائیں گے۔ ہمارے ملک میں علمی کتابوں کے ناشرین کی جو سقیم حالت ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اور اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ ایسی کتابوں کے گاہک نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ایک اعلیٰ درجے کی کتاب اول تو چھپتی ہی نہایت محدود تعداد میں ہے اور پھر اس کے فروخت ہونے میں بھی عمر نوح درکار ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ ایسی صورت

میں اعلیٰ ادب کے فروغ کا کوئی امکان نہیں ۔ اگر کتب خانے اچھی کتابوں کی مستقل فراہمی پر توجہ دیں تو ملک میں خوش گوار علمی فضا بہت جلد پیدا ہوسکتی ہے ۔

دوسری اہم بات جو خاص توجہ کی مستحق ہے ، وہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں لائبریرین کو کتب خانے کا محافظ سمجھا جاتا ہے اور اس کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ کتب خانے کے انتظامی امور کے علاوہ کسی اور کام میں دلچسپی نہ لے ۔ لائبریرین کی یہ حیثیت افسوس ناک ہے ، کیوں کہ انتظامی امور تو ہر وہ شخص انجام دے سکتا ہے ، جسے دفتری کام کی تھوڑی بہت شُدبُد ہو ۔ لائبریرین کا اصل کام قارئین کی رہنمائی ہے ۔ میرے نزدیک ایک لائبریرین اور ایک استاد میں کوئی فرق نہیں ۔ دونوں کا کام رہنمائی ہے ، اور لائبریرین کا کام اس وجہ سے اور بھی اہم ہے کہ وہ پڑھے لکھے لوگوں کی رہنمائی کرتا ہے ، لائبریرین بننا ایک قومی خدمت بھی ہے ، اگر لائبریرین کی معلومات محدود ہوں گی تو وہ اپنے مقدس فریضے سے کسی طرح عہدہ برآ نہ ہو سکے گا ۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ دوسرے ملکوں میں لائبریرین کا پیشہ وہ لوگ اختیار کرتے ہیں ، جن کا علمی مقام بہت بلند ہوتا ہے ۔ مگر اس کے برعکس ہمارے ملک میں یہ دیکھنے میں بھی آتا ہے کہ بہت سے ایسے لوگ اس پیشے کو اس لئے اپناتے ہیں کہ انھیں کوئی اور کام نہیں ملتا ۔

آپ ہزاروں اچھی اچھی لائبریریاں قائم کر لیجئے ، اگر آپ کے پاس اچھے لائبریرین نہیں ہیں تو ان لائبریریوں کا عدم اور وجود برابر ہے ۔ لہٰذا آپ حضرات سے میری یہ درخواست ہے کہ آپ جہاں اور دوسرے بہت سے مفید کام کر رہے ہیں ۔ وہاں آپ لائبریرین حضرات کی تربیت کا بھی مناسب انتظام کیجئے ۔ تاکہ لائبریریوں سے لوگ زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں ۔

آپ نے اس ہفتے کا جو پروگرام بنایا ہے وہ بہت مفید ہے ۔ جن موضوعات پر آپ نے مذاکرے منعقد کرنے کا اہتمام کیا ہے ، وہ سب ہماری توجہ کے مستحق ہیں ۔ جن اہل علم حضرات کو آپ نے ان مذاکروں میں شرکت کی دعوت دی ہے وہ سب آپ کے مسائل سے پوری طرح واقف ہیں اور وہ اس سلسلے میں جو کچھ بھی مشورہ دیں گے ان پر عمل کرنے سے ہمارے مقصد کو تقویت پہنچے گی ۔ مجھے امید ہے کہ آپ ان مذاکروں کی تمام کارروائی کو کتابی شکل میں محفوظ کر دیں گے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے استفادہ کر سکیں ۔

آخر میں ایک مرتبہ پھر میں آپ حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اس ہفتے کی کامیابی کے لئے دست بہ دعا ہوں ۔

اس انجمن گل میں

انجمن کے سرپرست

جناب نور حسین شاہ صاحب (لاہور) نے مبلغ ایک ہزار روپیہ ادا کر کے انجمن ترقی اُردو کی سرپرستی قبول فرمائی ہے۔

اُردو کالج کے لئے

۳۰ نومبر کو زیر تعمیر اردو کالج کے لئے چندہ جمع کرنے کے لئے اُردو دوستوں اور اردو کالج کے طالب علموں نے ایک جلوس نکالا۔ یہ جلوس شہر کی اہم شاہراہوں سے گزرا جلوس میں جناب مبین الحق صدیقی سابق اسپیکر مغربی پاکستان اسمبلی۔ جناب سیّد محمد تقی مدیر روزنامہ "جنگ" جناب رئیس امروہوی اور اردو کالج کے پرنسپل کرنل عطاء الرحیم نے شرکت کی۔

بچّوں کے ادب کے بارے میں صدر انجمن کے ارشادات

۲۱ نومبر کو قومی مرکز کتاب کی طرف سے کتاب میلے کے اختتام پر ایک خاص تقریب منعقد کی گئی جس میں جناب اختر حسین صدر انجمن ترقی اُردو نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ قومی مرکز کتاب کی طرف سے بچوں کے جو تحریری و تقریری مقابلے کئے گئے تھے، اُن میں انعام پانے والے بچوں کو جناب اختر حسین نے انعامات تقسیم کئے۔ موصوف نے اس موقع پر اپنے خطبۂ صدارت میں بچوں کے ادب کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے یہ کہا کہ ہمارے مصنفین کو بچوں کیلئے بہتر سے بہتر ادب پیش کرنا چاہیے۔ انہوں نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ قومی مرکز کتاب کو ہر عمر کے بچوں کی لسانی استعداد کا جائزہ لے کر الفاظ کی جامع فہرستیں تیار کرنی چاہئیں تاکہ بچوں کے لئے لکھتے وقت مصنفین ان فہرستوں کو پیش نظر رکھیں۔

انجمن ترقی اُردو خواتین پاکستان

بیگم رضیہ پراچہ سیکریٹری انجمن ترقی اُردو خواتین پاکستان اطلاع دیتی ہیں کہ انجمن کا جلسہ بروز پیر بوقت ۴ بجے شام بمقام دفتر انجمن زیر صدارت بیگم محمد شریف صاحبہ منعقد ہوا۔ تلاوت کلام پاک کے بعد اردو کی ترویج و ترقی کے لئے تقاریر ہوئیں۔ بیگم محمد شریف صاحبہ نے اپنی تقریر میں محترم جناب اختر حسین صاحب صدر انجمن ترقی اُردو .... کو ان کے اقدامات پر خراج تحسین پیش کیا۔ جو وہ اُردو کی ترقی۔ انجمن کی فلاح و بہبود اور اُردو کالج کی تعمیر کے سلسلہ میں کر رہے ہیں

اور دعا کی کہ ان کو اپنے نیک مقاصد میں خداوند تعالےٰ کامیابی عطا فرمائے اور اردو کی سرپرستی کے لئے سلامت رکھے۔
جلسے میں خواتین سے یہ اپیل کی گئی کہ وہ اُردو کالج کے تعمیری فنڈ میں زیادہ سے زیادہ چندہ دیکر بابائے اردو مولانا عبدالحق مرحوم کو نذرانۂ عقیدت پیش کریں۔ بیگم رضیہ پراچہ۔ جنرل سیکریٹری انجمن ترقی اُردو خواتین پاکستان

افروایشیائی ادیبوں کے وفد کی آمد

۲۴ نومبر کو افروایشیائی ادیبوں کا وفد انجمن ترقی اردو میں آیا۔ اس وفد میں مندرجہ ذیل ادیب شامل تھے۔

جناب رتنا دیسنا پریا سینا نائکے (سیلون)
جناب وینگ لی سووی۔ چنگ۔ (چین)
جناب احمد محمد خیر (سوڈان)
محترمہ گلوریا آئیونا سینا نائکے (سیلون)
جناب وریا لوڈا کروز (انگولا)

انجمن کے صدر جناب اختر حسین نے وفد کے ارکان سے باہمی دلچسپی کے مسائل پر گفتگو کی۔ اور انجمن کے اغراض مقاصد اور کاموں سے انہیں آگاہ کیا۔

صدر انجمن کا نیا پتہ

انجمن کے صدر جناب اختر حسین اپنے نئے مکان میں منتقل ہو گئے ہیں۔ ان کا نیا پتہ یہ ہے۔ ۲۹۔ اے۔ سن سیٹ بولوارڈ۔ ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی۔
فون نمبر ۵۴۳۲۷

مولانا حامد حسن قادری مرحوم

حیراں شکوہ آبادی

انیسویں[1] صدی کے تغزل اور مرزا داغ دہلی کے فیضان نے بعض خوش فکر شاعر پیدا کئے جو کسی وجہ سے مشہور نہ ہو سکے اور ان کے کمالات منظرِ عام پر نہ آ سکے۔ ہم ایسے ہی ایک سخنور کا تعارف کرانا چاہتے ہیں۔

منشی محمد حسین حیراں " ایم۔ ایچ حیراں " کے نام سے اپنے حلقۂ احباب سے باہر اپنے زمانہ کے دائرۂ علم و ادب میں بھی کافی شہرت رکھتے تھے۔ مشہور مردم خیز مشہر بستی شکوہ آباد کے رہنے والے تھے ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے۔ عربی فارسی کی رسمی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انگریزی میں مہارت پیدا کی۔ اور ۱۹۰۵ء سے ریلوے پولیس میں ملازمت اختیار کر لی۔ ۱۹۱۷ء تک کا زمانہ اندور سینٹرل انڈیا میں گزرا وہاں نواب احسان علی خان بہادر آف باندہ کی علمی صحبتوں میں شریک رہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

حیراں مئے نشاط چھلکتی ہے رات دن — اندور آج کل مجھے دارالسرور ہے

دو رسالے جلوۂ حیراں اور افتخار الملک بھی اپنی ادارت میں کئی سال تک نکالے۔ اس سلسلے میں مہاراجہ اندور اور نواب جاورہ کی سرپرستی کا شرف بھی حاصل ہوا۔ دو ناول شاہدِ یکتا اور کرشمۂ شباب بھی تصنیف و شائع کئے اور حیراں ناولسٹ مشہور ہوئے۔

۱۹۲۵ء میں عہدۂ سب انسپکٹری سے ریٹائر ہوئے اور اس کے بعد ۱۹۴۳ء تک مختلف ریاستوں میں انسپکٹر پولیس رہے۔ ۱۳؍ جون ۱۹۴۹ء کو اپنے وطن شکوہ آباد میں رحلت فرمائی۔

حضرت حیراں مرزا داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ ان کے صاحبزادہ مسٹر شمیم الحسن (منسٹریل آفیسر یو پی پولیس متعینہ آگرہ) نے خمخانۂ عشق کے نام سے حیراں صاحب کا دیوان سفید چکنے کاغذ پر نہایت خوش وضع شائع کیا ہے۔

---

[1] مولانا قادری مرحوم کا یہ مضمون غیر مطبوعہ ہے جو ان کے صاحبزادے جناب راشد قادری کے شکریہ کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔ (ادارہ)

دیوان کے دیباچہ میں شمیم الحسن صاحب نے اپنے والد حیرآں مرحوم کا وہ خط بھی درج کیا ہے جو انہوں نے مارچ ۱۹۰۲ء میں استاد داغ کو شاگردی کی درخواست کے لئے لکھا تھا۔ اور استاد داغ کا جواب بھی شائع کر دیا ہے جو اپریل ۱۹۰۳ء میں منظوری تلمذ کی اطلاع میں تحریر کیا گیا ہے۔ داغ کا خط یادگار اور قابل دید ہے۔

حضرت داغ ... متاخرین کے مسلم استاد اور دہلوی طرز تغزل کی آخری یادگار تھے۔ باوجود بعض قابل تسلیم اعتراضات کے داغ کے لطفِ زبان حسنِ بیان، شوق طبعی و بذلہ سنجی میں کسی کو کلام نہیں اگرچہ داغ کی شوخی ان کے ساتھ ختم ہو گئی۔ لیکن زبان و بیان کا مزہ دوسروں نے بھی پایا۔

اس امر میں حضرت حیرآں شکوہ آبادی بھی کسی سے کم نہ رہے۔ انداز فکر و بیان میں استاد کا اتباع بھی خوب کیا ہے مثلاً :-

خالی کبھی گیا ہی نہیں تیر آہ کا ! ! — گویا جواب ہے یہ تمہاری نگاہ کا

ہر رند بادہ نوش ہے مست مئے الست — ہوتا ہے میکدہ پہ گماں خانقاہ کا

ایک غزل کے چند شعر ہیں۔ بالکل استاد کا رنگ ہے۔

عدو نے جو کی مستند ہو گئی ! — ہماری ہر اک بات رد ہو گئی

کہاں اس کی لذت کہاں میرا دل — یہ قسمت سے داد و ستد ہو گئی

لکھا دفترِ عشق جس روز سے — محبت مرے نامزد ہو گئی !

نہیں بے سبب داغ دل پہ مرے — ترے عشق کی یہ سند ہو گئی

ہوا جب سے حیرآں میں شاگرد داغ
مری شاعری مستند ہو گئی !

اور دیکھئے :-

تم اپنی ذرا زلفِ گرہ گیر تو دیکھو — پہلو میں ہمارا دلِ مضطر نہیں ملتا

جلوے نظر میں ہیں کسی مست شباب کے — جامِ شراب میرے لئے جامِ جم ہوا

ان کی مشقِ ناز کے قابل ہوا — دِل مرا اب درحقیقت دل ہوا

رنگ لائی یہ بیعتِ پیر مغاں ! — شیخ بھی اب مرشدِ کامل ہوا

لیکن حیرؔاں صاحب نے محض استاد داغ کا اتباع ہی نہیں کیا بلکہ اپنے تفکر سے بھی کام لیا ہے اور داغ کے رنگ میں بھی ہے ۔ اور داغ کے رنگ میں بھی نکھار پیدا کیا ہے ۔ فرماتے ہیں ۔

اس روئے تابناک کی تاثیر دیکھنا ہوتا چلا ہے رنگ گلابی نقاب کا
کشتی کی پھر سے نوح بھی تیاریاں کریں کہتا ہے حوصلہ مری چشم پر آب کا

ہمیں بت خانہ میں جلوے نظر آتے ہیں کعبہ کے کہیں کیا اس کو جو کعبہ سے بے نیل ومرام آیا

دل میں غم پنہاں سے نہیں بوند لہو کی اب آگ برستی ہے مرے دیدۂ تر سے

شاعری میں ایک انداز فکر "شعر سازی" کہلاتا ہے ۔ اور ایک نوع کے حسن سے خالی نہیں ہوتا ۔ غالبؔ کا یہ شعر اس فن کا گلدستہ ہے :۔

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاق نسیاں کا

اور امیر مینائی کا یہ شعر اسی شاعرانہ کرتب کا ایک بھرپور دار ہے :۔

انگور میں تھی یہ شے پانی کی چار بوندیں جس دن سے کھنچ گئی ہے تلوار ہو گئی ہے

حیرؔاں مرحوم نے بھی کہیں یہ طرز اختیار کیا ہے فرماتے ہیں ۔

ہزاروں پارۂ دل ہر نفس کے ساتھ نکلے ہیں ۔
صدائے آہ اٹھی ہے دلیل کارواں ہو کر

آہ کو رہبر قرار دینا اور "ہزاروں پارۂ دل" کو کارواں بنانا دلچسپ حسنِ ادا ہے ۔

اس غزل کا ایک اور شعر بھی ایسا ہی ہے :۔

خزاں کے پردے میں گویا بہار تازہ آئی ہے نکلتا ہے دمِ آخر بھی آہ چھچکاں ہو کر

اس غزل کا مقطع فرماتے ہیں :۔

تلمذ ہے مجھے آخر جنابِ داغ سے حیرؔاں جہاں میں کیوں نہ چمکوں آفتاب آسماں ہو کر

اپنی شاعری کے رتبے کو خوب سمجھتے ہیں ۔ اس لئے اس کا اظہار بھی کر دیتے ہیں :۔

بزمِ مشاعرہ میں کیا کیا چمک رہی ہے حیرؔاں تری غزل ہے یا چاند چودھویں کا

یہ حیراں مرحوم کے اتباعِ استاد اور خالص قدیم طرزِ تخیل کا نمونہ تھا۔ اب دیکھئے کہ حیراں نے ذوقِ سلیم سے کام لے کر بدلتے ہوئے رنگِ غزل اور جدید لہجے کا بھی ساتھ دیا ہے۔ فرماتے ہیں :۔

سوزِ غم ہائے محبت زندگی کا ساز ہے — انتہائے عشق گویا زیست کا آغاز ہے
کعبہ و بت خانہ تیرے ذکر سے خالی نہیں — ایک ہی آواز ہے گو اختلافِ ساز ہے

اس غزل میں یہ شعر بھی مزے کا کہا ہے :۔

عاشق و معشوق کا اللہ رے راز و نیاز — کاتبِ اعمال کو بھی جستجوئے راز ہے

اگرچہ کوئی کہنے والا پہلے کہہ گیا ہے :۔

میانِ عاشق و معشوق رمزیست — کراماً کاتبیں را ہم خبر نیست

لیکن حیراں نے یہ کہہ کر تازگی پیدا کر دی ہے کہ ــــــ "کاتبِ اعمال کو بھی جستجوئے راز ہے"
یعنی ناظر تو ہے اور راز معلوم نہیں :۔ خوب کہا !

بیان و خیال کی اور خوبیاں ملاحظہ ہوں :۔

حسنِ تباں اگرچہ ہے اک جلوۂ فریب — ذوقِ سلیم ہے دلِ شیدا لئے ہوئے
ان کے ستم میں پاتا ہوں اک لذتِ لطیف — جیتا ہوں دردِ دل کا سہارا لئے ہوئے
دھرا رہا ہوں داستانِ محبت کی سرگزشت — بیٹھا ہوں گھر میں وسعتِ صحرا لئے ہوئے

ایک غزل کے یہ تین شعر دیکھئے۔ پرانی باتیں نئے لب و لہجہ میں کیا لطف دے رہی ہیں :۔

ناکامیابِ وصل رہے سالکینِ عشق — ہوتی تھی سازگار کوئی عاشقی مجھے !
احساسِ دردِ عشق کے قربان جایئے — محسوس ہو رہی ہے نئی زندگی مجھے
کیا جاں نوازیاں ہیں ستم ہائے دوست کی — اُٹھ اُٹھ کے درد دیتا ہے تسکین سی مجھے

اور لطیف اشعار ملاحظہ ہوں :۔

میری وحشت ارے معاذ اللہ — وسعتِ کائنات کچھ بھی نہ تھی !!
آپ کا حسن کارفرما تھا — عشق کی کائنات کچھ بھی نہ تھی !
عشق نے عمرِ جاوداں بخشی ! — کائناتِ حیات کچھ بھی نہ تھی !

جلوے حرم کے دہر میں ہم دیکھتے رہے — دل میں ترے خیال کو اکثر لئے ہوئے
ہم آشنائے رمزِ حقیقت ہیں ہمنشیں — یارِ فراق بھی ہیں سمجھ کر لئے ہوئے

یہ ہم سے پوچھئے کہ مبصر ہیں حسن کے — کیا شے ہیں آپ اہلِ نظر کے خیال میں
عزت گزینیاں مری ادبِ جستجوئے دوست — کیا کیا ہیں بیعتیں مرے پائے خیال میں

حیراں کا مجموعۂ کلام ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۲ء میں مکمل ہو گیا تھا جو اب ۱۹۵۱ء میں شائع ہو سکا ہے۔ اسی زمانے میں حضرت آرزو لکھنوی جانشین جلال لکھنوی نے یہ قطعہ تاریخ لکھا تھا۔

مشہور ہیں جو حضرت حیراں نادلسٹ — تالیف تازہ ان کی ہے بہ ہم کن شکیب
ہجری یہ سال طبع لکھو اب کا آرزو — مجموعۂ سخن ہے وہ دل چسپ دلفریب

۱۳۳۱ھ

فصلوں میں
کئی گنا اضافہ!
یہ ڈبلیو پی آئی ڈی سی کی کیمیاوی کھادوں کا کمال ہے کہ ان کے استعمال
سے اب ملک کی زرعی پیداوار بہت بڑھ گئی ہے۔
چند اہم خصوصیات:-
یہ زمین کی زرخیزی کو قائم رکھتی ہیں۔
ہر فصل کا عمدہ اور کامیاب ہونا یقینی ہے۔
پودوں کو بیماریوں سے محفوظ رکھتی ہیں۔
پودوں کی جڑیں مضبوط کراتی ہیں۔
چار قسموں کی یہ کیمیاوی کھاد ہر جگہ آسانی سے ملتی ہے اور
اس کا استعمال بھی آسان ہے۔
تیار کرنے والے:-
سوپر فاسفیٹ - لائلپور کیمیکلز اینڈ فرٹیلائزرز لمیٹڈ - لائلپور
الومینیم سائیڈ - پاک امریکن فرٹیلائزرز لمیٹڈ - داؤد خیل
امونیا اور امونیم سلفیٹ - نیچرل گیس فرٹیلائزر
فیکٹری - ملتان
مغربی پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن

علی عرشی ملیح آبادی

علمی نوادر

عہد اورنگ زیب کی اردو نظم

"علمی نوادر" کے عنوان کے تحت قومی زبان میں پچھلے چند شماروں سے ایسے علمی و ادبی مضامین شائع کئے جا رہے ہیں جو سالہا سال قبل مختلف رسائل میں شائع ہوئے تھے، مگر اب "نقش و نگار طاق نسیاں" بن چکے ہیں۔ یہ سلسلہ ہمارے قارئین نے بہت پسند کیا ہے۔ اس مرتبہ محمد علی عرشی ملیح آبادی مرحوم کا ایک مضمون شائع کیا جا رہا ہے جو "دبدبۂ آصفی" حیدرآباد دکن (جلد ۹ شمارہ ۱۲ بابت ۶ ربیع الاول ۱۳۴۴ھ) میں شائع ہوا تھا۔

مدیر

میرے کتب خانے میں اکثر کتابیں نایاب، قدیم، قلمی ہیں۔ منجملہ ان کتب کے ایک کتاب اردو نظم میں ہے ناب کے ابتدائی دو ورق تلف ہو گئے ہیں۔ اس وجہ سے مصنف کا نام وطن وغیرہ معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن اورنگ زیب کی مدح میں ایک قصیدہ ہے، جس کے دیکھنے سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ اس کا مصنف عہد اورنگ زیب میں ہے۔

یہ کتاب تصوف میں ہے اور کسی صوفی مشرب کی تصنیف سے ہے۔ چنانچہ ہم قصیدۂ اورنگ زیب عالمگیر کے بگر مقامات کے چیدہ چیدہ شعر نذر ناظرین کریں گے۔

یہ قصیدہ طولانی ہے۔ ہم نے تھوڑے سلسلہ کے شعر لکھے ہیں۔ اس کے بعد کے اس وجہ سے چھوڑ دیئے ہیں چھی طرح پڑھے نہیں جاتے ہیں۔

اشعار کے انتخاب میں صحت کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

در مدح بادشاہ دین پناہ اورنگ زیب غازی

اب بول توں مدح بادشہ کا — اور اس کی کمالیت کلہ کا
جس کے یو دو بالپن کی عادت — عالمگیری ہے اور عبادت
یک ملک نہیں جو اُن لیا نیں — یک نفل نہیں جو اُن کیا نیں
ایسا نہ ہوا کسی شہاں میں — نا بلکہ بڑے مشائخاں میں
جس ناؤں اہے ابوالمغازی — سلطان اورنگ زیب غازی
دیندار و دلیر اور دانا — یک علم نہ سب منے سیانا
کہتے جو دبیر ہے فلک کا — تدبیر کوں پیر ہے فلک کا
دیکھا او جوشہ کن آئے گا تب — آپس کو قرار طفل مکتب
اب لگ تو کسی نہ رائے پوچھا — بن آپ نہ کس بلائے پوچھا
جی فکر میں یعنی آپنے آئے — بے فکر اُنے ظہور میں لائے
دیکھا جو بچار کے نہیں تھار — رو چار کو آپنا کیا یار
دیوے جو غنیم کے اُپر چل — اللہ کے بل نہ اور کے بل
جس فتح کرے جم آبداری — نصرت تو ہمدا رکاب داری
ذوالقرنین سے کئی وزیر جس پاس — بقراط تو کیا ہے بل بلیتا س
دیکھا نہیں حکم بن کسے دہر — باندھا ہے نبیؐ کے شرع سوں سر
جس دل میں یو دوستی ہے پوری — دے دوست ہی دوست کے حضوری
اُچھ عمر نود برس کی نوخیز — یا دک سے تر نگ بہیر تا تیز
یک جس کی دعا ہزار دعوات — دعوات ہی تس اپر دھرے ہاتھ

چند شعر چھوڑ کر آخر کے دو شعر۔

پیچھے بہی ہوا نہ کوئی ایسا — آگے بہی تو پرسج ہوئے ایسا
اللہ رکھے دل کوں شاد شہ کے — بالا کرے بول بادشہ کے

سبب تصنیف ایں رسالہ

میں کوٹھری چھوڑ بھار آیا — دالان میں اس دنی کے دھایا
جب برس چہار گئے گزر تب — آسا یعنے مُکو دکھائے مکتب
بسم اللہ مجھے کیے کہو یاں — [illegible]

یعنی عقی یتی بہی ذہن زیرک　　جو ذنگ تھے اور جوان پیرک

اس عمر میں عشق جیو میں جاگ　　یوں بیر لیا جو بہیڑ کوں باگ

اس کے بعد اپنا عاشق ہونا نظم کیا ہے ۔ اور اس ضمن میں بہت کچھ رموز اور صوفیانہ نکات بیان کئے ہیں ۔

در شکایت روزگار

اس نظم کو پورا لکھا ہے تاکہ اس وقت کی حالت کا کافی اندازہ ہو سکے ۔

اے بھائی یہ بارہویں صدی ہے　　نیکی کو دبا بدی بدی ہے

ہے آج تو قحط سال ست کا　　چھٹ گیا ہے دہرم سوں دل جگت کا

ٹکڑے پہ جگت کے ناک تیوں ست　　اس ناک کوں نت سوں کیا دیانت

اس درد میں جو ہے کمی کا　　دبلا ہے دیانت آدمی کا

انصاف گیا ہے صاف جگ تی　　اور عدل کی دو نچہ لاف جگ تی

دہرتی پر آدہرم ادک ہوا ہے　　امرت کے بجائے بیک ہوا ہے

اک جیو پہ درد دین کا نین　　یک دل پہ اثر یقین کا نین

ہے ایک سچا ہزار جھوٹے　　یک دھڑ تو ہے بے شمار کھوٹے

اس دور میں ہے کنام نامی　　جو لاکرے دوڑ کے غلامی

چھپ نانوں ایک ٹھانوں پکڑیا　　پکھیا جو کنا نوں نانوں پکڑیا

ناکر کی ہے آرزو نہ فر کی　　صاحب ہے نیستی تفسر کی

ناجائی کوں مائی کا بھروسا　　نا بھائی کوں بھائی کا بھروسا

نا شرم کی خو ہے یک نین میں　　نا دہرم کی بو ہے یک بدن میں

دشمن بھی دسیا نہیں کہیں گھٹ　　اور دوست تو دشمنی کی لٹ پٹ

دل بر میں جو تھے اکڑ اکڑ کے　　بیدل سوں پریت اور پکڑ کے

نا ایک کو دوسرا قبولے　　گرچہ اُسے دوسرا قبولے

پورب کی طرف اگر چلے پیر　　تو جائے مرید اٹھہ دکھن دیر

سنسار میں ہے جو سرد اور گرم　　سو پیر پہ سب دسے برا کم

یعنی رہے جگ کے جھنجھ میں جھوم　　ان یوں جو اچھے تو آن تو معلوم

مِل چار یکس قبول جانے — عین القضا...[51]...پچھانے

اس مول میں توں ہوا ہے پیدا — اس...[52]......ہوا ہویدا

جے کام ترے جو پیش آ گا — بن پانچ کہیں نہ پیش جا گا

کئی مرغ موئے ہیں سو تا سک — بتواس کے پانچ ٹنکے پاتک

اب جیونے تی بھلا ہے مرنا — بہتر ہے جو بلے اجل گزرنا

بہتر جو یو تن کے ٹھاٹ ٹٹ جائے — جانو کے مٹی کے ماٹ پھٹ جائے

اس کھال کوں ڈال جیو جانا — ست[53] دیدیہ دھول دل لبانا

اے خاک توں جل کے بیچ گل جا — اے جل توں اگن کے بیچ جل جا

اے آگ توں بھاگ جیو نکہ بارا — اے باؤ لے جیون اگن کنارا

اے کھول اگاس آپنا گاس — اس پانچ کے کار دل سو وسواس

اے نفس توں نقش آپنا چھل — تجتی سوں اد کیا تو یو مرا دل

اے جیو جھٹک توں تن سوں میرے

اے گیان اٹک نہ من سوں میرے .

در وعظ و نصیحت

چند شعر چھوڑ کے

لی گیان کڑا جو آئے اڑ پر — انصاف اند سوں رکھ جکڑ کر

کچھ خوب نہیں یو بے لگامی — لے کچھ تو پختگی نہ خامی

جا بجا کے شعر جو صاف ہیں .

مت کھول اگر جو کھولنا ہے — تب کھول جو ساچ بولنا ہے

یک جھوٹ سوں دو جہاں لرزتا — دہرتی سوں ل آسمان لرزتا

---

[51] رسالہ کرم خوردہ ہونے کی وجہ سے الفاظ پڑھے نہ جا سکے ۔

[52] صفحے کے کرم خوردہ ہونے کی وجہ سے الفاظ پڑھے نہ جا سکے ۔ اس شعر سے پہلے کے چار شعر بھی اسی وجہ سے درج نہیں کیے جا سکے

[53] اصل میں اسی طرح لکھا ہے ۔

رہ دل میں نہ دے تو اس حسد کوں   جیوں حشر کر احد کے حد کوں

گر کوئی ترے سوں رنج پاگا   تو ہاتھ میں ہے سو گنج جاگا
یو گنج سو کیا تو معرفت ہے   یا اور تری صفا صفت ہے

اسکوں نہ خدا ہی نامی ہے   مُردار ملول مطلبی ہے

پڑرہ نہ پکڑ آسرا کسی کا   نا آس نہ آسرا کسی کا
پڑرہ پکڑ ایک بے خلل ٹھاؤں   پربت مَن ایک ہٹاؤں گڑپاؤں
پربت جو ہوئے ہیں پلے بندی   تو پائے ہیں یہ بلا بلندی

یہ وعظ و پند کا عنوان بہت دور تک ہے، اس کے بعد " در مطلبِ حق " کا عنوان ہے - اس کے بھی چند جا بجا سے لکھے جاتے ہیں -

گئے دیس تو بہت رہے سو تھوڑے   بہتر جو پرت پیا سوں جوڑے
وہ پیو ہے جیو آپنے کا   جیوں ہے بل آپنے بنے کا
وہ پیو جو یو اَجَل یو رندکار   یک طور سوں آپنے کیا بار
وہ پیو جو پالتا ہے کلّ کوں   کا نٹے کوں کرم کرے جو گل کوں
اُس من نہ کہوں ادمن نہ تن ہے   اس من کہوں جس جو من لہن ہے
اس ست تے دوستی رکھا اے من   جس دوست کوں دوست دوست دشمن
اول تجھے ادرج میں سنوارے   سلطاں کئی فوج میں اُتارے

چونکہ انتخاب میں طوالت ہوگئی ہے اس لئے ہم اسی قدر لکھ کر اکتفا کرتے ہیں - صرف آخر کتاب کے چند شعر جس میں کتاب کا سن لکھا ہے - وہ لکھتے ہیں اور وہ شعر جس میں انھوں نے اپنے پیر اور استاد کا ذکر کیا ہے سو

ہجری کتی یہی اکتک برس تھے   بارا اوپر ایک سو برس تھے
تب ہیں الپس کیا ہے بالا   اس جگ میں یو قدرتی رسالا
میں شعر تو بول جانتا نین   یو نپٹ نپٹ سمجھانتا نین
مجھ کوں نہ سفر سبق نہ صحبت   کوکی منے گئی یو عمر اکارت

مانس کوں سیلے سفر سوں مایا — یادے انسان سفر سوں پایا
ہوتا ہے کچھ ایک پیچ نہ گھر سوں — یو آدمی آدمی سفر سوں
دیکھا جو سفر کے صاف اور درد — سو سیا ہی سفر کی گرم ہوا سرد
تن کچھ کرے آپ سے نمایاں — ورنیں تو ہیں جیونکہ چارپایاں

مکتب کوں کس اب تلک گیا نیں — مخدوم سوں کس سلک بہیا نیں
یک حرف مجھے نہ کن پڑا یا — ڈال جہاڑ یا نہ چہر چہرا یا

علت نہیں فضل کوں یو ظاہر — کیا اسکوں مقیم کیا مسافر
جس صف میں نہیں شرع شریفاں — اسلام کے حکم کے حریفاں!
جس صف میں سگل موحداں ہیں — سدگیاں پچھانتے سدا ہیں
جس فی المثل ان منے اول پان — دیوے تو سری سو شاہ برہان
تھا باپ مرا مرید اس گھر — اس گھر سوں کیا الپ کوں گوہر
اس میں مجھے بھی بندگی ہے — مجھ جیوں میں جوت ہو چکی ہے

آخر کا شعر

رکھ اصل پہ جیٹ نہ چھاؤں اوپر — کر ختم خدا کے ناؤں اوپر

سید محمد علی ملیح آبادی
مقیم دکن

اُردو آپ کی۔
اردو کالج آپ کا۔
بابائے اردو کی یادگار، اردو کالج کی زیر تعمیر عمارت میں
ایک اینٹ آپ بھی لگائیے۔

ڈاکٹر عقیل طاہر قدوائی
ایم بی۔ بی ایس (لکھنو)

شوق قدوائی

قبلہ و کعبہ جناب والد صاحب حضرت شیخ طاہر علی قدوائی خلف الرشید حضرت شیخ احمد علی شوق قدوائی مرحوم نے دیوان[1]
وق کے نام سے ۱۹۲۸ء میں زیر طبع سے آراستہ کیا تھا۔ سید مرتضیٰ حسین بلگرامی صاحب نے بڑے اہتمام سے یہ کتاب
قبول المطابع گونڈہ میں چھپوائی تھی۔ اس دیوان کے لئے مقدمہ برادرم مولوی معین الدین[2] انصاری صاحب فرنگی محلی
ریسٹر ایٹ لا لکھنؤ نے بڑی جانفشانی سے اپنی خداداد قابلیت کو بروئے کار لاتے ہوئے تحریر فرمایا تھا۔ اس مقدمہ
کے شروع میں مرحوم شوق قدوائی کی مختصر سوانحعمری بھی شامل کی گئی تھی۔ اس سوانح عمری میں اس قدر اختصار سے کام
یا گیا تھا کہ شوق قدوائی کا پس منظر اور وہ کوائف و حالات جن میں ان کی شاعرانہ شخصیت کی تخلیق ہوئی اور پروان
بڑھی کماحقہٗ شائقین کی نظر کے سامنے نہ آسکے۔ اس کے علاوہ اس میں بہت سی غلطیاں بھی رہ گئی ہیں جن میں مرحوم
ی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات بھی شامل ہے۔ ان غلطیوں کا احساس دیوان کے طبع ہوتے ہی ہو گیا تھا اور والد
ماحب قبلہ نے خیال کیا تھا کہ طبع دوم کے وقت سوانحعمری پھر سے لکھ کر شامل کر دی جائے گی۔ بدقسمتی سے طبع اول
کے اڑتیس ۳۸ سال گزر جانے کے بعد بھی طبع دوم کی نوبت نہ آئی۔

ان اڑتیس سالوں میں بہت کچھ ہو گیا۔ برصغیر کے مسلمانوں کا پیارا وطن پاکستان معرض وجود میں آیا اور قومی زبان
ردو کے شعرا و ادبا کی دن دونی رات چوگنی قدر دانی ہونے لگی۔ اردو ادب کی تاریخ پر اچھی اچھی کتابیں لکھی گئیں اور اردو
کے کتب نصابی کا معیار بہت بلند ہو گیا۔ قدرتاً شیخ احمد علی شوق قدوائی کو اپنی پیاری زبان کے اس زریں دور میں اپنا
با اثر مقام حاصل ہوا۔ اور ان کی زندگی کے حالات تاریخ ادب کے شہ پاروں اور قوم کے نونہالوں کے لئے چھپنے والی
رسی کتابوں دونوں میں شامل کئے گئے۔ بدقسمتی سے یہ حالات زندگی فیضان شوق سے ماخوذ ہیں۔ اور اکثر مصنفین کرام

---

[1] دیوان شوق کا قلمی نسخہ خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ان کے ذاتی کتب خانہ واقع سترکھ ضلع بارہ بنکی میں موجود ہے۔
[2] معین الدین انصاری صاحب شوق قدوائی کی سب سے بڑی نواسی کے شوہر تھے۔

حاشیہ پر اپنے شکوک کا اظہار کرتے ہوئے انہیں کو نقل کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر راقم الحروف نے مصنفین و مؤلفین کرام کی اطلاع کے لئے مختصر مگر صحیح حالاتِ زندگی مرتب کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ اس فرض کی ادائیگی میں والد صاحب قبلہ کی ذاتِ بابرکات مشعلِ راہ ثابت ہوئی اور موصوف خرابیٔ صحت اور ضعفِ پیری کے باوجود خط و کتابت کے ذریعہ رہنمائی فرماتے رہے۔ شوقؔ قدوائی مرحوم کے نامور شاگرد حضرت مولانا منظور احمد انور صدیقی امروہوی صاحب نے بھی بر وقت دستگیری فرمائی۔ اور میں تہہ دل سے اُن کا شکر گذار ہوں۔

اس مختصر مضمون میں عمداً مرحوم کی شاعرانہ صلاحیتوں پر نہ تو رائے زنی کی گئی ہے، اور نہ ان کی کسی تصنیف پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس فرض کو وہ تمام حضرات بڑی سرگرمی سے ادا کر رہے ہیں جن کا یہ حصہ ہے۔ مرحوم کے عادات و خصائل کا بھی ذکر نہیں کیا گیا ہے، وہ بھی اس لئے کہ ان کے مزاج داں اور ان کے واقف کار بہت سے حضرات ابھی تک بقیدِ حیات ہیں اور اس مضمون پر قلم کو جنبش بھی دیتے رہتے ہیں۔

خاندان اور پیدائش

شیخ علی احمد شوقؔ قدوائی مرحوم کا تعلق مضافاتِ لکھنؤ کے مشہور قدوائی[1] خاندان

---

[1] رسالہ نقوش کے آپ بیتی نمبر میں اپنی آپ بیتی تحریر فرماتے ہوئے مخدومی حضرت مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی نے قدوائی خاندان کا یوں تعارف کرایا ہے۔

قدوائی اسرائیلی نسل سے ہیں سلسلۂ نسب لاوی بن حضرت یعقوب تک پہنچتا ہے حضرت ہارون بن عمران کے واسطہ سے مورثِ اعلیٰ قاضی معز الدین معروف بہ قدوۃ العلم والدین کہا جاتا ہے کہ خواجہ اجمیری کے عہد میں ہندوستان آئے اور اجودھیا (کہ اس کا دوسرا تلفظ اودھ ہے) میں آکر مقیم ہوئے۔ اجودھیا اب فیض آباد کے متصل ایک قصبہ ہے اور ہندوؤں کا مشہور تیرتھ۔ قدوائیوں کو اولادِ انبیاء ہونے کی بنا پر ہندوستان کے شیوخ (عثمانی و صدیقی وغیرہ) نے بلکہ خود سادات نے اپنا ہم کفو قرار دیا اور آپس میں شادی بیاہ کا کثرت سے رواج دیدیا۔ قدوائیوں کی نسل لکھنؤ کے قصبہ جگور اور بارہ بنکی کے قصبوں رسولی، بڑا گاؤں، گدیہ، مسولی وغیرہ میں خوب پھیلی اور بڑے بڑے نامور اُن میں پیدا ہوتے رہے۔

عام طور سے قدوائی گھرانے اپنے آپ کو حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد سے سمجھتے ہیں اور ام المومنین حضرت صفیہؓ سے قرابت داری پر نازاں ہیں جیساکہ مولانا دریابادی نے تحریر فرمایا ہے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت یعقوبؑ تک پہنچتا ہے۔ لیکن اس خاندان کے مورث اعلیٰ حضرت قاضی قدوہؒ حضرت عثمان ہارونیؒ کے مرید اور خلیفہ تھے اور اس رشتہ سے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے پیر بھائی۔ اس وجہ سے صوفیائے کرام کے بعض تذکروں میں بھی آپ کے حالات موجود ہیں۔ چنانچہ مولانا محمد خادم حسین زبیری صاحب مراد آبادی نے اپنی کتاب "معین الارواح" میں آپ کی مفصل سوانحیات

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہے تھا۔ آپ سنہ ۱۸۵۲ء میں اپنے آبائی وطن قصبۂ مجگور ضلع لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد شیخ کاظم علی قیس قدوائی اودھ کے ایک ممتاز اور عالی نسب رئیس تھے۔ ان کے اثر و رسوخ کا یہ عالم تھا کہ بادشاہِ وقت حضرت واجد علی شاہ نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں رسائی حاصل تھی اور اکثر شورہ پشت تعلقداروں اور زمینداروں کو سزا دینے کی خدمت سپرد ہوتی تھی۔ شعر و سخن میں وہ میر علی اوسط رشک لکھنوی کے شاگرد تھے اور عنفوانِ شباب ہی میں دیوان مرتب کر لیا تھا[1]۔ شیخ کاظم علی قیس نے صرف تیس سال کی عمر پائی۔ انہیں ایک دن دفعتاً خون کے چند استغراق ہوئے اس کے بعد اسہال بھی ہونے لگے جن میں خون تھا۔ اس طرح چند گھنٹے بیمار رہ کر داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ان کا انتقال سنہ ۱۸۵۵ء میں ہوا تھا۔ اس وقت ان کے بڑے صاحبزادے شیخ احمد علی قدوائی کی عمر ڈھائی سال تھی اور چھوٹے بیٹے شیخ واحد علی

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) تحریر کی ہے اور دس بارہ ماخذوں کے حوالے بھی دیئے ہیں۔ مولانا زبیری قاضی قدوہؒ کے حالاتِ زندگی یوں شروع کرتے ہیں۔

آپ دراصل سید ہیں۔ بادشاہ روم نے جو بنی اسرائیل سے تھا اپنی دختر کی شادی قاضی قدوہ کے والد کے ساتھ کی تھی۔ اس کے بطن سے قاضی قدوہ تولد ہوئے اس سلطانی نسب کے فخر کی وجہ سے لوگ انہیں بھی بنی اسرائیل سے کہتے تھے۔

(دیکھو بحر زخار) . . . .“

[1] قیس قدوائی کا قلمی دیوان اب ناپید ہے لیکن پرانے تذکرہ نویسوں نے جو غزلیں نقل کی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر ان کی عمر نے وفا کی ہوتی تو ان کا شمار بھی اپنے عہد کے مشہور استادوں میں ہوتا۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

حلق پر جب میرے شمشیر پھری — لب پہ آئی ہوئی تقریر پھری
یار نے بار سے لکھا خط کا جواب — نامہ بر پھر مری تقدیر پھری
نکہت زلف معتبر نہ ملی — جو صبا آئی ہے دلگیر پھری
سیمبر گھر سے نہیں میرے پھرا — ہاتھ آئی ہوئی اکسیر پھری
میں وہ مجنوں ہوں کہ صحرا صحرا — وحشتِ دل لئے زنجیر پھری

کس درجہ اوج پر ہے مرے یار کا دماغ — ہے ساتویں فلک پہ ستمگار کا دماغ
ہوتا ہے درد سر لئے صندل کے نام سے — کتنا ضعیف ہے ترے بیمار کا دماغ
دشوار قیس سے ہے ترے دیوان کا جواب — پایا کسی نے کب ترے اشعار کا دماغ

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

قدوائی صرف چند ماہ کے تھے۔ شاہی زمانہ کے دستور کے مطابق ان کی جاگیر یا علاقہ جو خدمات کی بجاآوری کے صلہ میں تھا، ان کی وفات کے بعد ضبط کرلیا گیا۔ البتہ آبائی زمینداری کے کئی مواضعات ان کے خاندان کے قبضہ میں رہے اس جائداد پر[1] ان کے بعد ان کے چھوٹے بھائی شیخ ناظم علی مرحوم مدتوں قابض و متصرف رہے۔

بچپن اور تعلیم و تربیت

والد کے انتقال کے بعد شوق قدوائی کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا بار ان کی والدہ کے کاندھوں پر پڑا۔ تیس قدوائی کا جن حالات میں انتقال ہوا تھا ان کی بنا پر شوق کی والدہ کو خیال تھا کہ ان کے شوہر کو کسی نے زہر دیدیا ہے۔ یہ خیال بلکہ شک انہیں تمام رہا اور اس شدت سے رہا کہ وہ اپنے بچوں کی حفاظت[2] اپنی جان سے زیادہ کرتی تھیں پھر بھی انہوں نے تعلیم و تربیت میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ مولوی عبدالحئی موہانی صاحب جن کا قیام جگور ہی میں تھا ان کے معلم مقرر ہوئے۔ قرآن شریف اور عربی فارسی کی ابتدائی تعلیم شوق نے انہیں بزرگ سے حاصل کی۔ ان کی والدہ کا یہ خوف کہ ان کے بچوں کو بھی دشمن زہر دیدیں گے وہم کی صورت اختیار کرگیا تھا۔ اس لئے پہلے ہی موقعہ پر انہوں نے دونوں بچوں کو وطن سے باہر بھیج دیا۔ ان کے داماد شیخ امیرالزماں صدیقی لبسلسلہ

بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۳

ہجرِ خوباں میں بہاتی ہیں جو دریا آنکھیں — کیا ہوئی تھیں اسی دن کے لئے پیدا آنکھیں

دشتِ غربت میں نہ کس طرح ہوں طوفاں انگیز — کثرتِ گریہ سے ہیں غیرتِ دریا آنکھیں

شعلہ رویوں کا تجسس اسے کیونکر نہ رہے — دل پہ داغ ہے داغوں سے سراپا آنکھیں

خواہشِ دید ہے ان کو نہ تمنائے وصال — رکھتی ہیں پیشِ نظر یار کا نقشا آنکھیں

چھوڑ کر کوئے محبت کو کہاں جاؤں تسیں
اور کوچہ سے نہیں میری شناسا آنکھیں

مندرجہ بالا نمونہ کلام پروفیسر نجم الاسلام صدیقی صاحب نے بڑی محنت سے تلاش کرکے عنایت کیا ہے۔ اس میں پہلی غزل کے اشعار تذکرۂ خوش معرکہ زیبا" از سعادت خاں ناصر سے اور بعد کی دو غزلیں "سراپا سخن" از محسن علی محسن سے نقل کی گئی ہیں۔

---

[1] یہ بیان کہ جائداد ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے دوران تلف ہوئی یا اسے غیر ملکی حکومت نے ضبط کرلیا غلط ہے۔ شوق قدوائی کی موروثی زمینداری اور ان کی جائداد ان کے صاحبزادے کے قبضے میں زمانہ حال تک رہی اور خدا کے فضل سے اس کا ایک تنکا بھی تلف یا ضائع نہیں ہوا

[2] شوق قدوائی کے بچپن کی پریشانی کی وجہ ان کی ڈھائی سال کی عمر میں یتیمی اور اس کم عمری میں موروثی جائداد و زمینداری کی ملکیت تھی۔ اس کا سبب ناداری یا مالی پریشان حالی نہ تھا جیسا کہ بعض تذکرہ نویسوں کی تحریروں سے ترشح ہوتا ہے۔ باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد عزیزوں کی ہمدردی اور محبت کی ضرورت تھی جو ان کو وقت پر حاصل بھی ہوتی۔ مالی امداد کی ضرورت نہ تھی نہ وہ کسی کے شرمندۂ احسان ہوتے۔

ملازمت اناؤ میں تھے چنانچہ یہ لوگ بھی ان کے ساتھ اناؤ میں رہے۔ پھر کچھ عرصہ رام پور میں اور اس کے بعد بدایوں میں قیام رہا۔ جگور سے روانگی کے وقت شوق کی عمر دس گیارہ سال تھی اور ان کا قیام اپنے بہنوئی کے ساتھ سات آٹھ سال رہا۔ اس عرصہ میں بھی ان کی تعلیم کی طرف سے کوئی غفلت نہیں برتی گئی بلکہ باقاعدگی سے یہ سلسلہ جاری رہا۔ بدایوں میں مولانا ابوالحسن صاحب سے انہوں نے علوم عربیہ کی تکمیل کی اور سرکاری ہائی اسکول میں انٹرنس تک تعلیم حاصل کی

عہد جوانی اور قیام لکھنؤ

شیخ احمد علی شوق قدوائی کے چچا شیخ ناظم علی قدوائی مرحوم جگور میں عیش وعشرت سے زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے بڑھتے ہوئے اخراجات کا بار مشترکہ جائداد پر پڑتا تھا اور خاندان کے دوسرے افراد کو تکلیف ہوتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے ایک بہت بڑا موضع فروخت بھی کر ڈالا تھا۔ اس صورت حال سے مجبور ہو کر شوق کی والدہ نے انہیں گھر بلا لیا۔ اس وقت ان کی عمر اٹھارہ سال تھی۔ جگور واپس آکر انہوں نے مصالحت سے جائداد تقسیم کر کے اپنا حصہ الگ کرنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ مجبوراً چچا کے خلاف مقدمہ[۲] دائر کر دیا۔ ان کا مستقل قیام اپنی والدہ کے ساتھ جگور میں تھا لیکن مقدمہ کی پیروی کے سلسلے میں جب شہر (لکھنؤ) جاتے تو اپنے پھوپی زاد بھائی منشی امتیاز علی صاحب کی کوٹھی میں ٹھہرتے تھے۔

اس زمانے میں انہوں نے راجہ صاحب اجودھیا کے یہاں تھوڑے دن ملازمت بھی کی لیکن کام طبیعت کے موافق نہ تھا اس لئے بہت جلد مستعفی ہو کر واپس چلے آئے اور مقدمہ کی پیروی اور جائداد کے انتظام میں مصروف ہو گئے۔

مقدمہ کا فیصلہ چچا کے خلاف اور بھتیجوں کے حق میں ہوا؛ اور اپنی زمینداری پر قبضہ اور اختیار مل جانے کے بعد وہ با اطمینان و فراغت لکھنؤ میں رہنے لگے اور اپنے علمی و ادبی مشاغل میں منہمک ہو گئے

لکھنؤ کے شعراء اور ادیبوں نے مرحوم قیس قدوائی کے فرزند کی حیثیت سے ان کی ہمت افزائی کی اور انہوں نے اس سے فائدہ بھی اٹھایا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ لکھنؤ کے معزز و باوقار حلقوں سے وہ اپنے والد محترم کے اثر و رسوخ اور ہر دلعزیزی کی وجہ سے متعارف[۳] ہوئے۔ لیکن ان کی کامیابی میں ان کی اپنی خوش مزاجی، ذہانت اور سخت کوشی کا بھی اچھا

۱؎ شیخ کاظم علی قیس قدوائی کے والد کا نام شیخ وحدت علی تھا اور شیخ کاظم علی قیس کے دو چھوٹے بھائی اور تھے ان میں شیخ ناظم علی ان کی رحلت کے بعد بقید حیات تھے اور سب سے چھوٹے شیخ سعادت علی بہرائچ میں کسی معرکہ میں شہید ہو چکے تھے۔

۲؎ یہ ایک ناخوشگوار خاندانی واقعہ ہے لیکن اس خیال سے اسے ہدیہ شائقین کیا جاتا ہے کہ شوق قدوائی کی سوانحعمری اور ادب کی میراث ہے اور اس مقدمہ کی ان کے حالات زندگی میں بڑی اہمیت ہے کیونکہ اس کے فیصل ہو جانے کے بعد وہ اس قابل ہوئے کہ شوق قدوائی بن سکیں اور اپنے ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کر سکیں۔

۳؎ لکھنؤ کے اساتذہ نے قیس قدوائی مرحوم کے بیٹے کی حیثیت سے ان کی جو ہمت افزائی کی، اس کی طرف ایک جگہ یوں اشارہ کرتے ہیں

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

خاصا دخل تھا۔ انہیں علم و فضل کی جستجو تھی وہ اس کے لئے سرگرداں رہتے تھے اور ان کے والد کے احباب خندہ پیشانی سے ان کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ تدبیرالدولہ مدبرالملک منشی مظفر علی خاں اسیر لکھنوی نے انہیں اپنے تلامذہ میں شامل کیا۔ آفتاب الدولہ شمس جنگ خواجہ اسد علی خاں تلق لکھنوی نے زبان سیکھنے کے لئے بیگمات سے متعارف کرایا اور محبت سے بھتیجا کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ نواب مہدی علی خاں سرفراز الدولہ (آخری تاجدار اودھ کے بہنوئی) اپنی صحبتوں میں شرکت کا شرف بخشتے تھے اور مشاعروں میں بلاتے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کاظم علی تپش قدوائی کی نوجوانی میں غیر متوقع موت سے ان کے دوست احباب اتنے متاثر تھے کہ ان کے بیٹے سے غیر معمولی محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے۔

شوق کی ذہنی تربیت اور شاعرانہ شخصیت کی تشکیل میں ان کے والد کے احباب نے جو اہم کردار ادا کیا تھا مرحوم عہد پیری میں بڑی حسرت سے اس کا ذکر کیا کرتے تھے اور ان کے دل میں مرتے دم تک ان بزرگوں کے لئے جذبۂ احسان مندی موجزن تھا۔

یوں تو شوق نے تیرہ چودہ سال کی عمر ہی سے غزل گوئی کی مشق شروع کر دی تھی لیکن حضرت اسیر سے اصلاح لینے کے بعد وہ باقاعدہ شعرائے لکھنؤ کے زمرے میں شمار کئے جانے لگے۔ انیس[۱۹] سال کی عمر میں انہوں نے اسیر سے اصلاح کی درخواست کی جو منظور کر لی گئی۔ اس نئے رشتہ کے علاوہ حضرت اسیر ان کے قرابت دار تھے اس لئے نہایت شفقت سے اصلاح دیتے اور گھنٹوں ایک ایک نکتہ اور فن کی باریکیاں سمجھاتے[لہ]۔ شوق بڑے اشتیاق سے استاد کے منہ سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کو جواہر پارہ سمجھتے اور گرہ میں باندھ کر رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت اسیر کے سینکڑوں شاگردوں میں بالاستثنا حضرت امیر مینائی جو شہرت و امتیاز شوق قدوائی کو نصیب ہوا وہ کسی اور کو نہیں ہوا۔

اصلاح کا سلسلہ حضرت اسیر کی وفات تک جاری رہا۔ اس کے بعد شوق نے کسی اور سے اصلاح نہیں لی۔ کسب فضیلت کا کوئی موقعہ ہاتھ آتا تو وہ جانے نہ دیتے تھے۔

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ) قیس گیا تو شوق اب آیا! — اس نے رکھا اس نے اٹھایا
بھول چلا تھا میں تو اس کو — ناصح تو نے یاد دلایا!

لہ اس امر کا اپنی زبان سے ترانۂ شوق میں یوں اعتراف کرتے ہیں۔

جتنی میرے سخن کی ہے دھوم — سب ہے فیضِ اسیر مرحوم!

ایک غزل کا مقطع ہے۔

قلمرو سخن کی ہر زمین پر ہوں حکمراں — یہ میرا زورِ شوق فیضِ حضرتِ اسیر ہے

انہیں تمام عمر تحصیل علم و تحقیق فن کا شوق رہا لیکن انہوں نے شعر و سخن میں کسی اور کے آگے زانوئے تلمذ تہہ نہ کیا۔ غزل گوئی سے انہوں نے مشق شروع کی تھی لیکن جلد ہی مثنوی کی طرف متوجہ ہو گئے اور اس صنف شاعری میں وہ شق بہم پہنچائی کہ اس اقلیم پر تمام عمر حکمرانی کی۔

شعر گوئی کے ساتھ ساتھ انہوں نے نثر نگاری بھی شروع کی اور اس عہد کے چوٹی کے نثاروں میں ان کا شمار ہونے لگا۔ نثر نگاری اور صحافت میں فاصلہ ہی کتنا ہے۔ ایک دن وہ اس میدان میں بھی داخل ہو گئے۔ لکھنؤ میں سکونت کے چند سال گزرے ہوں گے کہ اپنا پریس خریدا اور ہفتہ وار اخبار "آزاد" نکالنے لگے۔ اس اخبار میں سیاسی مواد کے مقابلہ میں علمی و ادبی مواد زیادہ ہوتا تھا اور بقول سید سلیمان ندوی مرحوم "اس عہد کے معزز و مشہور اخباروں میں تھا اور زمانہ کے ادبا کا مظہر خیال تھا اور سر سید کی تحریکات سے کافی ہمدردی رکھتا تھا۔"[۲]

شوق قدوائی مضمون نگاری اور شعر گوئی میں جس قدر کامیاب ہوتے اتنے ہی کاروباری معاملات میں ناکام۔ اخبار کے اخراجات انہیں اپنی جیب سے پورے کرنے پڑتے تھے جو وہ اپنے ذوق کی تسکین کے لئے کرتے بھی تھے۔ اخبار کو علم دوست ناظرین قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے لیکن مالی اعتبار سے وہ کبھی خود کفیل نہ ہو سکا۔ بدقسمتی سے ان کی والدہ اور اہلیہ میں ہمیشہ ان بن رہتی تھی۔ والدہ کا مستقل قیام جگور میں تھا اور اہلیہ نے اپنی ننھیال سترکھ ضلع بارہ بنکی میں سکونت اختیار کی تھی۔ والدہ کے اخراجات، اہلیہ کی ضروریات، اپنے مصارف اور اخبار "آزاد" کے مطالبات سب انہیں پورے کرنے پڑتے تھے جب کہ آمدنی کا واحد ذریعہ آبائی زمینداری تھی۔ وہ جائداد کا نہایت خوش اسلوبی سے انتظام کرتے تھے لیکن پھر بھی آمدنی اور خرچ کا حساب برابر ہوتا تھا۔ اسی نہج سے ان کی زندگی بسر ہوتی رہی کہ ان کی شہرت و قابلیت سے متاثر ہو کر مہاراجہ صاحب پرتاب گڑھ نے انہیں اپنی ریاست کی نیابت پیش کی، تنخواہ بھی اچھی تھی اس لئے شوق نے منظور کر لیا۔ اخبار بند کر کے پرتاب گڑھ پہنچ گئے اور نائب ریاست (دیوان) مقرر کر دیئے گئے۔ مہاراجہ صاحب بڑی قدردانی کرتے تھے پھر بھی طبیعت نہ لگی۔ آخر استعفیٰ دے کر لکھنؤ واپس آئے۔ پھر پریس خریدا اور دوبارہ اخبار نکالنے لگے۔

اس طرح بیس سال یعنی ۱۸۹۰ء تک شوق نے جم کر لکھنؤ میں قیام کیا۔ ان کی جوانی اپنے پسندیدہ مشاغل اور وطن کے خوشگوار ماحول میں بسر ہوئی۔

---

[۱] ان کی ضخیم بیاض ان کے ذاتی کتب خانہ واقع سترکھ میں محفوظ ہے۔ اس بیاض کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ مرحوم عربی، فارسی، انگریزی، اردو اور ہندی سب زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ ان سب زبانوں کے شعراء کا چیدہ کلام اس بیاض میں موجود ہے۔ [۲] "یادِ رفتگاں" از مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم

بھوپال میں ملازمت

لکھنؤ کی دلچسپ مصروفیت ابھی اور جاری رہتی۔ اگر اُن کے پھوپی زاد بھائی منشی امتیاز علی انہیں بہ اصرار بھوپال نہ بلا لیتے۔ منشی امتیاز علی صاحب بھوپال میں وزیر تھے۔ شوقؔ کا تقرر بھی مجسٹریٹ اور نائب ناظم یا ڈپٹی کلکٹر کی حیثیت سے ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد ترقی کر کے ناظم ضلع (کلکٹر) ہو گئے۔ شعرگوئی اور مضمون نگاری کا سلسلہ یہاں بھی زور و شور سے جاری رہا۔

شوقؔ صاحب اپنے فرائض نہایت دیانتداری سے انجام دیتے تھے۔ بائیس تیئس ۲۲-۲۳ سال ایک بڑی دیسی ریاست میں اچھی تنخواہ پر ملازم رہنے کے باوجود اپنی آبائی جائداد میں ایک پیسہ کا بھی اضافہ نہ کر سکے اور نہ کوئی اندوختہ چھوڑا۔

بھوپال کی ملازمت کے اوائل میں اُن کی والدہ ماجدہ نے وفات پائی۔ مرحومہ نے اُن کی تعلیم و تربیت میں جو اہم کردار ادا کیا تھا اس کا ذکر سطورِ بالا میں ہو چکا ہے۔ والدہ کے انتقال سے وہ اتنے دل برداشتہ ہوتے کہ جگور کے آبائی مکان کی کوئی فکر نہ کی اور وہ رفتہ رفتہ گرنا شروع ہو گیا یہاں تک کہ ملبہ کا ڈھیر بن گیا۔ ان کی اہلیہ شیخ محمد روشن صاحب صدیقی (بجنور ضلع لکھنؤ) کی صاحبزادی اور قاضی اکرام احمد صاحب عثمانی تعلقہ دار سترکھ (ضلع بارہ بنکی) کی بھانجی تھیں۔ اہلیہ کی ایما سے انہوں نے سترکھ میں مکان تعمیر کرایا۔ اور آئندہ کے لئے ان کا وطن جگور کے بجائے جگور سے چھ میل مشرق میں سترکھ ضلع بارہ بنکی ہو گیا۔ سترکھ کے اسی مکان سے ان کی اولاد کی شادیاں اور دوسری خاندانی تقریبات سرانجام پائیں۔ جب زمینداری کے انتظام کے سلسلے میں یا کسی اور ضرورت سے وطن آتے تو اسی مکان میں قیام کرتے تھے۔

بائیس تیئس سال ملازمت کرنے کے بعد نیک نامی کے ساتھ بھوپال سے سبکدوش (ریٹائر) ہوتے اور حسنِ خدمت کے صلہ میں وظیفہ (پنشن) مقرر ہوا۔ جو مرتے دم تک ملتا رہا۔

قیام رامپور

بھوپال سے آنے کے بعد انہیں رامپور میں ملازمت مل گئی کتب خانہ اور ترتیب و تدوینِ لغات کا کام سپرد ہوا۔ یہ فرائض بھی مزاج کے موافق تھے، اور یہاں ان کے چھوٹے بھائی شیخ واحد ابرؔ قدوائی کا بھی مستقل قیام تھا اس لئے یہاں ان کا دل لگ گیا۔ رامپور میں شعراء کی بڑی قدر دانی ہوتی تھی اور دربار کی طرف سے اُن کی سرپرستی اور دلجوئی کی جاتی تھی۔ اہالیانِ شہر کا مذاق بھی نہایت بلند تھا اور جگہ جگہ مشاعروں کا انعقاد ہوا کرتا تھا۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ اس حیثیت سے رامپور ایک چھوٹا موٹا لکھنؤ تھا۔ بھوپال کی طرح رامپور سے بھی وہ اخبارات اور رسائل کے لئے لکھتے رہے۔ یہاں ان کا تمام وقت ترتیبِ لغات، شعرگوئی، مضمون نگاری اور تلامذہ کے کلام کی اصلاح میں گزرتا تھا، اہلیہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اکلوتے صاحبزادے برسرِ روزگار تھے اور صاحبزادی کی بھی شادی ہو چکی تھی۔ اس لئے جو بھی کام کرتے تھے یکسوئی سے کرتے تھے۔ زمینداری کے سلسلے میں اب بھی وطن جاتے تھے لیکن جلد ہی رام پور واپس چلے آتے تھے۔

اس آخر زمانہ میں انہوں نے جو نظمیں لکھیں وہ اردو کی جدید شاعری کے لئے شاہپاروں کی حیثیت رکھتی ہیں۔

یہ نظمیں بھی ان کی طرز قدیم کی مثنویوں کی طرح اردو ادب کے لئے باعث افتخار ہیں۔

وہ رامپور میں اطمینان و آسودگی سے زندگی بسر کر رہے تھے کہ اچانک نواب حامد علی خاں مرحوم والی رام پور ان کے بھتیجے صفدر علی قدوائی صاحب سے کسی بات پر ناخوش ہوگئے اور ان کے بھائی آبر قدوائی کو رامپور چھوڑنا پڑا۔ اس واقعہ سے ان کا دل اچاٹ ہوگیا۔ انہیں رامپور میں گیارہ بارہ سال ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی عمر ستر سال سے تجاوز کر چکی تھی اور صحت بھی مسلسل خراب رہتی تھی اس لئے مستعفی ہو کر سترکھ چلے گئے اور وہاں گوشہ نشین ہوگئے۔

سترکھ میں قیام

شوق قدوائی کے اکلوتے فرزند طاہر علی قدوائی کو بہ سلسلۂ ملازمت چھ مہینے دہلی اور چھ مہینے شملہ میں رہنا پڑتا تھا۔ ان کی شادی بھی اپنی والدہ کی ننھیال میں ہوئی تھی اس زمانہ میں ان کے برادرِ نسبتی قاضی نظام الدین احمد عثمانی صاحب سترکھ کے تعلقدار تھے۔ مرحوم قاضی صاحب بڑے بامروت، سیر چشم اور نیک نفس رئیس تھے شرفاء اودھ کے بعض خاندانوں میں مستورات کا وطن سے باہر جانا اس زمانہ میں بھی معیوب سمجھا جاتا تھا، پھر قاضی صاحب کا شمار بارہ بنکی کے چوٹی کے رئیسوں میں تھا۔ اس لئے ان کے یہاں وضعداری اور خاندانی روایتوں کی حفاظت بھی نہایت سختی سے کی جاتی تھی، چنانچہ ان کی ہمشیرہ بجائے دہلی اور شملہ میں رہنے کے انہیں کے ساتھ ان کے محل میں قیام پذیر تھیں۔

جب شوق صاحب سترکھ آئے اور اپنے مکان میں قیام فرمایا تو قاضی صاحب کو خیال گذرا کہ شوق صاحب کو اپنے مکان میں تنہا رہنے سے تکلیف ہوگی، اس کے علاوہ قاضی صاحب کو اپنی بہن اور بھانجوں سے غیر معمولی محبت تھی۔ اس لئے ایک دن گئے اور شوق کو معہ بوریا بستر اپنے ساتھ اپنے یہاں اٹھوا لائے اور اپنے محل کے پھاٹک سے متصل بالاخانہ پر دو کمرے ان کی رہائش کے لئے خالی کروا دیئے۔

شوق قدوائی مرحوم نے اپنی تہتر سالہ زندگی کے آخری دو سال انہیں کمروں میں بسر کئے۔ سترکھ میں ان کا وقت یوں صرف ہوتا تھا کہ صبح سویرے سے سہ پہر تک تخت پر گاؤ تکیہ لگائے بیٹھے رہتے اور اپنے تلامذہ کے کلام پر اصلاح دیتے رہتے۔ سہ پہر کو چھڑی لے کر اپنے آم کے باغات کی طرف نکل جاتے اور چراغ جلے تک باغوں اور ان کے مالیوں کی اصلاح فرماتے رہتے۔

شوق کی رحلت

مارچ ۱۹۲۵ء میں شوق قدوائی مرحوم کو استسقاء کا عارضہ لاحق ہوا۔ وہ گونڈہ کے ڈاکٹر اسلم صاحب کے بڑے معتقد تھے اس لئے اپنے داماد خان بہادر رضی الدین احمد صاحب بیرسٹر ایٹ لاء کے یہاں گونڈہ چلے گئے۔ ان کی صاحبزادی نے بڑی محنت سے تیمارداری کی اور داماد نے بڑی توجہ سے علاج کرایا لیکن مرض موت کا پیغام لے کر آیا تھا۔ کسی طرح افاقہ نہ ہوا۔ آخر ۲۷ اپریل ۱۹۲۵ء کو اردو کا یہ مایہ ناز شاعر اور ادیب راہی ملک عدم ہوا۔ تجہیز و تکفین گونڈے میں ہوئی اور وہیں مزار ہے۔

شوق کی تصانیف

شوق قدوائی نے تمام عمر علم و ادب کی خدمت کی اور مرحوم کی تصانیف اس کثرت سے ہیں کہ ان کی مکمل فہرست تیار کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ محال ہے ایک طرف نظموں کا بہت بڑا ذخیرہ ہے اور دوسری طرف نثر کے مضامین کا انبار جو وقتاً فوقتاً مختلف اخبار و رسائل میں شائع ہوتے رہے۔

انہوں نے غزل سے مشق سخن شروع کی تھی لیکن بدقسمتی سے غزلوں کا وہ مجموعہ جس پر حضرت امیر کی اصلاح تھی مرحوم کی زندگی ہی میں ضائع ہوگیا تھا اور اب اصلاح شدہ کلام کا کوئی نمونہ باقی نہیں ہے۔

شوق قدوائی کی سب سے پرانی یادگار مثنوی "ترانۂ شوق" ہے۔ جو ۱۸۸۷ء میں پہلے پہل شائع ہوئی۔ یہ مثنوی اس قدر مقبول ہوئی کہ اس دور کے پچیس ۲۵ کاملان فن نے اس کے لئے قطعات تاریخ لکھے جن میں حضرت امیر مینائی اور حضرت محسن کاکوروی بھی شامل ہیں۔ اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوتے اور سب سے آخری ایڈیشن ۱۹۲۱ء میں چھپا۔ دوسری تصنیف ان کا مسدس "لیل و نہار" ہے جو انہوں نے ۱۸۹۹ء کی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں پڑھا۔ اور اس کے بعد سر سید احمد خاں صاحب کی نذر کر دیا اس کے بھی کئی ایڈیشن چھپے اور سب سے آخری ایڈیشن ۱۹۱۴ء میں علیگڑھ سے طبع ہوا۔ اس کے بعد انہوں نے مثنوی "حسن" لکھی جسے منشی سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ نے کتاب کی شکل میں چھاپا پھر دہلی سے "مخزن" میں نظر ثانی کے بعد شائع ہوئی۔ آخری بار ان کی نظموں کے مجموعے گنجینہ میں شامل کر دی گئیں اور ان کے اپنے پیش لفظ، عیش رامپوری کے نوٹ اور بابو جوالا پرشاد برق لکھنوی کے مقدمے کے ساتھ شائع ہوئی۔ پھر انہوں نے مثنوی "قاسم و زہرہ" تصنیف کی جو ۱۹۱۱ء میں الناظر پریس لکھنؤ میں طبع ہوئی۔ اسی سال ان کی نظم "در یتیم" منشی محمد امین صاحب نے مارہرہ میں چھپوائی۔ دو سال بعد یعنی ۱۹۱۳ء میں شوق قدوائی کی وہ معرکۃ الآرا مثنوی منظر عام پر آئی جس کا نام "عالم خیال" ہے۔ یہ مثنوی جو چار نظموں کا مجموعہ ہے کئی بار شائع ہوئی اور شائقین نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ سب سے آخری بار صدیق بکڈپو لکھنؤ نے ۱۹۳۱ء میں چھپوایا۔ مصنف مرحوم نے اپنی عمر کے آخری سال میں اس مثنوی پر نظر ثانی کر کے بہت زیادہ حذف و اضافہ فرمایا بلکہ بعض بعض مضامین ہی یکسر بدل دیئے۔ اس نئی ترتیب کے بعد "عالم خیال۔ جدید" کے نام سے میتھوڈسٹ پریس لکھنؤ میں ۱۹۲۵ء میں چھاپی گئی۔ آپ کی نظم نیرنگ جمال بھی نیر پریس لکھنؤ میں اسی سال طبع ہوئی۔

شوق قدوائی کا دیوان ۱۹۲۸ء میں ان کے صاحبزادے شیخ طاہر علی قدوائی نے مقبول المطابع گونڈہ میں "فیضان شوق" کے نام سے چھپوایا۔ اس دیوان میں غزلوں کے ساتھ ساتھ رباعیات کا مجموعہ بھی ہے۔ اس کے علاوہ بعض مسلسل نظمیں بھی جو اخلاقیات پر ہیں مثلاً (۱) اکل حلال (۲) عفو۔ (۳) ٹپکے گا وہی ظرف سے جو ظرف میں ہوگا۔ (۴) سخاوت (۵) ہے غنیمت صبح کا بھولا جو آئے شام کو (۶) احسان (۷) حکمت اور دولت

(۸) وعلم (۹) راست بازی وغیرہ، بھی شامل ہیں۔ مرحوم کے دو ڈرامے "رشیدؔ" اور "جہل" بھی بہت مقبول ہوئے۔ ایک نہایت ہی دلولہ انگیز مسدس جنگ بلقان سے متعلق تصنیف کیا تھا اس میں ترکوں پر مظالم کی داستان نہایت دردناک انداز میں بیان کی ہے۔ پھر ان کی فتح و نصرت کے لئے دعا مانگی ہے اور آخر میں مسلمانوں سے چندے کی اپیل کی ہے۔

ان کارناموں کے علاوہ شوق قدوائی کی اور بہت سی چھوٹی بڑی نظمیں ہیں جنہوں نے شہرت دوام حاصل کی مثلاً (۱) بہار (۲) برسات (۳) طبیعات اور مذہب (۴) بندھیاچل کی چاندنی رات (۵) برسات کی شام (۶) ایک حسین لڑکی (۷) پھول کی فریاد (۸) گلی کی بے کلی (۹) گدا کی صدا وغیرہ۔

اولاد

شیخ احمد علی شوق قدوائی کی شادی شیخ محمد روشن صدیقی (بجنور ضلع لکھنؤ) کی صاحبزادی سے ہوئی تھی، ان سے چار اولادیں ہوئیں۔ تین بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ دو لڑکیاں کم عمری میں وفات پا گئیں۔ شوق قدوائی کی نسل ان کے صاحبزادے اور صاحبزادی سے چلی۔ ان کے بیٹے شیخ طاہر علی صاحب قدوائی بی ایس۔ سی (علیگ) نے غیر منقسم حکومت ہند میں ملازمت اختیار کی اور انڈر سیکرٹری کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ اب اطمینان و آسودگی سے سکھر میں گوشہ نشین ہیں۔ ان کے چار بیٹے ہیں۔ سب سے بڑے بیٹے خلیل طاہر قدوائی صاحب بی۔ آر۔ ایس محکمۂ ریلوے میں اعلیٰ افسر ہیں اور لاہور میں چیف میکنیکل انجینئر ہیں۔ دوسرے بیٹے جمیل طاہر قدوائی صاحب بی اے ایل ایل بی (لکھنؤ) ایڈوکیٹ اپنے والد کے ساتھ رہتے ہیں۔ تیسرے بیٹے عقیل طاہر قدوائی ایم بی بی ایس (لکھنؤ) سکھر میں ڈاکٹر ہیں۔ اور چھوٹے بیٹے جلیل طاہر قدوائی صاحب ایم۔ ایس۔ سی (لکھنؤ) محکمۂ موسمیات حکومت پاکستان میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔

شوق صاحب کی صاحبزادی کی شادی احمد پور ضلع بارہ بنکی میں شیخ رضی الدین احمد صدیقی صاحب سے ہوئی تھی خان بہادر رضی الدین احمد صاحب مرحوم گونڈے میں بیرسٹر تھے۔ ان کا وہیں انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہیں۔

تلامذہ

شوق قدوائی کے تلامذہ کی فہرست بہت طویل ہے لیکن جن حضرات نے استاد کے نام کو چمکایا اور خود بھی استادوں میں شمار ہوئے ان میں سے چند کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

(۱) مولانا محمد حسین محوی صدیقی صاحب لکھنوی (۲) مولانا منظور احمد قیصر صدیقی صاحب امروہوی (۳) مولوی جمال الدین کوثر لکھنوی مرحوم (۴) مولانا محمود اسرائیلی صاحب (۵) مولوی یعقوب بخش راغب بدایونی (مرحوم) (۶) محمد شریف خاں فکری بھوپالی مرحوم (۷) عبدالحکیم خاں نشتر صاحب جالندھری (۸) صاحبزادہ معراج الدین شاہی (مرحوم) (۹) سید خورشید علی مہر دہلوی مرحوم (۱۰) منظور تحسین ذوق صاحب رامپوری (۱۱) عزیز اللہ خاں عزیز صاحب رام پوری (۱۲) مولوی احسن اللہ احسن سیمبی صاحب (۱۳) وحید الدین وحید سترکھی۔

وقار خلیل

ڈاکٹر زور کی یاد میں

دبستانِ دکن کے آخری معلم اردو، مایہ ناز نقاد، دکھنیات کے محقق اور صاحب طرز انشاء پرداز ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور بانی ادارۂ ادبیاتِ اردو وابوالکلام آزاد اورنیٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی چوتھی برسی کے موقع پر ادارۂ ادبیاتِ اردو کے زیر اہتمام چہارروزہ یوم زور کی تقاریب منعقد ہوئیں۔ جمعہ ۲۴ ستمبر کو بعد نماز عشا شہر میں واقع مسجد افضل گنج میں ذاکر خوانی و ختم قرآن کا انتظام کیا گیا اور بعد نماز مغرب ڈاکٹر زور مرحوم کے والد حضرت زعم کے مزار (واقع خانقاہ عنایت الٰہی) چادرِ گل چڑھائی گئی اور فاتحہ خوانی کے بعد تبرک تقسیم کیا گیا۔

پنجشنبہ ۲۴ ستمبر کی شام ۶/۱ بجے ایوانِ اردو کے آڈیٹوریم میں سابق گورنر گجرات نواب مہدی نواب جنگ بہادر بالقابہم نے ادیبوں، دانشوروں، شاعروں، سیاسی اور سماجی قائدین، جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ اور اردو دوستوں کے اجتماع میں افتتاحی اجلاس کی صدارت فرمائی۔ معتمد یوم زور، جناب میر سراج الدین علی خاں نے تحریک صدارت پیش کرتے ہوئے اس تقریب کے انعقاد کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

صدرنشین ادارۂ ادبیاتِ اردو، پروفیسر سید علی اکبر نے خیر مقدمی تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ "زور مرحوم کے بعد ادارہ خاموشی اور خلوص کے ساتھ ان علمی، ادبی اور ثقافتی فرائض کو بحسن و خوبی انجام دے رہا ہے، جو مرحوم کو عزیز تھے اور جن کے لئے ڈاکٹر زور نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔" پروفیسر علی اکبر نے محترم صدر کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ "نواب صاحب کو ہر نیک کام سے عملی دلچسپی رہی ہے۔ ادارہ کے قیام کی تاریخ سے آپ اس کی سرپرستی فرما رہے ہیں اور یقین ہے یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔ نواب مہدی نواز جنگ بہادر کی ہمہ گیر شخصیت ادارہ کے مقاصد کی تکمیل کے لئے بہترین ضمانت اور فالِ نیک ہے اور آج کے جلسے کی کرسئ صدارت پر نواب صاحب کی رونق افروزی ڈاکٹر زور مرحوم کی روح کے لئے باعث تسکین و فرحت ہوگی۔" پروفیسر سید علی اکبر نے ڈاکٹر زور کی بے وقت موت کے بارے میں گہرے رنج و الم کا اظہار کرتے ہوئے ان کی خدمات کو سراہا اور بتایا کہ ادارہ کا قیام ڈاکٹر زور کا اہم کارنامہ ہے۔ زور صاحب کی وفات کے بعد ادارہ کی سرگرمیوں کے

جاری رہنے کے بارے میں ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ اور ان کے رفقائے کار کی صلاحیتوں کا تفصیلی طور پر ذکر کرتے ہوئے صدر ادارہ نے اردو دوستوں سے مزید تعاون کی خواہش کی۔

جواں سال قانون داں رمن راج سکسینہ اعزازی معتمد یوم محمد قلی قطب شاہ کمیٹی نے یوم زوؔر کے سلسلے میں آئے ہوئے پیامات سنائے۔

صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر رادھا کرشنن اور وزیر اعظم ہند محترمہ اندرا گاندھی نے اپنے پیامات میں یوم زور کی کامیابی کے لئے دلی تمناؤں کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نائب صدر جمہوریۂ ہند نے اپنے پیام میں فرمایا کہ "مرحوم زورؔ صاحب کی قابل قدر علمی خدمات اور خود ان کا قائم کیا ہوا "ادارۂ ادبیاتِ اردو" ہمیشہ ان کی یاد دلاتے رہیں گے۔ میں یوم زوؔر کے انعقاد پر ادارہ کو تہِ دل سے مبارک باد دیتا ہوں"۔

مرکزی وزیر برقاب جناب فخر الدین علی احمد نے اپنے پیام میں ڈاکٹر زوؔر کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے کہ "ڈاکٹر زوؔر نے دکنی زبان اور اردو کی تاریخ، اردو لسانیات، صوتیات، تنقید و تبصرہ اور خالص ادب کی خدمت کو اپنا مقصدِ حیات بنایا اور اس کی تکمیل کے لئے اپنی تمام زندگی اور وسائل وقف کر دیئے۔ ادارہ کا قیام ڈاکٹر زوؔر کا لافانی کارنامہ ہے جس کی بدولت ہزارہا اردو مخطوطات محفوظ ہوگئے اور موجودہ اور آئندہ نسلوں کو ان سے استفادہ کرنے کی سہولتیں بھی مہیا ہوگئیں میں امید کرتا ہوں کہ ڈاکٹر محی الدین قادری زوؔر کی زندگی اور کارناموں سے اردو ادیب، شعراء، نقاد، معلم اور طالب علم سبھی ہمیشہ سبق لیں گے اور اپنی اپنی بساط کے مطابق اس عظیم اور حسین زبان کی خدمت کے فرائض انجام دیتے رہیں گے"۔

ریاست جموں و کشمیر کے وزیر اعظم جناب غلام محمد صادق نے یوم زوؔر کی کامیابی کی توقعات کا اظہار کرتے ہوئے اپنے پیام میں بتایا کہ "میری تمنا ہے کہ ادارہ کو اردو ادب کے عام فہم بنانے میں اور تحقیقاتی کام کو ترقی دینے میں کامیابی نصیب ہو"۔

سابق مرکزی وزیر جناب ہمایوں کبیر نے اپنے پیام میں کہا کہ "ڈاکٹر زوؔر مرحوم اپنے علمی و ادبی کارناموں کی وجہ سے ہندوستان میں اردو زبان کے ممتاز ادیب تصور کئے جاتے تھے۔ مجھے توقع ہے آئندہ نسلوں کے ادیب اُن کی تصانیف سے استفادہ کرکے ہندوستان کے ثقافتی ورثہ میں اضافہ کریں گے"۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر نواب علی یاور جنگ کا پیام تھا "میں ڈاکٹر زوؔر اور اُن کی اردو ادب کی خدمات سے بخوبی واقف ہوں "ادارۂ ادبیات اردو" مرحوم کا عظیم الشان کارنامہ ہے، اس کے علاوہ مرحوم نے جامعہ عثمانیہ میں میری وائس چانسلری کے زمانے میں اور اس سے قبل اور پھر بعد کے دور میں بڑی ذمہ دارانہ خدمات انجام دی تھیں اور اپنے جوشِ عمل اور احساسِ فرض شناسی کی وجہ سے ممتاز مقام حاصل کر لیا تھا"۔

ممتاز ماہر لسانیات ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی صدر نشین لیجسلیٹو کونسل ویسٹ بنگال نے اپنے پیام میں بتایا کہ "ڈاکٹر زوؔر کی موت سے نہ صرف اردو زبان کے تحقیقی کاموں کو نقصان پہنچا ہے، بلکہ ہندوستانی ثقافت کا بھی نقصان ہوا ہے۔ مجھے توقع ہے کہ

یوم زور کی تقاریب کامیاب ہوں گی "۔

مشہور مورخ ڈاکٹر تاراچند (ایم ۔ پی) نے یوم زور کے لئے اپنے پیام کے ذریعہ ان توقعات کا اظہار کیا ہے " ڈاکٹر زور مرحوم نے اردو زبان و ادب کی ترقی میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں جو ناقابلِ فراموش ہیں ۔ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ہر سال اسی طرح یوم زور کی تقاریب منعقد کی جائیں "۔

پدما بھوشن میر اکبر علی خاں بیرسٹر، جناب فضل الرحمان پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، نثار احمد فاروقی صاحب شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی نے بھی اپنے گراں قدر پیامات سے نوازا، جس میں ادارہ اور ڈاکٹر زور کی خدمات کا بھرپور اعتراف کیا گیا ہے ۔

ممتاز نقاد پروفیسر سید احتشام حسین صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی نے اپنے پیام میں کہا ہے کہ " ڈاکٹر زور مرحوم ایک عملی انسان تھے، وہ ایسی شمعیں جلانا جانتے تھے جن کی روشنی ان کے بعد بھی باقی رہے ۔ وہ ایسی بنیادیں رکھنا چاہتے تھے جن پر مستحکم عمارتیں کھڑی کی جاسکیں ۔ یہ شمعیں اور یہ بنیادیں ان کی تصانیف اور وہ ادارے ہیں جنھیں ان کے ذوقِ تخلیق نے جنم دیا، یہی ان کی یادگاریں ہیں ۔ مجھے خوشی ہے کہ ادارۂ ادبیاتِ اردو جسے مرحوم نے اپنے خون سے سینچا تھا نہ تو ان کی یاد سے غافل ہے اور نہ ان کے کام سے "۔

مرکزی انجمن ترقی اردو ہند کے معتمد عمومی پروفیسر آل احمد سرور صدر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اپنے پیام میں بتایا کہ " ڈاکٹر زور نے اردو کی بڑی خدمت کی، ان کی تحقیقات سے دکنی ادب کے کئی تاریک گوشوں پر روشنی پڑی ۔ ان کی لگن اور جذبے سے اردو زبان و ادب کو بڑا فروغ ہوا، اور وہ ان کی خدمات کا بڑا اچھا اشاریہ ہے ۔ ڈاکٹر زور کی یاد کو تازہ کرنا اور ان کے کارناموں سے نئی نسل کو روشناس کرانا یقیناً بڑا اچھا کام ہے امید ہے اس چراغ سے اور چراغ برابر جلتے رہیں گے "۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ریڈر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی نے اپنے احساسات و تاثرات کو پیام کی صورت میں ظاہر کرتے ہوئے لکھا کہ " ڈاکٹر زور اردو کے سچے عاشق تھے ۔ وہ ایک باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے ۔ وہ ایک اہم ادیب، ایک سچے عالم اور ایک بے ریا و پُرخلوص انسان تھے ۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ وہ ہم سے عین اس وقت بچھڑ گئے جب اردو کو ان سے بہت سے کام لینے تھے ۔ ان کی یاد منانا گویا انسانیت، شرافت، علمیت اور اردو دوستی کی قدروں پر اپنا ایمان تازہ کرنا ہے "۔

" از دل ریزد و بر دل خیزد " کے مصداق مخلصانہ پیامات کو حاضرین نے سماعت فرمایا، اور ڈاکٹر زور کی آڈی ٹوریم میں آویزاں خوبصورت شبیہ چشم نگراں کی طرح اپنے چاہنے والوں، یاد کرنے والوں اور اردو زبان و ادب کو فروغ دینے والوں کو دیکھتی رہی ۔ ایسے میں جواں سال شاعر صلاح الدین نیر نے دل دوز ترنم سے انتہائی متاثر کن نظم " آخری آنسو " پڑھنی شروع کی ۔ جب نیر نے یہ شعر پڑھا سہ

کیا جہاں بھی نیند آجائے وہیں سوتے ہیں لوگ زورؔ تیرے آخری دیدار کو روتے ہیں لوگ

تو اہلِ محفل پر رقت طاری ہوگئی۔

جناب عبدالوحید خاں ناظم ریاستی آثارِ قدیمہ نے ڈاکٹر زورؔ کی علمی و ادبی اور ثقافتی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ "ڈاکٹر زورؔ نے مرتے دم تک ہندوستان میں رہ کر اردو زبان و ادب کی خدمت کی۔ انہی خدمات کے سبب انھیں اردو بابا کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ نہ صرف دکھنی ثقافت کو انھوں نے زندہ کیا بلکہ ہم دکھنیوں میں خود اعتمادی کی فضا بھی ڈاکٹر زورؔ نے پیدا کی۔ ممتاز شاعر مخدوم محی الدین اور مشہور ادیب یرحسن ان ہی کے بنائے ہوئے ہیں۔ زورؔ صاحب نے قیام آندھرا کے بعد یوم محمد قلی کا انعقاد کرکے قومی یکجہتی کے مقصد کو آگے بڑھایا، اور آج یہ تقریب آندھرا کی قومی عید کی صورت اختیار کرگئی ہے۔ یہ سب زورؔ صاحب کے کیے ہیں" ناظمِ آثارِ قدیمہ نے اپنے محکمہ کی تنظیم جدید اور گنبدانِ قطب شاہی کے محکمہ کی تحویل میں آنے کے بعد کے واقعات پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ حکومت آندھرا پردیش اور محکمۂ آثارِ قدیمہ دکھنی آثار اور کلچر کی حفاظت اور ترقی کے لئے زورؔ صاحب کے بتائے ہوئے خطوط پر کام کرے گا اور "بسنت کے میلہ" کا آغاز بھی کیا جائے گا جو قطب شاہی زمانے میں منعقد ہوا کرتا تھا۔

الحاج مرزا شکور بیگ صاحب نے "نذرِ زورؔ" کے عنوان سے نظم سنائی۔ مرزا کے ان اشعار پر حاضرین نے خوب داد دی ؎

نام روشن کر دیا اُردو نے بے شک زورؔ کا زورؔ نے بھی کی بہت اُردو کی خدمت زورؔ کی

کارواں اردو کا مرزاؔ یوں تو اب بھی ہے رواں پھر بھی سب محسوس کرتے ہیں ضرورت زورؔ کی

ڈاکٹر غلام عمر خاں ریڈر مینجنگ ایڈیٹر مجلہ عثمانیہ نے اپنی فاضلانہ تقریر میں بتایا کہ "ڈاکٹر زورؔ مرحوم کی زندگی بیسویں صدی میں دکن کی علمی و ادبی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ وہ اپنے عہد کے ایک ممتاز محقق اور نقاد تو تھے ہی، لیکن ان کا جو کارنامہ انھیں اردو زبان کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھے گا، یہ ہے کہ انھوں نے دکن کے ایسے سینکڑوں شاعروں اور مصنفوں کو دوبارہ زندگی بخشی جن کے کارنامے طاقِ نسیان کی نذر ہوگئے تھے۔ دکھنی ادبیات کی بازیافت کو ایک تحریک اور ایک مہم کی حیثیت سے شروع کرنے کا سہرا ڈاکٹر زورؔ ہی کے سر ہے۔ انھوں نے اُردو ادب کی تاریخ کو ساڑھے تین سو سال پیچھے دھکیل دیا۔" ڈاکٹر غلام عمر خاں نے جامعہ عثمانیہ میں دکھنیات کے جدید کاموں اور تحقیقاتی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر زورؔ کے جانشین پروفیسر مسعود حسین خاں کی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ "جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ اُردو نے حال میں دکنی زبان و ادب سے جس غیر معمولی دلچسپی اور شغف کا اظہار کیا ہے اور دکنی کے تعلق سے مختلف تحقیقاتی منصوبوں اور مجلہ قدیم اُردو کا جو پروگرام بنایا ہے، یقین ہے کہ ڈاکٹر زورؔ مرحوم کی روح دکھنیات کے پودے کو بارآور ہوتا دیکھ کر مسرور ہوگی۔"

بین کلیاتی زورؔ یادگاری تحریری مقابلہ کے کنوئنر ڈاکٹر غلام عمر خاں نے مقابلے میں انعام پانے والوں کے نام کا اعلان کیا، اور صدرِ جلسہ نواب مہدی نواز جنگ نے سید مجیب الدین طالب علم انوننگ کالج کو انعام اول۔ محی الدین حبیبی طالب علم وٹمنری کالج کو انعام دوم اور اسلم فرشوری طالب علم انوار العلوم کالج کو انعام سوم عطا کیا۔

پدما بھوشن نواب مہدی نواز جنگ بہادر نے صدارتی تقریر میں بتایا کہ "آج کا یہ جلسہ محبت، خلوص اور ڈاکٹر زورؔ کی یاد کو تازہ کرنے والا جلسہ ہے۔ زورؔ صاحب بڑے عملی انسان تھے۔ انھوں نے اردو زبان و ادب کے لئے مثالی خدمات انجام دیں۔ وہ بڑی خوبیوں اور کردار کے آدمی تھے۔ ان کی تمام تمنائیں اُن کی زندگی میں تکمیل کو پہنچیں اس طرح وہ خوش نصیب بھی تھے۔ ایوانِ اُردو ان کے خیالات کا ترجمان اور دکن کی ثقافت کا آئینہ دار ہے۔ اُن کا ادارہ زبردست ادارہ ہے اور وہ بڑے انسان تھے۔ ادارہ کے قیام کے لئے زورؔ صاحب نے جن نامساعد حالات میں اپنا کام کیا ہے اور اُسے آج اس منزل پر پہنچایا ہے کہ تعریف نہیں ہوسکتی۔ عملی کام کی ابتداء صحیح معنوں میں ڈاکٹر زورؔ ہی نے دکن میں کی" نواب صاحب نے فرمایا کہ "اس ادارہ کو ترقی دینا، قائم رکھنا، اور زورؔ صاحب کی یاد کو منانا، اُن کے کارناموں کو بڑھانا ہم سب کا فرض ہے" مختصر اور جامع تقریر کے بعد میر سراج الدین علی خاں صاحب معتمد یومِ زورؔ نے شکریہ ادا کیا اور افتتاحی اجلاس برخاست ہوا۔

اتوار ۵ ستمبر صبح ۱۰ بجے ایوانِ اُردو کے اُردو میوزیم میں "آثار و تصانیفِ زورؔ کی نمائش" کا افتتاح جناب یل۔ین گپتا سابق معتمد منصوبہ بندی حکومت آندھرا پردیش نے کیا۔ نمائش کے کنوئنر جناب عبدالوحید خاں ناظم آثارِ قدیمہ نے نمائش کی تفصیلات سے واقف کرایا۔ اس نمائش میں ڈاکٹر زورؔ مرحوم کی تمام تصانیف، تالیفات، رسائل اور ان پر لکھے گئے مضامین نظم و نثر، رسائل کے خاص نمبر اور کتابیں، کئی نادر و اہم تصویریں، مضامین، مسودات اور استعمال کی یادگار اشیاء رکھی گئی تھیں۔ جناب یل۔ین گپتا نے اپنی تقریر میں ڈاکٹر زورؔ کی ادبی خدمات اور اُن کی شخصیت کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے بتایا کہ دکنی ادب کی ترویج، اشاعت میں زورؔ صاحب کی رہنمائی میں ادارہ نے بیش بہا کارنامے انجام دیئے ہیں اور اس کام کو اور وسعت دینے کی ضرورت ہے۔ ادارہ کی طرف سے اُردو انسائیکلوپیڈیا کا کام شروع ہوا تھا، جو حالات کی نامساعدت کے سبب تکمیل نہ پا سکا۔ میں اس ادبی اجلاس کے صدر جناب محامد علی عباسی سے خواہش کروں گا کہ وہ اس سلسلے میں ادارہ کی مدد فرمائیں، کیونکہ انسائیکلوپیڈیا کے کام کی تکمیل ڈاکٹر زورؔ مرحوم کی عین خواہش تھی۔ اگر ہم اس کام کو دوبارہ شروع کرکے اُسے تکمیل کو پہنچائیں تو صحیح معنوں میں زورؔ صاحب کی یاد منائی جاسکے گی" جناب گپتا صاحب نے اپنی تقریر میں اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا کہ "ادارہ کے وافر علمی و ادبی تہذیبی ذخیرے کے پیش نظر ایوانِ اردو میں توسیع کی ضرورت ہے اور اس کی بالائی منزل کی تعمیر کا کام بھی شروع

کیا جانا چاہیئے تاکہ یہاں کا سرمایہ سائنٹفک طریقے پر محفوظ رہ سکے ؟

نمائش کے افتتاح کے بعد گیارہ بجے صبح ریاستی معتمد فینانس جناب محامد علی صاحب عباسی کی صدارت میں یوم زورؔ کے سلسلے کا ادبی اجلاس منعقد ہوا - جناب میر حسن معتمد ادبی اجلاس نے صدر جلسہ کا خیر مقدم کیا - اس جلسے کا آغاز ڈاکٹر زورؔ کی ایوان اردو کے افتتاح کے موقع پر کی گئی خیر مقدمی تقریر کے ریکارڈ سے ہوا - زورؔ صاحب کی گرجدار آواز کو حاضرین نے جب سنا تو ان کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں - یادوں کے ان شبنمی لمحات میں وقار خلیل نے اپنی نظم " یادِ زورؔ " سنائی تو محفل پر عجیب رنگ چھا گیا - ان اشعار نے سب کو بے چین کر دیا ۔

زورؔ باقی ہے ترا شہرِ نگاراں اب بھی — یاد کرتی ہے تجھے صبحِ بہاراں اب بھی

تو نہیں بزم میں، ہر چیز وہی ہے کہ جو تھی — یہ ادارہ، یہ در و بام، یہ ایوان، یہ کلس

مشہور طنز و مزاح نگار ادیب جناب بھارت چند کھنہ لیبر کمشنر حکومت آندھرا پردیش نے ڈاکٹر زورؔ کی شخصیت اور ان کے کارناموں اور اپنی ملاقاتوں کا تفصیل کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ " ڈاکٹر زورؔ کی شخصیت کو اگر ایک جملے میں بیان کرنا ہو تو میرے خیال میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ہر اعتبار سے ایک زوردار شخصیت کے حامل تھے - بولتے تو منہ سے پھول جھڑتے اور ان کا شعور اور زبان پر عبور فوراً عیاں ہو جاتا - اگر ڈاکٹر زورؔ محمد قلی کے عہد میں پیدا ہوتے تو شاید ان کی عالمانہ صحبت میں شعر و سخن کا دلدادہ بادشاہ اپنی بھاگ متی کو بھی بھول جاتا - ڈاکٹر زورؔ کو ملکِ دکن سے پیار تھا، ہر دکنی چیز بشمول اردو سے انھیں والہانہ محبت تھی - مثلاً دکنی زبان اور پان، قطب شاہی بال، دکنی چال اور کھٹی دال، حیدرآباد کی بریانی، گنڈی پیٹھ کا پانی اور مہرو کی شیروانی، ملغوبہ آم، میٹھے جام اور لسانیات پر کام - بہرحال ڈاکٹر زورؔ اپنی زندگی میں بڑے ٹھاٹھ سے رہے - ان کے علم اور علم دوستی کی وجہ سے شہرت ان کے قدم چومتی رہی - جہاں جاتے ان کا وہاں احترام ہوتا، ایسا احترام جو کسی عہدہ کا رہین منت نہ تھا - اب جبکہ وہ اس جہانِ فانی سے رخصت ہو چکے ہیں ان کے کارہائے نمایاں کی وقعت اور ان کی عظمت اور بھی بڑھ گئی ہے " جناب کھنہ صاحب کی دلچسپ اور اثر انگیز تقریر کے بعد جواں سال مفکر اور ادیب جناب ضیاء الدین احمد شکیب نے عالمانہ مقالہ " تاریخ اردو میں ڈاکٹر زورؔ کی شخصیت کا تعین " کے زیر عنوان سنایا، اور بتایا کہ " ڈاکٹر زورؔ اردو کی ادبی تاریخ میں وہ پہلی شخصیت ہیں جنھوں نے ایک طرف تو صوتی اور لسانی اصولوں کے مطابق اردو زبان کے مطالعہ کی بنا ڈالی اور دوسری طرف اپنی لسانی تحقیقات اور ہمہ دانی کے زیر اثر اردو ادب کی تاریخ نویسی کے مسائل پر توجہ دی جہاں تک ڈاکٹر زورؔ کے تنقیدی کارناموں کا تعلق ہے اردو میں ٹھیٹ مغربی طرز کے اصولِ تنقید کو متعارف کرانے کی اولیت کا سہرا انہی کے سر ہے - ان کا سب سے بڑا کارنامہ اردو زبان اور تاریخ ادب کا وہ تصور ہے جو انھوں نے نئی نسلوں کو دیا ہے "

جناب شکیب نے ڈاکٹر زور کی تصانیف اور ان کے عہد سے متعلق مدلل بحث کرتے ہوئے بڑا ہی ٹھوس مضمون سنایا جسے حاضرین نے بیحد پسند کیا۔ ان کے بعد نواب میر یٰسین علی خاں نے "ایک خواب" کے نام سے متاثر کن اور رواں نظم سنا کر داد حاصل کی۔

مشہور ادیب اور ریسرچ اسکالر ڈاکٹر انور معظم نے "۴ ستمبر: ایک دن، ایک سوال" کے زیرعنوان مضمون پڑھا اور ڈاکٹر زور کے مشن کو آگے بڑھانے پر زور دیتے ہوئے بتایا کہ "زور صاحب کے مشن نے زور کو ایک اہم شخصیت میں تبدیل کیا، ہم چاہیں تو ان کے قائم کئے ہوئے اداروں کے ذریعہ چند اور شخصیتوں کی تعمیر اور تشکیل کر سکتے ہیں۔ ہمارے دل میں اگر ڈاکٹر زور کا سچا احترام اور ان کے مشن کی اہمیت کا پورا احساس ہے تو پھر ۴ ستمبر ایک دن کا نہیں ایک دور کی تاریخ بن سکتا ہے۔ ڈاکٹر زور بہتے دریا سے نہریں نکال لینے کو بڑا کام نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ چٹان کا سینہ چیر کر جوئے شیر لانے کے قائل تھے، چنانچہ دکنی ادب، لسانیات، صوتیات، اسالیبِ بیان اور تنقید پر ان کی تصانیف اور تالیفات اسی کوہ کنی کا ثمر ہیں۔ یہ صد فی صد درست ہے کہ دکنی روایات کے برخلاف دکن کے باہر زور صاحب اپنے دکنی ہونے پر ناز کیا کرتے تھے۔ وہ دکن پرست ضرور تھے مگر شمال شکن بھی نہیں تھے۔ وہ اردو دنیا کے ممتاز خدمت گزار شہری تھے، خلوص اور لگن کے ساتھ انھوں نے دکن میں اردو کے لئے وہی کام کیا جو کل ہند سطح پر عبدالحق نے انجام دیا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ اپنی ذات میں ایک ادارہ تھے۔"

پروفیسر سید محمد سابق صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ نے "چند باتیں، چند یادیں" کے زیرعنوان تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر زور کی یورپ سے واپسی کے بعد شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ سے وابستگی اور جامعہ کے ماحول کے بارے میں عجیب باتیں بتائیں۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو کے قیام کے پس منظر پر روشنی ڈالی اور کہا کہ "زور صاحب نے جامعہ عثمانیہ کے طلبا میں اتفاق اور کام کرنے کا حوصلہ پیدا کیا، اور ان کی حوصلہ افزائی کی۔ مضمون نویسی پر توجہ دلائی، خود کتابیں لکھیں اور مخدوم و میر حسن اور دیگر طلبا سے کتابیں لکھوائیں، اور اپنے ادارہ سے طلبائے جامعہ عثمانیہ کی کئی کتابیں شائع کرائیں اور پھر ان کی شبانہ روز کی توجہ اور کام کرنے والوں کے ایک حلقہ کے سبب ادارہ آج ایوانِ اردو کی شکل میں سارے ملک سے خراجِ تحسین حاصل کر رہا ہے۔ ڈاکٹر زور نے دکنی ادب اور تمدن کی حفاظت و صیانت میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں جیسا جیسا زمانہ گزرتا جائے گا ان کی قدر و منزلت میں اضافہ ہی ہوتا جائے گا۔ ان کی وفات کے بعد جو کام تشنہ رہ گئے ہیں ارباب ادارہ کو چاہیئے کہ ان کی تکمیل کی طرف توجہ دیں۔"

پروفیسر سید محمد کی تقریر کے بعد جامعہ عثمانیہ کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اپنی جچی تلی اور سلجھی ہوئی تقریر میں زور صاحب کے لسانی کارناموں کا شرح و بسط کے ساتھ ذکر کیا، اور ان کی شخصیت کے بارے میں بتایا کہ "ڈاکٹر زور کی شخصیت کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ وہ ایک ادبی قائد تھے، خود لکھا اور دوسروں سے لکھوایا۔ تحریکیں چلائیں،

اُردو کے لئے سینہ سپر ہوئے اور آخر کار اُردو کے لئے جاں بحق ہو گئے ۔ دکنی اُردو کے سلسلے میں ان کی دلچسپی ایسے ماحول میں پیدا ہوئی جب کہ حیدرآباد میں وحیدالدین سلیم اور عبدالحق کے سبب ایک تہذیبی فضا پیدا ہو گئی تھی" ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے بتایا کہ " مسلم یونیورسٹی نے سرسید کے بعد کوئی عمدہ کام نہیں کیا ۔ شعبۂ اردو علی گڑھ یونیورسٹی کی تمام توجہ تخلیقی ادب کی طرف مرکوز ہے ، لیکن اس کے برعکس جامعہ عثمانیہ نے تحقیقی کام کو آگے بڑھایا ہے جن میں سلیم ، عبدالحق اور ڈاکٹر زور کی مساعی کو دخل ہے " ڈاکٹر زور کی دکن پرستی کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر مسعود حسین خاں نے کہا کہ " پروفیسر زور نے اپنی لسانیاتی تحقیق کا آغاز " اردو شہ پارے " سے کیا اور اس کا ادبی عرفان دکھنی ادبیات پر ہوا "

صدرِ جلسہ مولوی محامد علی عباسی نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے ادارہ سے اپنی وابستگی اور ڈاکٹر زور کی خدمات اور ان کے مشن پر روشنی ڈالی اور کہا کہ " ڈاکٹر زور نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے آخر وقت تک اُردو کی خدمت کے لئے خود کو وقف کر دیا تھا اور اسی جذبۂ خدمت کے تحت کشمیر کا سفر کیا تھا ۔ اُن کی حیات کے زمانے میں اردو زبان و ادب کا بہت سا کام اسی ادارہ کے زیرِ اہتمام ہوا کرتا تھا ۔ اب اس بات کی ضرورت ہے کہ اس کام کو پھر سے پوری اسپرٹ اور مخلصانہ جذبے کے ساتھ شروع کیا جائے " ادارے کے علمی و ادبی اور تحقیقاتی کاموں کا تذکرہ کرتے ہوئے جناب عباسی نے اربابِ علم و دانش سے تعاونِ عمل کی اپیل کی اور ان کاموں میں ہاتھ بٹانے کی خواہش کی ۔ جناب میر حسن معتمد ادبی اجلاس کے شکریہ پر یومِ زور کا جلسۂ مقالات ایک بجے دوپہر اختتام کو پہنچا ۔

رات کے ۹½ بجے ایوانِ اردو کے سجے سجائے مشرقی طرز کے آڈیٹوریم میں ممتاز ترقی پسند شاعر جناب مخدوم محی الدین (یم - یل - سی) کی صدارت میں غیر طرحی مشاعرہ شروع ہوا ۔ باذوق سامعین نے کوئی ڈھائی گھنٹے مشاعرے کی کارروائی کو سُنا ۔ معتمد مشاعرہ محترمہ عائشہ رشادہ نے خیر مقدمی تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر زور کو خراجِ عقیدت ادا کیا اور کہا کہ " ڈاکٹر زور ایک عملی انسان تھے ، تاریخِ ادبِ اُردو میں اُن کا نام سرسید اور مولوی عبدالحق جیسے محسنین اردو کے ساتھ لیا جائے گا ۔ ایک اعلیٰ مقصد سے والہانہ وابستگی ، نصب العین کو پانے کے لئے سچی لگن ، بے پایاں خلوص اور بے مثال جوش اور استقلال ، خود کام کرنے اور دوسروں سے کام لینے کا عجیب و غریب سلیقہ ڈاکٹر زور کی دلکش اور متاثر کن شخصیت کے ایسے نمایاں اوصاف ہیں جن کی بدولت انھوں نے خدمتِ اردو کے راستے کی ہر رکاوٹ پر ہمیشہ قابو پایا اور ان تھک محنت اور لگاتار جدوجہد سے اپنے بلند ارادوں کی صورت گری کی " مشاعرے کا آغاز ڈاکٹر زور کے کلام سے ہوا ۔ جب ریکارڈ بجایا گیا تو سامعین پر زور مرحوم کی شخصیت اور کارناموں کے سبب ایک عجیب تاثر طاری ہو گیا ۔ اسی فضا میں صدرِ مشاعرہ مخدوم محی الدین نے اپنی غزل سے مشاعرے کی کارروائی شروع کی اور پھر حیدرآباد کے قدیم و جدید مکتبِ خیال کے شعراء نے نظمیں ، غزلیں اور رباعیات سنائیں ، جن میں صابر کمال ، علی الدین نوید ، عباس عابدی ، ستار چشتی ، مسعود عابد ، غیاث متین ، ضعیف الحسن خیال ، رؤف خلش ،

حسن فرخ، رئیس اختر، اسد انصاری، صلاح الدین نیر، عظمت عبدالقیوم، محمد منظور احمد، وقار خلیل، روحی قادری، ڈاکٹر غیاث صدیقی، ضیاء الدین احمد شکیب، خیرات ندیم، ابن احمد تاب، اختر حسن، میر یٰسین علی خاں، حضرت تاج قریشی اور صدرِ مشاعرہ مخدوم محی الدین شامل ہیں۔ محترمہ عائشہ رشاد نے شکریہ ادا کیا۔ ۲۰ ستمبر کی شب ۹ بجے ایوانِ اردو میں محفلِ سماع زیر صدارت جناب سید شاہ تقی الدین قادری منعقد ہوئی۔ مشہور موسیقار عزیز احمد خاں وارثی اور اُن کے ساتھیوں نے سازوں پر نعتیہ کلام پیش کیا۔ مشاعرہ اور قوالی کی ریڈیائی رپورٹ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے نشر ہوئی، اور یوم زور کی یادگار تقاریب نہایت کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچیں۔

احمد رفاعی

ذوق کی قصیدہ نگاری

(۳)

زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں، تشبیب کا یہ حصہ جو ستر اشعار پر مشتمل ہے اس کے کم و بیش ہر شعر میں ذوق نے کسی نہ کسی علم یا شعبۂ حیات میں اپنی مہارت و واقفیت کا دعویٰ کیا ہے، علوم میں رمل، جفر، سحر، افسوں، عزیمت، ہیئت، قیافہ، عروض، تفسیر، شرح، ہندسہ اور طبیعیات وغیرہ سب آجاتے ہیں۔ مختلف مذاہب و مسالک کے ضمن میں، زرتشتی، بیدک، اسرائیلی، عیسائی، سوفسطائی، معتزلہ، ملاحدہ وغیرہ سب کے اصول و ضوابط سے بحث کی گئی ہے اور ان مذاہب و مسالک سے متعلق تمام کتب و صحف مثلاً بید، شاستر، ژند پاژند، توریت، زبور، انجیل اور قرآن وغیرہ کے معانی و مفاہیم سے اپنی کامل آگہی و خبرداری کا دعویٰ کیا ہے۔

شہزادہ جواں بخت کی تقریب شادی پر جو قصیدہ پیش ہوا اس میں صرف ایک شعر میں قرآنِ زہرہ و مہ کا تذکرہ کیا ہے جو علم نجوم کی رو سے نیک علامت سمجھا جاتا ہے، تربیت ضبط نفس کے طور پر اہل طریقت کا ایک درس "پاس انفاس" کے نام سے موسوم ہے ذوق نے اپنے ایک قصیدے میں اس درس روحانی کے بارے میں اس انداز سے اظہار خیال کیا ہے ؎

زندگی چند نفس ہے کہو زاہد سے کہ تو پاس کر عیش کا کیا کرتا ہے پاس انفاس

مذکورہ بالا علوم اور شعبہ ہائے تہذیب و معاشرت کے علاوہ اور بہت سی گراں قدر معلومات ان کے قصائد میں نظم بند کی گئی ہیں جن کی روشنی میں ان کے تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے، ایک قصیدے میں مدو جزر سے متعلق سائنٹفک نظریے کا حوالہ موجود ہے ؎

تیرے مہتاب کرم سے جو سر قلزم بہر پردۂ نور میں اُبلا ہے تنورِ طوفاں

ایک جگہ مشہور خوشنویس ابن مقلہ کا تذکرہ اس لئے کیا گیا ہے کہ بادشاہ بذاتِ خود اپنے وقت کا بہت بڑا خوشنویس تھا، چمن کی دیوار قہقہہ ہمارے شعر و ادب کی روایت بن چکی ہے اُسے نظر انداز کر دیا گویا انتہائی علی بے بضاعتی کی دلیل تھا، نمک ڈالنے سے شراب سرکہ بن جاتی ہے ایک عام تجربہ ہے ابو اسحق ایک ایسا شاعر ہو گزرا ہے جو کھانے کی قسموں کو شعر میں

بیان کرتا ہے، شاہی مطبخ کے ذکر کے ساتھ ساتھ برسبیل تذکرہ اس کے نام کا حوالہ بھی موجود ہے، ارژنگ مانی کی تصویروں کی کتاب کا نام ہے، ذوق جس کا قلم بجائے خود موقلم کے مصداق ہے اپنے اس ہم پیشہ و ہم مشرب کو کیوں کر فراموش کر سکتا تھا ؎

کلکِ نقاشیٔ قدرت سے گلستاں میں آج تختۂ لالہ و گل صفحۂ نقشِ ارژنگ

شراب کے دھونے سے زخم صاف ہو کر جلد اچھا ہو جاتا ہے لیکن چونکہ بادشاہ کی دینداری کا اظہار مقصود ہے لہٰذا شراب کی اس صفت کو صفتِ معکوس کے طور پر بیان کیا ہے ؎

دھو دے اس عہد میں گر زخم کو مے سے جرّاح تو رہے حشر تلک سوزش و درد و آماس

دوسرے اشعار جن کی بابت اوپر اشارہ کیا گیا ذیل میں درج ہے ؎

تا نہ باقی رہے اور نہ رہے میں مستی توڑنا سنگِ نمک سے ہے وہ شیشے کا گلاس

عمر بھر مطبخِ عالی میں رہا نعمت خوار صفتِ اطعمہ پر خام رہا جون بسحاق

زمینِ میکدہ پہ خندۂ نشاط انگیز کرائے سے ہو دیوارِ قہقہہ تعمیر

وہ روشنی ہے ترے خط میں ابنِ مقلہ اگر لگائے آنکھ سے سرمہ کی جا تری تحریر

مندرجہ بالا معلومات ذوق کے پانچ قصائد کی تشابیب سے فراہم کی گئی ہیں اس کے علاوہ اور دیگر معلومات ہیں جو تشابیب کے علاوہ بھی قصائد کی مجموعی فضا میں جابجا بکھری ہوئی ہیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے یہ ملاحظہ ہو جس میں قواعد و گرامر کا حوالہ دیا گیا ہے ؎

خبر جملۂ عشرت ہے ترا جشنِ سعید مُبتدا جس کا بنا غرۂ ماہ شوال

گھوڑے کے ٹھوکر کھانے کو اصطلاح میں سکندری کھانا کہتے ہیں، ذوق نے اس اصطلاح کو محفوظ کر دیا ہے ؎

کیا بزمِش قلم داں دکھلائے شہسواری جب توسنِ تصور کھاتا سکندری ہو

زفیل کبوتر باز کی اس سیٹی کو کہتے ہیں جس پر کبوتر اڑ جاتے ہیں ذوق نے دورِ فارغ البالی کے اس یادگار ذوق سے متعلق اپنے درک و واقفیت کی روشنی میں ایک اچھوتا مضمون پیدا کیا ہے ؎

طائرِ روحِ عدو کے لئے بہرِ پرواز تیر کی تیرے صدا جیسے کبوتر کو زفیل

ایک قصیدے میں بازیگروں کے اُس خصوص کرتب کی جانب اشارہ ہے جو درخت بنا کر لوگوں کو دکھا دیتے ہیں، اُن قسم کے شعبدے باز ہندوستان میں اب تک کہیں کہیں پائے جاتے ہیں ؎

کرتا ہے شاخِ خشکِ تمنا کو نخلِ سبز در پردہ مثلِ پردۂ بازیگر آسماں

اوتاد و ابدال فقیروں کے گروہ ہیں کہتے ہیں دنیا کا نظام اُن کے دم سے قائم ہے ذوق نے اس عقیدے کی صراحت میں کہا ہے

تا وجود پاک سے ابدال اور اوتاد کے | انتظام اہلِ عالم ہووے عالم میں تمام

اِدّعائے علم و فضل کے طور پر ذوق نے اپنے کچھ قصائد میں عربی جملے اور تراکیب بھی استعمال کی ہیں ؎

جانبِ اعدا تو سرِ میدان کھینچ لے جس دم صارم بُرّاں | نعرہ ہو اس کا اقتل اقتل، ندبہ ہو اس کا نحنُ قتلنا

روئے نیکو پہ ہے مائل تری خوئے نیکو | کیوں کیونکر نہ کہ الحسنُ الیٰ الحسن یمیل

جس سے پوچھو کہ تو آگہ ہے کہے گا کہ بلے | انت تعرف کہو جس سے وہ کہے گا کہ نعم

کیوں نہ ارباب ہم ہوں تری ہمت کے غلام | حق یہی ہے کہ الانسان عبید الاحسان

قصیدے کا آہنگ بندی الفاظ کا روادار نہیں ہے لیکن ذوق نے ایک آدھ جگہ اس زبان کے نرم و مترنم لفظ کا استعمال کر ہی لیا ہے ؎

گلشنِ مدح میں دے تیرے ترا ذوق لگا | خرمنِ گل کی جگہ تازہ مضامیں کا اٹم

انگریزی زبان کا لفظ "فائر" بھی بہ تحریفِ خفیف ذوق کے یہاں موجود ہے ؎

پکارے سب کہ قواعد ہے فوج میں شاید | کہ فیر اڑ رہے ہر صف میں ہیں قطار قطار

روزمرہ اور محاورے کا استعمال بھی قصائد میں مستحسن نہیں سمجھا جاتا اس لئے کہ اس کے استعمال سے قصیدے کی فضا کچھ عامیانہ سی ہو جاتی ہے لیکن ذوق جنہیں محاورہ بندی سے یک گونہ جذباتی شیفتگی ہے اس باب میں خود پر صرف ایک حد تک ہی قدغن عائد کر سکے ہیں لہٰذا جہاں کہیں انھیں ذرا سی بھی گنجائش نظر آئی وہ محاورہ بندی سے باز نہیں رہ سکے ہیں ذیل میں ایسے کچھ اشعار درج کئے جاتے ہیں جن میں محاورہ کا استعمال روا رکھا گیا ہے ؎

کہے یہ رند کہ او زہد فروش آگ نہ پھانک | مانگے گر بادۂ تو زہد کہن کی قیمت

دیتی ہے طاقت پرواز یہ کیفیت سے | اس ہوا میں ہے بطے کہ اڑی بے پر و بال

نالۂ بوک کی ہیبت سے رکھے پھونک کے پاؤں | کوچۂ صور سے نکلے جو دمِ اسرافیل

افراطِ انبساط سے ہے کیا عجب اگر | مثل حباب جامے سے باہر ہو آسماں

دکھلائے آبداری جب تیغ شعلہ دم کی | شیروں کے دل میں ٹھنڈا خونِ دلاوری ہو

دیکھا جو تیرے فیض کو جاری تو رہ گیا | دریا بھی منہ کینوں کے گریباں میں ڈال کے

جاتا ہے دوڑ دوڑ کے ہر دم تری طرف | دھو دھو کے پاؤں پیچھے پیکِ خیال کے

کیا ساغرِ رنگیں کو کیا جلد مہیا | نرگس نے تو سرسوں ہی ہتھیلی پہ جمائی

امرد پرستی بھی ہماری کلاسیکی شاعری کی روایت ہے جس کا غزل میں خاص طور سے عمل دخل رہا ہے، ذوق نے اپنے ایک قصیدے میں اس موضوع سے متعلق بھی اظہار خیال کیا ہے ؎

تیرے تاثیرِ محبت نے دیا ہے تریاک　　　ورنہ تھا زہر دلوں کو خطِ سبز خوباں

ذوقؔ کے قصائد سے متعلق یہاں تک جو بحث کی گئی اس کی روشنی میں اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں فقہ، تصوف، تفسیر، حدیث اور تاریخ وغیرہ علوم میں خاصی دستگاہ حاصل تھی، اس کے علاوہ دیگر علوم مثلاً رمل، نجوم، طب اور موسیقی وغیرہ سے کچھ خصوصی قسم کی دل لبستگی ضرور تھی، نیز سماج و معاشرت کی کچھ جاندار اور جاذب توجہ قدروں کا گہرا احساس اور اس مخصوص ماحول سے کچھ والہانہ قسم کی وابستگی بھی تھی جس کے درمیان ان کے تہذیبی شعور کا نشوونما ہوا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ذوقؔ کے علم و فضل میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا ہے اور اس اعتبار سے ان کے قصائد کا علمی پایہ بلند و مستحکم ہوتا گیا ہے۔ ذوقؔ نے طبیعت صد درجہ تیز اور حافظہ غضب کا پایا تھا انھوں نے جو دیکھا یا پڑھا اسے سمجھا، پرکھا اور ذہن میں محفوظ رکھا، کیا ایک وقت جب خیالات نے انھیں ایک موقع فراہم کیا اور انھوں نے اپنے فلک بوس قصر ہائے فکر و فن کی تعمیر کی تو ذہن کے محفوظ کردہ سرچشمہ ہائے نور سے کچھ کرنیں لے کر ان کے در و بام پر بکھیر دیں جن کی جوت سے پوری تعمیر یکبارگی جگمگا اٹھی۔ گزشتہ سطور میں جن اشعار کا حوالہ دیا گیا ہے وہ بیشتر ذوقؔ کے علم و فضل کی نشاندہی کرتے ہیں لیکن ذوقؔ کے شاعرانہ کمال کا اندازہ کرنے کے لیے ان کے قصائد کو خالص فنی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے، ذوقؔ کی قادر الکلامی اور زبان پر بے پناہ قدرت کے سبب ان کے اسلوبِ بیان میں ایک خاص قسم کی تر و تازگی و طرح کاری موجود ہے۔ حسن تشبیہ، لطف استعارات کے پہلو بہ پہلو فکر و خیال کی رعنائیوں سے اس کی دلآویزیوں کو بے پناہ طور پر ابھارا گیا ہے اور موقع، صنائع لفظی و معنوی کے در و بست سے اس کی لچک، اس کے لوچ اور کیف و اثر کو زیادہ سے زیادہ بالیدہ کیا گیا ہے ذوقؔ کے لب و لہجے میں نرمی و وقار کا ایک بہت ہی سنبھلا ہوا امتزاج موجود ہے جو الفاظ و عبارات کی خوش ترکیبی، زبان کی موزونیت اور مٹھاس کے فطری تال میل سے عبارت ہے۔

ذوقؔ کی امیجری اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت کچھ تخیلی اور کچھ کچھ تمثیلی ہے جس کے سبب ان کے قصائد کی عام فضا بڑی حد تک ماورائی سی نظر آتی ہے، وہ اپنے تخیل کی بدولت مضمون آفرینی و پیام تراشی کا ایک کمال دکھلاتے ہیں مبالغے سے انھیں خاص مس ہے، صناعی و صنعت گری پر بھی وہ بے طرح مائل ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اختراعِ مضامین کے باب میں دقت پسندی سے انھیں ایک قسم کا والہانہ علاقہ ہے، اس چیز نے ان کے قصائد کو کچھ غیر فطری آب و رنگ دے دیا ہے لیکن بایں ہمہ اس کی دلکشی میں کلام نہیں، یہ چیز ذوقؔ کی مشاقی اور خلاقی سخن پر واضح دلیل ہے۔

ذوقؔ کو ضرورت کے تحت کہیں کہیں ضرب الامثال قلم بند کرنی پڑی ہیں لیکن ان کا استعمال محض قافیہ پیمائی کے طور پر معلوم ہوتا ہے مثلاً

دل جو غم گھر کا ہو گیا اس میں ہو سرمایۂ عیش　　　وہ مثل ہے کہ کہاں گھونسلے میں چیل کے ماس

سرو قامت سے اگر اس کے ہو طوبیٰ سرکش　　　راست ہاں راست ہے یہ "کل طویل" احمق"

پیشِ دشمن نہ گزر حق سے نہیں سالک کو آنچ		بلکہ ہے آتشِ نمرود گلستانِ خلیل

ذوق نے صرف یہ تین ضرب الامثال قلم بند کی ہیں، ان کا مخصوص تمثیلی انداز بیان ایک علاحدہ چیز ہے جو اپنی حدود میں تہہ دار اور معنی خیز قسم کا ہے اور جس کی منطقی شیرازہ بندی مضبوط اور جزیل ہے ذوق کے اس قسم کے اشعار اخلاقیات کی حدود میں آجاتے ہیں، جن کی معنوی گرہ کشائی سے کوئی نہ کوئی اخلاقی نتیجہ مرتب ہوتا ہے، اس نوع کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں ؎

گم ہوں ظاہر کی خرابی سے صفات اصلی		زنگ دیتا ہے چھپا جوہر شمشیر اصیل
نہیں بے قید علائق کسی عالم میں بزرگ		رسم تحریر میں بھی چھوٹے نہ زنجیر سے فیل
ہے تہہ خاک بھی قاروں کو سفر حشر تلک		نہیں تا تحتِ ثریٰ منزلِ آرام بخیل
عید یک روز جہاں میں ہے رمضان یک ماہ		بعد ہے کثرتِ تکلیف کے یاں عیش قلیل
جتنا خورشید تپے اتنی ہی بارش ہو سوا		ہووے کیونکر تپشِ عشق نہ رحمت کی دلیل

مندرجہ بالا اشعار جس قصیدے سے انتخاب کئے گئے ہیں اس کے متعلق مولانا امداد امام اثر کی رائے ہے ؎

"اس قصیدے کے اشعار تشبیب ویسے ہیں کہ جیسا اشعار تشبیب کو ہونا چاہیئے ان میں کچھ اقوال حکیمانہ و محققانہ بھی ہیں، پھر شاعری کا پیرایہ بھی اچھا رہا ہے مزید براں کلام احاطۂ غزلیت سے نکلا ہوا ہے، اتنے بہ کار آمد مضامین ذوق کے کسی قصیدے میں نظر نہیں پڑے"۔ [1]

یہ تمثیلی انداز ذوق نے صرف دو قصائد کی تشبیب میں اختیار کیا ہے، دوسرے قصیدے میں جو مخصوص اشعار اس موضوع سے متعلق نظر سے گزرے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں ؎

نظرِ خلق سے چھپ سکتے نہیں اہل صفا		تہ دریا سے چمک کر نکل آیا گوہر
پاک دنیا سے ہیں دنیا میں ہیں گو پاک سرشت		غرق ہے آب میں پر تر نہیں اصلا گوہر
غیر پُر مایہ نہ کم مایہ سے ہو ضبطِ ہوس		بہہ گیا ژالہ ہوا لگ کے نہ پگھلا گوہر
سرکشی کرتے ہیں بے مغز نہ پر مغز و قار		جز حباب آب سے سر کھینچے نہ بالا گوہر
ربط ناچیز سے کرتے ہیں کوئی پاک نہاد		ہو نہ ہم صحبتِ تارِ رگِ خارا گوہر

تشبیہات و استعارات کا استعمال ذوق نے بیشتر تشابیب کے شعروں میں کیا ہے، مبالغہ اور حسن تخیل کی جلوہ طرازیاں

---

[1] کاشف الحقائق جلد دوم صفحہ ۲۵۲

خصوصیت سے یہیں نظر آتی ہیں، یا پھر ان اشعار میں جو خالص مدح سے علاقہ رکھتے ہیں، حسن تراکیب و دیگر صنائع بدائع کا استعمال جن قصیدے کے ان ہی دو اجزائے ترکیبی میں بھرپور طریقے پر ہوا ہے، لیکن ذوق کی اصل شہرت کی بنیاد ان کی مرصع تشابیب پر قائم ہے تشابیب کے ضمن میں یہ بحث کافی طویل ہوگئی ہے لیکن طبیعت کی درازنفسیاں کچھ اور وسعت بیان کی طالب ہیں، وجہ یہ ہے کہ ذوق کے کمالات شعرگوئی کا صحیح اندازہ اس کے بغیر ممکن بھی نہیں ہے۔ گزشتہ سطور میں تشبیب کی بحث کے ضمن میں کچھ ایسے اشعار بھی پیش کئے گئے ہیں جن کا تشبیب کے علاوہ قصیدے کے دوسرے اجزائے ترکیبی سے علاقہ ہے۔ لیکن ایسا ارادہ طور پر کیا گیا ہے تاکہ موضوع بحث کا معنوی تسلسل منقطع نہ ہونے پائے اس معاملے میں کسی خلط مبحث کا گمان نہیں ہونا چاہیئے، ذیل میں ذوق کے مشہور قصیدے "زہے نشاط اگر کیجئے اسے تحریر" سے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں جن میں متحرک و مرکب تشبیہات کا حسن اپنے اچھوتے پن کے لحاظ سے دلآویزی و سحر کاری میں اپنا جواب نہیں رکھتا ؎

کرے ہے وا درِ غنچہ لبِ ہزار سخن	چمن میں موجِ تبسم کی کھول کر زنجیر
اثر سے بادِ بہاری کے لہلہاتے ہیں	زمیں پہ ہم سرِ سنبل ہے موجِ نقش حصیر
ہوا پہ دوڑتا ہے اس طرح سے ابرِ سیاہ	کہ جیسے جائے کوئی فیل مست بے زنجیر

اس ضمن میں ذوق کا ایک معرکتہ الآرا قصیدہ جس کی "ردیف "گرہ" ہے تخئیل ذوق کی نادرہ کاری کا بےمثل شاہکار ہے، اس قصیدے کی تشبیب میں شاعر نے اپنی گرفتہ دلی کو جا بجا کچھ ایسے طرفہ انداز میں پیش کیا ہے کہ پڑھنے والا حیرتوں میں ڈوب جاتا ہے ایک بھرپور قسم کا کیفیاتی تاثر اخذ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ تمام قصیدے کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے، لیکن چونکہ اس مضمون میں اس قدر تفصیلی حوالے کی گنجائش نہیں لہٰذا صرف چار چھ اشعار پر اکتفا کیا جاتا ہے ؎

رو یا میں شکل شیشہ کبھی کھول کر نہ دل	میرے گلو میں گریہ ہمیشہ رہا گرہ
پیدا ہوں سو گرہ اگر اک دل سے کھولئے	جوں کو کنار و لالہ و تخم فنا گرہ
سوزن کا رشتہ بن کے کھنچی جنتری میں آہ	ہے زیر پائے رشتہ بپا دوسرا گرہ

گریز کے یہ دو اشعار بھی قابل لحاظ ہیں ؎

دل تھا گرہ خیال میں جو آ کے عقل میں	یوں کھول دی بہ ناخن فکر رسا گرہ
اس آفتاب پر تو نظر کر کے جوں نگرگ	پل میں وہ اک زمانے کی ہے کھولتا گرہ

یہ آخری شعر خاص طور سے اس وجہ سے بھی قابل لحاظ ہے کہ اکبر شاہ کا تخلص "شعاع" تھا۔ شعاع کی رعایت سے آفتاب کی مناسبت خوب ہے۔ کلام ذوق کی یہ تہہ داریاں ذوق کی نکتہ سنجی کی معتبر ترین شاہد ہیں۔ ذوق نے بعض

ایسی حسین اور ہمہ وقت تازہ قسم کی تشبیہات اختراع کی ہیں جن کا دنیائے شاعری میں کہیں جواب نہیں، ذوق کی امیجری اپنی اپج، اجتہاد اور ایجاد معانی کے لحاظ سے یہاں انتہائی بلند دار فع مقام پر فائز نظر آتی ہے، ان تشبیہات کا رنگ افروز تموج دتحرک تخئیل کی بے کنار میں پھیلتا چلا جاتا ہے اور کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کھلی فضاؤں میں کسی نے ہر چہار طرف ہزار ہا رنگین آنچل لہرا دیئے ہیں، مثلاً کھلے ہوئے پھولوں میں مینھ کے چمکتے ہوئے قطروں کو یہ کہنا گویا یاقوت کے چھوٹے چھوٹے ڈبوں میں موتی بھرے ہیں تخئیل ذوق ہی کا حصّہ ہے۔ شعر ملاحظہ ہو ؎

گل بشگفتہ میں یہ قطرۂ باراں سے بہار بھر دیئے درحقِ یاقوت میں گویا گوہر

ذیل کے اشعار سرو پا نگاری سے تعلق رکھتے ہیں ؎

سینہ تا ناف صفا آب گہر کا دریا ناف اک عکس ذقن اس میں بجائے زورق

قد جو گلبن تو وہ پاؤں کے حنائی ناخن نیچے گلبن کے پڑے بکھرے ہوئے گل کے ورق

پہلے شعر میں کہتے ہیں کہ اس کا سینہ ناف تک صاف تھا اور ایک موتی کا دریا معلوم ہوتا تھا اس میں ناف کا گڑھا جو ٹھوڑی کے گڑھے کی طرح تھا کشتی معلوم ہوتا تھا۔ دوسرے شعر میں محبوب کے قد کو پھول کے درخت سے اور اس کے مہندی لگے ناخنوں کو پھول کی پنکھڑیوں سے تشبیہہ دی ہے، سرو پا نگاری کے ضمن میں ایسی نادر تشبیہہ شاید ہی کہیں مل سکے۔

ایک قصیدے کی تشبیب میں عیش و خوشی کو مجسم کیا ہے اور ان کے تعلق خاطر کو اس طرح واضح کیا ہے ؎

ایسے تھے دونوں وہ یک دل کہ دو قالب یک جاں یک زباں دونوں وہ اس طرح کہ جوں چاکِ قلم

شراب کا کبھی خم اور کبھی شیشے میں اڈیلا جانا ایک عام بات ہے لیکن ذوق نے اس منظر سے ایک اچھوتا مضمون پیدا کیا ہے ؎

گاہ مے خم میں ہے گہہ شیشے میں کیا کیا پئے سیر روح کرتی ہے کسی مست کی قالب تبدیل

ذوق کی بعض بعض تشبیہات حِسیاتی اندازِ فکر کی حامل ہیں، ایسی تشبیہات ہمارے لطیف احساسات کو گدگداتی ہوئی گزر جاتی ہیں، یہ موخر الذکر تشبیہہ کچھ اس قسم کی ہے۔ بعض تشبیہات براہ راست ہمارے ذوقِ جمال کو آسودہ کرتی ہیں اور جذبات و تاثرات کی پیچ در پیچ شاہراہوں پر روشنیوں کے پھول بکھیرتی چلی جاتی ہیں، سراپا نگاری کے ضمن میں ذوق کی اختراع کردہ بیشتر تشبیہات کا رنگ و آہنگ اسی قسم کا ہے مثلاً ذیل کا شعر ملاحظہ ہو ؎

کمر نزاکت سے لہکی جائے، کہ ہے نزاکت کا بار اٹھائے

اور اس پہ سو نور لہر کھائے، پھر اس پہ ہیں دو قمر فروزاں

ذوق نے اس شعر میں ایک حسین مفہوم کو کوزہ میں بند کیا ہے جو حد درجہ نازک بھی ہے، ذوق کی اس نوع کی تشبیہات میں ان کے فکر و خیال کی نورانی پرچھائیوں کے پہلو بہ پہلو ان کی فطری متانت و وقار کی چمک دمک کو محسوس کیا جا سکتا ہے اور اس احتیاط پسندانہ رجحان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو شاذ و نادر ہی کسی جگہ اپنی حدود سے تجاوز کرنے پر مائل ہوا ہو، ان کے تمام قصائد میں صرف ایک مقام پر امرد پرستی کی جانب ایک ہلکا سا اشارہ ملتا ہے جس کا گزشتہ سطور میں کسی جگہ حوالہ دیا جا چکا ہے ۔ مذکورہ شعر کے علاوہ ایک دوسرے قصیدے کی تشبیب میں ذیل کا شعر نظر سے گزرتا ہے جسے ذوق کے ذوقِ قافیہ پر محمول کرتے ہوئے نظر انداز کر دینا زیادہ مناسب ہوگا قصیدے میں قافیہ پیمائی سے مفر ہے بھی کہاں ؎

اللہ اللہ رے تری مستی و بالا دستی شب کہے مست کہ کر لوں گردوں سے مساس

بعض تشبیہات میں غضب کی محاکاتی شان ہے مثلاً ایک جگہ ہوائی کے شعلے کو علم کا کہکشاں کا پرچم قرار دیا ہے ؎

سر اٹھایا یہ ہوائی نے ہے آخر کہ ہوا شعلہ اس کا علم کا کہکشاں کا پرچم

مدح کے ضمن میں ذوق نے مبالغے سے بھی کام لیا ہے جس کی مثالیں آگے آئیں گی، یہاں صرف تشبیہاتی اشعار سے غرض ہے ۔ شخصی مدح کے باب میں ذوق کو شعوری طور پر یہ احساس رہا ہے کہ مغلوں کا دور کشور کشائی عرصہ ہوا رخصت ہو چکا ہے لہٰذا انھوں نے سلاطین کی قسمت آزمائیوں کی داستان کا دائرہ قدرے محدود کر دیا ہے اور زیادہ تر ان کی پاکیزہ سیرتی، دینداری اور صفاتِ ملکوتی پر زور دیا ہے اور ان فضائل کے اجاگر کرنے میں حسین ترین تشبیہات کو اختراع کیا ہے، بہادر شاہ کی سخاوت کے بیان میں کہتے ہیں ؎

رکھتا ہے تو وہ دستِ سخا جس کے سامنے ہے بحر بھی کشتی بکف از بہر گدائی

بادشاہ کے تدین و تقویٰ شعاری کے معیار کو اس انداز سے سراہا ہے ؎

یوں کرسی زر پر ہے تری جلوہ نمائی جس طرح کے مصحف ہو سرِ رحلِ طلائی

ظاہر ہے ایک فاسق و فاجر بادشاہ کے لئے ایسی روح پرور تشبیہ کوئی شاعر ایجاد نہیں کر سکتا ۔ یہاں بہادر شاہ کی بات اور ہے اس کی فرشتہ سیرتی کو نظر میں رکھا جائے تو اس تشبیہ کا استعمال مستحسن اور اس کی معنویت دوچند ہو جاتی ہے ۔

شاہانہ جاہ و جلال کے نقشے بھی ذوق نے کھینچے ہیں اور متعلقاتِ شاہی مثلاً تیر، تلوار، ہاتھی، گھوڑے وغیرہ کی تعریف بھی کی ہے ۔ قصیدے کی اس مقرر کردہ روایت سے پہلو تہی کسی طرح ممکن بھی نہ تھی، ذوق نے اس روایت کو جہاں کہیں برتا ہے وہاں طبیعت کے فطری جوش و خروش کے ساتھ برتا ہے البتہ اندازِ بیان پر تخیل کی کارفرمائیوں کی چھاپ ذرا گہری نظر آتی ہے ۔ ذیل کے شعر میں متعلقاتِ شاہی میں سے تیر کی تعریف کی گئی

ہے اور کیا زندہ و متحرک قسم کی تشبیہہ پیش کی ہے ؎

پیکاں ترا الماس گوں منہ سرخ سوفاروں کے یوں گویا لگا کر پر اڑا نورِ سحر رنگِ شفق

ذوق حسن خیال کے نئے نئے پہلو ایجاد کرتے ہیں، ان کا مشاہدہ غضب کا ہے، وہ منتشر جزئیات کو ایک حکم میں جمع کرکے بعض اوقات اچھوتے قسم کے نتائج مرتب کر لیتے ہیں ذیل کے شعر کو دیکھئے جس میں تلوار اور ڈھال کو ریاضی ترتیب دے کر کیا نادر مضمون پیدا کیا ہے ؎

رعبِ شمشیر ترا یوں ہو سپر سے دہ چند جیسے نقطے سے کریں ایک کو دس اہلِ سیاق

بعض تشبیہات بالکل خیالی قسم کی ہیں لیکن ابلاغ معانی کے لحاظ سے بھرپور، ایسی ہی ایک تشبیہہ میں گھوڑے کی تیز رفتاری کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے ؎

ایسا چالاک کہ اس طرح سے اڑ جاتا ہے جس طرح عاشقِ دل باختہ کے ہوش و حواس

ہاتھی کی تشبیہہ ملاحظہ ہو ؎

رفعت پہ تیرے فیل کی طبعِ رسا نے رات پھینکا کمندِ وہم کو جو کرکے وا گرہ
آیا نظر کہ صفحۂ چشمِ زمانہ میں اک نقطہ مشک ناب کا ہے ہو رہا گرہ

تشبیہات سے ہٹ کر اب ہم صنعت مبالغہ کی طرف رجوع کرتے ہیں، مبالغے کی دھوم دھام تشابیب اور مدح دونوں مقامات پر پائی جاتی ہے، مبالغے کے بغیر قصیدے میں چونکا دینے والی خصوصیات پیدا نہیں ہوتیں اسی وجہ سے اسے قصیدہ میں ضروری سمجھا گیا ہے، لیکن مبالغے میں یہ صنعت زورِ تخیل کے بغیر پیدا نہیں ہوتی - طباعی اور معنی آفرینی کے شگوفے تخیل ہی کے شجر سدا بہار سے پھوٹتے ہیں، ذوق اس گر سے واقف ہیں انھوں نے اپنے دور رس تخیل کی بدولت مبالغے کو معنی آفرینی کی حدود میں داخل کر دیا ہے، حد سے متجاوز اور غیر فطری قسم کی مبالغہ آرائی سے انھوں نے احتراز کیا ہے، وہ اس حقیقت سے واقف تھے کہ ہر نوع کی مبالغہ آرائی قلوب پر تادیر گرفت قائم رکھنے سے قاصر ہے اور غالباً یہی سبب ہے کہ وہ اس معاملے میں حتی الوسع منطقی سررشتوں کو ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیتے۔ ذیل میں دو شعر اس بیان کی تائید میں پیش کئے جاتے ہیں یہ دونوں شعر بھی ہاتھی ہی کی تعریف میں ہیں ؎

مانا اگر بلندیٔ شان و شکوہ میں ہاتھی سے تیرے ہو بھی گیا ہم سر آسماں
پر اس کے نقشِ پا کے مقابل بنا سکے چاہ آفتاب ایک جگہ کیوں کر آسماں

ذوق کے بیشتر مبالغے براہ راست ہمارے وجدان کو اپیل کرتے ہیں ایسے مبالغوں میں منطقی ربط و بست کی بہ نسبت محاکاتی اسلوب کو زیرِ نظر رکھا گیا ہے، یہ طریق کار پہلے کی بہ نسبت زیادہ موثر اور جاندار ہے، ذیل کے اشعا

اس دعوے کی تائید کریں گے ؎

پہنچے جو گوش صدف تک یہ نوید عشرت — اتنا بالیدہ بکف ہو کہ ہو مینا گوہر
موج گوہر میں بھی ہے طرز تبسم پیدا — کوئی دم میں روش غنچہ ہنسے گا گوہر
ہے ترے قطرۂ پیکاں سے دم بارش تیر — جگر چاک عدو میں صدف آسا گوہر
ہو تری کلک کرم جبکہ شہا گوہر بار — جیم محتاج کے دامن میں ہو نقطہ گوہر

ایک دوسرے قصیدے میں بادشاہ کی مدح میں کہتے ہیں ؎

رکھتی سرعت ہے تپ لرزۂ ہیبت سے تری — نبض محموم کی مانند جبل میں رگ سنگ
مرغ دل کو ترے دشمن کے قفس ہے سینہ — اور جگہ چوب قفس کی ہے ترا تیر خدنگ

اور یہ دیکھئے ایک عام فعل سے کس قدر روشن مفہوم پیدا کیا ہے کہ ذہن کے افق پر ستارے سے بکھرے ہوئے محسوس ہوتے ہیں ؎

ہووے جوں چادر مہتاب گلیم شب تار — رخ پرنور جو تو پونچھ کے جھاڑے رومال

عید قربان کے موقع پر اکبر شاہ کے حضور میں ایک قصیدہ گزرانا "دل کہ اس دہر میں ہے گرسنۂ ناز بتاں" اس قصیدے کی تشبیب میں فکر و خیال کی یہ ریزہ کاریاں قابل داد ہیں ؎

ہوں وہ لب تشنہ کہ میں دامن دریا سمجھوں — برق پر سوز کا ہاتھ آئے جو طرف داماں
میں وہ بسمل ہوں دل خوں شدہ جس کے خوں میں — تیغ قاتل روش کشتیٔ دریا ہو رواں
شرح جاں سوز سے میری نئے قلیاں کی طرح — کیا عجب نالے قلم سے جو نکل آئے دھواں
دل گرفتہ ہوں وہ میں دہر میں مانند انار — اک گرہ وا ہو تو صد گرہ ہوں اندر داماں

اس موخرالذکر شعر کے مضمون کو ذوق نے ذرا ترمیم کے ساتھ ایک دوسرے قصیدے میں اس طرح قلم بند کیا ہے ؎

گر میں گرفتہ دل ہوں تو جوں دانۂ انار — محفل میں ہوگا خندۂ دنداں نما گرہ

(باقی آیندہ)

عبرت النّاظرین

صفیر بلگرامی کی ایک غیر مطبوعہ مثنوی

حضرت صفیر بلگرامی کی ایک غیر مطبوعہ مثنوی "عبرت النّاظرین" جناب سید وصی احمد بلگرامی صاحب کے ذریعے دستیاب ہوئی ہے وصی احمد صاحب نے اس مثنوی کو مرتب فرمایا ہے اور اس پر ضروری حواشی بھی لکھ دیئے ہیں۔ لفظوں کا املا اصل کے مطابق ہے۔

عبرت النّاظرین

خدایا بقایا ہے تیرے واسطے — بقایا خدا ہے ترے واسطے
تری ابتدا کو نہیں ابتدا — تیری انتہا کو نہیں انتہا
نظر آرہا ہے یہ جو کچھ ہمیں — تو دکھلا رہا ہے یہ جو کچھ ہمیں
ثبات ایک شے کو نہیں اے قدیم — سوا تیرے کوئی نہیں ہے قدیم
کہے عقل کیونکر نہ یکتا تجھے ۵ — کہ ہے ہستیِ محض زیبا تجھے

غزل

خدایا ثبات جہاں کچھ نہیں — زمیں کچھ نہیں آسماں کچھ نہیں
تری ذات ہے واحد لاشریک — عیاں کچھ نہیں ہے نہاں کچھ نہیں
مکاں لامکاں ہیں تری جلوہ گاہ — یہاں کچھ نہیں ہے وہاں کچھ نہیں
بقا اپنی فانی ہے باقی فنا — نہیں کچھ نہیں اور ہاں کچھ نہیں
ترا نام باقی نشاں تیرا سب ۱۰ — کسی کا بھی نام و نشاں کچھ نہیں

کوئی کیا کرے تیری قدرت بیاں   زباں کچھ نہیں ہے بیاں کچھ نہیں
ترے ہاتھ میں سب کا ہے اختیار   یہ دل کچھ نہیں اور جاں کچھ نہیں
ابے حکم شرع آب خوردن خطاست   ہمارا یہ سو دو زباں کچھ نہیں
قیاسانہ کیا ہو تری جستجو   ہمارا بھی وہم و گماں کچھ نہیں

کسی نے کہا خوب ہے اے منجّر
خدا کے سوا این و آں کچھ نہیں ۱۵

وجود خدا میں ہو کیا گفتگو   کہ گونجی ہے عالم میں آواز ہوُ
جدھر کوئی دیکھے وہ موجود ہے   جدھر کو چلے جائی مقصود ہے
حقیقت کو کوئی نہیں جانتا   ہراک ہے وجود اوس کا پرمانتا
جوبے اُس کے جانے بھی چارہ نہیں   توبے اس کے ملنے بھی چارہ نہیں
نہ زین رشتہ سرِی توان تاختن ۲۰   نہ سررشتہ را می تواں یافتن
یہ ہیں تین شکلیں برائے وجود   زیادہ نہیں اس سے کوئی نمود
بہم ہستی و نیستی ہوں اگر   یہ ہے شکل پہلی بہ پیش نظر
وہ موجودہ اشیا میں موجود ہے   عیاں جو ہوا پھر وہ مفقود ہے
نمود ان کی ہے صاف مثل حباب   بقا و فنا ہیں بہم بے حجاب
جو ہے نیستی محض شکل دُوم ۲۵   ہمیشہ سے گُم تھی۔ ہمیشہ ہے گُم
وجود اُس کا موجود ہے نام کو   علاقہ نہیں ہے کسی کام کو
خرد لے یہ دو شکلیں ٹھہرائی جب   تو پھر رہ گئی ایک شکل عجب
وہ کیا محض ہستی نہ ہو نیست۔ جو   یہ حاصل نہیں پر کسی چیز کو
جو آلہ ہے اشیا کے ادراک کا   خرد اس میں ہو یا کہ ذہن و ذکا
نظر ہے اوس کو نہیں ایسی چیز ۳۰   کہ ہو ہستیٔ محض جس سے تمیز
حواسوں سے ہوتی نہیں ہے وہ حس   تصور میں ہوتی نہیں منعکس
مگر عقل کہتی ہے بے شک ہے وہ   یہ کیا جانیں۔ کیا ہے کہاں تک ہے وہ
اسی میں ہزاروں خیالات ہیں   خیالات کیا ہیں فقط بات ہیں
فلک اور زمیں کو کہے گر حکیم   کہ وہ ہے قدیم اور یہ ہے قدیم

تو پہلے یہی کہنا ہوگا ہمیں ۳۵ فلک کا یہ ہونا بھی۔ ٹھرا تو لیں
حکیمانِ سابق کا تھا یہ خیال نہیں مانتے ہیں حکیمانِ حال
طبق اوڑ گئے ۔ آسماں اوڑگیا وہ سب اون کا وہم وگماں اوڑگیا
کہاں آسمان ۔ ہے یہ مدِ نظر سیاہی ہے دوری کی سدِّ نظر
جو باطل ہوئی اصل شے اسے حکیم قدامت کہاں پھر کہاں وہ قدیم
نہیں آسماں ان دنوں کوئی شے ۴۰ فقط ہے زمیں اور وہ گردش میں ہے
بلندی کا بس آسماں نام ہے مگر اوس کے اجرام سے کام ہے
قمر اور مریخ اور آفتاب زحل مشتری زہرہ باآب وتاب
اسی طرح سے اور سیارے ہیں ثوابت بھی یوں نہیں بہت تارے ہیں
ہے ان سب کا مرجع فقط آفتاب یہ سب اور زمیں اوس سے ہے فیض یاب
ہراک گردِ خورشید گردش میں ہے ۴۵ کہ باقی نہیں دور سے کوئی شے
اسی سے جو ہو محض ہستی مراد اگر ہوں اسی کی قدامت سے شاد
تو اس کی بھی ہے صاف منکر خرد میں دیتا ہوں اس بات کی اب سند
کہ جب سب کا مرجع ہے اک آفتاب اوسی سے ہراک چیز ہے فیض یاب
تو پھر دیکھ حادث ہے وہ یا قدیم اسے غور کر جلد دل میں حکیم
یہ ثابت ہیں کرتے حکیمانِ حال ۵۰ بہت دور پہونچا ہے ان کا خیال
وہ کہتے ہیں عقلی دلائل سے صاف یہ ہوتا ہے ہم لوگوں پر انکشاف
کہ سیاروں کے ساتھ خود آفتاب ہے عالم کے عرصہ میں گرم شتاب
رواں ہے کسی جانب اس رنگ سے کہ واقف نہیں کوئی اوس ڈھنگ سے
نہیں بسکہ معلوم پیش نظر ہے عالم کے عرصہ کی کچھ انتہا
تو جب تک ہے یہ حال کا انتظام ۵۵ چلا جائے گا نہر تب تک مدام
جو سیارے اس کے ہیں ۔ ہمراہ ہیں حکیم اوس جگہ سے کب آگاہ ہیں
جہاں تھی زمیں ۔ یا کہ اب ہے جہاں میسر اسے پھر کہاں وہ مکاں
کہو اب تم اے اہل ہوش و خرد بقا ہے اسی کے لئے نا مزد
یہی آفتاب اور سیارے سب بقا و فنا کے ہیں بالکل سبب

یہی جس کو اک جا نہیں ہے قیام ۶۰ یہی جو نہ پائے گا پہلا مقام
یہی جو کہ مجبور گردش میں ہے ہر اک لحظہ کچھ دور گردش میں ہے
ان اشیا کی ہستی اوسی کے ہے ہاتھ بلندی دلپستی اوسی کے ہے ہاتھ
خرد اس کو کیونکر کرے گی قبول بقا خود نہیں منتقل کو حصول
اسے مان کر گر کہیں اہل فہم کہ مٹنے کا اس کے ہو کس طرح وہم
ہمیشہ سے ہے اس کو شکل بقا ۶۵ فنا ہونے کی اس کے صورت ہے کیا
تو قول حکیمان سے سن لیں دلیل ہیں معنی بہت اور عبارت قلیل
یہ دُم دار تارے جو ہیں سربسر یہی ہیں دُو عالم کے وجہِ ضرر
یہ گردش جو ان کو ہر اک آن ہے اسی سے قیامت کا سامان ہے
نہ ان کی بڑائی کی ہے انتہا نہ گردش ہے ان کی نظام انتما
یہ ہرشلؔ[1] کا ہے قول بہرِ سند ۷۰ وہ کہتا ہے اے صاحبانِ خرد
یہ دُم دار تارے بخارات ہیں جو گردش میں ہر وقت دن رات ہیں
جو ہیں چاہتے قربِ مہر جلیل تو آجاتے ہیں پاس دس لاکھ میل
جو ہیں چھوڑتے مہر کا یہ پڑوس تو ہیں دور جاتے کروروں ہی کوس
کسی طرح آتے نظر بھی نہیں نہ آنکھیں کریں کام نہ دوربیں
زبس گردش ان کی نہیں منتظم ۷۵ تو رستہ بھی ان کا نہیں منقسم
جو ہیں اور سیاروں کے راستے نکل جاتے ہیں اون کو یہ کاٹ کے
خطر اہل ہیئت کو ہر دم ہے یہ کہ گردش کا ان کی جو عالم ہے یہ
تو اک دن کسی سے یہ لڑ جائینگے یہ نقشے جہاں کے بگڑ جائینگے
الا اے حکیمان عالی نژاد یہ تحقیق تمکو رہے خوب یاد
یہ بے ڈھنگے تارے۔ یہ بے ڈھنگی چال ۸۰ عیاں کرتی ہے بس یہی احتمال
کہ اک دن جو سیارۂ ارض سے کہیں ہو گئی چار ٹکر اسے
تو پھر ہم نہ تم اور نہ جنگل پہاڑ زمیں ہی نہیں جس کو کہیئے اوجاڑ

---

[1] سر ولیم ہرشل ۱۷۳۸ تا ۱۸۲۲ عیسوی ماہر علم ہیئت۔

یہ احوال اجرام کا سب سنا　　جسے کہتے ہیں سب یقینی بقا

ادھر پھر کرتا ہے نقلِ مکان　　ادھر ذوذنب[1] کی ہے شورش عیاں

عیاں ایسی چالوں میں ہے بر ہمی　۸۵　سمجھ پر نہ مغرور ہو آدمی

خرد گاہ تاریک ہے گاہ صاف　　کبھی خبطگی ہے۔ کبھی انکشاف

نہیں کچھ بھی معلوم کیا ہے یہ ساز　　کھلے گا کسی پر کہاں اس کا راز

یہ ہم جو کہ اس طرح دراک ہیں　　سرِ راہِ تحقیق چالاک ہیں

ہر اک عقدے کا کرتے ہیں انکشاف　　عجائب دکھاتے ہیں بے اختلاف

بقا میں ہمیں جب کہ معذور ہیں　۹۰　تو مجبور چیزیں[*] تو مجبور ہیں

اوکھیں اپنی حد سے نہیں انحراف　　وہ جس طرح ہیں کب ہیں کرتے خلاف

سکون اور حرکت میں مختار ہم　　وہ رک سکتے ہرگز نہیں اک قدم

نہ ثابت کو حرکت کا ہے اختیار　　نہ سیّار کو ہے مجال قرار

ہم اون سے تو قدرت میں پھر بیش ہیں　　مگر ہمکو بھی دھڑکے درپیش ہیں

ہزاروں کو مرتے ہوئے ہے سُنا　۹۵　ہزاروں مرے سامنے سر دُھنا

یوں ہی ہم بھی اک روز مر جائینگے　　یوں ہی سارے ساماں گزر جائینگے

جو مختار گزرا تو مجبور کیا　　خرد سے یہ تحقیق ہے دور کیا

ہر اک عقل کو اپنی دوڑائے گا　　پھر آخر فنا ہی فنا پائے گا

غرض دو وجودوں کی شکلیں یہ تھیں　　جو میں نے بہ تفریح کامل لکھیں

خرد کہتی ہے رہ گیا اک وجود　۱۰۰　نہ ہوتا جو ممکن نہ ہوتی نمود

وہ ہے شکل سوم بہ درک تمام　　کہ ہستی ہی ہستی ہے جس کو مدام

جو کہتی خرد اس کا ہونا محال　　تو آتا بھی ہم کو نہ اس کا خیال

حقیقت میں جس کا نہیں ہے وجود　　نہ ہو وہم میں ہرگز اوس کی نمود

وہ ہے کس کی ہستی۔ کرو اس میں غور　　بجز ذات واحد نہیں کوئی اور

---

[1] ذَنَب : "..... نام شکلے ست در آسماں کہ از تقاطع منطقۂ فلک جوزہر (ص ۱۵۶) و مائل بصورت مار بزرگ بہم می رسد۔ یک طرفش را راس گویند۔ و طرف دیگر را ذنب" غیاث اللغات ص ۲۲۵-

کہ دو شکلیں بالا جو لکھی گئیں ۱۰۵ یہ شکل اون کی قسموں میں ہرگز نہیں
جو ہوتی تو ویسا ہی ہوتا شمار خرد ہے جدا کرتی بے اختیار
کہیں نیستی اور ہستی دو چیز نقیضین پیش نگاہِ تمیز
تو ہے نیستی محض جس طرح سے میسر ہوئی ایک حالت جسے
اوسی طرح یہ محض ہستی بھی ہے کہ وحدانیت جس کو پھبتی بھی ہے
تعدد نہ حالت کا اوس میں کہیں ۱۱۰ نہ ہے اس میں پیش خرد دل نشیں
بجا اپنے عالم میں دونوں ہیں صاف خرد کو نہیں اس میں کچھ اختلاف
مگر ماہیت دونوں کی ہے جدا کہ ہے نام جن کا فنا و بقا
نہ یہ دونوں ہو سکتے ہیں مجتمع نہ یہ دونوں ہونگے کبھی مرتفع
نقیضین و ضدین کا فرق یاں یہ کرتے ہیں ارباب حکمت بیاں
کہ ضدین ہوتی ہیں ایسی دو شے ۱۱۵ کہ جن کا بہم ہونا دشوار ہے
کہ جس طرح سے ہیں سفید و سیاہ نہ ہونگے کبھی جمع بے اشتباہ
مگر دونوں معدوم ہو سکتے ہیں وہ ہستی سے محروم ہو سکتے ہیں
یہ ممکن ہے ہو دوسرا کوئی رنگ بدل جائے جب ان کی ہستی کا ڈھنگ
اسی طرح ہیں جسم اور روح بھی کہ ہے مادی بھی ہیں اور مادی
کہ ممکن ہے ان دونوں کا ارتفاع ۱۲۰ مگر ان میں حاصل جو ہے اجتماع
یہ تبلا رہا ہے بہ صورت جلی کہ قدرت کا راز ان میں ہے منجلی
مگر ایسی حالت میں ہے کوئی شے کہ وہ روح ہے اور نہ وہ جسم ہے
اوسی سے ہے حاصل بغیر ارتفاع اسی نے دیا دونوں کو اجتماع
وگرنہ بہم ہونا دشوار تھا کہ خود میل دونوں کا درکار تھا
اور اس طرح ہونا ہے امر محال ۱۲۵ بجز قدرت قادر ذوالجلال
یہ اجماع جس وقت ہو بے نمود تو باقی رہا کیا عدم یا وجود
عدم اوس کی خاطر جو نابود ہے وجود اس کی خاطر جو موجود ہے
نقیضین یہ دونوں ہیں اور محال تو آتا ہے بے شبہ اس کا خیال
کہ ہے ہست ہونے میں مجبور نیست کہ خود خلق و ہستی سے ہے دور نیست

تو پھر عقل کہتی ہے سب بے اختیار ۱۳۰ ہو موجود موجود ہی کی پکار
عدم اپنی حالت میں ہے لاوجود وہ باقی ہے قائم ہے جس کا وجود
سوا ان دلیلوں سے ثابت ضرور کہ وہ محض ہستی ہے بس ایک نور
وہ ہستی میں اپنی ہے خود منفرد نہ اوس کا ہے مانند کوئی نہ ضد
اوسی محض ہستی سے ہم ہست ہیں اوسی سے بلند اور یہ پست ہیں
دلیل قوی کا اب آیا مقام ۱۳۵ سنو قول صادق علیہ السّلام

کہا ایک نے اے امام جلیل
وجودِ الٰہی کی کیا ہے دلیل

کہا پوچھتا کیا ہے اس کی سند دلیل اوس کی ہستی ہماری ہے خود
تامل سے اس میں ذرا غور کر ہماری یہ ہستی ہمیں سے نہ ہے گر
تو دو حالتوں سے یہ خالی نہیں کہ بے غور ہوتا ہے فوراً یقیں
کہ یا ہم نے ہست آپ کو جب کیا ۱۴۰ کہ جب ہست تھے آپ ہم مطلقا
محالات سے ہے یہ امر عجیب کہ ہے ہست سے ہست ہونا غریب
کہ ہستی تو خود اوس میں موجود ہے جو ہے نیستی صاف مفقود ہے
جو ایسا ہے اوس کو بقا چاہیئے نہیں ہے تو اس سے ابا چاہیئے
اگر ہم کہیں ہست اوس دم کیا کہ جب نیست تھے ہم۔ تو ہے یہ بھی کیا
خرد کو نہ آئے گا ہرگز خیال ۱۴۵ کہ ہو نیست خود ہست۔ یہ ہے محال
ہوئے جب کہ باطل یہ دونوں طریق کہ سمجھے گا جائز نہ کوئی فریق
تو بس ہو گیا ہمکو معلوم صاف نہ چون و چرا ہے نہ کچھ اختلاف
کہ ہیں ہست کردہ ہم اوس ہست کے محالات ہے نیستی خود سے جسے
زہے ہستیٔ محض و عین وجود کہ نازد بہ یکتائیش ہست و بود
فلاطون کا ہے قول مانا ہوا ۱۵۰ حکیمان موجودہ نے بھی لکھا
فلاطون نے یہ پیش کی ہے دلیل کہ ایجاد کی اپنے ہرگز سبیل
نہیں جان سکتی کوئی شے کبھی کہ کس دم ہوئی اور کیا وجہ تھی
نہ جب تک بتائے کوئی دوسرا کہ ہے وقت ایجاد اور وجہ کیا

اسی رہ کی ہر چیز ہے رہ نورد — تو عالم کو بس سمجھو تم ایک فرد
نہیں جس کو ادراکِ وجہِ وجود ۱۵۵ — کہ اپنی ہوئی کیوں ہے اور کب نمود
مگر ہاں بتا دے اوسے دوسرا — کہ ہو جزوِ عالم نہ جو مطلقا
سوا اس کے ادراک ہے بس محال — تو ہے کون ایسا بجز ذوالجلال
زبس ہم میں وہ ذاتِ باری نہیں — تو ہرگز کسی طرح مرئی نہیں
ہدایت کے اوس نے نکالے اصول — ہمیں میں سے ہوں انبیا و رسولؐ
انھیں کی ہدایت سے جانیں اوسے ۱۶۰ — کہیں وہ جو کچھ راست مانیں اوسے
ہمیں بس اسی کا یقین چاہیئے — زیادہ تجسس نہیں چاہیئے

کسے را دریں بزم ساغر دہند
کہ داروئے بیہوشیش در دہند

کہاں اوس کو پائیں ہمارے عقول — کہ ہے مَاعَرَفْنَاکَ قولِ رسولؐ
زہے بحرِ عرفانِ ربِّ قوی — کہ آئینۂ صورتِ معنوی
نہ ہوتا جو احمدؐ میں خالق کا نور ۱۶۵ — تو خالق کی صورت نہ پاتی ظہور
جو انسان کو مخلوق کامل کیا — اس اکمل کو انساں میں شامل کیا
خرد کو ہے چکر اسی بات میں — حدوث و قدم ایک ہی ذات میں
محالات میں قدرتِ حق کو دیکھ — محمدؐ کی ذاتِ محقق کو دیکھ
بشر کی خرد اس میں معذور ہے — کہ انسانیت رکھتی مجبور ہے
بشر تھا نبیؐ ایزدِ پاک کا ۱۷۰ — یہ ہے ماحصل ماعرفناک کا
بظاہر وہ دنیا میں جب تک رہا — بجا ماعرفناک اوس نے کہا
جب انسانیت سے گزر کر گیا — تو دنیا سے آخر سفر کر گیا
دلیل اس کی روشن ملی ہے ہمیں — گیا مہر کا نور پھر مہر میں
یہاں بھی ہیں کُل تین شکلِ شہود — دلایل سے جس کا ہے روشن وجود
وہ اک شکل جو محض ہستی کی ہے ۱۷۵ — جو ہے خاص ذاتِ خدا ضدّ سے
وہ اک نیستی جس کو ہستی کہیں — کہ جس طرح خورشید ہو ابر میں
نہیں بھی ہے اور ہاں بھی ہے۔ دیکھ لو — عیاں بھی ہے پنہاں بھی ہے دیکھ لو

وہ ذات رسولؐ خدا ہے فقط   حدوث و قدم جیسے نقطہ میں خط
وہ اک ہستی و نیستی لاوجود   کبھی ہے فنا اور کبھی ہے نمود
وہ اشیائے عالم ہے عالم بھی ہے ۱۸۰ نہیں اس سے خارج کبھی کوئی شے
یہ موجود کی تینوں شکلیں ہیں صاف   کہ عاقل کو اس سے نہیں انحراف
وہ دو ہیں جو خاص خدا و نبیؐ   نہیں ان میں میں حصہ کسی کا کبھی
ہوا اس سے ثابت کہ اب جو رہا   فنا پر وہ مجبور ہے ہو رہا
تو اقسام بھی اس کے ہیں بے شمار   اسی سے یہ عالم ہیں ہجدہ ہزار
بشر کو شرافت ہے مخلوق میں ۱۸۵ اسی پر سب آفت ہے مخلوق میں
فنا و بقا ہے اسی کے لئے   سزا و جزا ہے اسی کے لئے
اسی کے لئے ہے قیامت کا روز   اسی کے لئے واں کا ہے سانہ سوز
گزرگاہ ہے جب یہ دار محن   تو واجب سمجھنا بھی ہے یہ سخن
کہ اک دن ضروری گزر جائینگے   خدا جانے کس دم کدھر جائینگے
بہرحال ہے اب یہی مصلحت ۱۹۰ مہیا رکھیں توشۂ آخرت
کہ کردار کے اپنے مختار ہیں   عذاب اپنے اپنے ہی کردار ہیں
کریں کام وہ جس سے دائم رہیں   کہ دنیا یہ جب تک ہے قائم رہیں
کریں نیکیوں کی طرف التفات   بدی سے رہیں دور دن اور رات
مدلل سخن کہہ گیا ہے یہ ایک   کہ باقی نماند بجز نام نیک

کہاں ہیں سلاطین فرماں روا
۱۹۵ کہاں ہیں وزیران صاحب ذکا

کہاں ہیں دبیران عالی ہمم   کہاں ہیں امیران والا حشم
کہاں ہیں جوانان جنگ آزما   کہاں ہیں قوی بازوان وغا
کہاں ہیں حسیناں عاشق نواز   کہاں ہیں مسیران راہ نیاز
کہاں ہیں رقیبان بے ننگ و نام   کہاں ہیں یکسان بزم مدام
کہاں حسن والوں کے دیوانے ہیں ۲۰۰ کتابوں میں اب جن کے افسانے ہیں
بہت لوگوں کا اب نشاں بھی نہیں   نشان پئے کارواں بھی نہیں
بہت لوگوں کی قبریں ٹوٹی ہوئیں   کہ ہوں بستیاں جیسے لوٹی ہوئیں

پڑے ہیں وہ تربت میں پھیلائے پاؤں — کوئی دھوپ میں ہے کسی پر ہے چھاؤں
کسی میں فقط ہڈیاں چند ہیں — کھلی قبریں کچھ ہیں تو کچھ بند ہیں
یہ کہتی ہے عبرت ہر اک قبر پر ۲۰۵ یہ وہ ہیں جو سکتے مصدر خیر و شر
انھیں سے ہوئے ہیں ہزاروں ہی کام — یہی چلتے پھرتے تھے یاں صبح و شام
انھیں سے ہزاروں بھلائی ہوئی — انھیں سے ہزاروں برائی ہوئی
انھیں میں ہیں ارباب کبر و غرور — انھیں میں ہیں مجبور صاحب شعور
انھیں میں ہیں عاجز انھیں میں ضعیف — انھیں میں کمینے انھیں میں شریف
انھیں میں ہیں گلہائے بستان حسن ۲۱۰ انھیں میں ہیں وہ شمع ایوان حسن
کہ جب نکلے پردے سے وہ بے حجاب — تو شرما کے چکرا گیا آفتاب
انھیں میں ہیں وہ شاہدان حسیں — نزاکت میں جن کا تھا ثانی نہیں
نظر اون پہ ڈرتی تھی جاتے ہوئے — وہ اون کی حیا کچھ چھپاتے ہوئے
انھیں میں ہیں وہ پر غضب شوخ و شنگ — تصور سے جن کا بدلتا تھا رنگ
نگاہیں غضب اور چتون ستم ۲۱۵ جو دیکھیں نکل جائے رستم کا دم
انھیں میں ہیں وہ بے حیا دلربا — کہ ہر روز جن کا تھا عاشق نیا
کسی پر توجہ کسی دم نہیں — کوئی جان دے اون کو کچھ غم نہیں
انھیں میں ہیں وہ عاشقان نزار — جنھیں دیکھ کر قلب ہو بے قرار
نہ کھانے کی سدھ تھی نہ پینے کا ہوش — بھرا اون کے دل میں محبت کا جوش
دلوں سے لگی تھی تمنائے یار ۲۲۰ شب و روز محبوب کا انتظار
اگر ہجر ہو ان کو مرنا قبول — اگر وصل ہو تو زیادہ ملول
کہ دھڑکا ہے پھر ہجر کی رات کا — تیقن نہیں ہے کسی بات کا
انھیں میں ہیں دل دادگان متیں — کوئی جن کی الفت سے واقف نہیں
انھیں میں ہیں اوباش خانہ خراب — ہوا خواہ معشوق و مست شراب
انھیں میں ہیں اللہ والے فقیر ۲۲۵ ہیں دنیا کو چھوڑے ہوئے ناگزیر
انھیں میں ہیں وہ زور پیکر بے حیا — کہ لوگوں کو ٹھگتے ہیں صبح و مسا
انھیں میں ہیں پیران صوفی مذاق — انھیں میں مریدان با اشتیاق
انھیں میں ہیں دزدان چالاک و چست — انھیں میں ہیں نادان و محتاج و سست

غرض اک جہاں ہے بزیر زمیں ۔۔۔ مرقّق کبھی ایسا دیکھا نہیں
نہ اب اون کی باتیں نہ اب ان کا کام ۲۳۰ فقط رہ گیا ان کے کاموں کا نام
اگر نیک کاموں میں مصروف تھے ۔۔۔ اگر کار بد میں وہ معروف تھے
وہ جیسے تھے ایسا ہی ہے ان کا شور ۔۔۔ رہا کچھ نہ اب اپنی شہرت پہ زور
زباں ہے زمانے کی اور اون کا کام ۔۔۔ بدی سے وہ لیں یا کہ نیکی سے کام
اسی واسطے کہتے ہیں عقلمند ۔۔۔ کہ انسان ہے نام کا مستمند
وہی کام کر جس سے نیکی رہے ۲۳۵ کہ تا حشر تو سب میں باقی رہے
نہیں تجکو دنیا میں ہرگز قیام ۔۔۔ جسے ہے قدامت وہ ہے تیرا نام
بہت نام رہنے کے اسباب ہیں ۔۔۔ مجوز مگر اس کے کم یاب ہیں
خردمندوں نے ہے کیا انتخاب ۔۔۔ نکالی ہے لوگوں نے راہ صواب
رفاہ خلایق کا خواہاں ہے ایک ۔۔۔ ستائش گر قُرب شاہاں ہے ایک
بقا کوئی سمجھا ہے اولاد سے ۲۴۰ تو کوئی عمارت کی بنیاد سے
مجوز ہوا ہے کوئی نیک رائے ۔۔۔ پُل و مسجد و چاہ و مہماں سرائے
اسی طرح سے سیکڑوں کام ہیں ۔۔۔ کہ جو دہر میں باعث نام ہیں
مگر کیجئے غور اگر اک ذرا ۔ ۔۔۔ تو قائم نہیں ہے کسی کی بنا
عبث اس میں مصروف ہے آدمی ۔۔۔ نہیں اس کو حاصل بقا دائمی
اگر بعضے کاموں کی کچھ یاد ہے ۲۴۵ تو سمجھو وہ شہرت خداداد ہے
وگرنہ ہزاروں ہی گھر میٹ گئے ۔۔۔ مطلاّ مذہّب پرانے نئے
نہ مسجد رہی اور نہ پُل ہی رہے ۔۔۔ کنوئیں سیکڑوں بھر کے اندھے ہوئے
اگر رہ گئے بھی درِ قصر و بام ۔۔۔ نہیں جانتا کوئی بانی کا نام
غرض کوئی تجویز کامل نہیں ۔۔۔ قدامت کبھی ان سے حاصل نہیں
مگر ایک وہ نعمت ایزدی ۲۵۰ ملے جس سے سب شہرت سرمدی

وہ کیا ہے وہ کیا ہے فقط علم ہے
جو حاجت روا ہے فقط علم ہے

یہی ہے کلیدِ درِ مدّعا ۔۔۔ یہی ہے زمانے کا مشکلکشا

یہ دولت وہ ہے جو کہ پایندہ ہے ۔۔۔ کہ مالک بھی اور آپ بھی زندہ ہے
جو شمع از پئے علم باید گداخت ۔۔۔ کہ بے علم نتواں خدا را شناخت
یہ سرمایۂ دین و دنیا ہے بس ۲۵۵ کہ اللہ بس اور باقی ہوس
خرد مند از علم یابد کمال ۔۔۔ نہ از دولت و جاہ و مال و منال
خرد مند باشد طلب گار علم ۔۔۔ کہ گرم است پیوستہ بازار علم
خدا کی ہے پہچان جب علم سے ۔۔۔ خرد مند غافل ہو کب علم سے
مگر اس میں ردّ و بدل چاہیئے ۔۔۔ اگر علم ہو تو عمل چاہیئے
فقط علم سے کچھ بھی حاصل نہیں ۲۶۰ جو عامل نہیں مرد کامل نہیں
جہاں تک کہ ہو تجھ سے کر کسب علم ۔۔۔ سکھا اور لوگوں کو بھی حسب علم
کتابوں کو تالیف و تصنیف کر ۔۔۔ جو تصنیف مشکل ہو تالیف کر
نوشتہ بماند سیہ بر سفید ۔۔۔ نویسندہ را نیست فردا امید
خدا جانے تو کس جگہ جائے گا ۔۔۔ نوشتہ ترا بس یہ رہ جائے گا
تری یاد لوگوں میں ہو گی مدام ۲۶۵ کریں گے ترا ذکر سب صبح و شام
کتابیں تری کار آمد ہیں گر ۔۔۔ تو پھرتا قیامت ہیں پیشِ نظر
نہیں ہے لغل میں ضرورت تری ۔۔۔ نگاہوں میں پھرتی ہے صورت تری
مثل اس کی روشن ہے موجود ہے ۔۔۔ کہ جو صاحب فن ہے موجود ہے
امیر و گدا پر ہے موقوف کب ۔۔۔ اسی کام میں گر ہوں معروف سب
تو سب لوگ مشہور ہو جائینگے ۲۷۰ فنا کے خطر دور ہو جائینگے
مگر اس زمانے کے جو ہیں امیر ۔۔۔ انھیں ہے توجہ ادھر ناگزیر
کہ فرصت بھی ہے اور قدرت بھی ہے ۔۔۔ انھیں علم والوں کی صحبت بھی ہے
بسر اچھی اوقات کر سکتے ہیں ۔۔۔ وہ محنت بھی دن رات کر سکتے ہیں
مطابع کی افراط ہے وہ سبیل ۔۔۔ سہولت کی جس کی نہیں کچھ دلیل
لکھا اس طرف اور چھپوا دیا ۲۷۵ زمانے کو زور اپنا دکھلا دیا
سنی اپنی تعریف کانوں سے خود ۔۔۔ کہ مداح ہے خلق خود دم بخود
بڑھا حوصلہ دوڑا محنت پہ دل ۔۔۔ چلا نام بڑھتا ہوا متصل

فنا جب ہوئے بس وہ باقی رہا ۔۔۔ یہ ساغر رہا گو نہ ساقی رہا
غریبوں کی خاطر بھی حیلہ ہے یہ ۔۔۔ کہ روزی کا اون کی وسیلہ ہے یہ
یہ محنت ہوئی زندگی میں پکار ۲۸۰ پس از مرگ بس ہے وہی یادگار
ہزاروں ہی ایسے ہیں بے مقدرت ۔۔۔ کہ دی علم نے ہے جنھیں منزلت
جسے چاٹ اس کی ہوئی کیا کہوں ۔۔۔ بغیر اس کے اک دم نہیں ہے سکوں
ہمارا زمانہ وہ ناکارہ ہے ۔۔۔ جسے دیکھئے سخت آوارہ ہے
اگرچہ بظاہر ہے چرچا بہت ۔۔۔ کہ اسکول نے ہے دکھایا بہت
یہ ہے اوس کی تعلیم کا یہ اثر ۲۸۵ کہ آوارگی ہوتی ہے بیشتر
جو علم آیا تو نوکری کے لئے ۔۔۔ بڑھا حوصلہ افسری کے لئے
کچہری کا دن بھر حساب و کتاب ۔۔۔ جو شب آئی تو بس شراب و کباب
انھیں نفرتیں اپنے اقران سے ۔۔۔ انھیں وحشتیں اگلے سامان سے
غریب اس میں ہویا کہ اس میں امیر ۔۔۔ پڑھی انگریزی ہوئے بس شریر
کسی کو نہ تصنیف کا شوق ہے ۲۹۰ اگر ہے تو بس نام کا ذوق ہے
سمجھتے نہیں ہیں کہ ایسا بھی نام ۔۔۔ بہت روز دوں تک کچھ نہ آئے گا کام
اسی عہد کے دیکھے ہیں بس امیر ۔۔۔ جو ہیں علم سے صاف نفرت پذیر
دگرنہ جو آگے تھے ارباب زر ۔۔۔ یہاں تک کہ شاہان نیکو سیر
انھیں علم و دانش کا بھی شوق تھا ۔۔۔ بہت اون کو تصنیف سے ذوق تھا
ہمارے ہی اسلام میں دیکھئے ۲۹۵ سلاطیں نے ہیں کام کیا کیا کیے
تصانیف اون سب کی مشہور ہیں ۔۔۔ یہاں دو طرح اون کے مذکور ہیں
ہوا سلطنت سے جو اک تذکرا ۔۔۔ تو تصنیف سے ذکر ہے دوسرا
زہے پادشاہانِ دانش پناہ ۔۔۔ کہ خود خیر عالم تھے اور خیر خواہ
اگر سب کے احوال لکھوں یہاں ۔۔۔ تو بڑھ جائے گی اور یہ داستاں
سلاطین تیمور سے لیجئے ۳۰۰ اور ان کا تصور ذرا کیجئے
کتابیں جو تیمور و بابر کی ہیں ۔۔۔ ہمایوں شہ داد گستر کی ہیں
وہ ہیں کارنامے ۔ وہ ہیں یادگار ۔۔۔ فوائد بھی اون کے ہیں بس بے شمار

اگر لکھنؤ میں ذرا آیئے تو ہر شاہ کو قدرداں پایئے
مگر خاتمِ خسروانِ اودھ جو تھا جانِ عالم نہ جانِ اودھ
فلک قدر واجد علی بادشاہ
۳۰۵ ہوا خاتمہ جس پہ شاہی کا آہ

وہ خود صاحب علم و تصنیف تھا ہر اک علم کا اوس میں تھا ماتم
در یغا وہ اس سال میں مرگیا کہ شاہی کا بھی خاتمہ کرگیا
یہ ہے داستاں عبرت الناظرین قلم کو بیاں کی بھی طاقت نہیں
مگر مختصر اوس کے حالات کو سلیقے کو اور حسن اوقات کو
لکھوں تو نہیں اس میں نقصان ہے ۳۱۰ کہ وہ میری مدحت کا شایان ہے
توسل ہے اوس سے مجھے اے صغیر وہ سلطان تھا میرا بفضلِ قدیر
وطن ہے جو اصلی مرا بلگرام اودھ کا وہ قصبہ ہے بانگ و نام
یہ سلطاں اودھ کا تھا با عدل و داد گیا حیف دنیا سے وہ نامراد
قلم سے ہے جاری جو اشک سیاہ دوات اب بنی ہے دہن ۔ بہر آہ
صریر قلم ہے نغانِ قلم ۳۱۵ سراپا ہے نوحہ بیانِ قلم
یہ سلطان عالم تھا عالم پناہ
نسب اور حسب میں تھا با عز و جاہ (باقی آیندہ)

سید امیر حسن عابدی

نظیر اکبرآبادی
اور
سبکِ ہندی

ایرانی محققین نے فارسی نظم و نثر کے گذرے ہوئے ادوار کو تین سبکوں میں تقسیم کیا ہے۔ سبکِ خراسانی، سبکِ عراقی، سبکِ ہندی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ سبک صرف خراسان، عراق اور ہندہی میں پائے جاتے ہیں، یا یہ کہ یہ تینوں سبک کسی خاص شہر یا مکان سے تعلق رکھتے ہیں، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان سبکوں کی نشو و نما ادوار ان میں ان سرزمینوں کا خاص حصہ ہے، نیز یہ جگہیں ان کے ارتقا اور عروج کا مرکز رہی ہیں۔

ملک الشعراء بہار مرحوم نے خاص طور سے اس سلسلے میں انتقادی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے بڑی خدمت سرانجام دی ہے۔ ان کی کتاب سبک شناسی اس سلسلے کی سب سے پہلی اور اہم کتاب ہے جس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ فارسی ادب اور خاص کر فارسی نثر کی فطری اور مصنوعی رفتار مختلف زمانوں میں کیسی رہی ہے۔ نیز ہمیں اپنے ہندوستانی فارسی ادب کا جائزہ لینے کے لئے بہار جیسے ایرانی محققین کے کارناموں سے بڑی مدد ملتی ہے۔

سب سے پہلے سبکِ خراسانی ہے جس کا زمانہ فارسی ادب کے آغاز سے لے کر پانچویں صدی ہجری تک ہے۔ اس کا مرکز مشرقی ایران رہا۔ اس کی نمایاں خصوصیتیں الفاظ کی متانت اور پختگی، معانی کی جزالت اور فطری اور غیر مصنوعی تشبیہیں استعارے اور تمثیلیں ہیں۔ اس دور میں قدیم اور خالص فارسی الفاظ زیادہ مستعمل رہے، جو بعد میں عربی الفاظ کے مقابلے میں آہستہ آہستہ متروک ہوتے چلے گئے۔ گویا اس سبک کا نمایاں پہلو یہ رہا کہ سیدھے سادے خیالات کو سیدھے سادے الفاظ میں کسی تکلف کے بغیر ادا کر دیا جائے۔

اس کے بعد سبک عراقی کا دور آیا۔ اس کا چھٹی صدی ہجری سے لے کر آٹھویں صدی ہجری تک دور دورہ رہا۔ اس کا مرکز جنوبی ایران تھا۔ اس سبک کی ممتاز خصوصیتیں سلاست، روانی، حسنِ بیان، اور الفاظ کا تناسب و ہم آہنگی ہے۔ اس دور میں الفاظ کا دائرہ وسیع ہونے لگا۔ اگرچہ اس دور میں مرسل و سادہ، اور مسجع اور مقفّی دونوں قسموں کی نثر کا چلن تھا تاہم اچھی نثر وہی خیال کی جاتی تھی جو تکلف اور تصنع سے عاری ہو۔

مغلوں کے عہد میں فارسی کا مرکز ایران کی بجائے ہندوستان ہو گیا اور دسویں صدی ہجری سے گویا فارسی ادب

میں سبک ہندی کا سکہ ہی چلنے لگا۔ اس سبک کی فارسی اپنے تصنع اور آورد کی وجہ سے دوسرے دونوں سبکوں سے ممتاز ہے۔ اس میں زیادہ توجہ مضمون آفرینی، خیال آرائی اور دور از کار دقیق خیالات پر رہی، نادر تشبیہوں، دقیق استعاروں اور نئی نئی ترکیبوں پر خاص زور دیا گیا۔ اب پیچیدگی کو ہنر اور تصنع کو کمال پر ترجیح دی جانے لگی، نثر میں اس کے نمونے سہ نثر ظہوری اور رقائع نعمت خان عالی جیسی کتابیں ہیں۔ جن پر ہندوستانی فخر کرتے ہیں۔ حالانکہ ایرانی انہیں کوئی وقعت نہیں دیتے۔

ہندوستانی شاعروں اور نثر نگاروں نے زیادہ تر اسی سبک کے مبالغہ آمیز طریقے کی پیروی کی۔ اگرچہ ہر زمانے میں ایسے ادیب بھی موجود رہے جو سبک ہندی کے خصائص سے وابستگی کے باوجود اس میں اعتدال اور میانہ روی کے قائل رہے اور جنہوں نے زبان کو عوام کے خیالات اور مزاج سے قریب رکھنے کی کوشش کی۔

نظیر اکبر آبادی کو اردو ادب میں ایسا امتیازی مقام حاصل ہے جس میں تا حال ان کا کوئی اور شریک و سہیم نہیں ہو سکا۔ مگر ابھی تک ہمارے فارسی ادب میں ان کا مقام متعین کرنے کی کوشش نہیں ہوئی نہ اس موضوع پر کوئی خاطر خواہ کام ہی ہوا ہے۔

باطن لکھتے ہیں[۲]:

"جس وقت مزاج عالی تحریر نثر پر ملتفت ہوا مضمون انشا ہائے نزئی گزین، قند رمتین، فہم قرین، بزم عیش، رعنا زیبا، حسن بازار، طرز تقریر، وغیرہ تو عدد مثال نورتن زیب بازوئے شاہد مدعا ہو کر دست بستہ آن پہنچا۔"

پروفیسر شہباز لکھتے ہیں:

"باطن کا تو یہ بیان ہے کہ نو نثریں انہوں نے لکھیں، مگر میری نظر صرف پانچ سے روشن ہوئی .... گنوائیں نو ہیں، مگر نام ان کے ہاں بھی سات ہی ہیں۔ ان سات میں نزئی گزین اور رعنا زیبا تو میرے پاس نہیں باقی سب ہیں، یہ نثریں چھپی نہیں۔ میرزا نوازش علی بیگ کی نوازش سے مجھ کو قلمی نسخہ ہاتھ آیا۔ ان کا بیان تھا کہ خود میاں نظیر کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ چھوٹے چھوٹے ورق تھے، کتابت میں وضاحت، خوش خط نستعلیق۔ میرے پاس اس نسخے کی نقل ہے۔ ہر چند یہ امر مسلم ہے کہ میاں نظیر اچھے خوش نویس تھے.... لیکن اس میں مجھ کو کلام ہے کہ یہ نثریں انہی کی کتابت سے ہیں۔ اس لئے کہ ان میں بعض ایسی غلطیاں نقل کی ہیں جو سوا اس کاتب کے ان کے مصنف سے ہو ہی نہیں سکتیں۔"

مرزا فرحت اللہ بیگ کہتے ہیں:

"نظیر کے فارسی دیوان کا اب پتہ نہیں چلتا۔ پھر بھی پروفیسر شہباز نے اپنے مرتبہ کلیات میں فارسی اشعار کے بہت سے نمونے دیے ہیں۔ فارسی نثر میں بھی نظیر نے نو کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک

بھی طبع نہیں ہوئی۔ پروفیسر شہباز کو ان کتابوں میں سے پانچ کتابیں بھی مل گئی تھیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ باطن نے اپنے استاد کی وقعت بڑھانے کو یہ نام گڑھ نہیں لیے تھے۔"

نیاز فتح پوری کہتے ہیں:

"اس وقت میرے سامنے نظیر کی تین غیر مطبوعہ تصانیف فارسی کی موجود ہیں اور ان کے مطالعہ سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ وہ فارسی کے بھی اچھے ادیب اور شاعر تھے اور چونکہ اچھی فارسی جاننے کے لئے اچھی عربی دانی کی بھی ضرورت ہے۔ اس لئے یقیناً عربی و فارسی کی تمام متداول کتابیں ان کی نگاہ سے گذر چکی ہونگی اور وہ اپنے زمانے کے معمولی "میاں جی" نہیں بلکہ اونچے درجے کے "منشی و معلم" تھے۔

اس سلسلے میں مخمور اکبرآبادی نے لکھا ہے:

"عربی میں تو غالباً زیادہ استعداد نہ تھی۔ مگر فارسی کے وہ بہت بڑے عالم تھے، اردو کے علاوہ فارسی کا غیر مطبوعہ کلام بہت سا موجود ہے، جس سے دنیا اب تک روشناس نہیں ہوئی۔ اس میں نظم و نثر دونوں شامل ہیں۔ سہ نثر ظہوری کے انداز پر جو نثر میاں نظیر نے لکھی ہے۔ وہ اس نوع کی نثر کا نمونہ اور آپ اپنی نظیر ہے۔"

مولوی اشرف علی نے ۱۹۵۱ء میں کلیات نظیر اکبرآبادی کا مقدمہ لکھا۔ اس وقت تک یہ رسالے اچھی طرح سے منظر عام پر نہ آسکے تھے۔ موصوف نے پروفیسر شہباز کی کتاب سے بعض اقتباس بطور نمونہ کے نقل کئے۔ جو طرز تقریر سے لئے گئے تھے، اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:

"نثر کے یہ نمونے حضرت شہباز کی مہربانی سے زندگانی بے نظیر کے صفحات میں محفوظ رہ گئے ہیں۔"

یہ رسالے اس قدر نایاب ہیں کہ لکھنے والوں کو پورے نام گنا نا مشکل ہو گیا۔ چونکہ باطن نے صرف سات کے نام دیے تھے۔ جن میں سے پانچ خوش قسمتی سے شہباز کو بھی دستیاب ہو گئے۔ بقیہ دو نہ کسی نے دیکھے، نہ کسی کو ان کے نام معلوم ہوئے۔ بعد کے لکھنے والوں مثلاً سلیم جعفر اور فرحت کو بھی ان کا کچھ علم نہ ہوا۔ انہیں لازماً باطن اور شہباز کے لکھے پر قناعت کرنا پڑی۔ خوش قسمتی سے پچھلے دنوں دہلی یونیورسٹی کے کتاب خانے میں ان رسالوں کے خوبصورت قلمی نسخوں (شمارہ ۲۵۲۱۵) سے ایک قابلِ قدر اضافہ ہوا ہے۔ یہ رسالے نظیر کی فارسیت کے زندہ گواہ ہیں۔ بدقسمتی سے یہ مجموعہ ناقص ہے اور اس کے بعض حصے ضائع ہوگئے ہیں۔

یہ رسالے ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء میں یعنی نظیر کے انتقال کے صرف آٹھ سال بعد دہلی میں لکھے گئے تھے۔ ان کا سائز ۷×۱۲ ہے اور خط نستعلیق، کاتب کا نام رام چند کھتری دہلوی ابن منشی دیپ (چند) ابن دیوان برج لال ابن نند لال دیوان پرگنہ، مندسور مضاف صوبہ مالوا، ابن شیو لال ابن رادھا لال ہے۔"

ان میں سب سے پہلا اور عمدہ رسالہ انشائے بزم عیش ہے، جس میں چونتیس ورق ہیں۔ اس میں نظیر نے اکبرآباد کے لوگوں، وہاں کے میلوں ٹھیلوں، تاج محل وغیرہ کا بڑی خوش اسلوبی سے ذکر کیا ہے۔ اس کو یوں شروع کرتے ہیں:

"حمدِ خداوند جہاں آفریں ہم صفت و نعتِ شہِ مرسلیں

از من حقیر ستمۂ آں بشرح و بیان نیاید، لہٰذا حرفے چند تحریر می نماید، راقم ایں رقوم فرحت تقویم نظیر ہوس پذیر، کہ از ہنگام امتیاز حسن پرستی پسند کرد و جمال دوستی تعجیل آورد۔ ۔ ۔ صہبائے چشم دلبراں بقدر خرد خرید و بادۂ نگاہ پری پیکراں بسرمایۂ ہوش بستید، لعل دل پیش سرخی کف نہاد و گوہر ایمان بکفرِ کاکل داد۔ ۔ ۔ باوجود کراہت منظر مورد عنایت مہ طلعتان و باوجود حقارت لباس مصدرِ الطاف جامہ زیبان۔ ۔ ۔ در بندگی رتبۂ کہ معزوراں دولت حسن سلام اور اگر فتند و بفرما بری درجۂ کہ فرمانِ دہانِ کشور جمال از نگاہ او نگرفتند، کارے نکرد، تا شکوۂ تندخوئی کند و حرفے نگفت، تا۔۔۔ نازک مزاج گوید۔ ۔ ۔ وجہ معیشت بمعلمی نمود و درایں پیشہ نیز سرمایۂ نازنینان سود، نظم:

نازو دادے عز در داخلِ سامانِ حسن	عشق با ایں پردلی تابعِ فرمانِ حسن
جان و دلِ عاشقان بلبل و قمری و شد	ہست بہارے چنیں در چمنستانِ حسن
زاہدِ خلوت نشیں کرد رہا گوشہ را	دید مگر یک نظر گوشۂ دامانِ حسن
جلوہ نمود و بدل داد ہزاراں انبساط	زیں ہمہ لطفِ جمال و ایں ہمہ احسانِ حسن
غنچۂ دلِ را نظیر خرم و خنداں نمود	تازہ تر و سبز تر بادِ گلستانِ حسن

اس کے بعد نظیر نے جس انداز سے اکبرآباد، جمنا، تاج گنج اور وہاں کی برسات کی تعریف کی ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ سے ان کی حب الوطنی کا اندازہ ہوتا ہے، نیز انہوں نے ہندی اور ملکی الفاظ کو بڑی بے تکلفی اور شیرینی سے فارسی عبارتوں میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً لکھتے ہیں:

"اکبرآباد شہر بزرگ ترست و از عمارات بہرہ ور، اگر پرستانِ تعمیرات جواہر دارد، پیش تزئینِ ایں مکاناتِ سنگین سنگے نیارد، اگر باغاتِ چین با ہمہ حنا بازِ رنگین مدہر نگی کشاید، با شمارِ رنگینیِ یک چمن ایں لیسا تین رنگش برنگ بو پرواز نماید۔ صورت کشائیش از کشور ہر درعیان و شکل آرام از نمودِ ہر بام نمایاں ۔ ۔ ۔ ۔ نوحہ نازنیناں برحالِ نیازمنداں و لطفِ گلرخاں از عتاب دوچنداں۔ ۔ ۔ ۔ ابیات:

بود دائمٔ دلِ باشندگاں شاد	مدام آباد باشد اکبرآباد
عجب خاطر پسند و دل پذیر است	زادنی ساکنانِ او نظیر است

"جمنا دریائے دیرین ست و آبش بشیر و شکر قرین۔ ۔ ۔ بحرِ الطافِ جمنا درینجا ہمچناں جاری ست کہ

کہ در چمنستاں نسیمِ سحری۔ و در بستان بادِ بہاری۔ بر ساحلِ بے خطرش ہجومِ آب کشاں و غسل سازاں و اکثر بارِ چنیں بہار کہ گلعذاراں جلوہ طرازی شوند و بر بہنانِ صندل ساچوں خطوطِ "تلک" در شتۂ زنار صعبِ درازی بندند، لجلم شناے دریا وازوقِ تیز شنا وری آنقدر آشنا کہ وسعتِ روئے آب را فرش "چاندنی" می دانند و ہجومِ امواج را "ہرِ سیتل پاٹی"۔

دریا است کہ بنظر ہر صبح از آج گنج بشہر می آید و شام معاودت می نماید۔ در تماشا ے گراہ از بہارِ حسن رہگذری وجمالِ رشکِ خوبی پری وجبینِ کاکلِ مشکبار و عارضِ عرق نگار و قامتِ زیب شعار و رفتارِ شوخی شعار۔ منظرۂ تحریکِ طرۂ سنبل و صحبتِ شبنم و گل وظہور سرود بند دمی پردازد"۔[۱۲]

"چوں ہنگام برسات می آید، بہارے بنظر می آرد کہ طراوت در نظارتِ آنہا کجا نگارد۔۔۔ دریا بوسعت و سبزہ بکثرت۔ ابرِ سیاہ تاہ رنگاہ و تابشِ برق برعد ہمراہ۔ صداے طاؤسانِ بلند و شورِ غوکان و چکیدنِ آب از برگِ درختاں و نمودِ دیدنِ سیلاب بہجت نشان۔ بارشِ قطرات و ریزشِ رشحات، بظہور ایں رنگا رنگی بقدرت تازہ کاری صنعت گاہ ــــ سبحان اللہ۔ گاہ اللہ اللہ"۔[۱۳]

اس کے بعد انہوں نے دلچسپ جلسوں، صحبتوں، اور حسینانِ مہ جبین کی ملاقاتوں اور بعض موقعوں پر اپنے فارسی اشعار کی تصنیف کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں کہ ایک جگہ چند شعرا اور سامعین اور کچھ حسین معشوق بیٹھے تھے وہاں بحرِ طویل میں اپنا ایک شعر سنایا۔ جس کا ہر مصرع تقریباً ڈیڑھ صفحے میں آتا ہے۔ پہلا مصرع اس طرح ہے[۱۴]:

"سحرے برلبِ دریا، گذرے کوہ و آنجا، بنشستم بتماشا، طلبِ طبع مہیا، بدلم عینِ تمنا، کہ بتِ دلبرِ زیبا، برخ مہر برا فزا، بتنِ نسترن آسا، بقدِ زیب دہ بالا۔ بلبِ لعلِ شکرخا، باشاراتِ طرب زا، ز در پیش نظر آید، مثلِ خورشید برآید، حسنِ رخشندہ نماید، زلف برچہرہ کشاید، بشکر خندہ گراید، ہمی مشک بسا ید، رنگ ز آئینہ زداید، بہ نگہ روح رباید۔۔۔ ناگہاں یک سرِ خوباں، زلفِ او دلکش ریحاں، جبینش مہر نمایاں۔۔۔ چہرہ رشکِ گل خنداں، ابرواں ہم دو کماں ساں، سرمہ سا نرگس فتاں ناوک افگن صفتِ مژگاں، رنگِ پان برلب و دنداں، ذقنش سیبِ گلستاں۔ طرفہ ترچاہِ زنخداں، گوش پر از دُر و گوہر، گلو از صبحِ منور۔۔۔ بازو بدستِ بتر بود، سینہ گلبرگِ سمن بر، شکم و ناف نکوتر، کمرش نازکی اندر، پشت ہم چوں ورقِ زر، زانو وساق ہمہ انور، قدمش محملِ خوشتر، سرو قد، جامہ معطر، مہ رخے، برق وشے، غنچہ لبے، گلبدنے، غمزہ کنے، دل شکنے، خوش نگہے، عشوہ رہے، کج کلہے، نازورے، سحرگرے، دلبر خوش خود جفا جو۔۔۔ دفعۃً بیچ بگیسو و پری رو دمن بود۔۔۔

اور دوسرا مصرعہ یوں ہے[15]:

"چوں بنزدیک من آید، گل و سرو دسمن آمد، نرگس ونسترن آمد، لالہ و ناردن آمد، غنچۂ نقش دہن آمد، سنبلِ پُرشکن آمد، بوئے مشکِ ختن آمد، نکہتِ پیرہن آمد، ہمہ باغ و چمن آمد، سلکِ درِّ عدن آمد، بلکہ لعلِ یمن آمد، لبِ او در سخن آمد کہ بگو حالِ خود اکنوں، چہ کسی شاد کہ نزدوں، کنی اوقات بسر چوں، چہ بود خواہشت افزوں، ساکنِ شہر کہ بیروں؟ ایں سخن زاں لبِ میگوں، چو شنیدم شدہ مقروں، چشمِ او چوں، مےِ گلگوں، نگہش ہمسرِ افسوں، دل و جانم شدہ مفتوں، گفتمش اے قدِ موزوں، عاشقِ حسن بتانم، بندۂ مہوشانم، دادۂ عشوہ دآنم، عمرِ عیش روانم . . . . ولدہی زینتِ جانم، نامِ خوباں بزبانم، بلبلِ گلبدنانم، قمریِ سرو قدانم، چوں شنید ایں سخن آں گل۔ ترک فرمودتن تطعنہا ساختہ بالکل، کرد اصلا ر تعطل، بر دو ر گلشنِ پُر گل، نازِ گل غیرِ تامل، عنبرین یاں تحمل، خندۂ ساغرِ پُرمل . . . . آں سہی سرو گل اندام، پری شکل دلارام، . . . . بآں چہرۂ گلفام، بآں چشمِ چو جام، بہ آں خوبیٔ ہنگام، بآں ترکیِ اقدام، بآں سیرِ خوش انجام، درآں باغ بہر کام، بمن کرد ز اکرام، عجب لطف و مدارا . . ."

اس رسالے میں ہر خوش مزہ واقعہ "فرحت" کہہ کر بیان کیا گیا ہے۔ کسی چمن میں کسی گلرخ سے ملاقات ہوتی ہے تو کسی بھی معشوق جامہ زیب کے ساتھ گلگشت ہوتی ہے۔ کبھی دریا کے کنارے نظیر باغ میں مہ جبینوں کے ساتھ آدھی آدھی رات گزار دیتے ہیں تو کبھی لوگوں کے ساتھ درخت کے نیچے بیٹھے کسی سرو قد کا انتظار کرتے ہیں۔ کبھی رقص و سرود کی محفل گرم ہوتی ہے تو انہیں کرشن کنہیا یاد آجاتے ہیں، اور کبھی معشوقوں کو شطرنج کھیلتے دیکھ کر خود بھی وہاں پہونچ جاتے ہیں۔ کبھی مے خانے میں کسی پسرِ مے فروش کے نظارۂ حسن سے شادکام ہوتے ہیں تو کبھی چمن میں کسی گلرخ کے پاس بیٹھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دسہرہ کا زمانہ آتا ہے تو دریا کے کنارے ہجوم میں شامل ہو جاتے ہیں، اور دیوالی آتی ہے تو تہوار منانے والوں میں گھس جاتے ہیں، جب ہولی آتی ہے تو حسینوں کے ساتھ وقت گذارتے ہیں اور جب لوگوں کے ہاتھوں میں راکھی بندھن دیکھتے ہیں تو گنگنانے لگتے ہیں۔ مثلاً لکھتے ہیں[16]:

"روزے در چمن رسیدم و چند کس را نشستہ دیدم، گلرخے نیز بحث ہرہ بہار مشغول و کاکلِ عنبرینش بجنبشِ ہوا تحرک مشغول۔ چوں آں غنچہ لب گلبدن را متمکن یافتم برابر او حرفی . . . . بنشستم . . . . یکے از آں حلقۂ عزت نشان سخنے بوصفِ زلفِ گلرخاں بر زبان آورد۔ مو بمو پسندیدم و سلسلۂ ترجمہ بعد آں دراز گردانیدم گفت۔ اگر میلِ سخن باشد، نباید نہفت، نکو طرہ . . . مشکفام آں گل اندام گردم گفتم۔"

این زلفِ گلعذاران بہتر ز دامِ یاران　　در دامِ یک دو طائر، در حلقہ اش ہزاران

نازنین متبسم گردید، و تا شام مصدرِ عنایت گردانید۔"

"سہی قامتے جامہ زیب را زینت افزائے گلگشت دیدم، بوصفِ قد دم این منظوم بہم رسانیدم:

جائے آن باشد کہ با صد بار چون اری قدم　　جائے پائے تو بود ہر دم بچشمِ بوستان

سرو چون گرد قدت آرد ہمیں لازم بود　　گل بروئت گر فدا باشد ہمیں شایانِ آن

باغ را امروز از حسن تو رنگے دیگر است　　در سر زلفت سنبل تازہ بوے این زمان

اے بہارِ گلشنِ خوبی، بود حسنت مدام　　ہے گل بستانِ محبوبی! بہارت جاودان

تبسم کرد و ہمراہ گرفت، چمن چمن بر خود بالیدم و گفتم۔

خرم آن بلبل کہ در صحنِ گلستان بینیِ گل　　بر کشد آواز شوق دگو ہش او ساز دلپذیر

گفت: نامت: گفتم: نظیر: کارت: دیدن گلرخان۔[17]"

"صنمے سیمتن: آب را نسرین و ریحانِ نمودہ و قدرِ رفتنقہ بجبین افزودہ۔ ۔ ۔ ۔ دیرہمن را بت ساختہ دلہا بگردابِ اضطراب انداختہ متوجہ خانہ گردید و بخرام شوخی نگار ہوش و قرار را مائل رفتار گردانید دلم بحاقہ زلفِ تابدارش جا کرد۔ ۔ ۔ لعزم ہم سخنی دل نہادم و در پے بشوقِ دل افتادم، نظم:

لطفے کہ بود دل را در پیروی خوبان　　کے طبع کسے داند جز پیروِ محبوبان

"ہر گاہ نگاہِ جانب من کرد، گفتم: اے دلارام! جے سیتا رام۔ تبسم کرد و گفت: چہ خواہش داری؟ گفتم: عرضِ حال۔ گفت: بگو۔ گفتم: سری رام چندر لنکا را فتح نمود، و دلاور حسنِ شما حصارِ دلم۔ ۔ ۔ گفت: گواہ این سخنت؟ گفتم: ہنومان۔ بخندید و تا خانۂ خود مسرورِ ہم سخنی گردانید۔[18]"

"صفتِ دلبرے شنیدم۔ دیدنِ او کہ در کوچۂ پیچ دار پیچ بود، برسیدم، چون ملاقات کرد، پرسید کہ چگونہ در اینجا رسیدی۔ گفتم:

بشوقِ دیدنت بیباک یا ترسیدہ ترسیدہ[19]　　بہر صورت در اینجا آمدم پرسیدہ پرسیدہ"

"در شبِ دوالی کہ بلطفِ آن در و دیوار مجلا و نگارین می شود۔ ۔ ۔ در ہر کوچہ و فوزِ فرحت و ہر جا ظہورِ عیرت۔ نازنینان۔ ۔ ۔ بلباسِ درخشان و الفت گزینان بکامِ دلِ شادان۔ در بازار زینت و بہر دکان دکانِ رونق، دکانداران بردر، نظارگیانِ پر سر در، چراغانِ صف بستہ، ترصیع و لمعات بسو بیت پیوستہ، ابیات:

فراوان خوش دلی در ہر قبا سے — نمایاں جا بجا "کھیلیں" "بتاسے"
کسے دیدار "تلنگی" دلفریبی — کسے خوشحال از لطف "جلیبی"
کسے مشغول یک دو سیر "بھُری" — کسے "گجری" بگفت بر دوش "ہٹری"

کسے را اسپِ خواہش در رنگ و تاز — کہ گیرد اسپ خوش رنگِ و پرُّا زساز
کسے را دل دریں امید داری — کہ گیرد فیل با زرّیں عماری

ازیں اشیائے بازی طرفہ دیبہ — خریداراں فراہم از کہ و مہ[20]

اس رسالے میں نظیر نے جا بجا نازنینوں کے ٹیکہ، جھومر، کرن پھول، بالا، چنپا کلی، مانگ، نورتن، دوپٹہ، چوڑی، چھینٹ، پہنچی وغیرہ کی اشعار میں توصیف کی ہے جو فارسی ادب میں غالباً ایک تازہ چیز ہوگی۔ لکھتے ہیں:۔

"ٹیکہ" بر پیشانیِ تو ایں قدر زیبا کزیں — قرصِ خورشید آرزو دارد کہ گردد ہمچنیں[21]
"جھومر" از زلفت مُوناز ہمیا دارد — ایں شب تا رہمین عقد ثریا دارد[22]
ایں "کرن پھول" بگوشِ تو شگفت است چنیں — کہ بحسرت گل خورشید نگہ می دارد[23]
"بالا" گوشِ تو اے غنچہ دہن، خوش بالا — داشتم گوہرِ دل بر درِ بالا بالا[24]
در دلِ من چسپیت زیں "چنپا کلی" — آنکہ با شاہ ہندی را او بیکلی[25]
"مانگ" بر بازوئے تو اے تمکین از حسن خم — مینماید آنکہ من ہم مانگِ با ز طرفہ ام[26]
"نورتن" اے نوگلِ پرُ ناز بر بازوئے تو — نہ چنان گفتن بجا صد ناز بر خود می کند[27]
"دوپٹہ" تو گلابی و من دریں حیرت — کہ برگِ گل چنیں عرض و طول بس عجب است[28]
سبز "چوڑی" زر دیست کز آں — سر برآورد سبزۂ مژگان[29]
قبائے "چھینٹ" در آغوشِ نازنین خوب است — برائے زینتِ ملتان و خوبیٔ چیں است[30]
"پہنچی" بساعدِ تو عجب خوشنما رسید — دانم کہ دست بستہ بایں مدعا رسید[31]

دوسرا رسالہ طرزِ تقریر ہے، جو اس طرح سے شروع ہوتا ہے "حمدِ خالقِ دو جہاں جلّ شانہ و نعتِ سرورِ پیغمبران . . . " اس میں بھی نظیر نے محبوبوں، حسینوں، اور گلرخوں کی ملاقات کا ذکر کیا ہے، کسی معشوق کے

ساتھ بیٹھے خربوزہ کھا رہے ہیں، تو کسی کے پاس تربوزہ اڑا رہے ہیں۔ کسی کو پھولوں کا ہار پیش کرتے ہیں، تو کسی سے دل لگی کی ہوس رکھتے ہیں۔ کوئی شوخ ان سے شریفے کا تقاضا کرتا ہے، تو کوئی امرود اور بادام کے لئے خط لکھتا ہے۔ کوئی نازنین ان کی غزل لے کر پڑھتا ہے، تو کوئی انہیں سرمگیں آنکھوں سے شکار کرتا ہے، کسی نازنین کو غرفے میں دیکھ کر چکر لگاتے ہیں، تو کبھی کسی صنم کے ساتھ چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کبھی آم کی فصل میں کسی کے ساتھ وقت گزارتے ہیں، تو کبھی کسی کے وصل کے لئے بے چین ہو رہے ہیں۔ لکھتے ہیں[۳۲]:

"درفصلِ خربزہ کہ میوۂ خوشگوار است وعذوبت انبار، شکر فشانِ کام و زبان وبکثرتِ شیرینی اردزاں ... نزد نازنینے ... نشستہ بودم۔ خربزہ آمد، چوں قاش کرد، گفت: طرفہ خمے دارد۔ اکثرے بوصفِ آں کمانِ نگر کشیدند وبچوگانِ فصاحت گوئے بلاغت ربودند۔ مگر لپسندِ خاطرِ آں ہلالِ ابرو نگردید ... طبعِ من نیز ... قاش نقشِ برنگِ نقاش کشید کہ بہرِ تسلیم لبِ خوبان خمید متبسم گردید ... ایں گفتم:

قاشے کہ بوسہ لبِ شیریں تو گرفت   خواہم کہ بوسہ لبِ او نالبم رسد"

٭

"رقعۂ نازنین بطلبِ بادام رسید۔ فرستادم ورقم کردم کہ بادام چرا؟ ارقام نمود کہ فرستادنت بادام است[۳۳]"

٭

نزد نازنینے سیمتن رفتم وگفتم: سیبِ خوش رسیدہ است۔ گفت: بیار۔ گفتم: دست بسیب نرسید گفت: اے آسیب نخواہد رسید[۳۴]"

نازنینے پیش آمد وکاغذ از دستم گرفت۔ ایں دو بیت نوشتہ بودم۔

مہرِ عشاق فزود از رخِ مہ پارہ تو   ہمہ تن چشم تو شد آئینہ نظارہ تو
می درد گل بچمن پیرہن خود لیکن   کہ در روزے نگہے جانبِ رخسارہ تو[۳۵]

ایک رقاصہ خط لکھوانے کے لئے نظیر کے پاس آتی ہے تو اس سے یوں باتیں ہوتی ہیں:

"گفت: در بندِ آنم کہ بمشتاقے بنویسانم   گفتم: حق التحریر؟ گفت: ہرچہ دل پذیر
گفتم: بہم آغوشی بہر زد، مگر بیک بوسہ   گفتے کہ شنیدے کہ مکاتبہ می فرستم، باآنکہ
از دو ماہ آرزو دارد، ہنوز لیت ولعل   ترا بتحریر دو حرفِ چہ پاں؟ گفتم ہمیں
مختصر۔ گفت، مختصر[۳۶]"

یہ رسالہ نظیر نے بڑھاپے میں لکھا تھا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سن میں بھی کتنے جوان دل تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:[۳۲]

"در پیری پیش نازنینے رفتم۔ گفت: چرا آمدۂ؟ گفتم: برائے نظارہ حسن۔ گفت: ہنگام عزلت گزینی است کہ کوچہ گردی! ناخوش گردیدم۔ گفت: وقت سحر ٹرانی است کہ فراموشی۔ ابرو کشیدم گفت زمانِ پرہیز گاری است کہ بے ذوقی برنجیدم۔"

اس رسالے کے آخر میں لکھتے ہیں:

"نظیر حقیر این نثر مسرت مشحون و نظم مناسب مضمون بلطف ہم نشینی و ہم زبانی نازنینان تحریر نمود۔"[۳۳]

اس چونتیس ورق کے رسالے کی کتابت یکم شعبان ۱۲۵۴ھ / ۱۸۳۸ء کو شاہجہاں آباد میں تمام ہوئی

نیاز فتح پوری کہتے ہیں:

طرزِ تقریر میں انہوں نے بتایا ہے کہ معشوق سے چھیڑ چھاڑ کیسے کی جاتی ہے اور اس سلسلے میں کہیں کہیں صنعِ حکمت سے بھی کام لیا ہے۔ ہر چند ان کی یہ تصنیف فارسی کی کوئی سنجیدہ تصنیف نہیں ہے، لیکن یہ اس وقت کا رنگ تھا، طرزِ تحریر میں تقریباً دو سو علیحدہ علیحدہ ٹکڑے ہیں، جن میں سے اکثر "نازنینے را دیدم" یا اس کے ہم معنی فقرہ سے شروع ہوتا ہے، اور پھر اس نازنین سے ان کی بات چیت شروع ہوتی ہے جس میں کبھی یہ معشوق کو بناتے ہیں اور کبھی وہ انہیں بناتا ہے، اور آخر میں نظیر ایک شعر پڑھ کر اس صحبت کو ختم کر دیتے ہیں:

مگر مجھے نیاز صاحب کی اس بات سے اتفاق نہیں ہے کہ "اس کتاب میں جتنے واقعات ہیں، وہ سب فرضی ہیں۔"[۳۴]

تیسرا رسالہ مجمع مضامین ہے۔ یہ بیس ورق کا رسالہ اس طرح سے شروع ہوتا ہے: "حمد آفریننده دو جہان و نعتِ سرور پیغمبران .. "

اس رسالے میں نظیر سر۔ بہار حسن۔ محبوب۔ دندان، دہن، گوش۔ گردن، دوش، بازو، ساعد، پنجہ، انگشت بغل، پشت، سینہ، شکم، ناف، ران، وغیرہ کی تعریف کرتے ہیں۔ بہار کی تعریف میں کہتے ہیں:[۳۵]

"حسنِ گل بر نگے ہوس ربائے بلبلان کہ غنچہ لبانِ گلعذاراں، بعجب درآیند، وجمالِ سروِ بطرزِ بیتاب نمائے قمریاں کہ سبزانِ رعونت شعار نگہ تکرار نمایند شگفتنِ نسرین و نسترن بصباحتے کہ سمن عذارانِ سیمبر گوہر گوش بنیاز ند، وخندیدنِ لالہ و ناردن، بحرتے کہ گلبدنانِ یاقوتِ لب بانگشتان نزاکت نشان احتمالِ آں سازند ...."

٭

اس رسالے میں اشعار کی کافی تعداد ہے۔ مثلاً ایک غزل ہے[۴۲]:

ماہِ بچرخ منفعل، اے صنم، از لقائے تو	لعل ز رنگِ خود خجل، از لبِ جانفزائے تو
نرگسِ باغ راکجا قدر بود بچشمِ من	ہست پسندِ خاطرم چشم کرشمہ زائے تو
ظلم کنی دگر جفا، چیں بجبیں نیا درم	ہرچہ بخواہی آں کنی، اے دلِ من فدائے تو
کام تو ہر کجا فتد وقتِ خرام، اے نگارما	من بمرادِ دل دہم بوسہ بنقشِ پائے تو
خواہ بخواں بسوئے خود، خواہ براں زکوئے خود	اے مہِ من! تو شاہدی، ہرچہ پسند رائے تو
جلوہ کند اگر پری، من ندہم بحسن او	زانکہ درونِ سینہ ام ہست دلم برائے تو
چند دلِ نظیر را رنجہ کنی زتابِ ہجر	زود بیا بنزدِ او، درتہ صنم رضائے تو

٭

چوتھا رسالہ اسّی ورق کا انشائے محفل نام ہے۔ اس کا آغاز یوں ہوتا ہے:

"درسخن حمدِ خالقِ دوجہاں ہست افزودم از مجالِ بیاں

یہ رسالہ بھی بڑھاپے کی تحریر ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"بہنگامِ پیری کہ اندک التفاتِ نازنیناں بسیار مینماید، محبوبے رشکِ پری بصد نیاز دلبری برائے ملاقات، من آمد۔"

اس میں بھی انھوں نے اپنی ہوس رانیوں، حسینوں سے دل لگانے اور ان کی صحبت کا ذکر کیا ہے۔ کبھی کسی سے ہوس بھری محبت کرتے ہیں اور کبھی کسی محبوب کو حقہ پیتے دیکھ کر بے چین ہو جاتے ہیں۔ کسی حسین کے ہاتھ میں انگور ہے، تو کسی کے کبوتر، کسی دلبر کو مجمع میں دیکھ کر ان سے باتیں کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور جب وہ ناراض ہوتا ہے، تو عذر پیش کرتے ہیں، کسی رقاصہ کو دیکھ کر اس کے حسن اور لباسِ زریں کی داد دیتے ہیں[۴۳]:

"چندے برسبیلِ ہوس از نازنینے نقشِ الفت درست کردم وطائرِ دل را بدامِ محبت، اوگرفتار نمودم، باوصف عجز و نیاز نظرے بحالم نکرد، و باوجودِ خوشامد دسما بدنت بتوجہے مسرور نساخت"

چوں از کثرتِ استغنائے او عاجز گردیدم، شکوۂ آں شوخِ طناز پیش یکے از دلبرانِ عاشق نواز آغاز کردم ... "

بصد رنگینی و نزہت بہر گلشن بہار آمد — گل آمد، بلبل آمد، سبزہ آمد، برگ و بار آمد
بپائے ہر نہال و برفرازِ شاخِ ہر گلبن — تدرو، کبک آمد، عندلیب آمد، ہزار آمد
بعیش افزائیِ اہلِ جہاں در صحنِ ہر گلشن — ہجومِ لالہ آمد، کثرتِ نسرین و نار آمد
نظیر از نازنینانِ چمن گردید خوش چنداں — کہ گوئی، در برِ او گلرخ آمد، گل عذار آمد

⁂

در مجمعے دلبرے را دیدم، مائلِ مشاہدۂ حسن و جمالِ او گردیدم۔ خواستم، سلطے درمیاں آرم۔ بسخنانِ خوشامد آمیز در آمدم، ابرو درہم کشید، دانستم کہ موجبِ فضولیست، عذر نمودم[45] "

" رقاصۂ سمن عذار، سیم اندام را در لباسِ زریں بطرزے دیدم، گویا نسرینِ بکنار صد برگ اقامت پذیرفتہ، خواستم کہ با او ہم سخن شوم و عیارِ گفتگوئے او بنگرم "[46]

اس رسالے کی کتابت رام چند دہلوی نے ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء میں نویں رمضان، منگل کے دن تمام کی۔

⁂

پانچویں رسالے کا نام حسنِ بازار ہے۔ اس میں صرف سات ورق ہیں اور یہ اس طرح سے شروع ہوتا ہے:

" طبعِ نظیر دکانِ ہوس دارد، لہذا صفتِ شہر بازاری نگارد و گجر بداران الفاظ بشارتے و بمشتریانِ مضامین اشارتے ... "

اس میں اکبر آباد کے جوہریوں، بزازوں، حلوائیوں، عطرسازوں، گلفروشوں، میوہ فروشوں وغیرہ کی تصویرکشی کی گئی ہے، اور انہیں معشوقانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے، تنبولیوں اور سبزی فروشوں کا یوں ذکر کرتے ہیں[47]:

" نشستنِ تنبول فروش در دکانِ بلباسِ زیبا و طرزِ دلربا بکثرتِ حسن در ناز و بفرطِ برگ و ساز سرخروئی طرز ... پیچیدنِ پان بانگشتانِ نرمی نشان دلکشا، و بگردانیدنِ آں برحالِ مشتاقاں لطفِ کرشمۂ مہر فزا ... حرفِ تبدیلِ پانِ بتاں بتاخیر بر زبان و عرضِ افزائشِ لزومِ بہر قیاس پیشِ دکان "

⁂

" نشستنِ سبزی فروش در دکان در حسن و لباسِ خود نازاں۔ سبزۂ باغِ دلربائی، نہالِ حدیقۂ زیبائی ... جنسِ دکان سبز تر و کثرتِ سبزی جلوہ گر، طرزِ فروختن خوبتالی گرفتن و طرزہا بکف آوردن خوشوقتی ادا کردن "[48]

اس رسالے کے کاتب بھی وہی رام چند دہلوی ہیں، انہوں نے اسے شاہجہاں آباد میں ۱۲۵۴ھ/ ۱۸۳۸ء میں ۱۸ شعبان چہارشنبہ کے دن ختم کیا، انہوں نے ترقیمے میں اس کا دوسرا نام مینا بازار بھی دیا ہے۔

❖

نیاز فتح پوری لکھتے ہیں[۴۹] کہ:

حسن بازار میں ہر اس مبالغہ سے کام لیا گیا ہے جس سے اس نوع کی انشا میں متقدمین کام لیا کرتے تھے۔ عبارت کی رنگینی، تعبیرات کی ندرت، تشبیہات کی جدت، رعایتِ الفاظ وغیرہ سب وہی ہے اور اگر فرق ہے، تو صرف اتنا کہ نظیر نے کم لکھا ہے اور دوسروں نے زیادہ یا یہ کہ نظیر کے یہاں صرف تفنن ہے اور دوسروں کے یہاں اصل مقصود . . . . یہ رسالہ بہت مختصر ہے لیکن اس سے ان کی فارسی دانی پر کافی روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ابتدائی تعلیم عربی فارسی کی بہت اچھی ہوئی تھی . . . . .

❖

چھٹا رسالہ انشائے قدرمتین ہے جو ۵۳ ورق کو محیط ہے۔ یہ دراصل نظیر کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ اس کا آغاز ہے:

"تحریرِ حمدِ ایزدِ جہان آفرین جلّ جلالہ کہ بیک حرفِ کن انجمن تکوین با نواع زیب و زینت برآراست۔"

ان خطوط میں اس زمانے کے انداز میں نذیر نے بھی انشا پردازی کی ہے۔ یہ خطوط زیادہ تر دوستوں، محبوبوں اور مہربانوں کے نام ہیں۔ کسی میں شکایت ہے، تو کسی میں اظہارِ اشتیاق۔ کسی میں گل فروش کی سفارش، تو کسی میں عطر سازی کی، کسی میں اچار کی فرمائش ہے، تو کسی میں مرغ نقاد ویرکی۔ کسی میں آم کی رسید ہے تو کسی میں خربوزے کی، کسی میں لاتی کی مبارکباد ہے، تو کسی رکھو کی خواہش۔ گل فروش کی سفارش میں لکھتے ہیں[۵۰]:

"آب و رنگِ ریاضِ خلق خوشست　　درجہاں رشکِ صدچمن شدہ است

"غنچۂ اشتیاق با ہتزازِ نسیم خامہ شگفتہ گردانیدن شگوفہ رابے موسم لبشاخ رسانیدن است، از عرصۂ ممتد شمیم شگفتگی خاطرِ خیابانِ رشک مشامِ آرزو معطرنساخت لعباپش اشارتے، متوسل رقیمہ کہ از ایامِ طفولیت باز ہارِ نسرین و نسترن دماغ گردیدہ۔ و برا نبارِ یاسمن زیاسمین غلطیدہ۔ گلِ بیتا لے دست۔ بوسش از بلبلِ بال و پری خواہد و بہارا ز پیراہنش رخصتِ خود بیرون بردن تکویری نماید، خارِ اندیشہ دامنگیرِ حال دارد۔ جہت دفع آں گلچینِ گلشنِ خدمت است، یقین کہ بتوجہ ساقی گلدستۂ سازِ دلکشائے و حمائل پردازِ ترقی بودہ، طرّہ شاہد . . . . خواہد آراست و حدیقۂ طبعِ مکلّف نیز گلگل خواہد شگفت، گلستانِ شادمانی ہمیشہ بہار باد۔"

ایک دوست کے ہجر میں یوں اظہار درد کرتے ہیں:[۵۱]

"نخستین رسم و راہ دوستی را خوب دانستم — ندانستم جدائی را، بسے ناخوب دانستم

درین مہاجرت چند روز آں قدر صعوبت اندوز — گردید کہ شمۂ آن در سالہا بمیزان بیان نتواند سنجید، ہر صبح بیاد لقائے مہر افزا اشک برمژگاں چوں شبنم برگلہا و ہر شام بخیال چہرۂ ما آسا علم ناک فلک فرسا . . . سامعہ بتمنائے کلمات شیریں در حلے کہ گذارش نپذیرد و باصرہ در آرزوئے مشاہدۂ عارض رنگین بصورتے کہ رو نگارش نگیرد۔

بنوک خامہ آوردم کہ فرقت می کند اینہا — غلط گفتم، غلط، جا ناں محبت می کند اینہا

"فرخندہ زمانیکہ اشاعت مواصلت ظلام مفارقت بر دارد، زیادہ چہ برطرازد۔"

تمبا کو کی رسید میں لکھتے ہیں:[۵۲]

"بگرد چہرۂ لطف تو شوقم از ہوا داری — چناں گردد کہ برگرد رخ من دود تنبا ۔

"قرص مشکین تنبا کو راحت افزائے دل الفت طلب گردید، دبدود عنبر آمود مانند دود عود جامۂ طبع را معنبر گردانید، اگر بدرج سیم رنگ قرار گیرد، کلف ماہ خجلت پذیرد و چوں بمقام . . . . اقامت گزیند، داغ لالہ در آتش حسرت نشیند۔ تلخی گل نخوے نامرغوب کہ متحملش از قند لیصد التجا ربطے بہم رساند و دریں نوع مطلوب کہ قند بہزار تمنا ہم صحبتے گزنید۔ مفر مقدار مفرّی مسرو کرم بازاری و سیر گاہ دود منفعل ساز مشک تتاری، نفس از کشیدن آں باستقبال و مشایعت مشغول، و خاطر بوفور مبدم سرور موصول۔"

اس رسالے میں بعض خطوط منظوم ہیں۔ ایک ملاحظہ ہو:[۵۳]

"صاحبا، الطاف سارا، مشفقا — در جہاں باشی سلامت دائما!
بعد شوق صحبت عشرت نژاد — بر ضمیر روشنت مکشوف باد
یاد ایام مسیکہ بے ایں دلفگار — رہ نگردے دز دولت صبر و قرار
گر دو رنگے در ملاقات آمدے — برزبانت حرف ہیہات آمدے
می شدی گرلا علاج از من جدا — گریہ می گفتی بچشمت آشنا

چوں برفتی بر زباں حرفِ فراق — خاطرت می گشت از آرام طاق
بہرِ تسکینم گذشتی بر زباں — وعدہا و صد قسم بالائے آں
حیف آں مہر و وفائے برمحل — شد بایں ناہر یا سہہ بدل
یعنی از رفتے کہ رفتی آں طرف — تا درِ مقصود آری بکف
نہ خطے، نہ رقعۂ لطف التیام — نہ پیامے، نہ دعایے، نہ سلام
پس ہماں رافت کہ می شد ہر نفس — شد یقیں، بہرِ فریبم بود و بس
من بفہم آں کہ باشی با وفا — زاں ندامت گشتہ بودم مبتلا
جوش زد چوں در دلم بحرِ ملال — بر زباں ایں شعر آمد حسبِ حال

"حیلہ گر را آشنا پنداشتم!
سیم در زر را طلا پنداشتم"

ایک خط اس شعر سے شروع کرتے ہیں:[۵۴]

"نامۂ آں سروِ قامت گلبدن — در جوابِ خطِ شوق آمیزِ من

ایک خط میں لکھا ہے کہ کسی محفل میں ایک رقاصہ غزل گا رہی تھی، جو مجھے بہت پسند آئی۔ میں نے بھی اسی طرز پر ایک غزل کہہ ڈالی، لیکن معذرت بھی کی ہے، کہ چونکہ مجھے فارسی نظم میں پورا کمال حاصل نہیں ہے اس لئے اسے بنظرِ اصلاح دیکھنا چاہیے۔[۵۵]

"دوش درمحفلِ رقص، رقاصۂ نازنین، زہرہ جبین، پری فریب، طاؤس زیب کہ ربودنِ نقدِ ہوش از بین عینِ تعلیمِ غمزہ سحرسازش، دتاراجِ متاعِ شعور تختین ہرعشوہ جادو نوازش، حاصلِ دست افشانی بیش از تمنا در آستین، دستِ بستۂ حنا و آں پا کوبی افزوں از طلبِ بیش پا ...... غزل سرائید کہ در پسندِ حقیر انجامید، در تتبعِ آں چنیں ہم رسانید۔ چوں بر قوانینِ نظمِ فارسی آگہی، کلی ندارد، نظر باصلاحِ سخن سنجاں برقم می آرد:

باز در کوئے تو، اے مہر فزہ آمدہ ام — حرفِ بیجا نتواں گفت، بجا آمدہ ام
اوّلاً، کردہ ام از حیلہ، دلِ خود را جمع — بعد ازاں سوئے تو، اے حیلہ گرہ، آمدہ ام
سببِ آمدن از عاشقِ بدنام مپرس — تو مگر نیک ندانی کہ چرا آمدہ ام

من نظیرم، تو کنوں خواہ بکش خواہ بخش بہرہ نظارہ ات، اے ماہ لقا، آمدہ ام"

ایک خط بحر طویل میں ہے۔

ایک خط بحر طویل میں ہے، جس کے دو مصرعے ایک صفحے میں آئے ہیں۔ پہلا مصرع یوں شروع کرتے ہیں[56]:

"راحت افزائے محباں، مصدر لطف نمایاں، مظہر خوبی شایاں، مجمع مہر سمایاں
رونق محفل الفت، زینت بزم مودت، باعث راحت و بہجت، سبب فرحت و عشرت، شادباشی و سلامت"

اور دوسرا مصرع اس طرح سے:

"آنکہ از فرط عطوفت، بصد افزونی شفقت، طلب پردۂ الفت، شدہ با کثرت سرعت،
زہے فرخندہ بشارت، خجے زیبندہ اشارت"

اس رسالے کے خاتمہ پر نظیر نے اپنی فارسی نظم و نثر کو "ہوس" اور "خامی" بتلایا ہے مگر یہ محض انکسار ہے، ا
کی کتابت رام چند کھتری نے سمت ۱۸۹۵/۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء میں رجب کے مہینے میں کی تھی۔

نیاز فتح پوری اس رسالے کے متعلق لکھتے ہیں[57]:

"یہ کتاب بلحاظ انشا و مطالب طرز نقر بر سے بہتر ہے اور اس کا انداز تحریر بھی اس سے بالکل مختلف ہے، اس میں مختصر نویسی کو قائم رکھا گیا ہے اور اس میں اشعار بھی اچھے نظر آتے ہیں۔ بعض منظوم خطوط ہیں، اور فارسی کی چند غزلیں اور رباعیاں بھی ہیں، جو نظیر کی فارسی دانی کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہیں۔۔۔۔ ایک منظوم رقعہ ملاحظہ ہو، جس میں غالباً انہوں نے تیراکی کا میلا دیکھنے کے لئے رتھ طلب کیا ہے:

محیط بخشش و بذل استقامت ملاذ و منبع احسان سلامت
چو شوق صحبت رنگیں نگارم ہما نا موج دریا در شمارم
مگر بعد از سلام الفت آرا بنوک خامہ آرم مدعا را
کہ امروز از برائے سیر دریا بہانے حاضر و خلق است یکجا
نظر تا می رسد، یکسر بہار است چمن بر ساحل دریا نثار است
زغسل مردمان و بازیٔ آب بہر سو شوخی گرداب بیتاب
زعکس گلعذاراں آب دریا برنگ نہر گلشن در نظر ہا
بساحل بسکہ مہرو یاں عیاں اند شکار دام الفت ماہیاں اند
بفرحت نظرہ زن ہر موج آبست بے مقصود در جام حباب است

بہارِ حسن و آبِ بحر در جوشش ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ بہم پہلو بہ پہلو، دوش بر دوش
چہ بر دریا چنیں رنگیں بہار است ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ دلم از بہرِ آں لبس بیقرار است
دریں صورت نظر بر بیقراری ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ عطا سازند زہے بہرِ سواری
چو زناں مجمع ہمہ شادند امروز ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ کنم من ہم دلِ خود عشرت اندوز
کہ باشد دیدنِ عالم غنیمت ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ اگر یک لحظہ باشد دم غنیمت
نظیر اکنوں ندارد غیر ازیں یاد ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ کہ باشد خانۂ الطاف آباد!

اس رقعہ کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ عربی الفاظ کا صحیح صرف کر سکتے تھے اور منظر نگاری کے لئے وہ اچھے الفاظ اور اچھی ترکیبیں استعمال کرنے سے عاری نہ تھے۔ چند رقعات میں رباعیاں بھی نظر آتی ہیں لیکن ان میں سے بعض میں جدت کی گئی ہے کہ چوتھا مصرع ایک ہی رکھا ہے اور اس طرح ان کو ایک مسلسل نظم بنا دیا ہے، ایک رقعہ میں مستزاد رباعی پائی جاتی ہے۔"

مگر مجھے نیاز صاحب کی اس بات سے اتفاق نہیں ہے کہ فدر متین یہ خطوط زیادہ تر انشا کی حیثیت سے لکھے گئے ہیں۔ اور ہو سکتا ہے کہ بعض ان کے وہ خطوط بھی ہوں، جو واقعی انہوں نے اپنے احباب کو لکھے تھے[58]۔ نیز مجھے ان کا یہ خیال بھی درست نہیں معلوم ہوتا کہ ان میں سے شاید چند وہ رقعات جو پھول وغیرہ کی رسید میں لکھے گئے ہیں، اصلی ہوں ورنہ سب انشائی حیثیت رکھتے ہیں[59]۔

ساتویں رسالے کا نام قلمی نسخے میں رعنا زیبا ہے، باطن نے بھی یہی لکھا ہے، مگر فرحت اللہ بیگ اور سلیم جعفر نے رعنائے زیبا کہا ہے، بہرحال اس کا آغاز یوں ہوتا ہے:۔

" اگر حمد پروردگار جہاں ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ مگویم زبان است قاصر درآں
آغاز داستان۔ آوردہ اند کہ در زمانِ پیشین جوانے صاحبِ تاج و نگیں، حشمت، بلند آوازہ
و شوکتش آوازہ . . . "

اس میں کسی بادشاہ کے عشق و محبت کی داستان ہے جس کا نام غالباً "روشن گل" ہے۔ بدقسمتی سے یہ رسالہ ناقص ہے شروع میں سے ورق دو ستے لے کر ورق ۳ تک اور آخر میں سے ورق ۳۲ کے بعد تمام متن ساقط ہو گیا ہے، اور یہ بھی معلوم نہیں کہ آخر سے کتنے ورق ضائع ہو گئے ہیں۔ اس کی چند سطریں بطور نمونہ ملاحظہ ہوں[60]:

" روشنِ گل از دیدنِ جواہر فارغ گردید و خاطر نازکش سختیہا کشیدہ مشاہدۂ قطعاتِ لعل سنگہا بر سینہ گرفت و تماشائے افزود یا قوت رنگِ عارضِ گلگوں ہم رنگِ عقیق زرد کرد، بزم

نازنینش در کینہ توزے جست، دبرجانِ غمگینش رقمِ زرد دائرۂ الماس گشت .... از جواہر خانۂ برخاست ولعصد رنج دست از زیرِ سنگ برآورد .... دیدنِ رقص از نگاہش برافتاد وشنیدنِ سرود راہِ وقعہ کشاد "

سب سے آخر میں ایک اور رسالہ ہے جس کے صرف اختتام کے تین ورق (۴۱، ۴۲، ۴۳) بچ گئے ہیں۔ ظاہر ہے جملہ اوراق تینتالیس رہے ہوں گے۔ غالباً یہ بھی خطوط کا مجموعہ ہے جو نظیر نے سخنوروں، دوستوں اور مہربانوں کو لکھے تھے، یک مہربان سخن فہم کو لکھتے ہوئے اپنی تازہ رباعی درج کی ہے[61]:

"گر دیر شود سبادِ یاراں ہم زود بقدرِ آں مناسب

از چند روز نوید خیریت مزاج فرحت اندوز نساخت۔ دلِ الفت آمود تعلق دارد۔ ترتیب کہ زود جنبش نمایند مضمونِ دست داد، برزبانِ خامہ نہاد، رباعی:

گفتم زنبتے کہ ہر دو یابیم بہم دشنام لبِ تو، بوسۂ شیریں ہم

خواہد دلِ من ہمیں، چہ خواہد دلِ تو فرمود بناز، آں دہم ایں نہ دہم

اس کے ترقیمے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ انشائے نثری گزین ہے:

"تمام شد انشائے نثری گزین من نظیر اکبرآبادی از دست رام چند کھتری .... یوم چہارشنبہ پایانِ روز ۱۲ جمیدا الثانی ۱۲۵۴ھ / سمت ۱۸۹۴ / ۱۲۴۵ فصلی در دہلی"[62]

یقین ہے کہ اسی مجموعے میں کسی وقت ان کا نواں رسالہ فہم قرین بھی رہا ہوگا۔ جواب بالکل ناپید ہوگیا ہے۔

ان رسالوں کے پڑھنے سے میاں نظیر کی ایک سچی تصویر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتی ہے، وہ ایک عاشق مزاج، رند مشرب اور عوامی انسان تھے، ان کا عشق ہوس کارانہ اور مجازی تھا، اور وہ بڑھاپے تک اسی منزل میں رہے، ان رسالوں میں عشقِ حقیقی کی کوئی جھلک نہیں ملتی، نہ کہیں انہوں نے اپنے مادی جذبات پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ وہ ہمیشہ عوام الناس کے ساتھ زندگی بسر کرنے اور سب کو ایک نظر سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اگرچہ یہ رسالے نثر میں ہیں مگر انہیں سے نظیر کا فارسی کلام جمع کیا جائے۔ تو چھوٹا سا دیوان تیار ہوسکتا ہے۔ نظیر کو فارسی نظم و نثر میں کمال حاصل تھا اور ہندوستان کے فارسی ادب میں انہیں ایک اچھا خاصا مقام ملنا

چاہیئے۔ ان کی نثر مقفیٰ، مسجع اور مصنوع ہونے کے باوجود ہر قسم کی پیچیدگی اور دور از فہم خیالات اور محاورات سے پاک ہے۔ عربی کے مشکل الفاظ کے غیر معمولی اختلاط سے بھی بڑی حد تک مبرا ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے شگفتہ اور دلنشین جملے استعمال کرتے ہیں جو نوواردوں میں کھپ جاتے ہیں۔

∴

آخر میں یہ کہنا ضروری ہے کہ فارسی نے ہندوستان میں ایک نیا انداز پیدا کیا۔ اور ہم نے اسے اپنا کر اپنے رنگ میں اسے سنوارنے کی کوشش کی، جس سے ہندوستانیت کی بو نہیں جاتی۔ ہم لوگ اکثر "مجھ سے کہا" کا ترجمہ "از من گفت" کرتے ہیں۔ نظیر نے بھی بار بار یہی لکھا ہے[۶۳]

"از شوخ تند خو گفتم"۔ "شوخ از من گفت"۔ "از شکر لب گفتم"۔ "از مہر جبینے گفتم"۔

حواشی

(۱) ۱۱۴۷ھ — ۱۲۴۶ھ/۱۷۳۵ء — ۱۸۳۰ء (۲) سید قطب الدین باطن: گلستان بے خزاں (معروف بہ نغمۂ عندلیب (۲۶۸)؛ (نولکشور، ۱۲۹۱ھ) (۳) عبدالغفور شہباز: زندگانی بے نظیر (نولکشور ..۱۹)؛ ۲۷۲-۲۷۳ (۴) دیوان نظیر اکبر آبادی - (انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی ۱۹۴۲ء) ؛۹ (۵) نگار (جنوری ۱۹۴۰ء) ؛ ۵۹ (۶) محمود اکبر آبادی: روح نظیر (آگرہ اخبار برقی پریس ۱۹۴۶ء) ؛ ۹۱ : ۲۸ (۷) کلیات نظیر اکبر آبادی (مطبع رام کمار، نولکشور) ۲۳ (۸) گلزار نظیر (ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد ۱۹۵۱) (۹) ورق ۱-۳ (۱۰) ورق ۳ (۱۱) ورق ۴ (۱۲) ورق ۵ (۱۳) ورق ۵ (۱۴) ورق ۷-۸ (۱۵) ورق ۸-۹ (۱۶) ورق ۹- (۱۷) ورق ۱۰ (۱۸) ورق ۱۱-۱۲ (۱۹) ورق ۱۴ (۲۰) ورق ۲۶-۲۷ (۲۱) ورق ۲۱ (۲۲) ورق ۲۱ (۲۳) ورق ۲۱ (۲۴) ورق ۲۱ (۲۵) ورق ۲۱ (۲۶) ورق ۲۱ (۲۷) ورق ۲۱ (۲۸) ورق ۱۶ (۲۹) ورق ۴۲ (۳۰) ورق ۴۲ (۳۱) ورق ۴ (۳۲) ورق ۳ (۳۳) ورق ۶ (۳۴) ورق ۱۰ (۳۵) ورق ۱۱ (۳۶) ورق ۶-۷ (۳۷) ورق ۷ (۳۸) ورق ۴۳ (۳۹) نگار (جنوری ۱۹۴۰) ؛ ۶۴ (۴۰) نگار (جنوری ۱۹۴۰) ؛ ۶۹ (۴۱) ورق ۱-۲ (۴۲) ورق ۱۴ (۴۳) ورق ۴ (۴۴) ورق ۵-۷ (۴۵) ورق ۵۶ (۴۶) ورق ۶۷ (۴۷) ورق ۴-۵ (۴۸) ورق ۶ (۴۹) نگار (جنوری ۱۹۴۰) ؛ ۶۳ (۵۰) ورق ۵ (۵۱) ورق ۷ (۵۲) ورق ۱۱ (۵۳) ورق ۱۱ (۵۴) ورق ۱۴ (۵۵) ورق ۱۷-۱۸ (۵۶) ورق ۴ (۵۷) نگار لکھنؤ جنوری ۱۹۴۰ء) ۶۲-۶۳ (۵۸) نگار لکھنؤ (جنوری ۱۹۴۰ء) ۶۰ (۵۹) نگار لکھنؤ جنوری ۱۹۴۰ء) ۶۱ (۶۰) ورق ۱۶-۱۷ (۶۱) ورق ۴۱ (۶۲) ورق ۴۳ (۶۳) انشائے طرز تقریر: ۴، ۵، ۶، ۱۳ (نذر عرشی۔ باجازت مصنف)

ابوسلمان شاہجہانپوری

نئے خزانے

پیشِ نظر اشاریہ بابت ماہ مئی ۱۹۶۶ء مندرجہ ذیل موضوعات کے تحت ترتیب دیا گیا ہے

اردو ادب اور تحقیق و تنقید
دیگر زبانوں کا ادب
اردو زبان اور اس کے مسائل
اقتصادیات
آپ بیتی
تاریخ
تعلیمات
سیر و سیاحت
سیاسیات
شخصیات
اقبال، علامہ
آزاد، مولانا ابوالکلام
غالب
دیگر شخصیات

صحافت
عالم اسلامی اور اس کے مسائل
قانون
کتابیات و کتب خانہ
لسانیات و لغات
مذہبیات
تصوف
سیرت
قرآن و تفسیر
مسائل و مباحث
مکاتیب
نفسیات
وفیات
مطبوعات جدیدہ (نئی کتابوں اور رسالوں پر تبصرے)

پیشِ نظر اشاریے کی ترتیب میں مئی ۱۹۶۶ء اور بعض دیگر مہینوں کے مندرجہ ذیل رسائل سے مدد لی گئی ہے

ماہنامہ	ادب لطیف	لاہور	مئی ۱۹۶۶ء	ماہنامہ	قومی زبان	کراچی	مئی ۱۹۶۶ء
سہ ماہی	اردو	کراچی	اپریل "	"	ماہ نو	"	" "
ماہنامہ	افکار	"	مئی "	سہ ماہی	مجلہ علوم اسلامیہ	علی گڑھ	جون - دسمبر ۱۹۶۵ء
"	البلاغ	بمبئی	" "	ماہنامہ	معارف	اعظم گڑھ	مئی ۱۹۶۶ء
"	الشجاع	کراچی	" "	"	مہر و ماہ	لاہور	اپریل "
"	الفرقان	لکھنؤ	فروری "	"	نصرت	"	" "
—	اوراق	لاہور	نمبر ۲	"	نقش	کراچی	مئی "
ماہنامہ	اورینٹل کالج میگزین	"	مئی ۱۹۶۵ء و مئی ۱۹۶۶ء	"	نیرنگ خیال	لاہور	" "
"	برہان	دہلی	مئی ۱۹۶۶ء	"	ہمایوں	دہلی	" "
"	پیام عمل	لاہور	" "	ہفت روزہ	المنبر	لائل پور	" "
"	تجلی	دیوبند	" "	"	آئین	لاہور	" "
"	تحریک	دہلی	" "	"	چٹان	"	" "
"	ثقافت	لاہور	" "	"	خدام الدین	"	" "
"	جامعہ	دہلی	" "	"	شہاب	"	" "
"	چراغ راہ	کراچی	" "	"	صدق جدید	لکھنؤ	" "
"	ساقی	"	" "	"	قندیل	لاہور	" "
"	سب رس	حیدرآباد دکن	" "	"	لاہور	"	" "
"	سیارہ	لاہور	" "	"	ہماری زبان	علی گڑھ	ستمبر ۱۹۶۵ء تا مئی ۱۹۶۶ء
"	صریر خامہ (قومی و ملی شاعری نمبر)	حیدرآباد	"	روزنامہ	انجام	کراچی	(صرف جمعہ و اتوار ایڈیشن)
"	فاران	کراچی	مئی "	"	جنگ	"	" "
"	فروغ اردو	لکھنؤ	" "	"	حریت	"	" "

اردو ادب اور تنقید و تحقیق

مصنف	عنوان	ماخذ
احسن فاروقی، محمد ڈاکٹر	ادب اور قومیت	صریرِ خامہ، ص ۵۳ تا ۷۴،
احمد، ڈاکٹر مختارالدین	شہزادی جہاں آرا کی موجودہ تحریریں	مجلہ علوم اسلامیہ، ص ۵۰ تا ۶۳، جون دسمبر
احمد علی، مولوی	قصر عارفاں[1]	اورینٹل کالج میگزین، ص ۱ تا ۴۷، مئی
اختر، بشیر محمود	نذیر احمد کی مراۃ العروس	ادبِ لطیف، ص ۵۴ تا ۵۹، "
ادیب، سید مسعود حسن رضوی	مثنوی عشق نامہ مصنفہ واجد علی شاہ	ہماری زبان، ص ۳ تا ۴، ۱۵ جنوری
ارشد، ارشاد احمد	قومی تعمیر میں شاعروں اور ادیبوں کا حصہ	مہروماہ، ص ۲۸ تا ۳۵، اپریل
اظہر، اے ڈی	ہمارے علم عروض پر تنقیدی نظر	نصرت، ص ۳۴ تا ۵۳، "
افسر صدیقی	سی حرفی معظم	اردو، ص ۶۹ تا ۷۳، "
اکبر علی خاں	رشید حسن خاں کی تحقیقی غلطیاں	ہماری زبان، ص ۳ تا ۴، ۱۵ اگست
" "	" " "	" " ص ۳ تا ۴، ۲۲ "
آزاد، محمد حسین	خوش خطی	اوراق، ص ۵۳ تا ۶۲،
تحسین سروری	اردو مرثیہ	جنگ، ص ۱۱، ۱۳ مئی
صدق حسین	عبدالماجد کے قومی رجحانات	صریرِ خامہ، ص ۱۲۲ تا ۱۲۵،
زہر، نربھے رام	تشرر کی ایک نظم	" ص ۱۳۰ تا ۱۳۳،
الٰی، علیم اللہ	بوطیقا اور ارسطو کا نظریۂ تنقید	ادبِ لطیف، ص ۶۰ تا ۶۵، مئی
مدحسین	جنگ اور شعراء	صریرِ خامہ، ص ۱۲۶ تا ۱۲۹،
حبیب احمد صدیقی	جنگ کے سیاسی اشعار	" " ص ۱۰۲ تا ۱۰۳،
ب، جے کرشن چودھری	اردو شاعری میں قومی جذبات	ہماری زبان، ص ۳ تا ۵، ۲۲ دسمبر
بت الاکرام، سید	ظفر کی غزل گوئی اور اس کا پس منظر	جامعہ، ص ۲۶۹ تا ۲۷۸، مئی
رت کاسگنجوی، عبدالحق	اردو ادب میں قومی رجحانات	صریرِ خامہ، ص ۱۱۰ تا ۱۱۸،
" "	اردو ناول نگاری	ساقی، ص ۴۸ تا ۵۰، مئی

---

[1] ڈاکٹر محمد باقر کے تعارف کے ساتھ۔

حسین الحسین شیرازی	زبدۃ المعاصرین[له]	اورینٹل کالج میگزین، ص ۱ تا ۲۰۰، مئی
خالدی، ابوالنصر محمد	چند دکنی مثنویاں	سب رس، ص ۲۵ تا ۳۲، مئی
خان رشید، ڈاکٹر	قومی شاعری کا سیاسی پس منظر	صریر خامہ، ص ۵۹ تا ۶۱،
رضیہ سلطانہ	میر حسن کی سراپا نگاری سحر البیان کے آئینے میں	ہمایوں، ص ۱۶۰ تا ۱۷۲، مئی
رفعت، سید مبارز الدین	تبصرۃ الخوارقات	سب رس، ص ۳ تا ۱۰، ''
رئیس احمد جعفری	خالد کی نعتیہ شاعری	ثقافت، ص ۴۶ تا ۶۶، جنوری
ریاض احمد	علامتی اظہار	اوراق، ص ۱۷ تا ۴۷،
زبیدہ خاتون	اردو شعر و ادب پر طائرانہ نظر	خاتون دکن، ص ۱۶ تا ۱۹، مئی
ساجد، عبدالغفور	رزم حق و باطل اور جدید قومی شعرا	صریر خامہ، ص ۱۳۸ تا ۱۴۱،
ساحل، محمد جمال الدین	بنگال میں اردو ادب	قندیل، ص ۵ تا ۶، ۸ رمئی
سحر عشق آبادی	حضرت فراق کی ایک غزل	ہماری زبان، ص ۸ تا ۹، ۱۵ر نومبر
سراج الدین احمد، قاضی	قومی شاعری پاکستان کے مختلف علاقوں میں	صریر خامہ، ص ۱۳۴ تا ۱۳۷،
سلیم اختر	ادب میں ابلاغ	ماہ نو، ص ۱۹ تا ۳۲، مئی
سخی احمد ہاشمی، سید پروفیسر	شبلی نعمانی کی قومی شاعری	صریر خامہ، ص ۱۶۷،
شاد عظیم آبادی	ایک غیر مطبوعہ مرثیہ	اردو، ص ۱۵ تا ۷۸، اپریل
شانتی رنجن بھٹاچاریہ	بنگلہ زبان کی رامائن اور مہا بھارت	ہماری زبان، ص ۳ تا ۴ ۶۴، یکم مئی
شمیم احمد	ادب کے نام پر	نقش، ص ۱۲۲ تا ۱۲۴، مئی
صابر، مرزا صابر بیگ	ادبیات میں علامات اور روایات کی اہمیت	قندیل، ص ۱۰ تا ۱۱، ۲۹ر ''
طالب اشتیاق	جنگ سے پہلے اور جنگ کے بعد جدید شاعری	انجام، ص ۶، ۲۳ر ''
طالب رزاقی	حضرت فراق کی ایک غزل	ہماری زبان، ص ۳ تا ۴، یکم اکتوبر
ظفر الدین، ایم۔ اے	اردو کے قومی شعرا	صریر خامہ، ص ۱۴۳ تا ۱۴۵،
عارفی سروجی، میر	حضرت فراق کی ایک غزل	ہماری زبان، ص ۶ تا ۷، یکم دسمبر
عبداللطیف اعظمی	اردو نثر کے اسالیب پر سیپوزیم	ہماری زبان، ص ۸ تا ۱۰، ۲۲ر نومبر

له ڈاکٹر محمد باقر کے تعارف کے ساتھ

عبدالماجد دریابادی	آزادی وطن اور جوہر کی شاعری	صریر خامہ، ص ۱۵ تا ۱۹
عبدالودود، ڈاکٹر	ہمارے شعرا پر فن ناشناسی کا الزام	ہماری زبان، ص ۳ تا ۴، ۷۰، ۸ جنوری
عبداللہ، ڈاکٹر سید	تنقید کا دور قدیم	اوراق، ص ۳۶ تا ۷۰
عروج قادری	حافظ کی غزلیں	چراغ راہ، ص ۱۳ تا ۲۹، مئی
فائق رام پوری، کلب علی خاں	قائم اور سودا کی ادبی جنگ	اردو، ص ۸۹ تا ۹۸، اپریل
ماہر القادری	شبلی کی ملی شاعری	صریر خامہ، ص ۷۲ تا ۷۵
محمد تقی، سید	اردو شاعری میں قومی رجحانات	" " ۶۶ تا ۷۷
محمد حسن ایم۔ اے	اردو غزل کی ادبیت	نیرنگ خیال، ص ۹ تا ۱۶، مئی
مختار الدین احمد، ڈاکٹر	کچھ کربل کتھا کے بارے میں	ہماری زبان، ص ۶ تا ۸، یکم جنوری
مسیح الزماں	تحریک آزادی اور حسرت کی شاعری	صریر خامہ، ص ۸۸ تا ۹۳
مشرف علی، سید	مجاز کا فن ایک تجزیہ	خاتون دکن، ص ۱۲ تا ۱۵، مئی
نادم سیتاپوری	بزم اکبر	ہماری زبان، ص ۳ تا ۴، ۷، یکم مارچ
"	تحریک خلافت کی باغیانہ نظمیں	صریر خامہ، ص ۴۹ تا ۵۹
نامی، ڈاکٹر عبدالعلیم	۱۸۵۷ء سے پہلے تھیٹریکل کمپنیاں	اردو، ص ۷ تا ۲۸، اپریل
نثار احمد فاروقی	اردو میں شہر آشوب	ہمایوں، ص ۱۲۶ تا ۱۳۳، مئی
نظر کامرانی	نظیر اکبرآبادی کی شاعری، قومی یا عوامی	صریر خامہ، ص ۱۱۹ تا ۱۲۲
نعیم صدیقی	سید عبداللہ اور اسلامی ادب	سیارہ، ص ۲۶ تا ۳۵، مئی
نیر اقبال	فورٹ ولیم کالج اور چند مروجات	ہماری زبان، ص ۳ تا ۴، ۸، ۲۲ ستمبر
وزیر آغا	وحدت سے ارضیت تک	اوراق، ص ۶۸ تا ۹۶
وقار راشدی	وحشت کی قومی شاعری	صریر خامہ، ص ۹۸ تا ۱۰۱
وقار عظیم، پروفیسر	ظفر علی خاں کی ملی شاعری	" " ۵۵ تا ۵۸

دیگر زبانوں کا ادب

احسن فاروقی	انگریزی ادب کے آغاز پر ایک نظر	اردو، ص ۳۸ تا ۵۰، اپریل
خلیل، شیخ محمد ابراہیم ڈاکٹر	سندھ میں قومی شاعری	صریر خامہ، ص ۷۸ تا ۸۷

سلطان احمد بھوئیاں		
قمر عثمانی مترجم	خوشحال خاں خٹک اور نذر الاسلام	ماہ نو/ص ۱۳ تا ۱۸/ مئی
نظر، محمد انصار اللہ	فارسی کا ایک نادر تذکرہ	ہماری زبان/ص ۳ تا ۴/ ۸ راکتوبر
ولی الحق انصاری، محمد	عرفی شیرازی کا ایک نادر مخمس	فروغ اردو/ص ۹ تا ۱۱/
ارشد، ڈاکٹر اے ڈی	فیضی کا ایک مرثیہ	مجلہ علوم اسلامیہ/ص ۱۲۲ تا ۱۳۰/ جون تا دسمبر

اردو زبان۔ اور اس کے مسائل

امیر خاں (جامعی)	زبان کا طبقاتی کردار اور اردو	ہماری زبان/ص ۳ تا ۴/ ۲۲ نومبر
تنویر احمد علوی	ہندوستانی کلچر اور اردو	ہمایوں/ص ۱۳۴ تا ۱۳۸/ مئی
سنگر، ڈاکٹر سنت پرکاش	اردو مشترکہ تہذیب کا آئینہ ہے	ہماری زبان/ص ۶ تا ۷/ ۸ راکتوبر
مالک رام	اردو کا ماضی ۔ حال اور مستقبل	" " ، ۳ تا ۴+۶/ ۱۵ رمئی
وزیر آغا، ڈاکٹر	اردو کا مستقبل	" " ، ۳ تا ۴+۸/ ۸ راگست

اقتصادیات

اکرام خاتون مس	خواتین نظام بنکاری میں	جنگ/ص ۸/ ۱۴ رمئی
حق، زیڈ	قومی ترقی میں پس اندازی کی اہمیت	انجام/ص ۳/ ۱۴ ر "
صابر علی جعفری، سید	قومی بجٹ میں عورت کا حصہ	" " ۳/ ۱۴ ر "
فردوس، ا بے	عورتیں اور بجٹ کی تحریک	جنگ/ص ۶/ ۱۴ ر "
ممتاز حسن	قومی بجٹ میں عورتوں کا حصہ	" " ۶/ ۱۴ ر "

آپ بیتی

جوش ملسیانی	میری زندگی کا ناقابل فراموش واقعہ	ہماری زبان/ص ۵/ ۸ راگست
خورشید احمد، پروفیسر	جس نے ہنگامہ عدالت کا تیری دیکھا ہے	آئین/ص ۶ تا ۷+۱۱/ ۲۴ رمئی
ملا واحدی	خودنوشت سوانح عمری کا ایک باب	قومی زبان/ص ۳۹ تا ۴۷/ مئی
عبید المختار انصاری (مترجم)	حضرت سلمان فارسی کی کہانی خود ان کی زبانی	شہاب لاہور/ص ۸/ ۸ رمئی

سوئیکارنو	سوئیکارنو کی کہانی خود ان کی زبانی[1]	حریت، ص ۵، یکم مئی

تاریخ

اطہر مبارک پوری، قاضی	تاریخ قصبہ مبارک پور	البلاغ، ص ۷ تا ۱۳، مئی
جواد علی، ڈاکٹر	تاریخ طبری کے مآخذ	برہان، ص ۲۹۹، "
حسن علی جامی	غزوہ موتہ	چٹان، ص ۱۵ تا ۱۷، ۱۹ ر "
" "	" "	" " ۱۵ تا ۱۶، ۲۶ ر "
حفیظ اللہ پھلواری، محمد	جہاز رانی اور جہاز سازی میں مسلمانوں کا اہم حصہ	انجام، ص ۱۱، ۲۹ ر مئی
راشدی، پیر علی محمد	مشرق و مغرب	جنگ، ص ۱۱ تا ۱۴، ۲۸ ر مئی
رشید اختر ندوی	پانچ ہزار سالہ سرحد	چٹان، ص ۷ تا ۸ تا ۱۳، ۱۹ ر مئی
رئیس احمد جعفری	فرانس پر عربوں کی یلغار	ثقافت، ص ۲۸ تا ۴۵، جنوری
شکیب ارسلانی، امیر		
رئیس احمد جعفری مترجم	فرانس پر عربوں کی یلغار	ثقافت، ص ۱۴ تا ۳۳، مارچ
عبداللہ، سید ڈاکٹر	سانحات ۱۸۵۷ء اور ظہیر دہلوی	صریر خامہ، ص ۹ تا ۱۴،
غلام ربانی	بہمنی سکے	جامعہ، ص ۲۶۱ + ۲۶۸، مئی
غوری، شبیر احمد خاں	سولہویں سترہویں صدی میں شمالی ہندوستان کے اندر مسلم احیائی تحریکیں	معارف، ص ۳۲۵ تا ۳۵۰، مئی
فضل الرحمٰن ندوی	بگرام	مجلہ علوم اسلامیہ، ص ۸۵ تا ۱۲۱، جون تا دسمبر
کمالی، ڈاکٹر صبیح احمد	حکمت ولی اللہ میں تاریخ کا مرتبہ	" " " ۱ تا ۴۵، " "
مصطفٰے حسن علوی، ڈاکٹر	دربار عالمگیری	الفرقان، ص ۸ تا ۴۴، فروری
مودودی مولانا، سید ابوالاعلیٰ	شہادت امام حسین کا حقیقی مقصد	حریت، ص ۵ + ۸، ۳ ر مئی
ناز، ایم۔ ایس	۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا ایک خونی باب	قندیل، ص ۱۰ تا ۱۱، ۸ ر "
نیاز فتح پوری	چین میں مسلمانوں کی تاریخی پس منظر	جنگ، ص ۲، ۷ ر "

[1] یہ سلسلہ ۳ ر مئی ۱۹۷۲ء کے بعد تک جاری ہے ۔

خلیق الزماں چودھری	کاش وہ جانتے [1]	جنگ، ص ۵، ۷ رمئی
رئیس احمد جعفری	تاریخ پاکستان کی جھلکیاں [2]	انجام، ص ۵، ۷ ر "
مجیب، محمد	قطب کی عمارتوں کا مجموعہ	تحریک، ص ۱۱، ۱۷، ۴۰، ۴۴، مئی

تعلیمات

اختر حسین صدر انجمن ترقی اردو	تعلیم اور ثقافت [3]	قومی زبان، ص ۳ تا ۹، مئی
اشتیاق حسین قریشی، ڈاکٹر	پاکستان میں یونیورسٹیوں کی اہمیت	" " ۲۳ تا ۲۸، "
آفتاب احمد صدیقی، ڈاکٹر	اکبر کا نظریہ تعلیم	سرِ خامہ، ص ۳۸ تا ۴۵،
حبیب الرحمٰن	اردو تعلیم اور قانونی موقف	ہماری زبان، ص ۳ تا ۴، یکم جنوری
حفیظ الرحمٰن صدیقی	طلبا اور تعلیم کے مسائل ۔ حمود الرحمان کمیشن رپورٹ	جنگ، ص ۷، ۷ رمئی
حمید احمد خاں، پروفیسر	شمع معرفت [5]	قومی زبان، ص ۱۳ تا ۱۷، مئی
خدا بخش، ملک	خطبہ ۔ بتقریب جلسہ عطائے اسناد انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور	" " ۵ تا ۱۲، "

سیاحت

ابراہیم جلیس	سفرنامہ ۔ بحر اوقیانوس انسان کے قدموں کے تلے	انجام، ص ۳، ۱۶ رمئی
" "	" ۔ کرسٹوفر کولمبو اور میں	" " ۳، ۲۳ ر "
" "	" ۔ واشنگٹن کی پہلی رات	" " ۳، ۳۰ ر "
بخاری	بخاری کی سرگزشت	حریت، ص ۷، ۲ ر "
رضوانہ حامد	غزنی میں ایک دن	جنگ، ص ۳، ۲۰ ر "

---

[1] مسلمانانِ ہند و پاکستان کی وہ خدمات جو انھوں نے عالمِ اسلام کے لئے انجام دیں ۵ رمئی تا ۱۰ رمئی مسلسل بعنوان شائع ہوا [illegible]
میں روزنامہ انجام کراچی میں بھی یہ سلسلہ شائع ہوا ہے

[2] جمعہ ایڈیشن میں یہ سلسلہ مضمون جاری ہے دیکھئے ۱۴، ۲۱، ۲۸ رمئی کے شمارے

[3] جامعہ کراچی کی بزمِ ثقافت کا افتتاحی خطبہ ۔ [4] نیز دیکھئے ۱۲، ۲۸ رجون کے شمارے

[5] گورنمنٹ کالج جوہر آباد کے جلسہ عطائے اسناد کا خطبہ صدارت

کوثر نیازی	سفر حجاز کے تاثرات	شہاب، ص ۹، یکم مئی

سیاسیات

اشرف، مولانا حکیم عبدالرحیم	حجاز کی حکومت۔ کل اور آج	المنبر، ص ۵ تا ۸، ۱۳ر مئی
امان اللہ خاں جنرل سکریٹری آزاد کشمیر د		
پاکستان	کشمیر ماضی اور مستقبل	حریت، ص ۴+۹، ۹ر مئی
تاج الدین انصاری، ماسٹر	بھارتی رہنماؤں کا مزاج	چٹان، ص ۹، ۲۳ر ″
″ ″	بھارت کی بے بسی	″ ″ ۹ تا ۱۰، ۹ر ″
راشدی، پیر علی محمد	مشرق و مغرب[1]	جنگ، ص ۱۲، ۷ر ″
رئیس احمد جعفری	وطن پرستی یا حق پرستی	ثقافت، ص ۳ تا ۶، جنوری
″	اعلان تاشقند۔ ایک قابل غور پہلو	″ ″ ۳ تا ۶، مارچ
صفدر، محمد	چین اور روس کے اختلافات	نصرت، ص ۷ تا ۱۴، اپریل
کلیم اختر	معاہدہ تاشقند کے بعد	قندیل، ص ۶ تا ۱۸، ۱۵ر مئی
مجید امجد بٹ	کشمیر کی تحریک آزادی اور شیخ عبداللہ	انجام، ص ۷، ۹ر مئی

شخصیات

اقبال

افتخار حسین آغا	یوم اقبال اور اقبال	افکار، ص ۲۵ تا ۳۰، مئی
انجم اعظمی	اقبال ایک مطالعہ	″ ″ ۳۲ تا ۴۴، ″
حبیب اللہ خاں، خاں	فکر اقبالؒ کے انسانی پہلو	چٹان، ص ۲ تا ۱۷، ۱۶ر ″
سرور، پروفیسر آل احمد	اقبال ایک مطالعہ	افکار، ص ۵ تا ۲۱، مئی
شیدائی، پروفیسر اسد الحق	اقبال کا مسئلۂ تقدیر	سیارہ، ص ۲۳ تا ۴۱، ″
ظہیر، حافظ احسان الحق	چند لمحے اقبالؒ کے ساتھ	چٹان، ص ۷ تا ۸، ۱۶ر ″

---

[1] سیاسی حالات و مسائل پر تبصرے کا مستقل سلسلہ دیکھئے ۶، ۱۳، ۲۰ر مئی کے شمارے

عندلیب شادانی، ڈاکٹر	اقبال کا نظریہ فن وشعر	حریر خامہ، ص ۲۰ تا ۲۲،
غلام مصطفٰی خاں، ڈاکٹر	اقبال کی شاعری کا تاریخی وسیاسی پس منظر	" " ۲۳ تا ۲۸،
محمد خاں (جھنگ صدر)	اقبال کا فارسی کلام	فاران، ص ۴۴ تا ۵۰، مئی
ملا واحدی	۱۹۰۵ء کا ایک یادگار دن ـ علامہ اقبال حضرت سلطان المشائخ کی بارگاہ میں	صبح امید، ص ۲۴ تا ۲۵، جون
یوسف حسن	اقبال کے پیغام کی افادیت	نیرنگ خیال، ص ۵، مئی
	باغ جناح کی بنچ پر علامہ اقبال سے ایک ملاقات	شہاب، ص ۸ تا ۹، ۲۲ مئی

آزاد، ابوالکلام

آزاد، مولانا ابوالکلام	شہادت حسینؓ	انجام، ص ۳، ۳ مئی
"	شہادت حسینؓ اور اسلام	جنگ، ص ۲، ۳ "
"	شہادت حسینؓ ایک بڑا سبق	حریت، ص ۵، ۳ "
برق، طلحہ رضوی	تحقیق شہید اعظم[ا] (تصنیف مولانا ابوالکلام آزاد)	ہماری زبان، ص ۷ تا ۸، یکم ستمبر

غالب

خیر بہوروی	سلسلہ غالبیات ـ غالب کے دو شعر	فروغ اردو، ص ۲۲ تا ۲۴، مئی
قدرت نقوی، سید	عظمت غالب	قومی زبان، ص ۴۸ تا ۵۴، "
مدیر (مشفق خواجہ)	مرزا غالب کا ایک نیا شعر اور گلدستہ انجمن	" " ۵۹ تا ۷۱، "
نادم سیتاپوری	غالب اور سرسید	جامعہ، ص ۲۵۵ تا ۲۶۰، "

دیگر شخصیات

ابراہیم جلیس	ٹیپو کی طرح جو ٹیپو کی طرح او سو جاؤ	انجام، ص ۷، ۷ مئی
"	بہت غریب ـ بڑا آدمی (حسرت موہانی مرحوم)	" " ۳، ۱۳ "
ابو سعید قادری، مولانا	سیرت عائشہؓ	خدام الدین، ص ۱۰ تا ۱۲، ۱۳ مئی
ابو سلمان شاہجہانپوری	مولوی عبدالحق ـ ایک مطالعہ[ا]	ثقافت، ص ۷ تا ۱۵، فروری

[ا] منقول از "قومی زبان"

مصنف	عنوان	ماخذ
ابوعلی	مولوی محبوب الرحمان کلیم بی - اے	ہماری زبان، ص ۳ تا ۴ + ۶، یکم ستمبر
ارشاد احمد	عبدالعزیز خالد	چٹان، ص ۱۳ تا ۱۴ + ۱۸، ۱۴ر مئی
اسماعیل حسن خاں، ملک	آثر لکھنوی	ساقی، ص ۳۱ تا ۴۲، مئی
اقبال احمد صدیقی	نواب جنرل سر صادق محمد خاں خامس عباسی	جنگ، ص ۷، ۳۰ر "
اکبرالدین صدیقی، محمد	میٹھے بچن سناؤں[1]	سب رس، ص ۱۱ تا ۱۴، "
بشیر احمد، میاں	سر راس مسعود	حریت، ص ۵، ۳۰ر "
تحسین سروری	میر قربان علی داستان گو	قومی زبان، ص ۲۷ تا ۴۷، مئی
حسن ریاض، سید	حسرت موہانی کی آئین فہمی	حریت، ص ۳ تا ۱۰، ۱۴ر مئی
حسن مثنیٰ ندوی، مولانا سید	حضرت امام حسنؓ	" " ۵ + ۸، ۲ر "
خلیل الرحمان اعظمی	سر سید کے ادبی تصورات	ہماری زبان، ص ۳ تا ۴، یکم نومبر
خلیل المنیری	بھوپال کا ایک خوش فکر غزل گو شاعر	خاتون دکن، ص ۲۰ تا ۲۲، مئی
رام لعل	محروم	اوراق، ص ۷۹ تا ۸۵،
رضوان احمد	ایک بیباک رہنما (مولانا حسرت موہانی)	جنگ، ص ۱۰، ۱۴ر مئی
رئیس احمد جعفری	حضرت مولانا فضل الرحمان مراد آبادی	ثقافت، ص ۴۴ تا ۵۶، فروری
سراج نظامی	مولانا حسرت موہانی	جنگ، ص ۱، ۱۴ر مئی
سلطان احمد	بزرگ دتہ کی یاد	ہماری زبان، ص ۳ تا ۴، ۸ر نومبر
شاہد احمد دہلوی	آغا شاعر قزلباش	ساقی، ص ۵۹، مئی
ضمیر حسن دہلوی، سید	میر باقر علی دہلوی	" " ۴۱ تا ۴۳، مئی
ظل الرحمان، حکیم سید (علیگ)	جگر اور ترک شراب	ہماری زبان، ص ۶، ۸ر دسمبر
ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر	میر نثار علی شہرت دہلوی	" " ۳ تا ۴ + ۱۱، ۱۵ر نومبر
عابد حسین، سید ڈاکٹر	سر راس مسعود	جنگ، ص ۲، ۳۰ر مئی
عبدالعزیز قادری، مولانا ابوسعید	حضرت علیؓ	خدام الدین، ص ۱۵ تا ۱۷، ۲۷ر مئی
عبدالقوی، حکیم دریابادی	نواب سید محمد خاں رند	فروغ اردو، ص ۱۲ تا ۱۵، مئی

[1] مرزا بیجا پوری، قائم، احمدی، عبدی اور دوسرے، مرثیہ گو شعرا کا تذکرہ۔

علی فضل آبادی، استاذ	شیخ عبداللہ بن حسنیؒ	الفرقان، ص ۴۳ تا ۴۸، فروری
غالب، مرزا اسداللہ خاں	مثنوی ابر گہربار	المعارف، ص ۹۹ تا ۱۱۰، اپریل
فروغ احمد	تعارف (نذر الاسلام)	سیارہ، ص ۲۳ تا ۴۸، مئی
فضل المتین، سید	داغ کے شاگرد نواب عبداللہ خاں	ہماری زبان، ص ۳، ۲۲ر اپریل
فضل من اللہ	تعارف (فروغ احمد)	سیارہ، ص ۴۸، مئی
کشفی، میر غلام احمد	شیخ محمد عبداللہ	انجام، ص ۷، ۹ر ،،
کوثر نیازی، مولانا	اصلاحی - میرا دوست	شہاب، ص ۱، ۵ر جون
محمد صدیق جھنگوی، مولانا	حضرت عبداللہ غزنویؒ	المنبر، ص ۱۰، ۹ر مئی
،، ،،	،، ،،	،، ،، ۵، ۲۰ر ،،
محمود بشیر، سید	پروفیسر قاضی محمد فرید مرحوم	جنگ، ص ۷، ۷ر ،،
معین شاکر	سرسید - ایک سیاسی مفکر	سب رس، ص ۲۶ تا ۳۰، مئی
مناظر عاشق ہرگانوی	ایبوپ - س - فیلبس	ہماری زبان، ص ۶ تا ۷، ۱۵ر نومبر
نجمہ صابری ایم - اے	آزادی کامل کا پہلا نقیب (حسرت موہانی)	انجام، ص ۵، ۱۴ر مئی
نذیر احمد	بدیع الزماں ترکو سیستانی	مجلہ علوم اسلامیہ، ص ۴۴ یا ۸۴، جون تا دسمبر
نسیم احمد فریدی، مولانا	حضرت شاہ ابوالرضا محمد فاروقی	الفرقان، ص ۱۵ تا ۲۸، فروری
نظام الدین	یوسف سدیدی	اوراق، ص ۱۵۲ تا ۱۵۹،
نقوی، وحید اللہ پروفیسر ایم - اے	ابن ابی الربیع	فاران، ص ۲۵ تا ۳۴، مئی
نیر اقبال	ڈاکٹر ہنری ہیے رس	ہماری زبان، ص ۸ تا ۹، ۲۲ر اگست
وقار راشدی	بنگالہ کا عظیم قومی شاعر	صریر خامہ، ص ۱۰۴ تا ۱۰۸،
دیریندر پرشاد سکسینہ	وحشی کانپوری مرحوم	ہماری زبان، ص ۲، ۸ر اگست
یونس احمر	نذر الاسلام	ماہ نو، ص ۷ تا ۱۲، مئی
——	الاستاذ السید مصطفیٰ السباعی الحسنی	المنبر، ص ۱ تا ۹، ۱۳ر ،،
——	،، ،،	،، ،، ۱۱ تا ۱۲، ۲۰ر ،،
——	شاہ فیصل کی شخصیت کے چند اہم پہلو	،، ،، ۹ تا ۱۰، ۸ر ،،
——	سلیمان ڈیمیرل (ترکی کے نئے وزیراعظم)	ثقافت، ص ۴۳ تا ۴۸، اپریل

شریف میاں - رئیس احمد و دیگر حضرات	پروفیسر میاں محمد شریف[1]	ثقافت، ص ۵ تا ۱۰۳، مئی
	جان پہچان[2]	ادب لطیف، ص ۷ تا ۱۰، ”

صحافت

روش، اقبال احمد	قومی ادب پر صحافت کا اثر	صریر خامہ، ص ۱۵۹ + ۱۰۹،
یس مینائی بنگلوری	انتخاب (رسالہ)	ہماری زبان، ص ۳، ۵ اکتوبر
اظری عاشق ہرگانوی	اختر شیرانی کارومان	” ” ” ۹، ۱۵ ”
مارٹونکی	اختر ” ”	” ” ” ۳، ۲۲ ”

عالم اسلام

یل اللہ، پروفیسر محمد	پاکستان اور عرب دنیا	انجام، ص ۳، ۳۰ مئی
” ”	علاقائی تعاون	” ” ۳، ۲۳ ”
	مغربی افریقہ کی مسلم ریاستیں	ثقافت، ص ۵۵ تا ۵۹، اپریل

قانون

بنی، ڈاکٹر محمد یوسف	قانون اسلامی میں سزائیں	ثقافت، ص ۲۱ تا ۳۰، اپریل
باس علی، سید	انسانی معاشرہ - اور قانون	آئین، ص ۶ تا ۸، ۷ مئی

کتابیات وکتب خانے

سلمان شاہجہانپوری	نئے خزانے (نومبر کے اخبارات و رسائل کا اشاریہ)	قومی زبان، ص ۳۸ تا ۵۵، مئی
ادارہ	اشاریہ مضامین رسالہ اردو	اردو، ص ۱ تا ۱۶، اپریل

---

[1] اس نمبر کے تمام مضامین پروفیسر میاں محمد شریف مرحوم کے متعلق ہیں لکھنے والے ہیں: رئیس احمد جعفری، جسٹس ایس اے رحمان جعفر پھلواروی، الطاف علی بریلوی، محمد اسحق اور محمد منیر شیخ -

[2] اس نمبر میں عارف عبدالمتین، انور محمود خالد، اقبال منہاس، جمشید نصرت اور پرویز بشیر کا تعارف کرایا ہے -

شرف علی	پاکستان کا قومی کتب خانہ	قومی زبان، ص ۵۵ تا ۶۵، مئی
سرامروہوی	گنج ہائے گراں مایہ (مخطوطات انجمن کی وضاحتی فہرست)	" " " ۷۵ تا ۸۲، "
بیدار، عابد رضا	علوم اسلامیہ کی ایک انسائیکلوپیڈیا	برہان، ص ۳۰۱، مئی
عبدالقوی، دلینوی	کتابیات مقالات علامہ سید سلیمان ندوی	معارف، ص ۳۷۷ تا ۳۹۲، مئی
محسن، ڈاکٹر	سرسالار جنگ میوزیم	ثقافت، ص ۴۹ تا ۵۴، اپریل
قمر، محمد انصار اللہ	سعیدیہ لائبریری کے نوادر	ہماری زبان، ص ۳ تا ۴، یکم دسمبر

لسانیات ولغات

اختر رضوی	سندھی رسم الخط	انجام، ص ۱۲، ۹ مئی
سہیل بخاری	اردو زبان کا صوتی آہنگ	اوراق، ص ۵۷ تا ۷۸،
شبیر علی کاظمی	اردو اور بنگلہ کا اشتراک	ماہ نو، ص ۴۴ تا ۴۸، مئی
عابدی، عبدالصمد	صحت الفاظ	نیرنگ خیال، ص ۵۹، "
عبدالحق، بابائے اردو مولوی	لغت کبیر (قسط نمبرا)	اردو، ص ۱ تا ۱۶، اپریل

مذہبیات

تصوف

شمیم احمد، سید	مکتوبات مخدوم الملک (شیخ شرف الدین بہاری)	ثقافت، ص ۲۰ تا ۲۴، مارچ
	" " نمبر ۲	" " ۳۰ تا ۳۴، اپریل

سیرت

ابن حسن رضوی جارچوی، مولانا سید	محمدؐ اور آلِ محمدؐ کی گھریلو زندگی	جنگ، ص ۷، ۲ مئی
ابوطاہر فارانی	ہمارا آقا (صلی اللہ علیہ وسلم)	لاہور، ص ۵ تا ۱۴، ۳۰ مئی
بشیر احمد صاحب لپسردی، مولانا	ذکرہ نبی الامم	خدام الدین، ص ۷ تا ۱۲، ۲ "
" "	" "	" ۹ تا ۱۴، ۱۳ "
محبوب الرحمان، مولانا	محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم	فاران، ص ۸ تا ۱۲، مئی

نوفل، عبدالرزاق
محمد احسن علی خاں ندوی (مترجم) | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عظیم الشان معجزہ | ثقافت، ص ۷ تا ۱۵، اپریل

قرانیات

احمد علی، ڈاکٹر عابد	مصحف عثمانی	مجلہ علوم اسلامیہ، ص ۱۰۱ تا ۱۳۰، جلد ۷، دسمبر
احتشام الحق تھانوی، مولانا	درس قرآن (مستقل سلسلہ ہر جمعہ کو)	جنگ، ص ۵، ۱۲ مئی
علی نقوی، علامہ سرکار سید العلما	تفسیر قرآن	پیام عمل، ص ۹ تا ۱۰، ۷ ء

مسائل و مباحث

امام الدین، مولانا ابو محمد	خلافت راشدہ (قسط نمبر ۳)	انوار الاسلام، ص ۳ تا ۹، ۱۸ مئی
امینی، مولانا محمد تقی	احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت	برہان، ص ۲۶۱ تا ۲۷۷، مئی
انور، مولانا عبید اللہ	فلسفہ شہادت	خدام الدین، ص ۵ تا ۶، ۱۵، ۷ مئی
انور، " "	توکل کا صحیح معنوم	" " ۴ تا ۷، ۱۳ مئی
" " "	تقوےٰ	" " ۴ تا ۱۷، ۲۷ "
بالوی، عطا اللہ	قطع ید	ثقافت، ص ۸۴ تا ۹۰، مارچ
جعفر پھلواروی، محمد	کم سنی کی شادی اور فسخ نکاح	" " ۲۶ تا ۴۷، جنوری
" "	نکاح نابالغہ اور خیار فسخ (۲)	" " ۳۰ تا ۴۳، فروری
حسام اللہ شریفی، محمد مولانا	اسلامی حکومت میں مالیات کا شعبہ	فاران، ص ۵۱ تا ۵۶، مئی
حنیف ندوی، محمد	شیعہ فرقے	ثقافت، ص ۹ تا ۲۵، جنوری
" "	شیعہ فرقے نوعیت اختلاف	" " ۹ تا ۲۹، فروری
طاسین، مولانا محمد	وطن دوستی اور اسلام	تجلی، ص ۵۵ تا ۵۹، مئی
مجیب اللہ ندوی، مولانا حافظ	فقہا کی اصطلاح خلاف قیاس پر امام ابن تیمیہ کی تنقید	معارف، ص ۳۵۱ تا ۳۶۷، مئی
محمد ادریس، حافظ	ہماری بقا اور اسلام	ایلی، ص ۱۰، ۱۷ مئی
محمد شفیع، مولانا مفتی	ذبح کا مسنون طریقہ	تجلی، ص ۷، مئی

محمد شفیع، مولانا مفتی	انکار حدیث درحقیقت انکار قرآن کی منافقانہ صورت ہے۔	خدام الدین، ص ۹ تا ۱۶، ۲۰ رمئی
مودودی، مولانا ابوالاعلیٰ	اسلام میں قومیت کا تصور	صریر خامہ، ص ۹ تا ۱۸
نذیر احمد کاشمیری، صوفی	اہل تبلیغ سے گزارش	صدق جدید، ص ۷، ۷ رمئی
نعمانی، نظام الدین	پردہ اور اس سے متعلقہ مباحث	ثقافت، ص ۷ تا ۲۲، مارچ

مکاتیب

ادیب، مشتاق احمد خاں عادل	برجموہن دتاتریہ کیفی کے چار خط	ہماری زبان، ص ۷، یکم مئی
ویریندر پرشاد سکسینہ	مولانا حالی کے دو مکاتیب	" " ۷، یکم نومبر
" " "	اصغر گونڈوی کا ایک غیر مطبوعہ خط	" " ۵، یکم دسمبر

نفسیات

رئیس امروہوی	حیات جاودانی	جنگ، ص ۵، ۲ رمئی
" "	نفس کی حلیہ سازیاں	" " " ۱۶، ۷، "
" "	جناتی دورہ	" " " ۳۰، ۷، "

وفیات

عبدالقوی دسنوی	بشیر الحق دسنوی مرحوم	ہماری زبان، ص ۷ تا ۸، ۱۵ اکتوبر
———	وفات مرزا عشق لکھنوی	" " " ۲، ۸ ردسمبر
———	آہ تلوک چند مرحوم	" " " ۲، ۸ رجنوری
———	آہ جہاں بانو نقوی	" " " ۲، ۲۲ ر "
———	سمرسٹ ماہم کا انتقال	" " " ۲، ۲۲ ردسمبر
———	ایک مخلص اردو دوست[1]	" " " ۲، یکم ستمبر

[1] سندر لال پروانہ کا انتقال

جناب زار دہلوی ہماری زبان، ص ۷، ۱۵ اکتوبر

مطبوعات جدیدہ (نئی کتابوں اور رسالوں پر تبصرے)

نام	مصنف	تبصرہ نگار	حوالہ
آب حیات (مولانا محمد حسین آزاد)	مرتب: سید سجاد	ش۔ع	جنگ، ص ۵، ۱۳ مئی
اردو شاعری کا مزاج	ڈاکٹر وزیر آغا	شہریار	ہماری زبان، ص ۱۲، ۸ ستمبر
اردو لسانیات	شوکت سبزواری	جمیل جالبی	اردو، ص ۱۱۴ تا ۱۱۷، اپریل
اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر	مترجم: چودھری رحم علی الہاشمی	س (سعید احمد اکبرآبادی)	برہان، ص ۳۱۶ تا ۳۱۸، مئی
اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر	ڈاکٹر تارا چند	تاجور سامری	ہمایوں، ص ۱۷۸ تا ۱۷۹، مئی
اسلام کا تہذیبی نظام	سید یحییٰ ندوی	احمد انس	چراغ راہ، ص ۵۰، "
اسلامی عہد میں فن تعمیر	معین الحق	م۔ح	معارف، ص ۳۹۷، "
اعتبار نظر	سید احتشام الدین حسین	خلیل الرحمان اعظمی	ہماری زبان، ص ۱۲، ۲۲ دسمبر
افکار پریشاں	ایم آر کیانی	جمیل ہمدم	اوراق، ص ۲۹۶ تا ۲۹۷،
انسان کی کہانی	علاؤ الدین خالد	محمد عزیز الرحمان	انجام، ص ۴، ۲۳ مئی
بابل (ناول)	محمود ریاض	ش۔ع	جنگ، ص ۵، ۱۷ "
برگ گل مجاہد نمبر	پروفیسر غضنفر شبیر حسین قریشی	" "	" " ۵، ۱۳ "
بزم آخر	منشی فیض الدین دہلوی مترجم: ولی اشرف صبوحی	اسلم فرخی	اردو، ص ۱۱۸ تا ۱۱۹، اپریل
بنیادی اسالیب بیان	عزیز احمد قاسمی	م۔ح	معارف، ص ۳۹۹، مئی
بنیادی اسالیب بیان	مولانا عزیز احمد قاسمی	س (سعید احمد اکبرآبادی)	برہان، ص ۳۱۹، مئی
پاکستان منزل بہ منزل	شریف الدین پیرزادہ	سید محمد تقی	اردو، ص ۱۱۱ تا ۱۱۲، اپریل
پاکستان میدان جنگ میں	شریف فاروق		شہاب، ص ۱۳، یکم مئی

نام	مصنف	تبصرہ نگار	حوالہ
پاکستانی کلچر	جمیل جالبی	غلام حسین اظہر	اوراق، ص ۲۹۵،
"	"	محمد عزیز الرحمان	انجام، ص ۱۱، ۹ر مئی
پرانے موسموں کی آواز (مجموعہ کلام)	کمار	محمود سعیدی	تحریک، ص ۲۹ تا ۳۰، مئی
پری خانہ	واجد علی شاہ		
	تحسین سروری مترجم	م۔ک	ہماری زبان، ص ۱۲، ۸ر اکتوبر
تاریخ اکبری معروف بہ تاریخ قندھاری	محمد عارف قندھاری	مختار الدین احمد	مجلہ علوم اسلامیہ، ص ۱۳۰ تا ۱۴۴، جون تا دسمبر
تاریخ فلاسفۃ الاسلام	محمد لطفی جمعہ		
	ڈاکٹر ولی الدین (مترجم)	احمد انس	چراغ راہ، ص ۴۹ تا ۵۰، مئی
تاریخی مقالات	خلیق احمد نظامی	تاجور سامری	ہمایوں، ص ۱۸۰، مئی
تاویل الاحادیث (عربی)	حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی		
	مرتبہ الاستاذ غلام مصطفے القاسمی		شہاب، ص ۱۳، یکم مئی
	محمود احمد عباسی		صدق جدید، ص ۴، ۱۷ر مئی
تذکرہ خواجہ گیسو درازؒ	اقبال الدین احمد	ن۔ن	انجام، ص ۱۱، ۹ر مئی
تذکرہ طالب آملی مع انتخاب کلام	خواجہ عبد الرشید	س	برہان، ص ۳۱۷ تا ۳۱۸، مئی
تذکرہ مصابیح رشاد ترجمہ			
مناقب الاصفیاء	شاہ شعیب		
	شاہ ابو صالح (مترجم)	م۔ج	معارف، ص ۳۹۸ تا ۳۹۹، مئی
ترک ادبیات	احمد قبا قلی	ڈاکٹر اکمل ایوبی	مجلہ علوم اسلامیہ، ص ۱۴۴ تا ۱۴۹، جون تا دسمبر
تنقید کا نیا پس منظر	جیلانی کامران	و۔ا	اوراق، ص ۲۹۸ تا ۳۰۰،
تنقیدی مقالات	مرزا ادیب	سجاد نقوی	" " ۳۰۴ تا ۳۰۵،
جامعہ کی کہانی	عبد الغفار مدہولی	ریاض الرحمان شروانی	ہماری زبان، ص ۱۲، ۸ر اگست
چند دن دیار غیر میں	عبد اللہ عباس ندوی پھلواروی	۔	صدق جدید، ص ۵ تا ۸، ۱۳ر مئی

نام	مصنف	تبصرہ نگار	حوالہ
خیمے کے آس پاس (ترجمہ رباعیات)	عمر خیام	تبسم کاشمیری	ادب لطیف، ص ۱۰۲، مئی
دلیل سحر	کنہیا لعل کپور	ش۔ ع	جنگ، ص ۵، ۱۳ر مئی
دیوان درد	ظہیر احمد صدیقی	خلیل الرحمان اعظمی	ہماری زبان، ص ۱۲، یکم اکتوبر
دیوان رکن صاین ہروی		مختار الدین احمد	مجلہ علوم اسلامیہ، ص ۱۳۴ تا ۱۴۰، جون تا دسمبر
دیوان شعر بشار بن برد	مرتبہ: سید بدر الدین علوی	" "	" " " ۱۴۵ تا ۱۵۶، " "
دیوان قائم	مرتب: ڈاکٹر خورشید الاسلام	وحید اختر	ہماری زبان، ص ۱۲، ۱۵ر اپریل
دیوان قربی	ابو الحسن قربی دیلوری		
	مرتبہ: سید فضل اللہ	م۔ ج	معارف، ص ۴۰۰، ۱۱ر مئی
رضا لائبریری رام پور کے عربی			
مخطوطات کی فہرست	امتیاز علی عرشی	مختار الدین احمد	مجلہ علوم اسلامیہ، ص ۱۶۱ تا ۱۶۵، جون تا دسمبر
رگ جاں	خورشید الاسلام	حبیب الرحمان	ہماری زبان، ص ۱۱، ۲۲ر جنوری
روح قرآن (انگریزی)	مرتبہ: دینوبا بھاوے جی	س (سعید احمد اکبرآبادی)	برہان، ص ۳۱۸، مئی
سبیل الرشاد یعنی ترجمہ مکتوبات			
دو صدی	شرف الدین یحییٰ منیری		
	سید ابو صالح مترجم	م۔ ج	معارف، ص ۳۹۷ تا ۳۹۸، مئی
سیرت پاک	مرتبہ البشیر محمد شارق دہلوی		شہاب، ص ۱۳، یکم مئی
شعلہ جاں	درد سعیدی		فاران، ص ۱۰ تا ۲۲، "
"	" "	ش۔ ع	جنگ، ص ۵، ۱۳ر مئی
شعلہ گل (مجموعہ کلام)	احمد ندیم قاسمی	ناصر زیدی	ادب لطیف، ص ۱۰۳، مئی
صحافت پاکستان و ہند میں	عبد القوی دسنوی	ڈاکٹر عبد السلام خورشید	ہماری زبان، ص ۳ تا ۴ + ۶، ۸ر ستمبر
صلیب غم	عارف عبد المتین	مرزا ادیب	اردو، ص ۱۱۲ تا ۱۱۳، اپریل
" "	" "	جاوید اختر	ادب لطیف، ص ۱۰۴ تا ۱۰۵، مئی
ضرب آتشیں	قمر ساحری	شہریار	ہماری زبان، ص ۱۲، یکم دسمبر

نام	مصنف	تبصرہ نگار	حوالہ
علیؓ شخصیت اور کردار	عباس محمود العقاد		
	منہاج الدین اصلاحی مترجم	ش ۔ ع	چٹان/ص ۱۲/ ۹ رمئی
فرائضی تحریک	نثار احمد	نثار احمد	چراغ راہ/ص ۴۳ تا ۴۹/ مئی
قاسم کی مہندی	قاسم محمود	انور سدید	اوراق/ص ۳۰۱ تا ۳۰۳/
کربل کتھا	فضل علی فضل		
	مرتب: مالک رام و مختار الدین احمد	خلیل الرحمان اعظمی	ہماری زبان/ص ۱۲/ ۵ ارنومبر
کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ	وحید قریشی	مشفق خواجہ	اردو/ص ۱۱۹ تا ۱۲۱/ اپریل
گلبانگ ۔ مجموعہ کلام	سحر عشق آبادی		ہماری زبان/ص ۱۲/ ۱۵ ستمبر
گیتا پر تقریریں	ونوبا بھاوے جی	س (سعید احمد اکبرآبادی)	برہان/ص ۳۱۸ تا ۳۱۹/ مئی
لہر لہر ندیا گہری	زبیر رضوی	خلیل الرحمان اعظمی	ہماری زبان/ص ۱۲/ یکم ستمبر
متاع شوق	شاغل قادری	م ۔ ج	معارف/ص ۴۰۰/ مئی
مجموعہ قوانین اسلام	تنزیل الرحمان ایڈوکیٹ		شہاب/ص ۱۳ تا ۱۴/ ۲۲ر۹
مرحوم دلی کی ایک جھلک	شمیم احمد	شہریار	ہماری زبان/ص ۱۲/ یکم دسمبر
مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت	مناظر احسن گیلانی		صدق جدید/ص ۶/ ۹ رمئی
مطالعہ امیر	ڈاکٹر ابو محمد سحر	ڈاکٹر محمود الہی	ہماری زبان/ص ۱۲/ ۵ ردسمبر
مقالات اقبال	مرتب: سید عبدالواحد معینی	مظفر علی سید	چراغ راہ/ص ۴۴ تا ۴۶/ مئی
من مجھاون	شاہ تراب	وحید اختر	ہماری زبان/ص ۱۱ تا ۱۲/ ۲۲ رجنوری
مومن	مرتبہ: احسان دانش /		
	عبدالرحمان اصلاحی	س (سعید احمد اکبرآبادی)	برہان/ص ۳۲۰/ مئی
میرے گزشتہ روز و شب	جگن ناتھ آزاد	شہریار	ہماری زبان/ص ۱۲/ یکم دسمبر
نور القبس المختصر من المقتبس	ابی عبداللہ محمد بن عمران	مختار الدین احمد	مجلہ علوم اسلامیہ/ص ۱۵۷ تا ۱۶۰/ جون
نیا عہد نامہ	خلیل الرحمان اعظمی	ملیح کومل	اوراق/ص ۳۰۶ تا ۳۰۸/
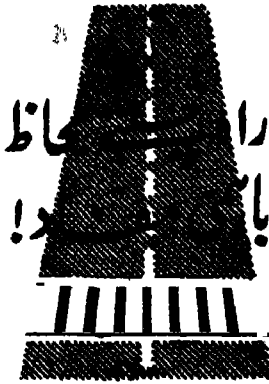
- اگر سڑک پر جانور یا جانور گاڑیاں گذر رہی ہوں تو گاڑی آہستہ چلایئے اور ایسی کوئی حرکت نہ کیجئے جس سے جانوروں کے بدکنے یا خوفزدہ ہونے کا خطرہ ہو۔
- چوراہوں یا زیبرا کراسنگ کے قریب جانور گاڑیوں کی رفتار کو سست کر دیجئے اور تیز رفتار گاڑیوں کو گزرنے کا راستہ دیجئے۔
- سڑک پار کرنے یا اوورٹیک کرنے سے قبل اس بات کا یقین کر لیجئے کہ راستہ بالکل صاف ہے۔
- اگر کوئی سست رفتار گاڑی آگے آگے جا رہی ہو تو جلدبازی سے کام نہ لیجئے اور مصروف راستوں پر اس کو ہرگز اوورٹیک نہ کیجئے۔
- ایسے چوراہوں پر جہاں سگنل یا پولیس کانسٹبل نہ ہوں وہاں ہمیشہ جانور گاڑیوں کو گذرنے کا راستہ دیجئے۔
- اپنے مڑنے کے اشارے صحیح، واضح اور مناسب وقت پر دیجئے۔ ان اشاروں کا جانور گاڑیوں کے لئے خاص خیال رکھئے۔

یہ گاڑیاں جن میں بریک نہیں ہوتے!

وہ گدھا گاڑی ہو یا اونٹ گاڑی، ان میں بریک تو ہوتے نہیں کہ گاڑی بان انہیں جہاں بھی چاہے روک لے۔ آپ کی موٹر میں البتہ جدید ترین قسم کے بریک لگے ہوئے ہیں۔ اس لئے یہ آپ کا فرض ہے کہ جلدبازی سے کام نہ لیں اور ہمیشہ اُن گاڑیوں کو راستہ دیں جو ایکدم سے نہیں رُک سکتیں۔

آپ وقت سے پہلے کیوں مرجھائیں!
دس میں سے نو آدمیوں میں قبل از وقت بڑھاپے کے آثار نظر آنے
لگتے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا سبب ناقص اور ناکافی غذا ہوتی ہے۔
اس غیر طبعی حالت سے بچنے کے لئے ہمدرد کا ماء اللحم دو آتشہ
استعمال کیجئے۔ یہ صحت و شباب قائم رکھنے کا بہترین ذریعہ ہے۔
جدید طبی تحقیق کی مدد سے ماء اللحم کے خواص اور خوبی کو کمال تک
پہنچا دیا گیا ہے اور اب یہ ہر لحاظ سے ایک ایسا مکمل اور مؤثر
ٹانک بن گیا ہے جو تھکے ہوئے اعصاب کو قوت بخشتا ہے اور
پورے نظام جسمانی کو چاق و چوبند کر کے سال بھر کے لئے
ضروری توانائی مہیا کرتا ہے۔ بیشمار لوگ اس کی تاثیر کو آزما چکے ہیں
ماء اللحم دو آتشہ
جاڑوں میں نئی قوت اور صحت حاصل کرنے کے لئے ایک مکمل اور مؤثر ٹانک
ہمدرد
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان
کراچی - لاہور - ڈھاکہ - چٹاگانگ
Maullaham
united